مدیران اعزازی
باری
احسان دانش
بیدی

مسئول
چودھری
برکت علی
بی۔ اے

سالنامہ ۱۹۴۱ء

ادبِ لطیف

جلد (۱۲) | قیمت عہ | شمارہ (۴، ۵)

مندرجات

افسانہ

شعرستان

بحث و نظر

ڈرامہ

شعرستان

مضامین

افسانہ

انتظاریہ

اشارات

داستان ماضی

لاہور کو اس امر پر ناز ہے کہ انڈین ہسٹری کانگریس کا سالانہ اجلاس یہاں ہوا۔ دیوان بہادر کرشنا سوامی آئینگر نے اپنے صدارتی خطبہ میں بتایا کہ کس طرح ہندوستان کی صدیوں کی تاریخ کو از سر نو زندہ کیا جا رہا ہے اور ہندوستان کی تاریخ کو آغازِ انسان کی تاریخ سے قریب لے جایا جا رہا ہے۔ وادیٔ سندھ کی دریافتوں نے ہندوستان کی تاریخ کو متمدن دنیا کی قدیم ترین تاریخ سے ملا دیا ہے۔ ہندوستان کا فراموش شدہ ماضی اب پھر ہمارے ذہنوں میں جگہ لے رہا ہے۔ دیوان بہادر کا خیال ہے کہ گزشتہ تیس سال کی دریافت کے پیش نظر ہندوستان کی تاریخ کو از سر نو لکھا جانا چاہیئے۔

انڈین ہسٹری کانگریس

انڈین ہسٹری کانگریس کے چوتھے سالانہ اجلاس کا افتتاح ۱۶ دسمبر کو پنجاب یونیورسٹی ہال میں کیا گیا۔ اس اجلاس میں ہندوستان بھر کے نامور مورخ شریک ہوئے۔ دیوان بہادر کرشنا سوامی آئینگر اس اجلاس کے صدر تھے۔ پنجاب یونیورسٹی کی طرف سے خان بہادر میاں افضل حسین وائس چانسلر پنجاب یونیورسٹی نے انڈین ہسٹری کانگریس کے مندوبین کا شکریہ ادا کیا۔ مولانا ابو الکلام آزاد صدر کانگریس، سر گرجا شنکر باجپائی، اور سر بی ایل متر کے پیغامات پڑھ کر سنائے گئے۔ انڈین ہسٹری کانگریس کی رپورٹ کانگریس کے پہلے اجلاس میں پیش کی گئی۔

"ہندوستانی اور غیر ہندوستانی تاریخی شواہد سے پتہ چلتا ہے کہ صدیوں پہلے مغربی ایشیا اور مصر سے ہندوستان کے تاجرانہ تعلقات تھے۔ موہنجو دارو اور ہڑپہ کے آثار سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ چار ہزار سال پہلے ہندوستان اور مغربی ایشیا میں تمدنی تعلق تھا۔ ہندوستانی سپاہی ایران کے لئے یونان کے میدانوں میں جنگ کرتے رہے۔ اشوک کے تبلیغی مشن نے مغربی ایشیا، مصر اور مشرقی یورپ کا دورہ کیا تھا۔ اس تعلق کا نتیجہ ہندوستان اور ان ملکوں کے ادب، آرٹ اور مذہب پر ظاہر ہوا۔ ایک شامی مصنف نے اپنی تحریر میں کسانی دیوتا کا ذکر کیا ہے میرے خیال میں یہ لفظ کرشنا کی بگڑی ہوئی صورت ہے۔ مسیح کی ولادت سے ایک سو پچاس برس پہلے آرمینیا میں کرشنا کا دھرم جگہ حاصل کر چکا تھا۔ تجارتی تعلقات کے بعد ہندوستان اور رومی سلطنت میں سیاسی تعلقات بھی قائم ہو گئے تھے۔ آگسٹس سیزر کے دربار میں ہندوستانی سفارت موجود تھی۔ مغرب کے ادب اور مذہب کا ہندوستان پر کافی اثر پڑا۔ سنگ تراشی میں ہندوستان یونان کا مرہون منت ہے۔ شمال میں تجارتی سرگرمیوں کا آغاز ہوا۔ کابل، قندھار اور ہرات فتح کرنے کے بعد ہندوستانی فوجوں نے ختن پر بھی قبضہ کر لیا تھا۔ ہندوستانی تہذیب و تمدن چین میں بھی داخل ہو گئی۔ تبت نے فن تحریر کو ہندوستان سے حاصل کیا۔"

تعصب کا خاتمہ

دیوان بہادر کرشنا سوامی آئینگر نے اپنے خطبۂ صدارت میں بتایا کہ گزشتہ بیس سال کی مدت میں ہندوستانی تاریخ کے متعلق ہماری معلومات میں بہت اضافہ ہو چکا ہے۔ وادیٔ سندھ کی تہذیب کے باقی ماندہ آثار ہماری تاریخ کو ہزاروں سال پیچھے لے گئے ہیں۔ ہندوستانی تہذیب اور تمدن خلیج بنگالہ کی راہ سے جزائر شرق الہند اور چین تک جا پہنچی تھی . . . . ہمارے مقاصد خواہ کتنے ہی نیک کیوں نہ ہوں۔ لیکن ہم انہیں ماضی کی تاریخ سے پورا نہیں کر سکتے۔ تاریخ کا مقصد اس سے زیادہ اور کچھ نہیں کہ وہ ماضی کو ایک مکمل صورت میں پیش کرے۔ ہم از منۂ تعصب کو تاریخ کے صفحات سے نہیں نکال سکتے۔ بلکہ ہم تاریخ پڑھنے والے کو بتا سکتے ہیں کہ اس قسم کے تعصبانہ افعال کا کس قدر برا اثر ہوا۔

بڑا ہندوستان

ہندوستان کی تہذیبی تاریخ کے متعلق یہ خیال عام ہے کہ ہندوستانی

فلک بوس پہاڑوں او گہرے سمندروں میں محصور ہونے کی وجہ سے نہ اپنی تہذیب سے دوسرے ملکوں کو متاثر کر سکا اور نہ دوسرے ملکوں کی تہذیب سے خود متاثر ہوا لیکن اب تاریخی شواہد اس نظریہ کی تردید کر رہے ہیں۔ سائیں داس خطبات کے سلسلہ میں تقریر کرتے ہوئے ڈاکٹر مجم دار نے اس نظریہ کی ان الفاظ میں تردید کی۔

پنجاب کو ان الفاظ میں خراج عقیدت پیش کیا۔

"رگ وید کے گیت سب سے پہلے پنجاب کے دریاؤں کے کنارو پر گائے گئے۔ پنجاب ہندوستانی تہذیب کا اولین گہوارہ ہے۔ اگر ابتدائی تہذیبوں نے نیل فرات اور دجلہ کے کناروں پر اپنا سر نکالا تھا تو کیا وجہ ہے کہ سندھ اور گنگا اس قسم کی تہذیبوں کو پیش نہ کرتے روسی سائنس دان ویری لوف کا خیال ہے کہ پنجاب میں سب سے پہلے گندم کی کاشت ہوئی۔ پنجاب نے سب سے پہلے ہندوستان کو اصول حکمرانی دیئے۔ جمہوریت کا خیال سب سے پہلے پنجاب ہی نے ہندوستان کو دیا۔ قدیم ہندوستان میں پنجاب ہی علم و ادب کا بہترین مرکز تھا۔ پانینی، چانکیہ اور چندر گپت ٹیکسلا ہی کے فارغ التحصیل تھے"

تحفۂ پنجاب

ڈاکٹر رابندر ناتھ ٹیگور کو کسی زندہ دل پنجابی نے تین تحفے پیش کرتے ہوئے ان میں کسی ایک کو پسند کرنے کی درخواست کی تھی:۔

(۱) 'لٹے ہوئے سہاگ کے پھول'

(۲) 'ستی عورت کی راکھ'

(۳) 'مزار پر اُگے ہوئے درخت کے مرجھائے ہوئے پتے'

ڈاکٹر ٹیگور بین الاقوامی شہرت کے مالک ہیں۔ ادبیات کا نوبل انعام بھی حاصل کر چکے ہیں۔ دنیا کی بیشتر زبانوں میں آپ کے افکار و اشعار کا ترجمہ ہو چکا ہے۔ یورپ کی تھکی ماندی، مادہ پرست اور پیہم جنگ و جدل اور معاشی مسابقہ میں مبتلا اقوام کے لئے ٹیگور کی زندگی سے گریزاں شاعری سکون و اطمینان کا شاید کوئی پہلو پیش کر سکے۔ لیکن ایشائی اقوام کے لئے ٹیگور کے پاس کوئی نئی چیز نہیں ہے 'گل و بلبل' 'حسن و عشق' 'ہجر و وصال' 'حزن و الم' کی داستانوں سے ہمارا اپنا ادب بھرا پڑا ہے۔ ہم اس کے مطالعہ سے اکتا چکے ہیں۔ ٹیگور اپنے اشعار میں زندگی کی حقیقتوں کو چھپا کر ہمیں خیالی دنیا میں چاہتا ہے —— ایک ایسی دنیا جس میں صدیوں زند[...] کرنے کے بعد ہم اکتا گئے ہیں۔ ہمارے لئے ٹیگور کے پاس سہ[اگ کے] پھول، ستی عورت کی راکھ، اور مزار پر اُگے ہوئے درخت کے پتوں کے سوا اور کچھ نہیں

ہنری برگسان

جرمن ادیبوں، شاعروں اور فلسفیوں میں یہودیوں کی تعداد بہ[ت] رہی ہے۔ نازیوں نے جب جرمن یہودیوں کو جلا وطن کیا تو نظ[ریۂ] اضافیت کے بانی ڈاکٹر آئن سٹائین کو بھی جلا وطن ہونا پڑا تھا [فرانس] کی سرزمین 'حریت' 'اخوت' اور 'مساوات' کا نعرہ بلند کرنے میں یو[رپ] کی سب اقوام سے آگے تھی لیکن اب روسو اور والٹیر کے وطن میں آ[زادیٔ] فکر کے لئے کوئی جگہ دکھائی نہیں دیتی۔ فرانس کی وشی حکومت [نے] ہنری برگسان کو جلا وطن کر دیا۔ علامہ اقبال کی زبان سے ہنری [برگسان] کا پیغام سنئے ؎

تا بر تو آشکار شود راز زندگی
خود را جدا ز شعلہ مثال شرر مکن
بہر نظارہ جز نگہ آشنا میار
در مرز و بوم خود چو غریبان گزر مکن

نقشے کہ بستہ ہمہ اوہام باطل است
عقلے بہم رساں کہ ادب خوردہ دل است

ہنری برگسان نے فرانس کے حکیمانہ ادب میں نمایاں اض[افہ] کیا۔ ۱۹۲۸ء میں اُسے نوبل انعام ملا تھا۔ اس کا تعلق فلسفیوں کی ا[س] سلک سے ہے جس میں ہیگل، کانٹ اور شوپنہار دکھائی دیتے ہیں۔ جب وکٹر ہیوگو کو جلا وطن کیا گیا تھا تو اس نے کہا تھا:۔

"میں اس وقت آؤں گا جب آزادی آئے گی"

ہنری برگسان بھی فرانس میں اس وقت آئیگا۔ جب وہاں آزادیٔ افکار کا اعلان ہو گا ✤

پیرس اور لیڈن یونیورسٹیاں

پیرس پر نازی قبضہ ہونے کے بعد پیرس یونیورسٹی کے طلباء نے ذہنی اور فکری آزادی برقرار رکھنے کے لئے جدوجہد کی۔ لیکن نازی پولیس نے پیرس یونیورسٹی کے پانسو طلبا کو گرفتار کر لیا۔ طلبا کی گرفتاری بجائے خود ایک مذموم فعل تھا۔ لیکن نازی اس سے ایک اور قدم آگے بڑھے اور پیرس یونیورسٹی کو بند کر دیا۔ آزادیٔ خیال اور درس و تدریس کے پیشِ نظر پیرس یونیورسٹی کا شمار دنیا کی بہترین درسگاہوں میں ہوتا ہے۔ ہالینڈ کی قدیم ترین درسگاہ لیڈن یونیورسٹی کو بھی نازیوں نے بند کر دیا ہے۔ لیڈن یونیورسٹی کو چار سو برس پہلے ولیم آرینج نے قائم کیا تھا۔ طب اور قانون کی تعلیم کیلئے لیڈن یونیورسٹی بین الاقوامی شہرت رکھتی ہے۔ مشرقی زبانوں کی تعلیم کیلئے یورپ کی کوئی یونیورسٹی لیڈن یونیورسٹی کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ مصر اور ہندوستان میں لکھی ہوئی قلمی کتابوں کا سب سے بڑا ذخیرہ اسی یونیورسٹی میں ہے۔

جواہر لال کی زبان

اردو کے ایک اخبار نے لکھا کہ پنڈت جواہر لعل نہرو گھر میں اردو بولتے ہیں۔ اس پر ہندی کے ایک ترجمان نے معترض ہوتے ہوئے کہا کہ "پنڈت جی کی زبان ہندی ہے" بس پھر کیا تھا دونوں میں بحث چھڑ گئی۔ اسی سلسلے میں پنڈت جی کا ایک خط شائع ہوا جس میں انہوں نے نہ اردو والوں کو ناراض کرنا چاہا اور نہ ہندی والوں کو خفا۔ انہوں نے لکھا کہ میں گھر میں اردو بولتا ہوں لیکن لکھنے پڑھنے میں مجھے اردو کی نسبت ہندی میں آسانی ہوتی ہے "چلئے چھٹی ہوئی" سوال یہ ہے کہ اگر پنڈت جی گھر میں اردو بولتے ہیں تو اس سے اردو کو کیا فائدہ اگر وہ ہندی بولنا شروع کر دیں اس سے اردو کو کیا نقصان؟ اگر اردو اور ہندی ایک شخص کے بولنے یا نہ بولنے سے بن اور بگڑ سکتی ہیں تو دونوں کا اللہ والی۔ پنڈت جی اردو بولیں یا ہندی اس سے ہندی اور اردو کے پرچارکوں کو خوش نہیں ہونا چاہئے۔ پنڈت جی وطن عزیز کے نامور سیاسی ہونے کے علاوہ انگریزی زبان کے ایک بلند پایہ انشا پرداز بھی ہیں۔ وہ انگریزی زبان میں لکھتے ہیں۔ اس سلسلہ کے متعلق اردو ہندی بولنے کی بحث بیکار ہے۔ پنڈت جی اردو بولتے ہیں، ہندی لکھ سکتے ہیں۔ اور انگریزی لکھتے ہیں *

سالنامہ

سالنامہ ادبِ لطیف کی ترتیب و تدوین میں اس امر کی انتہائی کوشش کی گئی ہے۔ کہ قارئین کرام کی خدمت میں نظم و نثر کا ایک مرقع جمیل پیش کیا جائے۔ ادبِ لطیف گزشتہ سات سال سے اردو ادب کی حسبِ ہمت خدمت کر رہا ہے۔ ہم نے زیرِ نظر سالنامہ کو اپنے تمام گذشتہ سالناموں سے بہتر بنانے کی ہر امکانی کوشش کی ہے۔ ہم ان تمام اہلِ قلم حضرات کا شکریہ ادا کرتے ہیں جنہوں نے ۱۹۴۰ء میں "ادبِ لطیف" کی قلمی معاونت فرمائی۔ سالنامہ کی ترتیب و تدوین میں ادارہ خواجہ حسن عباس کا شکریہ ادا کرتا ہے۔ جنہوں نے اپنا بہت سا وقت انتخاب مضامین پر صرف کیا۔

ادارہ منشی محمد شریف عباسی خوشنویس کا شکریہ ادا کرتا ہے جنہوں نے سالنامہ کی کتابت میں اپنا بہت زیادہ وقت صرف کیا۔ عباسی صاحب ہمارے ادارہ کے بہترین خطاط ہیں۔ اور تمام اچھی کتابیں انہیں کی لکھی ہوئی ہیں۔ اور منشی محمد حسین (صاحب) بھی ادارہ کے شکریہ کے مستحق ہیں۔ جنہوں نے کتابت میں عباسی صاحب کا ہاتھ بٹایا۔

مکتبۂ اردو کے منیجر چوہدری نذیر احمد صاحب بھی ہمارے شکریہ کے مستحق ہیں جنہوں نے متواتر چار ہفتوں کی تگ و دو اور ان تھک محنت کے بعد سالنامہ کو قارئین کرام تک پہنچایا۔

انتظاریہ

سالنامہ ادبِ لطیف" کا یہ حصہ اس وقت بڑھایا گیا جب عملی طور پر سالنامہ مرتب ہو چکا تھا۔

تصحیح

سردار کرپال سنگھ بیدار کے "نغمات" کے پہلے مصرعہ کا پہلا لفظ "پرس" چھپ گیا ہے۔ آپ اسے "پیرس" پڑھیں۔

جلیل صاحب کی غزل میں ماشاد کو "ناشاد" پڑھیں اور دوسرے شعر کے دوسرے مصرعہ کو اس طرح پڑھیں۔

صید ہے کوئی نہ اب صیاد ہے"

فیض صاحب کی نظم "افسردگی" میں افسانۂ نور کو "فسانۂ نور" پڑھیں *

نازی گیت

جرمنی کی نازی حکومت نے بچوں کے لئے جو گیت مرتب کی ہیں۔ انکے لفظ لفظ سے بوئے خون آتی ہے: بچوں کو کمسنی میں یہ تعلیم دی جاتی ہے کہ دنیا میں صرف جرمن قوم ہی کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ دنیا کی ساری قوموں پر حکومت کرے۔ بچوں کو خونخواری کی تعلیم! زندگی کی کس قدر ہیبت ناک تصویر ہے ؟

کیا یہ زندگی کی تردید نہیں ؟

بچوں سے ریاضی پڑھاتے وقت اس قسم کے سوال دریافت کئے جاتے ہیں :۔

(۱) اگر ایک جرمن طیارہ ایک گھنٹے میں تین سو میل اڑتا ہے تو بتاؤ کہ وہ پانچ گھنٹوں میں کتنے میل اڑے گا۔ ؟

(۲) اگر ایک جرمن طیارہ ایک منٹ میں پچاس گولے پھینکے تو بتاؤ وہ پندرہ منٹ میں کتنے گولے پھینکے گا۔ ؟

نازی جرمن نے اپنی خون آشام پالیسی کا اظہار اسکولوں ہی میں نہیں کیا بلکہ نازیوں کے عوام کے لئے چند گیت بھی تیار کرلئے ہیں۔ ان گیتوں سے نازی وحشت اور بربریت کا پورا ثبوت ملتا ہے مسٹر نریندر ناتھ سیٹھ نے ہمیں نازی جرمن کے چند گیتوں کا ترجمہ بھیجا ہے۔ جنہیں ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔

ـــــ (۱) ـــــ

انہیں بجانے دو
جن کے پاس وقت ہے
اپنے باجے اور ڈھول
ہم تو صرف یہ چاہتے ہیں
کہ لوہا لوہے سے بجے اور خون میں تر ہو جائے۔
فرانسیسیوں کے خون سے۔
اے انتقام کے مسرت انگیز دن
لوہے کے بجنے کی آواز ہم جرمنوں کو کتنی سُریلی معلوم ہوتی ہے۔
اور یہ کتنی بڑی بات ہے

ـــــ (۲) ـــــ

ایک سووس کارتوس
میرے کندھے پر لٹک رہے ہیں
بندوق بھری ہوئی ہے۔
ہم تیار ہیں
اے بالشویک اب تو آ

ـــــ (۳) ـــــ

اے چھوٹے سے ڈھولک
تو خوب بج
ہم روس کی طرف کوچ کرنا چاہتے ہیں
تو اِس طرح بج
کہ بالشویکوں کو ہماری طاقت کا احساس ہو

طالب علموں کا لباس۔

گورنمنٹ کالج لاہور کے پرنسپل نے اپنے کالج کے طالبعلموں کو ہدایت کی ہے کہ وہ موٹروں پر سوار ہو کر کالج میں نہ آئیں۔ اور نہ قیمتی لباس زیب تن کریں۔ پرنسپل کی یہ ہدایت جہاں طالب علموں کو سادہ زندگی بسر کرنے کی تلقین کرتی ہے وہاں انہیں اسراف اور فضول خرچی سے بھی باز رکھتی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ کھیل کے میدان میں گورنمنٹ کالج لاہور کے طلبا ہندوستان بھر میں امتیازی حیثیت رکھتے ہیں لیکن غیر کھلاڑی طلبا کی صحت روز بروز خراب ہو رہی ہے۔ اسکو وجہ طلبا کا افلاس نہیں ہو سکتا۔ بلکہ اسکا سبب قیمتی لباس اور سامان آرائش۔ اگر طلبا پرنسپل کی ہدایت پر پوری طرح سے عمل کریں تو انہیں بہت جلد معلوم ہو جائے گا کہ ان کی تعلیمی قابلیت اور جسمانی صحت میں کتنی حیرت انگیز تبدیلی پیدا ہو چکی ہے۔

جاہری

نوٹ :۔ "ابن آدم عالم تنہائی میں" میکسم گورکی کی ڈائری کا ایک ورق ہے۔

مکتبۂ اردو ۔۔۔ لاہور

رفتارِ کار پر ایک طائرانہ نظر

مکتبۂ اردو گزشتہ چار سال سے اردو ادب کی خدمت میں مصروف ہے۔ کتابوں کی نشر و اشاعت کے پیشِ نظر یہ مدت بہت تھوڑی ہے تاہم مکتبۂ اردو نے اس قلیل مدت میں اردو ادب میں اضافہ کرنے کے لئے ہر ممکن جد و جہد کی۔ مکتبۂ اردو نے گزشتہ سال سستی کتابوں کا ایک سلسلہ شروع کیا تھا۔ اس سلسلہ کی ایک درجن سے زائد کتابیں چھپ چکی ہیں۔ اس سلسلہ کا مقصد مختلف علوم و فنون کے ابتدائی مطالعہ کو آسان اور عام فہم انداز میں پیش کرنا ہے۔

۱۹۴۰ء میں مکتبۂ اردو لاہور نے مندرجہ ذیل کتابوں کو پیش کیا:۔

۱۔ دانہ و دام:۔

راجندر سنگھ بیدی کے افسانوں کا مجموعہ ہے۔ بیدی حقائقِ حیات کی ترجمانی کرنے والا افسانہ نویس ہے۔ اس کے افسانوں میں انسانی زندگی اپنی تمام خوبیوں اور کمزوریوں کے ساتھ موجود ہے۔

۲۔ راجہ اور کسان۔

لیونارڈ وُلف کی کتاب کے دو ابواب کا اردو ترجمہ ہندوستانی راجہ اور ہندوستانی کسان کی زندگیوں پر بے لاگ تبصرہ۔

۳۔ عناصرِ تہذیب۔

تاریخِ تہذیب کے ماہر وِل ڈیورنٹ کی کتاب "داستانِ تہذیب" کے چند ابواب کا اردو ترجمہ۔

۴۔ انقلابِ فرانس۔

باری نے تاریخِ عالم کے اس اہم ترین حادثہ کو اردو زبان میں سب سے پہلے ۱۹۳۴ء میں پیش کیا۔ ترمیم اور اضافوں کے ساتھ اب یہ کتاب نئے انداز میں پیش کی گئی ہے۔ باری ایک مخصوص اندازِ تحریر کا مالک ہے۔

۵۔ سرکش روحیں۔

شام کے مشہور مصنف جبران خلیل جبران کی کتاب کا اردو ترجمہ کتاب کا مترجم ابو العلا چشتی ہے۔

۶۔ رنگ و بو۔

پروفیسر فیاض محمود کے افسانوں کا اولین مجموعہ فیاض محمود کے افسانے زندگی سے اس قدر قریب ہوتے ہیں کہ افسانوں کے کردار ہمارے سامنے چلتے پھرتے اور بستے نظر آتے ہیں۔

۷۔ آبگینے۔

اختر انصاری کے یہ قطعات اپنی جدت طرازی کے اچھوتے ہیں۔ ایسے انداز اور مغربی اسلوب کے اعتبار سے اردو شاعری میں ایک نئے باب کا اضافہ ہے۔

۸۔ عصمت انونو۔

کمال اتاترک کے دستِ راست اور جانشین کے حالاتِ زندگی۔ جمہوریت ترکیہ کے ارتقا کی تصویر۔

۹۔ کونپل۔

اوپندر ناتھ اشک کے افسانہ کا مجموعہ۔ اشک کے افسانوں کی مقبولیت کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ اس کے افسانوں کا ترجمہ ہندی، مرہٹی، گجراتی اور بنگالی میں ہو چکا ہے۔

۱۰۔ سٹالین۔

سوویٹ روس کے آہنی انسان کی داستان زندگی، ابتدائی زندگی، جلاوطنی، لینن کے ساتھ ایامِ زیست، ٹرانسکی اور سٹالین کے اختلافات۔

۱۹۴۱ء میں مکتبۂ اردو کم و بیش ایک سو نئی کتابیں شائع کرے گا۔ ان نئی کتابوں کے متعلق ہم ایک علیحدہ کتابچہ شائع کر رہے ہیں۔ سرِ دست ان کتابوں کی فہرست دی جاتی ہے۔ جو جنوری ۱۹۴۱ء میں شائع ہو رہی ہیں:۔

۱۔ سوشلزم ۔۔۔ فریڈرک اینگلز

یہ کتاب پچھلے سال مکتبہ اردو نے شائع کی تھی۔ اب ضروری اضافوں کے بعد اس کا دوسرا ایڈیشن شائع ہو رہا ہے۔ ترجمہ کی زبان بہت آسان کر دی گئی ہے۔

۲۔ مشین اور مزدور۔

باری کی نئی کتاب۔ سرمایہ دارانہ تہذیب میں مشین اور مزدور کے تعلقات پر بحث۔ مزدور تحریک کی ابتدائی تاریخ۔

۳۔ پرواز لق لق۔

حاجی لق لق کے افسانوں اور مضمونوں کا نیا مجموعہ۔

۴۔ محمدؐ عربی۔

باری کی زیر نظر کتاب "تاریخ عالم" کا ایک باب

۵۔ حسن کی قیمت۔

حکیم احمد شجاع کی کتاب کا نیا ایڈیشن۔

۶۔ ٹراٹسکی۔

روس کے جلاوطن ادیب مورخ اور انقلاب پسند کے سوانح حیات سٹالین اور ٹراٹسکی کے اختلافات پر نریندر ناتھ میٹھ کی لکھی ہوئی کتاب۔

۷۔ رضا شاہ پہلوی۔

ایران کے بانی رضا شاہ پہلوی کے سوانح حیات، ایران نو ترقیات۔

۸۔ جاگیرداری۔

موجودہ دور سرمایہ اور جاگیرداری میں کش مکش۔ جاگیرداری اور کارخانہ داری میں تصادم۔

۹۔ منٹو کے افسانے۔

سعادت حسن منٹو کے افسانوں کا مجموعہ

منٹو ہندوستان کے ان افسانہ نگاروں کے اسکول سے تعلق رکھتا ہے۔ جو زندگی سے گریز کا قائل نہیں۔ جو انسانی خوبیوں اور کمزوریوں کو نقد و تبصرہ کئے بغیر افسانوں کو پیش کرنے کا درس دیتا ہے۔ منٹو کا ہر افسانہ ہر انسان کی زندگی کا کوئی نہ کوئی پہلو پیش کرتا ہے۔

ن۔ م۔ راشد وحیدی کی نظموں کا مجموعہ بھی شائع ہو رہا ہے

۱۰۔ بگولے۔

احمد ندیم قاسمی کے افسانوں کا مجموعہ

قاسمی پنجاب کی دیہاتی زندگی کا سب سے بڑا عکاس ہے

۱۱۔ گرہن۔

راجندر سنگھ بیدی کے افسانوں کا نیا مجموعہ

۱۲۔ ٹوٹے ہوئے تارے۔

کرشن چندر ایم۔اے کے افسانوں کا نیا مجموعہ

۱۳۔ آؤ!

سعادت حسن منٹو کے ریڈیائی ڈراموں کا پہلا مجموعہ

۱۴۔ میکسم گورکی کی ڈائری۔

روس کے مشہور و معروف ادیب میکسم گورکی کی ڈائری کے چند اوراق کا اردو ترجمہ۔ کتاب کا مترجم حسن عباس ہے۔

۱۵۔ نئے زاویے۔

ہندوستان کے نامور انشا پردازوں کی متحدہ کوششوں کا نتیجہ۔ یہ کتاب اردو ادب میں ایک شاندار اضافہ ہوگی۔

'نئے زاویے' کا مرتب کرشن چندر ہے۔ یہ انسانی زندگی کے متعلق نئے زاویئے پیش کرتی ہے۔ تہذیب، اخلاق اور ادب کو نئے زاویہ سے مطالعہ کرنے والے انشاء پردازوں کے افکار تازہ کی اک تصویر۔

سالنامہ۔

مکتبہ اردو 'ادب لطیف' کے سالنامہ کو پیش کر رہا ہے۔ ادارہ کی بلند ہمتی کا اندازہ کیجئے۔ سالنامہ جس کاغذ پر شائع کیا گیا ہے وہ لیتھو پرنٹنگ میں ایک نئی اور کامیاب کوشش ہے۔

آئندہ پرچہ۔

ادب لطیف کے سالنامہ میں جنوری ۱۹۴۱ء کا پرچہ بھی شامل ہے۔ ادب لطیف کا آئندہ پرچہ یکم فروری کو شائع ہوگا۔

چوہدری نذیر احمد

مینجنگ پرپرائٹر مکتبہ اردو لاہور

مسافر

ڈاکٹر سید عبداللہ۔ ڈی۔ لٹ

ترقی پسند ادب کا اخلاقی زوال

دنیا کے ذرے ذرے میں تغیر کا اصول کارفرما ہے چیزیں بنتی ہیں اور بگڑتی ہیں۔ بگڑتی ہیں اور بنتی ہیں۔ موسموں میں اختلاف، رات دن کا چکر، حالات و کوائف کا ادل بدل کر آنا، زمانی اور زمینی اوضاع و اطوار کی رنگا رنگی ـــ سب اسی ایک قانون تغیر کی مختلف شکلیں ہیں۔ لیکن جہاں یہ سب کچھ درست ہے وہاں اس سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ کارخانۂ حیات کے یہ بوقلموں تغیرات اپنے اندر ایک نظم، ایک وحدت اور ایک ہم آہنگی رکھتے ہیں۔ اس انقلاب کے محرکات و مظاہر کے اندر ہی اندر کوئی ایسا متحدہ قانون کام کر رہا ہے جو اس تجدد میں ایک ضبط پیدا کرنے کا باعث ہوتا ہے۔ ندی بہتی ہے۔ اس کا ہر ہر قطرہ تجدد کا نغمہ گاتا ہے۔ باغوں میں بہاریں آتی ہیں۔ پھول کی دنیا میں انقلاب اور زبردست انقلاب آجاتا ہے پھر خزاں چھا جاتی ہے شہرستان چمن کا نظام یکسر بدل جاتا ہے۔ برسات میں مینہ کی جھڑی لگتی ہے۔ بارش کا تسلسل گھنٹوں تک جاری رہتا ہے۔ گویا آسمان نے اپنے جوئبار کے بند کھول دیئے ہیں۔ قدرت یہ سب کھیل یوں کھیلتی ہے۔ گویا ان میں کوئی خاص سبق ہمارے لئے پنہاں نہیں ہوتا۔ لیکن کون کہہ سکتا ہے۔ کہ ندی کا تسلسل قدیم و جدید میں پیوند کا ایک مکمل وعظ ہے! خزاں رسیدہ باغ کی بہاریں یک لخت انقلاب کا نہیں بلکہ قوائے نباتی کے ایک طویل عمل اور رد عمل کا نتیجہ ہیں۔ بہار کے بعد خزاں کی غارتگری کوئی اتفاقی تبدیلی نہیں۔ بلکہ کسی گذشتہ سے پیوستہ باب کی ایک فصل ہے اور آسمانی ندی یعنی مینہ کا جاری ہونا حادثہ نہیں۔ بلکہ ماضی میں کام کرنے والے ہزاروں اثرات کا مظہر ہے۔

اس میں شبہ نہیں۔ کہ بظاہر یہ شاعرانہ تمثیلات و تشبیہات ہیں۔ لیکن درحقیقت اس جہانِ آب و گل کا ایک ایک ذرہ اسی قانونِ عالمگیر کا آئینہ دار ہے۔ انسانی تاریخ، علوم، معاشرت، فلسفہ بلکہ ہمارا سارا تمدن اسی اصولِ مخفی کا ترقی یافتہ ظہور ہے۔ اور ادب، شعر و سخن، فن اور آرٹ تک بھی اس کے دائرۂ عمل میں شامل ہیں۔

۱۹۳۵ء میں ہندوستان میں ایک نئی ادبی تحریک ظہور میں آئی جس کو ترقی پسند ادب یا نیا ادب کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ اس ادبی انقلاب کے علمبرداروں میں بہت سے ایسے حضرات شامل تھے جو ہمارے قدیم ادب کے مسموم اثرات کو ملک کی ذہنی ترقی کے لئے مضر خیال کیا کرتے تھے۔ اور مخلصانہ چاہتے تھے۔ کہ اس فرسودہ ضابطۂ فکر و خیال میں ایک ایسی خوشگوار تبدیلی پیدا کی جائے۔ جس سے نوجوانانِ وطن کے افکار و خیالات میں ترقی اور آزادی کی روشنی پیدا ہو۔ اور اُن کے دل و دماغ سے وہ قدیم ظلمتیں اور کدورتیں دور ہو جائیں جو ہماری ذہنی غلامی اور پستی کا باعث بن رہی ہیں۔

چنانچہ انجمن ترقی پسند مصنفین نے اپنے ایک اعلان نامہ میں اپنے اغراض و مقاصد کی ان الفاظ میں صراحت کی تھی۔ کہ "ہندوستانی ادب کی نمایاں خصوصیت یہ رہی ہے کہ وہ زندگی کی ہیبت اور حقیقی کیفیتوں سے جی چرانا چاہتا ہے۔ حقیقت و اصلیت سے بھاگ کر ہمارے ادب نے بے بنیاد روحانیت اور تصور پرستی کی آڑ میں پناہ لی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے عناصرِ قوی مضمحل ہو گئے ہیں۔ اسکا پتہ اس سے چلتا ہے۔ کہ ہمارے ادب میں عقلیت مشکل سے پائی جاتی ہے۔"

"ہماری انجمن کا مقصد یہ ہے کہ ادبیات اور فنونِ لطیفہ کو قدامت پرستوں کی مہلک گرفت سے نجات دلائیں۔ اور انکو

عوام کے دکھ سکھ اور جدوجہد کا ترجمان بنا کر اس روشن مستقبل کی راہ دکھانے کے لئے جس کے لئے انسانیت اس دور میں کوشاں ہے"

"ہم اس انجمن کے ذریعے ہر ایسے جذبے کی ترجمانی کریں گے جو ہمارے وطن کو ایک نئی اور بہتر زندگی کی راہ دکھانے ...۔ ہم چاہتے ہیں۔ کہ ہندوستان کا نیا ادب ہماری زندگی کے بنیادی مسائل کو اپنا موضوع بنائے یہ بھوک، افلاس، سماجی پستی اور غلامی کے مسائل ہیں"

اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ کہ انجمن ترقی پسندان کے بعض مقاصد بہت شاندار ہیں۔ اور ہاشبہ ان کو جامۂ عمل پہنانا ملک کی حقیقی بہی خواہی اور ادب کی سچی خدمت کے مرادف ہے۔ کون نہیں چاہتا کہ ہمارے ادیب جھوٹی تصور پرستی کو چھوڑ کر حقیقت و اصلیت کا دامن تھامیں۔ کون نہیں چاہتا کہ زندگی کی تین اور حقیقی کیفیتوں کا صحیح مطالعہ کیا جائے۔ کون نہیں چاہتا کہ ادب کو عوام کے دکھ سکھ اور جدوجہد کا ترجمان بنا کر اس کو اس کے روشن مستقبل کا راستہ دکھایا جائے۔ بھوک، افلاس، غربت، سماجی پستی اور سیاسی غلامی واقعی وہ موضوع ہیں جن کی حقیقت کو بے نقاب کرنے میں اہل قلم حضرات کی پوری کوششیں صرف ہونی چاہئیں۔ تاکہ وطن کی مصیبتوں کا خاتمہ ہو جانے کے بعد اہل وطن امن و امان کے دن کاٹ سکیں۔ انجمن ترقی پسند ان کے مخلص ارکان کے دل میں جو درد پیدا ہوا۔ اُس میں یقین جانئے، ملک کا ہر بہی خواہ شریک تھا اور شریک ہے۔ اور حتی الوسع ان کے ان اعلیٰ مقاصد کے پورا کرنے میں ساعی و کوشاں رہا ہے اور کوشاں رہے گا۔

لیکن یہ دیکھ کر دھوکہ ہوتا ہے۔ کہ اب تک ترقی پسند ادیبوں نے جو کام کیا ہے اس سے ان بیان کردہ مقاصد کو کوئی خاص تعلق نہیں معلوم ہوتا۔ درحقیقت انقلاب پیدا کرنے کے لئے جس قسم کے اولوالعزم صاحبان بصیرت کی ضرورت ہوا کرتی ہے شاید ترقی پسند ادیبوں کی جماعت ایسی شخصیتوں کے وجود سے خالی ہے۔ بدقسمتی کی بات ہے۔ کہ ہندوستان میں سوشلزم اور انقلابی جدوجہد کے رہنماؤں میں کوئی ایسا شخص موجود نہیں ہے۔ جو ان تحریکوں کو کسی نفسیاتی اصول پر چلانے کے قابل ہو۔ اس صورت حالات کا نتیجہ یہ ہے۔ کہ یہ اہم ذمہ داریاں بعض ایسے نوجوانوں نے اپنے کندھوں پر لے لی ہیں۔ جو قطعاً اس کے اہل نہیں۔

آج ترقی پسند ادب کیا ہے؟ بعض بے فکرے مگر ذہین نوجوانوں کا ہنگامۂ ہوس! ہر وہ ادیب جو کارل مارکس کے چند فراموش شدہ نظریوں کے بعض مدھم سے خیالات کو دہرا سکتا ہے اپنے آپ کو ترقی پسند کا خطاب دے لیتا ہے۔ عورت (یا جنس) اور بھوک۔ یہ دو الفاظ ہیں۔ جو ترقی پسندوں کے ہر ناول۔ ہر ڈرامہ، ہر قصے، ہر نظم میں اس کثرت کے ساتھ آتے ہیں۔ کہ اس سے ان حضرات کے جنسی اختلال کا شبہ ہوتا ہے۔ انسانی زندگی کی ان دو بنیادی ضرورتوں سے کسے انکار ہو سکتا ہے۔ اور ان کے مداوا اور تدبیر کی اہمیت سے بھی کسی کو انکار نہیں۔ لیکن جنسی معاملات پر یہ ترقی پسند ادیب جس رنگ میں قلم اٹھا رہے ہیں۔ اُن سے افسوس ہے کہ ملک ترقی کو کیا کرے گا۔ اخلاقی اور اقتصادی بدحالی میں پہلے سے زیادہ مبتلا ہو جائیگا۔

شراب دنیا میں ہمیشہ سے شاعروں اور نوجوانوں کے لئے جاذب توجہ رہی ہے۔ چنانچہ اس "دختِ رز" کے چاہنے والوں میں بعض بڑے بڑے لوگ بھی نظر آتے ہیں۔ تاہم سماجی طور پر اس کے مضرات و نقصانات کا انکار کسی نے نہیں کیا۔ اور اس کو ایک اعلیٰ اخلاقی محرک کا رتبہ تو کبھی میسر نہیں آیا۔ لیکن آج ملک میں بعض غیر معتدل ترقی پسند ادیب نہ صرف اس سے اپنے دل و دماغ کو روشن کر رہے ہیں۔ بلکہ اس کی تبلیغ میں اس درجہ منہمک ہیں۔ گویا یہی 'ترقی پسندی' کا سب سے بڑا منتہٰی ہے۔

مے خواری اور بدکاری، نفع پسندی اور مادہ پرستی کوئی نئی چیزیں نہیں۔ انسانی زندگی کے ہر دور میں یہ کمزوریاں موجود رہی ہیں۔ اور آئندہ بھی یہ تقصیریں اس ضعیف مخلوق سے سرزد ہوتی رہیں گی ——— کیونکہ انسان بہرحال کمزوریاں

سے مرکب ہے ـــــ لیکن بدکاری جب مذہب کی طرح احترام کی نظروں سے دیکھی جائے۔ نیکی جب بدی کے ترازو میں تل کر زیادہ قیمت پائے، مے خواری جب حقیقی مذمت کے مرادف قرار پائے ہیشتی جب عین زندگی بن جائے تو اس وقت یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ اعرابی کعبہ کو نہیں بلکہ ترکستان کو جا رہا ہے۔ یہ راہ بت کدہ کی نہیں خانقاہ کی ہے، یہ شراب نہیں سرکہ ہے۔ ان پھولوں کا رنگ دلپذیر سہی، لیکن خوشبو سے خالی نہیں ـــــ یہ سچائی نہیں بلکہ جھوٹ ہے محض جھوٹ!

اب سوال یہ رہ جاتا ہے کہ ادبی حیثیت سے ترقی پسند ادیبوں کا کل کارنامۂ حیات کیا ہے؟ غزل جو ہزار سال سے نہ صرف ایشیائیوں بلکہ مغربیوں کے روح کو فرحت بخشتی آئی ہے۔ آج ترقی پسند ادیبوں کے نزدیک محض اس لئے مردود و بیکار ہے کہ وہ عہد قدیم کی یادگار ہے ہم تسلیم کرتے ہیں۔ کہ قدامت پسندی بُری چیز ہے۔ اس کا مٹایا جانا نہایت ضروری ہے۔ لیکن اس تخریب کے ساتھ ہم تعمیر بھی چاہتے ہیں۔ ہم یہ چاہتے ہیں۔ کہ غزل کے بجائے سانیٹ، بلینک ورس، دس بیتی، ساڑھے پانچ بیتی، نثر مقفی ـــــ غرض کسی چیز کو رواج دیجئے۔ لیکن اس میں وہ شان ہونی چاہئے جو غزل میں ہے۔ مثنوی بُری چیز ہے۔ لیکن آپ طویل مضامین کے لئے کوئی بہتر پیمانہ مقرر کر دیجئے۔ افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ اس میدان میں ترقی پسندوں کو کوئی خاص کامیابی نصیب نہیں ہوئی۔ اور نہ شاید انہیں ہو۔

اس مضمون میں میں نے دانستہ اشخاص کا نام لینے سے احتراز کیا ہے۔ تاہم مدح کے رنگ میں نام لینے سے کوئی خاص مضائقہ نہیں معلوم ہوتا۔ مثال کے طور پر شاعر انقلاب حضرت جوش ملیح آبادی کو لیجئے۔ ہمیں اعتراف ہے۔ کہ حضرت جوش نے ہندوستان کی آزادی کے موضوع کو عمدہ ترین طریق پر اہل ملک کے سامنے پیش کیا ہے جس کے لئے وہ مستحق تحسین و آفرین ہیں۔ لیکن اب ان کے موضوع بھی ختم ہوتے نظر آتے ہیں۔ مزدور و سرمایہ دار، کسان اور مزارع، غریبی اور بے زری اگرچہ ہمارے لئے بہت ضروری مسائل ہیں لیکن ایک شاعر کا قلم اس ریگستان بلکہ سنگستان میں تا دیر نہیں چل سکتا۔ اور قدرتی طور پر پھر وہی عشق و محبت کا موضوع سامنے آتا ہے جس سے عملی طور پر تو نہیں لیکن، کہنے کو ترقی پسند ادیب نفرت کا اظہار کرتے ہیں۔

ہمارے بھائی اور دوست احمد علی صاحب ترقی پسندوں میں بہت صاحب فہم و بصیرت ہیں۔ اور یہ خیال کیا جا سکتا ہے۔ کہ شاید وہ بہت جلد، اعتدال کی شاہراہ پر آ جائیں۔ لیکن افسوس ہے کہ انہوں نے بھی بعض امور میں اسی غیر معتدل جوش کا اظہار کیا ہے۔ جو خام تبع نوجوانوں کا خاصہ ہے۔ وہ اپنے ایک مضمون میں لکھتے ہیں کہ ٹیگور اور اقبال کی شاعری بیماروں کی طرح زندگی سے گریز کرتی ہے اور حقیقت کو جھٹلانے کی خواہش سے پیدا ہوتی ہے۔ اور باوجود اپنی خوبصورتی کے محض خواب و خیال ہے،" ٹیگور کی شاعری سے قطع نظر میں خیال کرتا ہوں۔ کہ اقبال کی شاعری پر احمد علی صاحب کا یہ طعن درست ثابت نہیں ہوتا۔ اس میں شبہ نہیں۔ کہ اقبال کی شاعری کا ایک دور واقعی خیالی اور تخیلی دنیا کے بسانے میں مصروف رہا لیکن اقبال کی اس خصوصیت سے کون انکار کر سکتا ہے۔ کہ وہ ہمیشہ نوجوان ترین افکار اور تازہ ترین تحریکات کے علمبردار رہے ہیں۔ اقبال نے انقلاب نہ سہی، تبدیلی اور خودشناسی کا سبق قوم کو پڑھایا۔ جو یقیناً کسی خیالی نظریہ پر مبنی نہ تھا۔ بلکہ اس کی چشم جہاں بیں ایسے حقائق کا بے نقاب مطالعہ کر رہی تھی۔ جن سے شاید ہمارے نوجوان آشنا نہ ہو سکیں۔" ایک ایسا ادب جو زندگی سے تعلق نہیں رکھتا۔ اور بالکل تنگ نظر ہے۔" بے شک بے جان ادب ہے۔ لیکن اقبال کا ادب ایسا ادب نہیں۔

میں اپنے ترقی پسند دوستوں کے دوسرے کارناموں سے آج بحث نہیں کرتا۔ چونکہ یہ مبحث تمہیدی ہے۔ اس لئے میں بعض ان اسباب کا ذکر کرتا ہوں جن سے ترقی پسندوں کی راہ اکثر غلط ہو جاتی ہے۔ سب سے پہلی چیز یہ ہے کہ قدامت اور تجدد کے درمیان جو کشمکش ابتدائے آفرینش سے آج تک قائم ہے۔ اس میں دونوں اثرات کی حدود متعین ہیں۔ اب تک نہ تو قدامت نے شکست کھائی اور نہ تجدد پسندی کی ترقی رک سکی۔ ذہن انسانی کے بنانے میں

قدامت اور تجدّد دونوں کا یکساں حصّہ ہے۔ ایک کا بالکل مٹ جانا اور دوسرے کا سراپا غالب آجانا بالکل ناممکن ہے۔ ہمارے تجدّد پسند (یا ترقی پسند) ہمیشہ یہ غلطی کرتے ہیں کہ ترقی کے جوش میں قدامت کے ضروری عنصر کو نظرانداز کر دیتے ہیں۔ آج بھی ترقی پسندوں کے سامنے جو موضوع ہیں وہ یورپ اور روس کے پیش کردہ ہیں۔ جو اس میں شبہ نہیں۔ ہندوستان کے لئے جدید ہیں لیکن ان میں بھی قدامت پسندی کے جراثیم موجود ہیں کمیونزم، ترقی پسندی کے درخت کا آخری پھل ہے۔ لیکن کون نہیں جانتا کہ اس تحریک میں سٹالن اور ٹراٹسکی کی کش مکش میں اسی قدیم و جدید کی جنگ کی ایک جھلک ہے۔

ماحول انسانی سرگرمیوں کے لئے لازمی چیز ہے۔ ماحول وہ لازمی میدانِ عمل ہے۔ جہاں زندگی کی ندی ہمیشہ سے بہتی چلی آئی ہے۔ صدیاں گزر جاتی ہیں، ہر صدی ماحول پر نیا رنگ چڑھاتی ہے۔ لیکن ماحول میں قدیم اثرات ہمیشہ موجود رہتے ہیں۔ جدید اکثر لذیذ ہوتا ہے لیکن قدیم کے اثر سے اُن کی لذت اور بھی زیادہ ہو جاتی ہے۔ ہمارے ترقی پسند قدرت کے اس اٹل قانون کی کارفرمائیوں سے غافل ہو جاتے ہیں۔

زبان اردو کو دیکھیے۔ کہاں پیدا ہوئی، کیسے ترقی پذیر ہوئی کن کن مرغزاروں سے ہو کر گزری! کیا کیا اثرات قبول کئے۔ —— پھر کہیں جا کر اردو بنی۔ یہ ایک بھاری غلطی ہو گی اگر ہم اس کے دامن کو جدید اثرات کے پھولوں سے مالا مال نہ کریں۔ لیکن یہ ایک جرم ہو گا۔ اگر ہم اس کو قدیم سے بالکل منقطع کرنے کی کوشش کریں۔

یورپ ہم سے بہت زیادہ ترقی یافتہ ہے۔ لیکن کیا یورپ نے اپنی سب روائتوں کو فراموش کر دیا ہے۔ جہاں تک سرسری نظر کام کرتی ہے۔ یورپ اپنے سارے تجدد کے باوجود قدامت پسند ہے کتنی عمدہ چیزیں اُس نے ایشیا سے حاصل کی ہیں، شاید بہت کم! کیا اس کا یہ مطلب ہے کہ ایشیاء کا جیب و دامن ان بلند حقائق سے ہمیشہ خالی رہا؟ نہیں خود یورپ ہی تجدّد پسندی کے باوجود قدامت کے مسلک پر عامل ہے۔

سائنس نے جدید دنیا میں انقلاب پیدا کرنے میں بڑا حصہ لیا لیکن سائنس نے جہاں قدیم اقدار[۱] کو فنا کیا ہے۔ وہاں ذہن انسانی کی تسلی و اطمینان کے لئے نئے اقدار پیدا نہیں کئے۔ یہی وجہ ہے۔ کہ خالص انسانی فرحت کے اعتبار سے قدیم کلچر موجودہ سائنٹفک کلچر سے بہت زیادہ مفید ہے۔ جدید زندگی نے اقتصاد کے تمام پہلوؤں کو ابھارنے کے باوجود اقتصاد پر تصرف و اختیار کا کوئی کامل ذریعہ نہیں نکالا۔ بھوک افلاس اور غریبی کو دور کرنے کے سارے دعاوی کے باوجود انسانی افلاس اور غریبی ترقی کر رہی ہے۔ کیونکہ ضروریات اور حاجتیں زیادہ کی جا رہی ہیں۔ اور وہ نسخۂ کیمیا —— جس کا نام قناعت ہے —— اب تقریباً مفقود ہے۔ اسی مادہ پرستانہ رجحان کا نتیجہ نازی ازم، فاشزم اور دوسری مصیبتیں ہیں۔

مقصود یہ ہے۔ کہ ابھی تک دُنیا کو پرانے اقدار کی ضرورت ہے۔ سائنس کے اقدار کو پرانے اقدار سے پیوند دینے سے شائد نسلِ انسانی کی بہتری ہو سکے۔ قدیم ادب کو نئے ادب سے قدیم آرٹ کو جدید آرٹ سے ہی قدیم زندگی کو جدید زندگی سے ایک ربط ہے۔ جس کے اخلاقی محاسن موجودہ بےفکرے ادب کے مقابلے میں بدرجہا بہتر ہیں۔ ترقی پسند ادب ملک کی اہم ترین ضرورت ہے۔ اسلئے اس غلط فہمی کو دور کر دینا چاہیئے۔ کہ اس مضمون کے ذریعے اس ادب کی کسی طرح مخالفت منظور نہیں۔ اگر مخالفت ہے۔ تو محض اس گندے ادب کی جس میں آئے دن فحاشی، سوقیت، ابتذال اور دریدہ ذہنی کی تعلیم دی جاتی ہے جس میں اپنی جہالت اور حماقت کو ترقی پسندی کے سنہرے اور درخشاں نقاب میں چھپایا جاتا ہے جس میں ادنی جذبات اور بہیمانہ حرکات کو انسانی شرف کے بلند نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ لہٰذا ہم سنجیدہ ادیبوں کے ترقی پسند عناصر سے خاص طور پر التجا کرتے ہیں۔ کہ وہ نوجوانان ملک کے سامنے کوئی بلند علمی و عملی معیار پیش کریں۔ تاکہ یہ عمدہ تحریک چند اوباشوں کے فکر و عمل سے بدنام ہو کر حوالۂ مدفن نہ ہو جائے۔

---

[۱] اس موضوع پر رسالہ SCRUTINY بابت ماہ اکتوبر میں ایک عمدہ مضمون شائع ہوا ہے۔ جس کا عنوان TRADITIONS & INNOVATIONS ہے۔

افسانہ
غلام عباس
کرشن چندر
مسعود جاوید
بلراج ساہنی
راجندر سنگھ بیدی
سعادت حسن منٹو
حسن عباس
پریش
محترمہ سروج ماتھر
سہیل عظیم آبادی

غلام عباس

کتبہ

شہر سے کوئی ڈیڑھ دو میل کے فاصلے پر پُر فضا باغوں اور پھلواریوں میں گھری ہوئی، قریب قریب ایک ہی وضع کی بنی ہوئی عمارتوں کا ایک سلسلہ ہے۔ جو دور تک پھیلتا چلا گیا ہے۔ ان عمارتوں میں کئی چھوٹے بڑے دفتر ہیں۔ جن میں کم و بیش چار ہزار آدمی کام کرتے ہیں۔ دن کے وقت عام طور پر اس علاقے کی ساری سرگرمی اور گہما گہمی گرد دل کی چار دیواریوں ہی میں محدود رہتی ہے۔ لیکن صبح کو ساڑھے دس بجے سے پہلے اور سہ پہر کو ساڑھے چار بجے کے بعد وہ سیدھی اور کشادہ سڑک جو شہر کے بڑے دروازے سے اس علاقے تک جاتی ہے۔ ایک ایسے دریا کا روپ دھار لیتی ہے جو پہاڑوں پر سے آیا ہو۔ اور جو اپنے ساتھ بہت سا خس و خاشاک بہا لایا ہو۔

گرمی کا زمانہ۔ سہ پہر کا وقت۔ سڑک پر درختوں کے سائے طویل ہونے شروع ہو گئے تھے۔ مگر ابھی تک زمین کی تپش کا یہ عالم تھا۔ کہ جوتوں کے اندر تلوے جھلسے جاتے تھے۔ ابھی ابھی ایک چھڑکاؤ گاڑی سڑک پر سے گزری تھی۔ جہاں جہاں پانی پڑا تھا۔ انجرات اُٹھ رہے تھے

شریف حسین کلرک گریڈ نمبر ۲ معمول سے کچھ سویرے دفتر سے نکلا۔ اور اُس بڑے پھاٹک کے باہر آکر کھڑا ہو گیا۔ جہاں سے تانگے والے شہر کی سواریاں لاد کر لیجایا کرتے تھے۔ تانگے میں سوار ہو کر گھر جانے کی لذت اُسے مہینے میں صرف چار پانچ روز حاصل ہوتی تھی۔ اور آج کا دن بھی انہیں میں سے ایک تھا۔ آج خلافِ معمول تنخواہ ملنے کے آٹھ روز بعد بھی اُس کی جیب میں پانچ روپے کا نوٹ اور کچھ آنے پیسے پڑے تھے۔ وجہ یہ تھی کہ تنخواہ ملنے کے دوسرے ہی روز اُس کی بیوی بچوں سمیت میکے چلی گئی تھی۔ شریف حسین بہت بے فکری محسوس کر رہا تھا۔ کیونکہ گھر میں وہ بالکل اکیلا رہ گیا تھا۔ دن میں دفتر کے ریسٹوران میں پوریاں کھا کر پیٹ بھر لیا تھا۔ سوچا تھا رات کو شہر کے کسی سستے ہوٹل میں چلا جائے گا۔ چونکہ گھر میں کچھ ایسا اثاثہ نہ تھا جس کی حفاظت کے لئے اُس کا گھر میں موجود رہنا ضروری ہوتا۔ اس لئے وہ آزاد تھا۔ کہ جب چاہے گھر جائے۔ اور چاہے تو ساری رات سڑکوں پر گھومتا رہے۔

تھوڑی دیر میں ناتپسٹوں، سٹینوگرافروں، ریکارڈ کیپروں، ڈسپیچروں، نقل نویسوں، اکاؤنٹنٹوں اور دوسرے کلرکوں کی ٹولیاں کمروں سے نکلنی شروع ہوئیں۔ سائیکل سوار نیم آستینوں کی قمیص خاکی زین کے نکر اور چپل پہنے۔ سر پر سولا ہیٹ رکھے۔ کلائی پر گھڑی باندھے۔ رنگدار چشمے لگائے۔ بڑی بڑی توند والے بابو، اچھا تا کھولے منہ میں بیڑی بغلوں میں فائلوں کے گٹھے دبائے۔ ان فائلوں کو وہ اپنے افسروں کی خوشنودی کے لئے قریب قریب ہر روز اس امید میں ساتھ لے جاتے۔ کہ جو گتھیاں وہ دفتر میں نہیں سلجھا سکے ممکن ہے گھر میں اُن کا کوئی حل سوجھ جائے۔ مگر گھر میں انہیں دیکھنے تک کا موقعہ نہ ملتا۔ بعض منچلے، تانگے، سائیکل اور چھاتے سے بے نیاز۔ ٹوپی ہاتھ میں کوٹ کندھے پر۔ گریبان کھلا ہوا۔ جس کے بٹن ٹوٹ جانے پر انہوں نے سیفٹی پن سے بند کر رکھا تھا اور جس کے نیچے سے ان کی چھاتی کے گھنے بال پسینے میں تر بتر نظر آتے تھے۔ نئے رنگروٹ سستے سلے سلائے ڈھیلے ڈھالے بد قطع سوٹ پہنے اس گرمی کے عالم میں واسکٹ اور نکٹائی کا تکلف کئے۔ کوٹ کی بالائی جیب میں دو دو تین تین فونٹین پن اور پنسلیں لگائے خراماں خراماں چلے آ رہے تھے۔ گو ان سب کی مادری زبان ایک تھی۔ مگر وہ غیر زبان میں لہجہ بگاڑ بگاڑ کر باتیں کر رہے تھے۔ اُس کی وجہ طمانیت نہ تھی۔ جو کسی غیر زبان پر قدرت حاصل ہونے پر اُس زبان میں باتیں کرنے پر اُکساتی ہے۔ بلکہ یہ کہ اُنہیں

دن بھر اپنے افسروں سے اُس زبان میں باتیں کرنی پڑتی تھیں اور اب وہ باہم بات چیت کر کے اس کی مشق بہم پہنچا رہے تھے۔

اُن کلرکوں میں ہر عمر کے لوگ تھے۔ ایسے کم عمر بھولے بھالے ناتجربہ کار بھی۔ جن کی ابھی مسیں بھی پوری نہیں بھیگی تھیں۔ اور جنہیں اسکول سے نکلے ابھی تین مہینے بھی نہیں ہوتے تھے۔ اور ایسے عمر رسیدہ جہاں دیدہ گھاگھ بھی جن کی ناک پر سالہا سال عینک استعمال کرنے کے باعث گہرا نشان پڑ گیا تھا۔ اور جنہیں اس سڑک کے اتار چڑھاؤ دیکھتے دیکھتے بیس بیس پچیس پچیس برس ہو چکے تھے۔ بیشتر کارکنوں کی پیٹھ میں گدی سے ذرا نیچے خم سا آ گیا تھا۔ اور کُند استروں سے متواتر حجامتیں بنانے کے باعث اُن کے گالوں اور ٹھوڑیوں پر بالوں کی جڑیں نکل آئی تھیں۔ جنہوں نے بے شمار ننھی ننھی پھنسیوں کی شکل اختیار کر لی تھی۔

پیدل چلنے والوں میں بہتیرے لوگ بخوبی جانتے تھے۔ کہ دفتر سے اُن کے گھر کو کتنے راستے جاتے ہیں۔ اُن کا فاصلہ کے کے ہزار قدم ہے۔ ہر شخص افسروں کی بدمزاجی یا ماتحتوں کی نالائقی پر نالاں نظر آتا تھا۔

ایک تانگے کی سواریوں میں ایک کی کمی دیکھ کر شریف حسین لپک کر اُس میں سوار ہو گیا۔ تانگہ شہر کے دروازے کے قریب پہنچکر رُک گیا۔ شریف حسین نے اکنی نکالکر کوچوان کو دی۔ اور گھر کے بجائے شہر کی جامع مسجد کی طرف چل پڑا۔ جس کی سیڑھیوں کے گرد اگرد ہر روز شام کو کہنہ فروشوں اور سستا مال بیچنے والوں کی دوکانیں سجا کرتی تھیں۔ اور میلہ سا لگا رہتا تھا۔ دنیا بھر کی چیزیں اور ہر وضع و ہر قسم کے لوگ یہاں ملتے تھے۔ اگر مقصد خرید و فروخت نہ ہو۔ تو بھی یہاں اور لوگوں کو چیزیں خریدتے۔ مول تول کرتے دیکھنا بجائے خود ایک پُرلطف تماشہ تھا۔

شریف حسین لکچر باز حکیموں، سنیاسیوں، تعویذ گنڈے بیچنے والے سیانوں اور کھڑے کھڑے تصویر اُتار دینے والے فوٹوگرافروں کے جمگھٹوں کے پاس ایک ایک دو دو منٹ رُکتا۔ سیر کرتا اُس طرف جانکلا۔ جہاں کباڑیوں کی دکانیں تھیں۔ یہاں اُسے بیشمار مختلف قسم کی چیزیں نظر آئیں۔ ان میں سے بعض ایسی تھیں۔ جو اپنی اصلی حالت میں بلاشبہ حد درجہ حسین اور صنعت کا اعلیٰ نمونہ ہوں گی۔ مگر ان کباڑیوں کے ہاتھ پڑتے پڑتے یا تو ان کی صورت اس قدر مسخ ہو گئی تھی۔ کہ پہچانی ہی نہ جاتی تھی۔ اور یا اُنکا کوئی حصّہ ٹوٹ پھوٹ گیا تھا۔ جس سے وہ بیکار ہو گئی تھیں چینی اور تانبے کے ظروف۔ گلوب۔ ٹیبل لیمپ۔ گھڑیاں تصویریں قطعات قلمدان۔ کتابیں۔ رسالے۔ بیکار بیٹریاں اور بلب۔ گراموفون کے کل پرزے اور ریکارڈ۔ فنر۔ جسّس بھرا ہرن۔ گلدان۔ آئینے چوکھٹے۔ جراحی کے آلات۔ چھری کانٹے۔ ستار۔ مالائیں۔ پیتل کے لم ڈھینک۔ بارہ سنگھے۔ بدھ کا نیم قد مجسمہ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

ایک دوکان پر اُس کی نظر سنگِ مرمر کے ایک ٹکڑے پر پڑی۔ جو معلوم ہوتا تھا۔ کہ عہدِ مغلیہ کے کسی مقبرے یا بارہ دری سے اکھاڑا گیا ہے۔ اُس کا طول کوئی سوا فٹ تھا اور عرض ایک فٹ شریف حسین نے اس ٹکڑے کو اُٹھا کر دیکھا۔ اُس کی توقع کے خلاف یہ مرمریں ٹکڑا کہیں سے ٹوٹا پھوٹا نہ تھا۔ یہ ٹکڑا ایسی نفاست سے تراشا گیا تھا۔ کہ اُس نے محض یہ دیکھنے کے لئے کہ بھلا کباڑی اس کے کیا دام بتائے گا۔ قیمت دریافت کی۔

تین روپے! کباڑی نے اُس کی قیمت کچھ زیادہ نہ بتائی تھی۔ مگر آخر اسے اس کی ضرورت ہی کیا تھی۔ اُس نے ٹکڑا رکھدیا اور چلنے لگا۔

"کیوں حضرت چلدیئے؟ آپ بتائیے کیا دیجئے؟"

شریف حسین رُک گیا۔ اُسے یہ ظاہر کرتے شرم سی محسوس ہوئی۔ کہ اُسے اس چیز کی ضرورت نہ تھی۔ اور اُس نے محض اپنے شوقِ تحقیق کو پورا کرنے کے لئے قیمت پوچھی تھی۔ اس نے سوچا دام اس قدر کم بتاؤں۔ جو کباڑی کو منظور نہ ہوں۔ کم از کم کباڑی میرے متعلق اپنے دل میں یہ تو نہ کہے کہ یہ کوئی کنگلا ہے۔ جو محض دوکانداروں کا وقت ضائع کرنے اور اپنی حرص پوری کرنے آیا ہے۔

"ہم تو ایک روپیہ دیں گے!" یہ کہہ کر شریف حسین نے چاہا

کہ جلد جلد قدم اٹھاتا کباڑی کی نظروں سے اوجھل ہو جائے مگر اُس نے اِس کی مہلت ہی نہ دی۔

"اجی سنئے تو۔ کچھ زیادہ نہیں دیں گے؟ سوا روپیہ بھی نہیں... اچھے سے جائیے۔"

شریف حسین اپنے پیچ و تاب کھانے لگا۔ کہیں نے بار مگنے گیوں نہ کہے۔ ناچار لوٹنا پڑا۔ قیمت ادا کرنے سے پہلے اُس نے اُس مرمریں ٹکڑے کو اُٹھا کر دوبارہ جانچ پڑتال کی۔ کہ اگر ذرا سا بھی نقص نظر آئے تو اس سودے کو منسوخ کر دوں۔ مگر وہ ٹکڑا بے عیب تھا۔ اور یہ تعجب کی بات تھی کہ کباڑی نے اُسے اس قدر کم قیمت پر بیچنا کیوں قبول کیا۔

رات کو جب وہ کھلے آسمان کے نیچے اپنے گھر کی چھت پر اکیلا بستر پر کروٹیں بدل رہا تھا۔ تو اس سنگِ مرمر کے ٹکڑے کا ایک مصرف اُس کے ذہن میں آیا۔ کیا عجب خدا اُس کے دن پھیر دے۔ اور وہ گریڈ سے ترقی کر کے سپرنٹنڈنٹ بن جائے۔ اور اُس کی تنخواہ چالیس سے بڑھکر چار سو ہو جائے۔ یہ نہیں تو کم سے کم ہیڈ کلرکی ہی سہی۔ پھر اُسے ساجھے کے مکان میں رہنے کی ضرورت نہ رہے۔ بلکہ وہ کوئی بڑا سا مکان لے لے اور اِس مرمریں ٹکڑے پر اپنا نام کندہ کرا کے مکان کے پھاٹک کے باہر نصب کر دے۔

مستقبل کی یہ خیالی تصویر اُس کے ذہن پر کچھ اِس طرح چھا گئی کہ یا تو وہ اس مرمریں ٹکڑے کو بالکل بے مصرف سمجھتا تھا۔ اور یا اب اُسے ایسا محسوس ہونے لگا۔ گویا وہ ایک عرصے سے اس قسم کے ٹکڑے کی تلاش میں تھا۔ اور اگر وہ اُسے نہ خریدتا۔ تو سخت غلطی کرتا۔

ملازمت کے ابتدائی ایام میں اُس کا کام کرنے کا جوش اور ترقی کا ولولہ انتہا کو پہنچا ہوا تھا۔ مگر دو سال کی سعیٔ لاحاصل کے بعد رفتہ رفتہ اُس کا یہ جوش ٹھنڈا پڑ گیا تھا۔ مزاج میں سکون آچلا تھا۔ کہ یکبارگی اس مرمریں ٹکڑے نے پھر سے اُس کے خیالوں میں ہلچل ڈالدی مستقبل کے متعلق طرح طرح کے خوش آئند خیالات کئی دن تک اُس کے دماغ میں چکر لگاتے رہے۔ اُٹھتے بیٹھتے۔ سوتے جاگتے۔ دفتر جاتے دفتر میں۔ دفتر سے آتے۔ کوٹھیوں کے باہر لوگوں کے نام کے بورڈ دیکھکر یہاں تک کہ جب مہینہ ختم ہونے پر اُسے تنخواہ ملی۔ تو اُس نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ اس مرمریں ٹکڑے کو شہر کے ایک مشہور سنگتراش کے پاس لے گیا۔ جس نے بہت چابکدستی سے اُس کا نام اِس پر کندہ کر دیا۔ اور کونوں میں چھوٹی چھوٹی خوشنما بیلیں بنا دیں۔

اس سنگِ مرمر کے ٹکڑے پر اپنا نام کھدا دیکھ کر اُسے ایک عجیب لذت کا احساس ہوا۔ زندگی میں غالباً یہ پہلا موقع تھا۔ کہ اُس نے اپنا نام اس قدر جلی حروف میں لکھا دیکھا ہو۔ گھر آتے ہوئے بازار میں کئی مرتبہ اُس کا جی چاہا کہ کتبہ پر سے اُس اخبار کو اتار ڈالے۔ جس میں سنگتراش نے اُسے لپیٹ دیا تھا۔ اور اس پر ایک نظر اور ڈال لے۔ مگر ہر بار ایک حجاب۔ ایک نامعلوم خوف سا جیسے اُس کا ہاتھ پکڑ لیتا شاید وہ ڈرتا تھا کہ کہیں راہ چلتے لوگ اس کتبہ کو دیکھ کر اُس کے اُن خیالات کو نہ بھانپ جائیں۔ جو پچھلے چند دنوں سے اُس کے دماغ پر مسلط تھے۔

گھر کی پہلی سیڑھی پر قدم رکھتے ہی اُس نے اخبار اُتار پھینکا۔ اور نظریں کتبہ کی دلکش تحریر پر گاڑے دھیرے دھیرے سیڑھیاں چڑھنے لگا۔ بالائی منزل میں اپنے مکان کے دروازے کے سامنے پہنچکر رُک گیا۔ جیب سے چابی نکالی۔ قفل کھولنے لگا۔ پچھلے دو برس میں آج پہلی مرتبہ اُسے معلوم ہوا۔ کہ اُس کے مکان کے دروازے کے باہر اتنی جگہ بھی نہیں کہ اُس پر کوئی بورڈ لگایا جا سکے۔ اگر جگہ ہوتی بھی۔ تو ایسے بورڈ یہاں تھوڑا ہی لگائے جاتے ہیں۔ اُن کے لئے تو بڑا سا مکان چاہیئے۔ جس کے پھاٹک کے باہر لگایا جا سکے۔ تو آتے جاتے کی نظر بھی پڑے.......

قفل کھولکر مکان کے اندر پہنچا۔ اور سوچنے لگا۔ کہ فی الحال اِس کتبہ کو کہاں رکھوں۔ اس کے حصۂ مکان میں دو کوٹھڑیاں۔ ایک غسل خانہ اور ایک باورچی خانہ تھا۔ الماری صرف ایک کوٹھڑی میں تھی مگر اُس کے کواڑ نہیں تھے۔ بالآخر اُس نے کتبہ کو اُسی بے کواڑ کی الماری میں رکھدیا۔

ہر روز شام کو جب وہ تھکا ماندہ دفتر سے واپس آتا۔ تو سب سے پہلے اُس کی نظر اس کتبہ پر پڑتی۔ امیدیں اُسے سبز باغ دکھاتیں

اور دفتری مشقت کی تکان کسی قدر کم ہو جاتی۔ دفتر میں جب کبھی اُس کا کوئی ساتھی کسی معاملے میں اُس کی رہنمائی کا محتاج ہوتا۔ تو اپنی برتری کے احساس سے اُس کی آنکھیں چمک اُٹھتیں۔ جب کبھی کسی ساتھی کی ترقی کی خبر سنتا۔ تمنائیں اُس کے سینے میں ہیجان برپا کر دیتیں۔ افسر کی ایک نگاہ لطف وکرم کا نشہ اُسے آٹھ آٹھ دن تک رہتا۔

جب تک اُس کے بیوی بچے نہیں آئے تھے۔ وہ اپنے خیالوں میں مست تھا۔ نہ دوستوں سے ملتا۔ نہ کھیل تماشوں میں حصہ لیتا۔ رات کو جلد ہی ہوٹل سے کھانا کھا کر گھر آ جاتا۔ اور سونے سے پہلے کئی کئی گھنٹے عجیب عجیب خیالی دنیاؤں میں بسر کرتا۔ مگر اُن کے آنے کے بعد اور اور فکروں نے اُسے گھیر لیا۔ اور مستقبل کی یہ سہانی تصویریں رفتہ رفتہ دھندلی پڑنے لگیں۔

کتبہ سال بھر تک اُس بے کواڑ کی الماری میں پڑا رہا۔ اس عرصے میں اُس نے نہایت محنت سے کام کیا۔ اپنے افسروں کو خوش رکھنے کی انتہائی کوشش کی۔ مگر اُس کی حالت میں کوئی تبدیلی نہ ہوئی۔

اب اُس کے بڑے بیٹے کی عمر چار برس کی ہو گئی تھی۔ اور اُسکا ہاتھ اُس بے کواڑ کی الماری تک بخوبی پہنچ جاتا تھا۔ شریف حسین نے اِس خیال سے کہ کہیں وہ کتبہ کو گرا نہ دے۔ اُسے وہاں سے اٹھا لیا۔ اور اپنے صندوق میں کپڑوں کے نیچے رکھ دیا۔

یہ کتبہ ساری سردیاں اُس کے صندوق میں پڑا رہا۔ جب گرمی کا موسم آیا۔ تو اُس بیوی کو اُس کے گرم کپڑے رکھنے کے لئے صندوق میں سے فالتو چیزوں کو نکالنا پڑا۔ چنانچہ اُس کی بیوی نے کتبہ کو نکال کر کاٹھ کے اُس پرانے صندوق میں ڈال دیا۔ جس میں ٹوٹے ہوئے چوکھٹے بے بال کے برش۔ بیکار صابن دانیاں۔ ٹوٹے ہوئے کھلونے اور ایسی ہی اور ردی چیزیں پڑی رہا کرتی تھیں۔

شریف حسین نے اب اپنے مستقبل کے متعلق زیادہ سوچنا چھوڑ دیا تھا۔ دفتروں کے رنگ ڈھنگ دیکھ کر وہ اس نتیجہ پر پہنچ گیا تھا۔ کہ ترقی لطیفۂ غیبی سے نصیب ہوتی ہے۔ کڑی محنت جھیلنے اور جان کھپانے سے کچھ حاصل نہ ہوگا۔ اُس کی تنخواہ میں ہر دوسرے برس تین روپے کا اضافہ ہو جاتا جس سے بچوں کی تعلیم وغیرہ کا خرچ نکل آتا۔ اور اُسے زیادہ تنگی نہ اٹھانی پڑتی۔

پے درپے مایوسیوں کے بعد جب اُسے ملازمت کرتے بارہ برس ہو چکے تھے۔ اور اُس کے دل سے رفتہ رفتہ ترقی کے تمام ولولے نکل چکے تھے۔ اور کتبہ کی یاد تک ذہن سے محو ہو چکی تھی۔ تو اُس کے افسروں نے اُس کی دیانتداری اور پرانی کارگزاری کا خیال کر کے اُسے تین مہینے کے لئے گریڈ نمبر ۱ کے ایک کلرک کی جگہ دیدی۔ جو چھٹی جانا چاہتا تھا۔

جس روز اُسے یہ عہدہ ملا۔ اُس کی خوشی کی انتہا نہ رہی۔ اُس نے تانگے کا بھی انتظار نہ کیا۔ بلکہ پیدل ہی تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا بیوی کو یہ مژدہ سنانے چل دیا۔ شاید تانگہ اُسے کچھ زیادہ جلدی گھر نہ پہنچا سکتا۔

دوسرے مہینے اُس نے نیلام گھر سے ایک چھوٹی سی خوبصورت لکھنے کی میز اور ایک گھومنے والی کرسی خریدی۔ میز کے آتے ہی اُسے پھر کتبہ کی یاد آئی۔ اور اُس کے ساتھ ہی اُس کی سوئی ہوئی امنگیں جاگ اُٹھیں۔ اُس نے ڈھونڈ ڈھانڈ کر کاٹھ کے صندوق میں سے کتبہ کو نکالا۔ صابن سے دھویا۔ پونچھا۔ اور دیوار کے سہارے میز پر ٹکا دیا۔

یہ زمانہ اُس کے لئے بہت کٹھن تھا۔ کیونکہ وہ اپنے افسروں کو اپنی بہتر کارگزاری دکھانے کے لئے چھٹی پر گئے ہوئے کلرک سے دُگنا کام کرتا۔ دن کو دن سمجھتا۔ نہ رات کو رات۔ پھر بھی وہ خوش تھا ہاں جب کبھی اُسے اُس کلرک کی واپسی کا خیال آتا۔ تو اُس کا دل بجھ سا جاتا۔ کبھی کبھی وہ سوچتا ممکن ہے وہ اپنی چھٹی کی میعاد بڑھوالے .... ممکن ہے وہ بیمار پڑ جائے ...... ممکن ہے وہ کبھی نہ آئے.......

مگر تین مہینے گزر جانے کے بعد نہ تو اُس کلرک نے چھٹی کی میعاد بڑھوائی۔ اور نہ وہ بیمار ہی پڑا۔ البتہ شریف حسین کو اپنی پرانی جگہ پر آ جانا پڑا۔

اس کے بعد جو دن گزرے۔ وہ شریف حسین کے لئے بڑی مایوسی اور افسردگی کے تھے۔ اُس کا جی کام میں مطلق نہ لگتا۔ نہ کبھی

سے ہنستا ہوا بات کرتا۔ تھوڑی سی خوشحالی کی ایک جھلک دیکھ لینے کے بعد اب اُسے اپنی حالت پہلے سے زیادہ ابتر معلوم ہونے لگی تھی۔ مگر یہ کیفیت چند دن سے زیادہ نہ رہی۔ افسروں کے تیور جلد ہی اُسے راہِ راست پر لے آئے۔

اب اُس کا بڑا لڑکا چھٹی میں پڑھتا تھا۔ چھوٹا دوسری میں۔ اور منجھلی لڑکی ماں سے قرآن مجید پڑھتی۔ سینا پرونا سیکھتی۔ اور گھر کے کام کاج میں اُس کا ہاتھ بٹاتی۔ باپ کی میز کرسی پر بڑے لڑکے نے قبضہ جما لیا۔ وہاں بیٹھ کر وہ سکول کا کام کیا کرتا۔ چونکہ میز کے ہلنے سے کتبہ کے گر جانے کا خدشہ رہتا۔ اور پھر اس کتبہ نے میز کی بہت سی جگہ بھی گھیر رکھی تھی۔ اس لئے لڑکے نے اُسے اٹھا کر پھر سے بے کواڑ الماری میں رکھدیا۔

سال پر سال گزرتے گئے۔ اس عرصے میں کتبہ نے کئی جگہیں بدلیں کبھی بے کواڑ کی الماری میں تو کبھی میز پر۔ کبھی صندوقوں کے تھاک پر تو کبھی چارپائی کے نیچے۔ کبھی بوری میں تو کبھی کاٹھ کے صندوق میں ایک دفعہ کسی نے اُسے باورچی خانے کے اُس بڑے طاق میں رکھدیا۔ جس میں روزمرہ کے برتن رکھے رہتے تھے۔ شریف حسین کی نظر پڑ گئی۔ دیکھا تو دھوئیں سے اُس کا سفید رنگ پیلا پڑ چلا تھا۔ اُٹھایا۔ دھویا۔ پونچھا اور پھر بے کواڑ کی الماری میں رکھدیا۔ مگر چند ہی روز میں اُسے پھر غائب کر دیا گیا۔ اور اُس کی جگہ وہاں کاغذی پھولوں کے بڑے بڑے گملے رکھ دئے گئے۔ جو شریف حسین کے بڑے بیٹے کے کسی دوست نے اُسے تحفۃً دئے تھے۔ کتبہ کا رنگ پیلا پڑ جانے سے وہ الماری میں رکھا ہوا بدنما معلوم ہوتا تھا۔ مگر اب ان کاغذی پھولوں کے سرخ سرخ رنگوں نے الماری میں جان ڈال دی تھی۔ اور ساری کوٹھڑی دہک اُٹھی تھی۔

دوسرے دن شریف حسین نے کتبہ کو غسل خانے کے طاق میں پڑا پایا

دفتر میں وہ میز جس پر کام کرتا تھا۔ اُس میں ایک بڑا سا دراز تھا جس میں فائلیں وغیرہ پڑی رہا کرتی تھیں۔ گھر میں اس کتبہ کے لئے کوئی موزوں جگہ نہ پاکر اُسے اسی دراز کا خیال آیا۔ چنانچہ وہ کتبہ کو اخبار میں لپیٹ کر دفتر لے گیا اور میز کے دراز میں فائلوں کے نیچے رکھدیا۔ چونکہ یہ دراز اُس کی غیر حاضری میں مقفل رہتا تھا۔ اس لئے اُسے اپنے متجسّس ساتھیوں کی دست اندازی کا اندیشہ نہ تھا۔

یہ کتبہ ایک عرصہ تک اسی دراز میں پڑا رہا۔ مگر آخر اُس سے یہ جگہ بھی چھن گئی۔ ایک افسر کو ان کلرکوں کا معائنہ کرنے آنا تھا۔ چنانچہ معائنہ سے ایک شام قبل شریف حسین اُسے پھر گھر لے گیا۔ اس وقت تک بے کواڑ کی الماری کے کاغذی پھول خزاں کے بغیر ہی مرجھا چکے تھے۔ چنانچہ کتبہ کو پھر اپنی پرانی جگہ مل گئی۔

اب شریف حسین کو ملازم ہوئے بیس برس گزر چکے تھے۔ اُس کے سر کے بال نصف سے زیادہ سفید ہو چکے تھے۔ اور پیٹھ میں گدی سے ذرا نیچے خم آ گیا تھا۔ اب بھی کبھی کبھی اُس کے دماغ میں خوشحالی و فارغ البالی کے خیالات چکر لگاتے مگر اب اُن کی صورت پہلے کی سی نہ تھی کہ خواہ وہ کوئی کام کر رہا ہو۔ تصورات کا ایک تسلسل ہے۔ کہ پہروں ٹوٹنے کا نام ہی نہیں لیتا۔ اب اکثر ایک آہ پل بھر میں ان تصورات کو اڑا لیجاتی اور پھر بیٹی کی شادی۔ لڑکوں کی تعلیم۔ اس کے اخراجات۔ اور اُن کی ملازمت کی فکریں ایسی نہ تھیں۔ جو دم بھر کے لئے بھی اُس کا خیال کسی اور طرف جانے دیتیں۔

پچپن برس کی عمر میں اُسے پنشن مل گئی۔ اب اُس کی بیٹی کی شادی ہو چکی تھی۔ بڑا لڑکا کسی دفتر میں چالیس روپے کا ٹائپسٹ تھا۔ اور چھوٹا آٹھویں جماعت میں پڑھتا تھا۔ جب اُسے پنشن وصول کرتے تین سال گزر گئے۔ تو جاڑے کی ایک رات کو وہ کسی کام سے بستر سے اُٹھا۔ اُٹھتے ہی ہوا لگی۔ اور نمونیہ ہو گیا۔ اور کوئی چار دن بستر پر پڑے رہنے کے بعد اُس کا انتقال ہو گیا۔

اُس کی موت کے دو مہینے بعد اُس کا بڑا بیٹا مکان کی صفائی کر رہا تھا۔ کہ پرانے اسباب کا جائزہ لیتے ہوئے ایک بوری میں اُسے وہ کتبہ مل گیا۔ بیٹے سے باپ کو بے حد محبت تھی۔ کتبہ دیکھ کر اُس کی آنکھوں میں بے اختیار آنسو بھر آئے۔ اور وہ دیر تک ایک محویت کے عالم میں اُس کی دلآویز خطاطی اور نقش و نگار کو دیکھتا رہا۔ یکبارگی اُس کے ذہن میں ایک بات آئی۔ اور اُس کی آنکھوں میں چمک پیدا ہو گئی۔

اگلے روز وہ کتبہ کو ایک سنگتراش کے پاس لیگیا۔ اور اُس سے کتبہ پر پالش اور اُس کی عبارت میں معمولی سی ترمیم کرانے کے بعد اُسے اپنے باپ کی قبر پر نصب کر دیا۔

کرشن چندر، ایم۔ اے

سیما

اسے سوچنے اور غور کرنے کی بہت بڑی عادت تھی۔ یونہی بیٹھا بیٹھا جہان بھر کی باتیں سوچا کرتا۔ گو وہ ابھی بمشکل سولہ سال کا ہوگا۔ اور کالج کے پہلے سال ہی میں تھا۔ لیکن ہر وقت کھویا کھویا سا رہتا۔ اس کے سر کے بال بڑھے ہوئے اور اکثر الجھے ہوئے ہوتے تھے پتلون گھٹنوں کے قریب آگے بڑھی ہوئی اور کوٹ کی بانہیں کہنیوں کے قریب بے حد میلی اور گھسی ہوئی۔ جیسے وہ ان کہنیوں سے اپنی انگلیوں کا کام لیتا رہا ہو۔ وہ بے حد شرمیلا لڑکا تھا۔ شرم، جھجک اور ڈر، یہ تینوں اوصاف اس میں تھے (یعنی اگر انہیں اوصاف کہا جا سکتا ہے تو۔) یونہی ایک بے معنی فضول سا ڈر۔ کالج کے لڑکوں سے، پروفیسروں سے، راہ چلتے ہوئے خوش پوش لوگوں سے اسے ڈر محسوس ہوتا۔ اگر وہ چاہتا تو خود بھی خوش پوش بن سکتا تھا۔ لیکن اسے خوشنما کپڑوں سے بھی ڈر لگتا تھا۔ وہ کوئی ایسا کام نہیں کرنا چاہتا تھا۔ جو لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کر سکے۔ اس کا چہرہ ہر وقت متفکر سا دکھائی دیتا۔ بڑی بڑی سیاہ آنکھوں میں اداسی جھلکتی ہوئی دکھائی دیتی۔ لبوں پر کبھی کبھی حزیں سی مسکراہٹ بھی آجاتی۔ لیکن یہ مسکراہٹ بہت کم لوگوں نے دیکھی تھی۔

وہ اپنی والدہ کی نگرانی میں اس شہر میں پڑھنے آیا تھا۔ شہر کی ایک بارونق گلی میں انہوں نے ایک مکان کرایہ پر لیا تھا۔ اس کا جی تو چاہتا تھا۔ کہ وہ شہر سے باہر کسی ایک کونے میں مکان لیلے۔ لیکن اس کی والدہ نے اس بات کی مخالفت کی تھی۔ شہر کے باہر تو چمار بستے تھے۔ یا ایک پاگل خانہ تھا۔ پھر شہر کے باہر وہ کس سے بات کر سکے گی۔ کیونکہ عورت اور خاموشی دو متضاد چیزیں ہیں۔ اور پھر یہ گھر کالج کے قریب بھی تھا۔ یعنی کوئی دس منٹ کا راستہ سائیکل پر۔ اور پچیس تیس منٹ پیدل۔ والدہ نے اسے ایک نیا سائیکل خرید دیا تھا۔ لیکن اسے اپنے سائیکل سے بھی ڈر محسوس ہوتا تھا۔ عجب بے ہنگم سی سواری ہے۔ ہر وقت آدمی کی جان بریکوں میں پھنسی رہتی ہے۔ ہینڈل سنبھالو تو بریکیں جواب دے جاتی ہیں۔ بریکیں کا خیال رکھو تو گھنٹی بجانے کا خیال نہیں رہتا۔ کوئی موٹر گاڑی سامنے سے آجائے۔ تو نہ پیڈل چلتے ہیں نہ پہیے۔ یہ بھی معلوم نہیں ہوتا کہ آدمی کا جسم گدی پر ہے یا ہوا میں معلق۔

اس کی والدہ کو اس سے بہت محبت تھی۔ اگر کالج سے واپس آتے ہوئے اسے پانچ منٹ کی دیر بھی ہو جاتی۔ تو وہ گھر کے دروازہ پر کھڑی اس کی راہ دیکھا کرتی۔ اگر وہ باہر سیر یا کھیل سے دیر میں آتا۔ تو اس کی ماں پریشان ہو جاتی۔ اور بار بار پوچھتی۔ بیٹا اتنی دیر کہاں رہے۔

یونہی سوچتا ہوا چلا آرہا تھا۔

یہ اچھی عادت نہیں۔ ہر وقت یونہی کیا سوچتے رہتے ہو۔

اور وہ شرما کر کہتا "کچھ نہیں ماں" اور اسکا چہرہ کانوں تک سرخ ہو جاتا۔ اگر وہ بتا دے کہ وہ کیا سوچتا ہوا واپس آرہا تھا۔ تو اس کی ماں کیا خیال کرے گی۔ اور وہ خود بھی کئی بار سوچتا کہ وہ یوں کیوں ہر وقت سوچتا رہتا ہے۔ اس سوچ کا مطلب؟ فائدہ؟ اسے اکثر اپنے آپ سے ڈر محسوس ہوتا تھا۔

سیما کو اس نے پہلے پہل اسی گھر میں دیکھا تھا۔ الھڑ بلکہ بھدی سی لڑکی۔ صرف رنگ صاف تھا۔ ورنہ اس میں کوئی ایسی بات نہ تھی جس کے متعلق وہ سوچ سکتا۔ اس میں نہ جوانی تھی نہ روپ۔ لڑکی ہی تو تھی وہ۔ نہ چال اچھی۔ نہ لباس اچھا۔ نہ ہنسی اچھی۔ نہ گفتگو اچھی۔ ہاتھ کی انگلیاں بے ڈھنگی سی نظر آتی تھیں۔ ان میں کوئی نفاست نہ تھی۔ لب پھیکے اور بے رس سے معلوم ہوتے تھے۔ نگاہوں میں گہرائی نہ تھی۔ سیدھی صاف

ہی نگاہ تھی۔ وہ نگاہ جو کچھ جانتی ہی نہیں۔ معلوم تو اُسے بھی کیا تھا۔ لیکن کم از کم کتابوں میں تو وہ کئی بار لڑکیوں کے متعلق پڑھ چکا تھا۔ اور دُور سے اُس نے کئی خوبصورت لڑکیوں کو دیکھا بھی تھا۔ لیکن اُن سے بات اُس نے کبھی نہ کی تھی۔ اُسے لڑکیوں سے ڈر محسوس ہوتا تھا ہاں سیما سے وہ ڈرتا نہ تھا۔ سیما وہ لڑکی نہ تھی۔ ایک بار جب وہ سیما کی طرف غور سے دیکھ رہا تھا۔ اور سیما نوکر سے کھانا مانگ رہی تھی۔ اور نوکر اُس سے ہنس ہنس کے بات کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ تو اُسے بُرا محسوس ہوا۔ نوکر کی ہنسی اور سیما کا بے ڈھنگا پن، اُس کی بے سمجھی یہ سب چیزیں اُسے بری محسوس ہوئیں۔ اور وہ سوچنے لگا۔ کہ یہ لڑکی ہمارے گھر آتی ہی کیوں ہے۔ لیکن پھر اُسے خیال آیا کہ اُس کی ماں پُرانے خیال کی عورت ہے۔ وہ جب تک دن میں کسی برہمن کو کھانا نہ کھلا لے خود کھانا نہیں کھاتی۔ اُسے ان برہمنوں سے جو گلے میں چادر لٹکائے ماتھے پر تلک لگائے بغل میں پوتھی دبائے اُس کے گھر آتے تھے۔ اور جنہیں کھانا کھلائے دکشنا دئے بغیر اُس کی ماں کبھی واپس نہیں لوٹاتی تھی۔ بہت ڈر محسوس ہوتا تھا۔ لیکن اُس کی ماں یہ سب کچھ اپنے لال کے لئے کرتی تھی۔ وہ اس کی جنم پتری کھول کر بیٹھ جاتی اور برہمن مہاراج سے پوچھتی مہاراج میرا لڑکا کب نوکر ہوگا۔ مہاراج میرے لڑکے کا کب بیاہ ہوگا۔ مہاراج کیا میری بہو میرے کہنے میں ہوگی۔ مہاراج میں پوتے کا منہ کب دیکھوں گی۔

اور برہمن مہاراج اتنے اچھے دلکش جواب دیتے تھے۔ کہ کھانا کھلائے اور دکشنا دئے بغیر کوئی چارہ نہ تھا۔

رام دھن اُسکا نوکر اُسکا ہم عمر تھا۔ اور بے حد شریر۔ بلکہ شریفوں کی اصطلاح میں اُسے بدمعاش ہی کہنا چاہئے۔ وہ سیما کو اکثر چھیڑتا رہتا تھا۔ لیکن سیما کو اوّل تو بہت سے رکیک حملوں کا پتہ ہی نہ چلتا تھا دوسرے وہ ہر روز کھانا لیجاتی تھی۔ اور پھر آخر اس میں کسی کا کیا بگڑتا تھا۔ بیچارہ رام دھن چولھے کے قریب چپاتیاں اتارتا اور ایک دو گندے جملے کہہ کر خاموش ہو جاتا۔ اور وہ کھانا لیکر چلدیتی۔ بات اس سے آگے کبھی نہ بڑھنے پائی۔ کیونکہ سیما کی عمر بمشکل دس بارہ سال کی ہوگی۔ اُسکا چہرہ، چال ڈھال، قد بت، ہر چیز نامکمل نظر آتی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ قدرت نے اُسے بناتے بناتے جان بوجھ کر ادھورا رہنے دیا۔ وہ حسین بن سکتی تھی۔ لیکن بدقسمتی سے نہ بن سکی۔ اب نہ وہ خوبصورت تھی۔ نہ بدصورت۔ بلکہ محض ایک لڑکی۔ بیکار۔ بے مصرف۔

ایک دن سیما رسوئی میں کھڑی کھانا لے رہی تھی۔ اور وہ اپنا چہرہ اپنی ہتھیلیوں میں رکھے کچھ سوچ رہا تھا۔ کہ رام دھن کی شریر ہنسی کی آواز اُسے سنائی دی۔ رام دھن اُسے بلا رہا تھا۔ اپنی طرف متوجہ کرنا چاہتا تھا۔ جب اُس نے رام دھن کی طرف دیکھا۔ تو رام دھن اپنی ران پر ہاتھ مار کر بولا۔ واہ واہ۔ بابوجی میں نے ایک بہت عمدہ تجویز سوچی ہے۔ بھلا کہئے۔ اگر آپ کا سیما سے بیاہ ہو جائے تو کیسا رہے۔ واہ واہ۔

سیما بے خوفی سے اور بغیر کسی جھجک کے ہنس پڑی۔ اُسے سیما کی ہنسی اور رام دھن کا مذاق بہت برا معلوم ہوا۔ اور اُس نے حقارت سے منہ دوسری طرف پھیر لیا۔ اور جب سیما چلی گئی۔ تو اُس نے رام دھن کو خوب ڈانٹا۔ اور ماں سے شکایت کر کے اُسے ایک اور ڈانٹ پلوائی۔ اُس نے سوچا یہ گنوار کتنا کتنا بیہودہ، فضول اور نکما شخص ہے۔ جب دیکھو لڑکیوں کے متعلق گندے مذاق کرتا رہتا ہے۔ کیا کرے تعلیم نہیں پائی تمیز نہیں سیکھی۔ عقل ہوتی تو ایسی باتیں نہ کرتا۔ اور پھر غریب بھی ہے۔ اس کے بھائی بہن بھی ہوں گے۔ اس جتنی ہی تو عمر ہے۔ فرض کرو کہ وہ رام دھن کی حالت میں ہوتا خدا کسی کو غریب نہ بنائے۔ لیکن خدا نے غریب بنائے ہی کیوں۔ اُس نے ہر شخص کو مسرت اور دولت کیوں نہیں عطا کی۔ یہ سوچتے سوچتے اُسے دنیا کے خدا سے بھی ڈر محسوس ہوا۔

اس گھر میں وہ سیما کو قریباً ہر روز دیکھتا تھا۔ یونہی، سرسری طور پر کبھی اُس نے اُس کی زندگی، اُس کی حرکات و سکنات، اُسکی ہستی کے متعلق زیادہ غور و خوض نہیں کیا تھا۔ ایک بار اُس نے اس کے متعلق جو اندازہ لگایا تھا۔ وہ بہت دیر تک اُس کے دل میں رہا۔ اُس میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ دو سال گزر گئے۔ وہ اب بی۔ اے میں تھا۔ فلسفہ لیتا تھا۔ اور اپنی خیالی دنیا میں اور بھی گہری دلچسپی لینے لگا تھا۔

اور یہی دنیا اس کے لئے حقیقی دنیا بنتی چلی جا رہی تھی۔ باہر کی دنیا کو وہ ایک سرسری جھلکتی ہوئی۔ اچٹتی ہوئی نگاہ سے دیکھتا۔ لوگ۔ باس آوازیں۔ دھمکیاں۔ ہنسی۔ حسد۔ خوشی۔ اکثر بے معنی اور بیکار چیزیں نظر آتیں۔ ان میں اُسے کیا دلچسپی ہو سکتی تھی۔ اس خول کے اندر ایک کساور دنیا تھی۔ رنگین۔ پُرکیف۔ خوبصورت۔ علمی اور ادبی مطالعہ نے اس کے دل پر ایک گہرا اثر پیدا کیا۔ اور وہ اپنی تخیلی دنیا میں اور منہمک ہو گیا۔ کئی بار تو اس قدر سوچ میں ڈوبا ہوتا کہ اُس کی والدہ اسے شانے سے پکڑ کر جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر جگاتی "اُٹھو بیٹا کھانا کھا لو" وہ ناچار کھانا کھانے کے لئے بیٹھتا۔ اور نوالہ ہاتھ میں لئے سوچنے لگتا۔ اور اُس کی والدہ کو پھر اُسے جگانا پڑتا۔ اور وہ محجوب ہو کر کھانا کھانے لگتا۔ کیسا بے وقوف تھا وہ۔ کم از کم کھانا کھاتے ہوتے تو اُسے نہ سوچنا چاہیئے تھا کہتے ہیں کہ کھانا کھاتے ہوئے آدمی اگر سوچنا شروع کر دے۔ تو کبھی نہ کبھی حلق میں نوالہ اٹک جاتا ہے۔ آخ ...... تھو ...... تھو .... اب پھر نوالہ حلق میں اٹک گیا تھا۔ اُس کی والدہ سرزنش کے انداز میں کہتی میں نے تمہیں کئی بار سمجھایا ہے۔ کھانا کھاتے وقت نہ سوچا کرو۔ یہ بہت بری عادت ہے۔

بی۔ اے میں داخل ہونے کے بعد اُس نے اپنی ماں سے کہہ سنکر مکان تبدیل کر لیا۔ اُسے گلی میں رہنا اچھا نہ لگتا تھا۔ وہ شہر کے باہر ایک کونے میں تنہا رہنا چاہتا تھا۔ اب وہ بڑا ہو گیا تھا یعنی اٹھارہ سال کی عمر کا جوان۔ اب اُس کی ماں یونہی اُس کی ہر بات کو نہ ٹال سکتی تھی۔ آخر اس کی ماں نے شہر سے باہر تو نہیں لیکن شہر کے شمالی کونے پر ایک مکان لے لیا۔ یہ مکان ایک گلی کے آخری سرے پر واقع تھا۔ اور اس مکان کے پرے ایک وسیع میدان تھا۔ اور اُس سے پرے سرکاری ہسپتال کا باغ۔ اور اُس سے پرے وسیع کھیت۔ اور اُن سے پرے پہاڑوں کی چوٹیوں کا سلسلہ۔ وہ یہ مکان کرایہ پر لیکر بہت خوش ہوا۔ اُس کی ماں بھی خوش تھی۔ کیونکہ کچھ بھی ہو یہ مکان ایک گلی ہی میں تھا۔ اُن کے مکان کے ساتھ ایک خالی زمین کا ٹکڑا تھا۔ جس پر جا بجا جھاڑیاں اُگی ہوئی تھیں۔ جنگلی لالہ کھلا تھا۔ دھتورے کے سفید پھول انہی ڈنڈیوں پر جھکے ہوئے تھے۔ اس خالی زمین کے ٹکڑے کے پرے سیما کا گھر تھا۔ کچی مٹی کا بنا ہوا۔ یہاں سیما اپنے چھوٹے بھائی، خالہ، خالہ کے خاوند اور ماں کے ساتھ رہتی تھی۔ سامنے گلی میں اور مکان بھی تھے۔ غرضیکہ اُس کی والدہ کے لئے رونق کا اچھا خاصہ سامان تھا۔

اب کے جو سردی کا موسم آیا۔ تو اس نے سیما میں پہلی بار تبدیلی محسوس کی، وہ جلدی جلدی قدم اُٹھاتے ہوئے کالج کو جا رہا تھا۔ کہ اُسے خالی زمین کے ٹکڑے کے قریب سیما مل گئی۔ سیما اپنے ہاتھ میں ایک کانگڑی لئے اُس کے گھر کی طرف آ رہی تھی۔ کانگڑی میں لال لال کوئلے دھک رہے تھے۔ سیما اُس کی طرف دیکھ کر مسکرائی۔ اور بولی "آپ سردی میں ٹھٹھرتے ہوئے جا رہے ہیں۔ اس کانگڑی پر ہاتھ تاپ لیجئے" یہ کہکر وہ ہنسی۔

وہ چونک پڑا۔ یہ نئی قسم کی ہنسی تھی۔ البیلی میٹھی کچھ تھوڑی سی فوری، تھوڑا سا عزور، اُس نے سیما کی طرف دیکھا۔ دونوں کی آنکھیں ملیں۔ لیکن اب ان آنکھوں میں انجان پن نہ تھا۔ اور وہ سیما سے نظر نہ ملا سکا۔ اُس نے یکایک محسوس کیا۔ کہ سیما کے چہرے پر ایک نئی دلآویزی آ گئی ہے۔ رخساروں پر ایسی شہابی رونق۔ جیسی پکے ہوئے سیب پر جیسے انسانی ہاتھ نے نہ چھوا ہو۔ لبوں میں رس اور سرخی اور چمک۔ اور ایک لطیف قسم کی بناوٹ۔ جیسے یہ لب۔ اپنے مالک کے اختیار میں نہیں۔ ان کی شوخی۔ ان کی ہنسی۔ ان کی سرخی ان کی چمک۔ ایک فطری۔ قدرتی۔ خوددر چیز ہے سیما کی مخملیں ٹھوڑی سے اتر کر اُس کی نگاہ سیما کی گردن پر پہنچی۔ اس گردن میں ہنس کے پروں کی سفیدی۔ اور ہنس کی گردن کا خم موجود تھا۔ وہ بہت حیران ہوا۔ اُس کی نگاہ اور نیچے جانے لگی۔ لیکن گردن کے نیچے ایک ریشمیں کرتا تھا۔ نیلا جھلمل کرتا ہوا۔ اور پھر اُس کی نگاہیں اُن ہاتھوں پر پڑیں جو کانگڑی کو پکڑے ہوئے تھے۔ لمبی مخروطی اُنگلیاں اور پوریں حنا میں رنگی ہوئیں۔ بھلا وہ اب تک ان انگلیوں کی خوبصورتی سے کیوں آگاہ نہ تھا۔ سیما ایک ہاتھ اُٹھا کر اپنے سر کی طرف لے گئی اور کانچ کی چوڑیاں گویا چاندی کی گھنٹی کی طرح بج رہی تھیں سیما کے سر کے بال سنہرے تھے اور بل کھاتے ہوئے

وہ بہت حیران ہوا۔ اس نے اپنے دل میں ایک نئی قسم کی جھجک اک انوکھا ڈر سا محسوس کیا۔ اب تک وہ سیما سے کبھی خائف نہ ہوا تھا۔ لیکن اب اسے سیما سے بھی ڈر محسوس ہونے لگا۔

وہ راستے میں سیما کے متعلق سوچتا رہا۔ وہ اس کے متعلق سوچنا نہ چاہتا تھا۔ لیکن سیما کی صورت بار بار اُس کے سامنے آجاتی اور وہ پریشان ہو جاتا۔ جس چیز کو وہ آج تک نامکمل اور ادھوری سمجھتا آیا تھا۔ اب یکایک اتنی جاذب، دلآویز بن گئی تھی۔ کہ اُس کے تصور ہی سے اُس کا دل کانپنے لگتا۔ ابھی کل ہی تو اُس نے اُسے دیکھا تھا۔ اور آج . . . . . یہ یکایک کیا ہو گیا تھا۔ اب نہ وہ الھڑ تھی۔ نہ بھدی۔ اس کی نگاہوں میں محبت۔ ہونٹوں میں رس۔ چال میں شعریت آگئی تھی۔ خودی اور غرور، اور پھر ایک لطیف قسم کی بغاوت جیسے وہ چاہتی تھی کہ کوئی اس کی طرف دیکھے۔ اور وہ اُسے مرعوب کر لے۔ کوئی اُس سے مذاق کرنا چاہے اور وہ ایک ملکہ کی طرح اُسے جھڑک دے۔ یا خاموشی سے اس طرح گزر جانے جیسے وہ ان چیزوں سے بہت بلند اور بے نیاز ہے۔ اور یکایک اُسے بھی ایسا معلوم ہوا۔ کہ سیما بہت بلند اور بے نیاز ہو گئی ہے۔ اس سے پہلے اُس کے ذہن میں سیما کی قدر و قیمت ایک بھیک مانگنے والی برہمن لڑکی سے زیادہ نہ تھی۔ اب یکایک اُسے ایسا معلوم ہوا جیسے وہ خود بھیک منگا بن گیا تھا۔

اُس دن جب وہ کالج سے لوٹا۔ تو اُس کی عجب حالت تھی۔ جوں جوں وہ سیما کے کچے گھر کے قریب آتا گیا۔ اُس کا چہرہ سُرخ ہوتا گیا۔ اُس کے دل کی دھڑکن بڑھتی گئی۔ اُس کی چال میں ایک عجیب ناہمواری سی پیدا ہو گئی۔ جیسے کسی نے اُسے شراب پلا کر نیم مدہوش کر دیا ہو۔ اسی حالت میں جب وہ سیما کے گھر کے سامنے سے گزرا تو اس نے سیما کو دروازہ پر کھڑی اپنی خالہ سے باتیں کرنے میں معروف پایا۔ دیوار سے لگی ہوئی نیلراج کے پھولوں کی بیل تھی۔ جس کے لمبے لمبے نازک سے پھول سیما کی انگلیوں کی طرح ہرے پتوں پر جھکے ہوئے تھے۔ اور ان کے ڈنٹھلوں میں بھی سیما کی گردن کی سپیدی اور لچک موجود تھی۔ اُس دن اُسے نیلراج کے پھول بہت پیارے معلوم ہوئے۔ اب تک اُسے شاعروں اور نظموں سے رغبت نہ تھی انگریزی نظموں کے الفاظ اکثر اس کی سمجھ میں نہ آتے تھے۔ آج رات وہ بہت دیر تک انگریزی شاعروں کی نظمیں پڑھتا رہا۔ "بلبل کا نغمہ" "ے میا کا عشق اور شیلے کی والہانہ شیفتگی، ان نظموں میں جو درد۔ کسک اور جلال موجود تھا۔ اک غبار بنکر اس کے دل پر چھا گیا۔ جیسے اُس کی تشنہ روح مدتوں کے بعد سیراب ہو گئی ہو نظمیں اور سیما کا زندہ جسمانی، لیکن غیر مرئی سا حُسن اُس کے دل میں ایک اضطراری کیفیت پیدا کرتا گیا۔ یہ سب جذبات اُس کے دل میں اس طرح گھُل مل گئے۔ کہ وہ ٹھیک طرح سے اُن کا تجزیہ نہ کر سکتا تھا۔ اک طوفان تھا جو امڈا چلا آ رہا تھا اور اُس نے جھجکتے ہوئے ڈرتے ہوئے۔ لیکن ایک نامعلوم سی مسرت کے ساتھ اپنے آپ کو اس طوفان کے حوالے کر دیا

وہ بہت مدت تک اسی نیم مدہوشی کے عالم میں رہا۔ کئی برسوں تک رہا۔ اور دل ہی دل میں سیما کو پیار کرتا رہا۔ کیونکہ وہ بے حد شرمیلا لڑکا تھا۔ اظہارِ محبت کی جرأت جو زبان سے کی جاتی ہے اُسے کبھی نہ ہوئی۔ وہ کسی کو اپنا ہمراز نہ بنانا چاہتا تھا۔ سیما سے پہلے اُس نے خوبصورتی دیکھی نہ تھی سمجھی نہ تھی۔ جانی نہ تھی۔ اب یکایک اُسے ایسا معلوم ہوا گویا اُس کے ہاتھ کوئی خزینہ آگیا ہے۔ اُس نے سیما کو اُٹھا کر اپنے دل میں رکھ لیا۔ سر سے پاؤں تک۔ لیکن کسی کو اس کی خبر نہ ہوئی۔ سیما کو بھی نہیں۔ کیونکہ وہ بے حد شرمیلا تھا۔ اُسے اس نئے جذبے سے اس نئے حسن سے ڈر محسوس ہوتا تھا۔ وہ چپکے چپکے اس نئی دنیا کے دو پہلے مرغزاروں میں گھومنا چاہتا تھا۔ اکیلے ہی اکیلے، کسی کے دیکھے سنے بغیر۔ وہ یہ پسند نہیں کرتا تھا کہ لوگ اُسے دیکھیں اور اُس کی طرف متوجہ ہوں۔ اس بات کا خیال آتے ہی اُس کا چہرہ سُرخ ہو جاتا۔ ماتھے پر پسینے کی بوندیں آجاتیں اور کسی نامعلوم ڈر کے احساس سے اُس کے سارے جسم میں ایک سنسنی سی پھیلتی جاتی۔ جیسے کسی نے ساکن تالاب کی سطح پر ایک سنگریزہ پھینک دیا ہو۔

وہ سیما کو دن میں کئی بار دیکھتا تھا۔ اور جب تک دیکھ نہ لیتا اُسے چین نہ پڑتا۔ اگر یہ کہا جائے کہ وہ اُس راستے کو بھی پوجتا تھا۔ کہ جن قدموں سے سیما اُدھر سے گزر جاتی تھی۔ تو یہ ایک مبالغہ نہ ہوگا۔ اُس کی وارفتگی میں اتنی گہرائی پیدا ہو چکی تھی۔ کہ اُس پر ایک قسم کی ذہنی نیم بیہوشی ہر وقت طاری رہتی۔ ایک والہانہ کیفیت۔ حال کا سا وجد۔ سرمدی نشہ۔ اور پھر ایک عجیب قسم کی بے قراری۔ بے کلی۔ بے چینی درد اور مٹھاس

سیما کو دیکھتے ہی اُس کے جسم کے رونئیں رونئیں میں کسی آتشین سیّال کی لہریں گردش کرنے لگتیں۔ اُسے ایسا معلوم ہوتا کہ اُس کا جسم ٹوٹ رہا ہے جسم اور روح تحلیل ہوتے جا رہے ہیں۔ تحلیل ہوتے ہوئے ایک شفقی روشنی بنے جا رہے ہیں شفقی روشنی سیما کے گرد لپٹتی جا رہی ہے۔ جیسے وہ کوئی نورانی ہالہ ہو۔ اور پھر وہ اپنے ذہن میں اس روشنی اور سیما میں کوئی فرق معلوم نہ کر سکتا۔ یہاں پہنچکر اُسے ایسا معلوم ہوتا گویا وہ کسی ہیبت ناک قصر کے آخری کونے پر کھڑا ہے کسی خوفناک آتش فشاں پہاڑ کے آخری دہانے پر شفقی روشنی ریلتا ہوا لال لال لاوا ابلتی اور ہزاروں پر پیچ حلقوں میں گردش کرتی ہوئی معلوم ہوتی اور وہ اپنے آپ کو تھامنے کی کوشش کرتا۔ اُسے ڈر محسوس ہوتا کہ وہ کہیں اس دہانے سے نیچے نہ گر جائے۔

لیکن وہ بے حد شرمیلا تھا۔ شرم۔ جھجک اور ڈر کے مضبوط خول نے اُسے تھام رکھا تھا۔ یہ چیزیں اس نے اپنے بزرگوں سے۔ اپنی سماج کے ماحول سے اپنے ملک کی فضا سے ورثے میں پائی تھیں۔ اُس کی ماں اُس کی اچھی طرح نگہداشت کرتی تھی۔ وہ اُسے بہت چاہتی تھی۔ اُسے برے لڑکوں کی صحبت سے بچاتی تھی۔ مخرب الاخلاق کتابیں نہیں پڑھنے دیتی تھی۔ کسی لڑکی سے بات نہیں کرنے دیتی تھی۔ وہ ایک اُجلے۔ پاکیزہ صاف ستھرے ماحول میں پرورش پا رہا تھا۔ کہ یکایک اُس کی زندگی کا سیما کے حسن سے تصادم ہوا۔ اور اُس کی زندگی دو حلقوں میں بٹ گئی۔ اور یہ دو مختلف محوروں کے گرد طواف کرنے لگی۔ ایک زندگی اسی شرم اور جھجک اور ڈر کے خول کے باہر تھی۔ وہ اب بھی اُسی طرح گھوم رہا تھا۔ گھر۔ والدہ۔ پلے گراونڈ۔ کتابیں۔ دوسری زندگی اس خول کے اندر تھی۔ جو پہلے بالکل باہر کی زندگی کی طرح تھی۔ لیکن اب اسے سیما کے حسن نے متلاطم کر دیا تھا۔ اور ان دونوں زندگیوں کے درمیان وہی خول تھا۔ وہی ڈر۔ شرم۔ جھجک۔ اور یہ دونوں زندگیاں اپنے اپنے طوروں پر گھومتی ہوئی چلی جا رہی تھی۔

کسی کو اُس کی محبت کا اندازہ نہ تھا۔ لوگ کہتے ہیں کہ عشق اور مشک چھپائے نہیں چھپتے۔ لیکن اُس نے اپنے پیار کو سالہا سال اپنے دل کے نہاں خانے میں چھپائے رکھا۔ اس سیپ کے موتی کی طرح جو نیلی موجوں کے نیچے غواصوں کی نظر سے دُور کسی گہرے سمندر میں مستور ہو۔ اس کے دل کی تہ تک کون پہنچتا۔ وہ تو اپنا غواص آپ تھا۔ وہ اس راز کو اپنے آپ سے۔ دنیا سے۔ سیما سے ہر ایک سے چھپانا چاہتا تھا۔ ایک موہوم ڈر ہر وقت اس کے دل میں لگا رہتا۔ کہ اگر کوئی اس راز سے واقف ہو گیا۔ تو اس کا موتی نیلی موجوں کے نیچے تھپیڑے کھاتے ہوئے سمندر کی گہرائیوں میں سے بھی۔ صدف کی چھاتی کو توڑ کر نکال لیا جائیگا۔ اور پھر وہ کسی کا نہ رہے گا۔ قارون نے بھی اپنے خزانے کی نگہداشت اس تندہی سے نہ کی تھی ـــــ

لیکن کئی بار جب اس کی روح سیما کے حسن کے شدت احساس سے تڑپنے لگتی تو اس کا جی چاہتا کہ وہ کھل کر بات کر دے۔ کسی لطیف پیرائے میں سیما پر اُس بے پناہ کسک کو ظاہر کر دے۔ جو اس کی جان کو کھائے جاتی تھی۔ کبھی کبھی وہ اسی شدت احساس کے زیر اثر جھلّا اُٹھتا چاہتا کہ سیما کو اپنے بازوؤں میں اس زور سے لپیٹ لے کہ اُس خوبصورت لڑکی کا دم گھٹنے لگے۔ اس کی بڑی بڑی سیاہ آنکھیں حیران ہو جائیں اور اُس کے نازک ہونٹ اس طرح کھلے رہ جائیں جیسے گلاب کی ادھ منہ کلی۔ جسے رات کی اوس اور صبح صادق کے جھونکوں نے کچی نیند سے جگا دیا ہو کبھی کبھی اس شدید احساس کے زیر اثر اُس شرم۔ جھجک اور ڈر کے خول کے اندر ہی اندر اُس کا دم گھٹنے لگتا۔ اور وہ چاہتا کہ یک لخت ایک جھٹکے سے اس خول کو چیر کر باہر نکل آئے۔ اسے پھاڑ کر تار تار کر دے۔ حتےٰ کہ اس کی دونوں زندگیوں کے حلقے ایک دوسرے پر منطبق ہو جائیں۔ ایک ہی محور کے گرد گھومنے لگیں۔ لیکن یہ ایک وقتی۔ نیم اضطراری حرکت ہوتی تھی۔ جیسے کسی مضبوط قفس کے اندر پرندہ پر پھڑپھڑائے پھر چند لمحوں کی جانگسل کاوش کے بعد بے حرکت ہو کر رہ جائے۔

کئی بار ایسے بھی موقعے آتے تھے۔ کہ جب وہ سیما سے اکیلا ملا تھا۔ ایک بار اُس کی ماں نے گھر سے باہر کسی کے ہاں جاتے وقت سیما کو

بھیجا تھا۔ اور اُسے کہا تھا۔ کہ وہ اس کے آنے تک گھر ہی میں رہے۔ پھر اُس نے سیما کو ایک تھالی میں بہت سے چاول لا کر دئے تھے۔ اور اس سے کہا تھا کہ ان سے کنکر الگ کر دے۔ اور چاول سنوار کر دال بھی بگھار لے۔ اتنے عرصہ میں وہ خود بھی واپس آ جائے گی۔ اور اُس کی ماں نے پڑوسی کے بیٹے کو بھی سیما کی مدد کرنے کے لئے کہا تھا۔ اور جب ماں چلی گئی تھی۔ تو وہ پیچھے سے سیما کے قریب جا کر بیٹھ گیا تھا۔ اور چاولوں سے کنکر نکالنے میں مصروف ہو گیا تھا۔ سیما اور وہ دونوں ساتھ ساتھ ایک ہی مونڈھے پر بیٹھے ہوئے دیر تک چاول سنوارتے رہے تھے۔ اور وہ اُس سے کچھ بھی نہ کہہ سکا تھا۔ اُسے ڈر تھا۔ مبادا سیما اس کے دل کی تیز دھڑکن سن لے۔ وہ نگاہیں دیکھ لے۔ جو کھل کر دل کا راز کہہ دیتی ہیں۔ اُس نغمے سے آشنا ہو جائے۔ جس سے اس کی روح کا ہر تار مرتعش ہو رہا تھا۔ چاروں طرف ایک شفقی روشنی سی پھیلی ہوئی تھی۔ اور وہ اپنے اور سیما کے سانس کی مدہم لے کو اس روشنی میں پھیلتے اور مدغم ہوتے دیکھ رہا تھا۔ چاول سنوارنے کے بعد وہ مونڈھے سے اُٹھ بیٹھا۔ اور سیما دال بگھارنے لگی۔ سیما سامنے بیٹھی دال بگھار رہی تھی۔ اور وہ اُس کے خوبصورت ہاتھوں کو دیکھ دیکھ کر مبہوت ہو رہا تھا۔ لمبی۔ پتلی۔ مخروطی۔ حنائی انگلیاں! وہ اُن کی لمس سے بہرہ اندوز ہونے کے لئے بے تاب ہو اُٹھا۔ سرخ سرخ ناخنوں والی پوریں گلاب کی کلیوں کی مانند تھیں۔ کیا یوں نہیں ہو سکتا۔ کہ وہ ساری عمر سامنے بیٹھی یونہی دال بگھارتی جائے۔ اور وہ اُسے اسی طرح سامنے بیٹھا تکتا جائے۔ یہ سوچ کر وہ ہنس پڑا۔ کتنا مضحکہ خیز خیال ہے۔ اور ناممکن۔ اس زندگی کے سب سپنے یونہی ہوتے ہیں۔ میٹھے۔ پیارے۔ دلنواز۔ لیکن ناممکن۔

ایک بار وہ اسی طرح گھر کے باہر خالی زمین کے ٹکڑے پر جہاں جنگلی لالہ کھلا ہوا تھا سیما کے ساتھ پھول چننے کے لئے بھیجا گیا تھا۔ سرما کا موسم تھا۔ دھوپ کھلی ہوئی تھی۔ اور پکتی ہوئی پیلی پیلی گھاس کے لمبے لمبے خوشے۔ ٹھنڈی ہواؤں میں لہرا رہے تھے۔ میدان میں جگہ جگہ خودرو لالے کے پھولوں کے تختے تھے۔ اور اُن سے پرے پنجتارے کے درختوں کی ایک قطار پھیلی ہوئی سیما کے گھر تک چلی گئی تھی۔ پنجتارے کے درختوں پر سرخ پھول آئے ہوئے تھے۔ اور دور سے یہ درخت سرخ چھتریوں کی قطار کی طرح نظر آتے تھے جو سمندر کے ساحل پر ایستادہ ہوں۔ سیما اور وہ اس میدان میں گھاس کے خوشوں پر اپنی ہتھیلیاں سہلاتے ہوئے آگے بڑھتے گئے۔ گھاس کے خوشے نرم تھے۔ لانبے۔ نرم۔ ملائم اور سنہرے۔ جیسے سیما کے بال۔ سیما کا دوپٹہ گردن سے نیچے شانوں پر گر گیا تھا۔ اور اس کے بال ہوا میں لہرا رہے تھے۔ لانبے۔ نرم اور سنہرے اور اُس کا دل بیتاب ہو گیا۔ اور اُس نے چاہا کہ وہ سیما کے بالوں سے بھی اسی طرح کھیلے جس طرح وہ دونوں اب گھاس کے خوشوں سے کھیل رہے تھے۔ چمکدار دھوپ تھی۔ اور اس براق آسمان کے پس منظر میں پنجتارے کے سرخ پھول سیما کے لبوں کی طرح مسکراتے ہوئے دکھائی دیتے تھے۔ ہوا میں گھاس کے خوشوں کی سوندھی سی مہک تھی۔ یا لالہ کی خوشبو۔ یا دھتورے کے سفید پھولوں کی کڑواہٹ لیکن اس وقت وہ بھی بری معلوم نہ ہوتی تھی۔ بلکہ ان دونوں خوشبوؤں کے ساتھ مل کر ایک انوکھی سی مہک پیدا ہو گئی تھی میٹھی بھی اور کڑوی بھی۔ چمکتا ہوا سورج۔ پنجتارے کی سرخ چھتریاں۔ خوشبوؤں سے لدی ہوئی ہوا۔ اور سیما کی موجودگی۔ گویا کائنات کا زندہ اور غیر مرئی حسن اُس کی آنکھوں کے سامنے آ گیا تھا۔ اور اس کی روح اس حسن بے کراں کے احساس کے بار سے اس قدر بوجھل ہو گئی کہ وہ سیما سے کچھ بھی تو نہ کہہ سکا بس وہ خاموشی سے پھول چنتے رہے۔ اور وہ پھول چن چن کر اُس کی جھولی میں ڈالتا رہا۔ حتیٰ کہ جھولی پھولوں سے اس قدر بھر گئی۔ کہ پھول سیما کی ٹھوڑی کو چھونے لگے اور اب ان پھولوں کو اُٹھائے وہ خود بھی ایک خوبصورت پیڑ معلوم ہوتی تھی۔ جس کی شاخیں لالے کے پھولوں کے بار سے جھک گئی ہوں۔ تھک کر وہ دونوں پنجتارے کے درختوں کی قطار کے نیچے جا بیٹھے تھے۔ اور اُس نے سیما کے بیٹھنے کے لئے اپنا کوٹ گھاس پر بچھا دیا تھا۔ اور سیما اُس کی اس حرکت پر ہنس پڑی تھی۔ اور اطمینان سے اپنے کانوں میں پنجتارے کے پھولوں کے آویزے لگانے میں مصروف ہو گئی تھی۔

نہیں اُس نے سیما سے کبھی اپنے دل کی بات نہیں کی۔ ہزار کوشش کے باوجود بھی سالہا سال تک وہ اُسے کچھ نہ کہہ سکا۔ وہ دل ہی

دل ہی دل میں سیما سے پیار کرتا رہا۔ ڈرتے ڈرتے جھجکتے جھجکتے جیسے وہ کسی فعلِ شنیع کا مرتکب ہو رہا ہو۔ اس عرصہ میں اُس کی دونوں زندگیوں کے سیارے اپنی اپنی جگہ حرکت کرتے رہے اور اپنے اپنے محور پر گھومتے رہے۔ اس عرصہ میں کچھ زیادہ شرمیلا ہوتا گیا۔ اس کی جھجک پہلے سے بھی بڑھ گئی خوف کی گرفت اور بھی شدید ہو گئی۔ لوگوں میں اس کی عزت اور شرافت کا چرچا اور بڑھ گیا۔ اس عرصے میں اُس نے اپنی تعلیم ختم کر لی تھی۔ پھر تین سال تک باغات کے محکمے میں تربیت حاصل کی تھی۔ اور اب وہ سرکاری باغات کا افسرِ اعلیٰ بن گیا تھا۔ اس عرصہ میں سیما کی بھی شادی ہو گئی تھی! وہ سینہ در کا لال ٹیکہ لگائے اُس کے گھر آیا کرتی تھی۔ کیونکہ وہ ایک غریب براہمن کی لڑکی تھی۔ اور ایک غریب براہمن سے بیاہی گئی تھی۔ اور پوجا پاٹ اور دکشنا اور روٹی مانگنا ہی تو براہمنوں کے چار کام تھے۔ اب وہ ایک معزز عہدے دار تھا۔ شاہی باغات کا افسرِ اعلیٰ۔ وہ اب سرکاری باغات میں ایک بنگلے میں رہتا تھا۔ اس کی والدہ اس کے ساتھ تھی۔ اور اسی طرح اس کی نگہداشت کرتی تھی۔ جیسے وہ ابھی دو سال کا بچہ ہو۔ شاید ذہن اور شعور کے لحاظ سے وہ ابھی ایک دو سالہ بچے کی مانند تھا۔ کیونکہ وہ اب بھی سیما کو بھولا نہیں تھا۔ اُس کی وارفتگی شیفتگی۔ الفت اُسی شدت کے ساتھ قائم تھی۔ بلکہ سیما کی شادی کے بعد کچھ بڑھ ہی گئی تھی۔ جتنی زیادہ وہ اب اُس سے دور ہو گئی تھی۔ شاید اسی نسبت سے وہ اُس سے زیادہ محبت کرنے لگ پڑا تھا۔ لیکن اب اس محبت میں درد بڑھ گیا تھا۔ بے چینی اور بے کلی تیز ہو گئی تھی۔ اور وہ خوف جو اس کی زندگی میں لوہے کی ڈاٹ کی طرح پھنسا ہوا تھا۔ اسکی روح کو کچلتا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ اس بات کی تو اُسے کبھی ہمت ہی نہ ہوئی تھی۔ کہ سیما سے اپنی محبت کا ذکر کرے۔ اپنی ماں سے سیما سے شادی کرانے کو کہے۔ یا اُس دیوار کو توڑ ڈالنے کی کوشش کرے۔ جو سماج نے براہمنوں اور غیر براہمنوں کے درمیان کھڑی کر دی تھی۔ ہاں وہ پہلے سے بھی زیادہ شدت کے ساتھ سیما کو چاہنے لگا۔ دل میں کسی وقت تیر کی سی چبھن محسوس ہوتی تھی۔ جب سیما اکیلی یا اپنی سہیلیوں کے ساتھ یا اپنے خاوند کے ہمراہ اُس کے سامنے سے گزر جاتی تھی۔ شادی کے بعد سیما اور بھی حسین نکلی تھی۔ جیسے اُشا کی اُجلی اُجلی سپیدی کو آفتاب کی پہلی کرن نے جلا دی ہو۔ اس حسن نے اُس کی آنکھوں میں چکا چوند پیدا کر دی تھی۔ اس کی روح کا اضطراب بڑھ گیا تھا۔ شاید کہیں دل کے کسی تاریک گوشے امید کی ایک کرن ابھی تک تڑپ رہی تھی۔ کہ سیما کو پا لیگا۔ محض اپنے جذبۂ شوق و وارفتگی کے سہارے۔ وہ بڑے بڑے منصوبے باندھتا۔ لیکن پھر وہی شرم جھجک اور ڈر کا خوف اُس کی امنگوں کا گلا گھونٹ دیتا۔ سیما اب تو بیاہتا تھی۔ پتی برتا۔ عفت مآب عورت۔ لیکن یہ سب کچھ جانتے ہوئے بھی وہ اُسے چاہتا رہا۔ وہی دوری تھی۔ وہی بُعد۔ وہی دبا ہوا خاموش جذبہ۔ وہی ناکام چاہت۔ اب اُسے سیما کو دیکھنے کا موقعہ کم ملتا تھا۔ لیکن جب بھی وہ سیما کو دیکھتا۔ تو سیما کے چہرے پر ایک دلآویز تبسم دیکھتا کہ وہ شدتِ احساس سے پاگل ہونے لگتا۔ یا ایک ایسی شاہانہ تمکنت دیکھتا جو گویا صاف کہہ رہی ہوتی "تم مجھے کبھی نہ پا سکو گے۔ تم اس لازوال حُسن کو کبھی نہیں چھو سکتے۔" اور اس کا رنگ متغیر ہونے لگتا۔ اُس کا سارا جسم کانپنے لگتا۔ اور اُس کی آنکھوں کے سامنے سیاہ حلقے سے ناچنے لگتے۔

اودل اُسی کا دوست تھا۔ نکما۔ نڈر۔ بے باک۔ نہ اُسے سماج کی پروا تھی۔ نہ اپنے ماں باپ کی۔ مذہبی عقائد کے لحاظ سے وہ بے رہرو سمجھا جاتا تھا۔ وہ پنچائت کے محکمہ کا افسر تھا۔ شہر کے عزت دار لوگ اُسے نفرت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ کیونکہ اُس کے چال چلن کو درست نہ سمجھا جاتا تھا۔ اور یوں بھی تو کوئی شریف آدمی اُس کا ساتھی نہ تھا۔ یہی لوہار، کمہار۔ زمیندار۔ کرخندار۔ شاگرد پیشہ لوگوں سے اُس نے اپنا ربط بڑھا رکھا تھا۔ اودل اور اُس کی طبیعت میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ لیکن شاید یہی وجہ تھی جس نے ان دونوں کو دوست بنا دیا تھا۔ اودل ہمیشہ اُسے چھیڑا کرتا۔ اُسکے مذہبی، سیاسی اور ذاتی عقائد کا مضحکہ اڑایا کرتا۔ اس دنیا میں ہر شخص خود غرض ہے۔ ہر شخص کمینہ ہے۔ اِس مہاجنی دور میں ہر شخص کی ایک قیمت مقرر ہے۔ ہر شخص ایک خاص قیمت پر بک جایا کرتا ہے۔ پچھلے زمانوں میں امیر لوگ غلام رکھا کرتے تھے۔ اب حکومتوں نے غلامی اٹھا دی ہے۔ لیکن لوگ اب بھی اسی طرح بکتے ہیں۔ بازاروں میں۔ گلی کوچوں میں۔ دفتروں میں۔ یہ نئی قسم کی غلامی ہے۔ اسے نوکری کہتے ہیں۔ مزدوری کہتے ہیں۔ لیکن غلامی نہیں کہتے۔ کیونکہ غلامی ممنوع ہے۔ لیکن لوگ اب بھی اسی طرح بکتے ہیں۔ مرد بھی اور عورتیں بھی۔ سماج میں عورتوں کا درجہ

بلند ہو گیا ہے۔ لیکن وہ بدستور بکتی ہے۔ بیچی جاتی ہے۔ گھروں میں۔ بازاروں میں۔ شادی میں۔ ہر نہج اور ہر صورت میں بیچی جاتی ہے۔ یہاں ہر شخص کی ایک قیمت مقرر ہے۔ خدا سے لیکر عورت تک دنیا میں آدمی ہر چیز خرید سکتا ہے۔ بشرطیکہ اُس کے پاس پیسہ ہو۔ پیسہ! پیسہ! پیسہ۔ اور اس قسم کی ہزاروں اول جلول باتیں بکتا۔ اودل کی یہ باتیں سنکر اُسے بہت غصہ آتا تھا۔ اور وہ اُس سے گھنٹوں بحث کیا کرتا۔ پھر باتیں کرتا کرتا وہ یک لخت خاموش ہو جاتا۔ ایک عجیب سی اداسی کا تاریک سایہ اُس کی روح پر مستور ہو جاتا۔ اور اُس کی بڑی بڑی سیاہ آنکھوں میں آنسو چھلکنے لگتے۔

اُسے اس طرح پریشان اور خاموش دیکھ کر اودل اُسے اور بھی تنگ کرتا۔ "یوں باتیں کرتے کرتے اداس کیوں ہو جاتے ہو۔ کیا کسی سے محبت ہے؟ حیرت ہے۔ تمہارے جیسے شرمیلے، ڈرپوک آدمی کو بھی کسی عورت سے محبت ہو سکتی ہے۔ کیا تم نے کبھی کسی عورت کی شکل بھی دیکھی ہے۔ کبھی کسی عورت سے بات بھی کی ہے۔ دراصل یہ تمہارا قصور نہیں۔ یہ ہماری اپنی تربیت کا قصور ہے" آتی کی گود میں ہم پلکر جواں ہوئے ہیں "سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا" تم کسی سے کیا خاک محبت کروگے۔ عورت کو دیکھتے ہی تمہارے تن بدن پر رعشہ چھا جاتا ہے۔ زبان میں لکنت آجاتی ہے۔ ماتھے پر پسینے کی بوندیں۔ دیکھو دیکھو! ابھی سے تمہارا چہرہ سرخ ہو رہا ہے۔ ایلو یہ سرخی کانوں تک جا پہنچی۔ کیسے جھینپ رہے ہو میاں اپنا علاج کرو۔ یہ محبت وحبت سب بکواس ہے۔ مجھے دیکھو شادی نہیں کی۔ لیکن درجنوں عورتوں سے عشق کر بیٹھا ہوں۔ یعنی وہ چیز جسے تم اپنی دانست میں عشق سمجھتے ہو۔ شادی تو میں کبھی نہیں کروں گا۔ شادی میں عورت مہنگی پڑتی ہے۔ میں تو کبھی کبھار عورت خرید لیا کرتا ہوں۔ جس طرح ادنی جراب، سوئی یا دستانہ خریدا جاتا ہے۔ اور پھر جب بیکار ہو جائے تو پھینک دیا کرتا ہوں۔ اس نظام میں ہر چیز کی ایک قیمت ہوتی ہے۔ اُس قیمت پر وہ چیز حاصل کی جا سکتی ہے۔ اور جب وہ چیز اپنا مصرف کھو بیٹھے۔ تو بیکار ہو جاتی ہے۔ پھینک دی جاتی ہے۔ ہر جگہ یہی ہوتا ہے۔ دفتروں میں کارخانوں میں۔ بازاروں میں گھروں میں۔ یہ تم کیا محبت کی بدعت لے بیٹھے۔ بتاؤ تو سہی وہ کون حور شمائل ہے جس سے تمہیں اتنی والہانہ محبت ہے۔

اور وہ جھنجلا کر کہتا۔ مجھے کسی سے محبت نہیں۔ یہ تم کیا فضول باتیں لے بیٹھتے ہو۔

اودل ہنسکر کہتا۔ "نہ بتاؤ۔ لیکن یہ تمہاری آنکھیں سب کچھ بتا رہی ہیں۔ اور ایک دن تمہیں اپنی زبان سے سب کچھ بتانا ہوگا"

اور ایک دن آخر اُس نے اودل کو سب کچھ بتا دیا۔ ایک ابر آلود شام کو کہ جب اودل اور وہ اودل کے کمرہ انگیٹھی کے قریب بیٹھے آگ تاپ رہے تھے۔ اُس نے اودل کو سب کچھ بتا دیا۔ اس کی طبیعت بے حد اداس تھی۔ اور کمرے کے باہر چھائے ہوئے میلے کہرے نے اُسے اور بھی غمگین بنا دیا تھا۔ ان پوچھے۔ انجانے طریق پر اودل نے اس کے پیار کی کہانی اس کی زبان سے سن لی۔ جھجکتے جھجکتے۔ ڈرتے ڈرتے اُس نے اپنی ناکام چاہت کی داستان کہہ ڈالی۔ اور جوں جوں وہ داستان کہتا گیا۔ اُس کی طبیعت میں روانی آتی گئی۔ ایک طوفان تھا کہ امڈا ہوا چلا آ رہا تھا۔ اُس کی گھٹی ہوئی تشنہ روح کی ساری تلخی اب چھلک کر باہر آ رہی تھی۔ اور جب اُس نے داستان ختم کی تو اُس کی اور اودل دونوں کی آنکھوں میں آنسو چمک رہے تھے۔ اودل کو معلوم نہ تھا کہ اس شرمیلے نوجوان کے دل میں محبت کا ایک بے کنار سمندر موجزن تھا۔ وہ بہت حیران ہوا۔ اور اُسے اپنے دوست پر بہت رحم آیا۔

جب وہ داستان محبت سن چکا۔ تو کچھ دیر کے بعد اُس نے اپنے دوست کے شانے پر تھپکی دے کر کہا۔ "مجھے کیا معلوم تھا کہ ایک دن مجھے تمہارا ڈاکٹر بننا پڑیگا۔ پھر رک کر بولا۔ تمہاری جیب میں دس دس روپے کے دو نوٹ ہوں گے؟"

اُس نے دو نوٹ نکال دیئے۔ "کیوں کیا بات ہے؟" اُس نے پوچھا۔

"کچھ نہیں" اودل نے مسکرا کر کہا۔ "تمہارے لئے دوائی لینے جا رہا ہوں۔ ذرا خاموشی سے بیٹھے رہنا" یہ کہہ کر دروازہ باہر سے بند کر کے چلا گیا۔

وہ اودل کی بات نہ سمجھ سکا۔ لیکن اودل ہمیشہ اسی قسم کی فضول باتیں کیا کرتا تھا۔ اس لئے اُس نے اس کی بات کی چنداں پروا

نہ کی اور وہ آگ تاپتے ہوئے، سرخ سرخ کوئلوں کی طرف دیکھتے ہوئے پھر گہری سوچ میں مستغرق ہو گیا۔ باہر بادل گھر آئے تھے۔ اور سامنے کے سلسلہ ہائے کوہ پر جھکے پڑتے تھے۔ ان کی گرج لرزہ خیز تھی۔ اور بجلی کی چمک خشمگیں، جیسے انہیں رہ رہ کر اس پر غصہ آ رہا تھا۔ کہ اس نے کیوں اپنے رازِ محبت کو یوں افشا کیا۔ ہوا کی دہشتناک سیٹیاں۔ اور دریچوں کے شیشوں کی کھڑکھڑاہٹ سنتا سنتا شاید وہ سو گیا۔ یہ نیند تھی یا مدہوشی، اُسے یہ معلوم نہ تھا۔ کہ وہ کتنا عرصہ اسی حالت میں رہا۔ یکایک اُس نے دروازے پر ایک ہلکی سی دستک سُنی۔ اودل ہوگا۔ اُس نے افسردہ لہجے میں کہا: "کون ہے؟" ایک اور دستک اور پھر دروازہ آہستہ سے کھل کر بند ہو گیا۔ یہ سیما تھی۔ وہ اُسے دیکھ کر ٹھٹکی۔ پھر نگاہیں نیچی کئے۔ قدم اُٹھاتی اُس کے قریب آ گئی۔ اور اُس کے برابر کرسی پر بیٹھ گئی۔

یہ سیما ہے۔ اُس نے اپنے دل میں سوچا۔ سچ مچ یہ سیما ہے۔ اُس کی برسوں کی محبوب۔ کائنات کا زندہ اور غیر فانی حسن۔ وہی لانبے ریشمیں سنہرے بال۔ وہی پیارا چہرہ۔ وہی دلآویز لب۔ وہی گردن کی موہنی سپیدی۔ یہ سچ مچ سیما ہے۔ غیر شعوری انداز میں اُس کے ہاتھ آگے بڑھے۔ اور اُس کے بالوں سے کھیلنے لگے۔ یہ وہی بال ہیں۔ سنہرے۔ ملائم۔ یہ وہی چہرہ ہے۔ اُس کی انگلیاں سیما کے رخساروں کو چھونے لگیں۔ جیسے کوئی اندھا راستہ بھول گیا ہو۔ اور بڑھتے ہوئے طوفان میں ہاتھوں سے ٹٹول کر راہ ڈھونڈ رہا ہو۔ سیما کے جسم میں ایک ہلکی سی کپکپی پیدا ہوئی . . . . . یہ وہی لب ہیں جنہیں چومنے کی خاطر وہ ہزار بار پاگل ہو گیا تھا۔ اُس نے آہستہ سے ایک بار دو بار ان لبوں کو چوما۔ پھیکے۔ اور سرد لب۔ جیسے وہ کسی مٹی کی مورت کو چوم رہا ہو۔ کیا یہ وہی سیما ہے۔ اُس کی نگاہیں سیما کے ہاتھوں پر پڑیں۔ خوبصورت ہاتھ۔ کنول کی مٹی کی طرح سفید۔ ملائم اور بے داغ۔ اس نے اس کے ہات اپنے ہاتھوں میں لے لئے۔ یکایک اُسے ایسا معلوم ہوا جیسے وہ اُن ہاتھوں کی انگلیوں اور پشت کو سکڑتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ جھریاں نمودار ہو رہی تھیں۔ جلد پر چتلے چتکبرے داغ ظاہر ہو رہے تھے۔ پھر جلد سیاہ تر ہوتی گئی۔ انگلیاں سکڑتی گئیں۔ اب وہ ان ہاتھوں کی ایک ایک جوڑ اور ہڈی الگ الگ کر سکتا تھا۔ یکایک ایک شعلہ سا بلند ہوا۔ اور اُس نے گھبرا کر ہاتھ کو چھوڑ دیا۔ وہ یکایک اُٹھ کھڑا ہوا۔ اُسے ایسا معلوم ہوا گویا اُس کا دم گھٹا جا رہا ہے۔ کسی نے اس کے حلق میں ایک روڑا اتار دیا ہے اور وہ بول نہیں سکتا۔ اُس کی آنکھوں کے آگے سیاہ حلقے ناچنے لگے۔ اُسے ایسا معلوم ہوا کہ اگر وہ ایک لمحہ اور بھی اس کمرے میں رہا۔ تو گھٹ کر مر جائے گا۔ اُس نے اپنے ہاتھ پھیلائے اور دوڑتا ہوا کمرے سے باہر نکل گیا۔ دوڑتے دوڑتے اس نے اودل کے بلند قہقہوں کی آواز سنی۔

وہ بھاگتا ہوا جا رہا تھا۔ اور سیاہ بادلوں کے چھینٹے اُس پر پڑ رہے تھے۔ وہ پیلے کہرے میں بھاگتا ہوا جا رہا تھا۔ اور بارش میں بھیگ رہا تھا۔ لیکن اُسے بارش کی پروا نہ تھی۔ اسے گردوپیش کی دنیا کا ہوش نہ تھا۔ کوئی اُس کے کانوں میں چلا چلا کر کہہ رہا تھا "دنیا میں ہر چیز بکتی ہے۔ دنیا میں ہر چیز کی ایک قیمت ہے۔ خدا سے لیکر عورت تک"۔ اور اُس نے اپنے کانوں میں انگلیاں داب لیں۔ اور بھاگتا ہوا چلا گیا۔ پیلے کہرے میں اُس نے چنار کے درختوں کی ایک قطار دیکھی۔ جو ایک سائے کی طرح اُس کے سامنے بھاگتی ہوئی چلی گئی۔ نیلراج کے لمبے لمبے نازک سے پھول سبز پتیوں پر جھکے ہوئے تھے۔ اُسے بھاگتے ہوئے دیکھ کر یکایک اُنہوں نے اپنی آنکھیں کھولیں اور دلنواز ترحم سے اُس کی طرف دیکھنے لگے۔ پیلی پیلی گھاس کے لانبے نرم اور سنہرے خوشے کہرے میں چاروں طرف سے اُبھر اُبھر کر ہوا میں لہرانے لگے ——— اور اُس نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ اور بڑھتے ہوئے طوفان میں بھاگتا گیا۔ اُس کا دم گھٹتا جا رہا تھا۔ اُس کی روح میں کوئی چیز پھنستی جا رہی تھی۔ اُس کا سارا جسم کانپ رہا تھا۔ بھاگتے بھاگتے اُس کے قدم یکدم رُک گئے۔ مٹھیاں بھنچ گئیں۔ اور وہ کراہتے ہوئے

بولا۔ "سیتا! سیتا!" جیسے وہ اپنے خدا کو بلا رہا ہو۔ وہ خدا جو وہاں موجود نہ تھا۔ پھر یکایک ایک خوفناک ہنسی اُس کے لبوں سے پھوٹ پڑی۔ ہا ہا ہا۔ کسی نے بند آتش فشاں دہانے کا منہ کھول دیا تھا۔ وہ لاکھوں توپوں کی گرج کے ساتھ چاروں طرف ریتا ہوا لاوا پھینک رہا تھا۔ جیسے پجاری چلا رہے تھے۔ اور غزنوی نے گرز مار کر سومنات کی مورت کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا تھا۔ جیسے زندگی میں پھنسا ہوا آہنی ذات اک آخری کشمکش سے۔ ٹکڑے ٹکڑے ہو کر تڑپ گیا تھا۔ اور زندگی کے دونوں حلقے گھومتے گھومتے ایک دوسرے پر منطبق ہو گئے تھے۔ اک ناگہ بیہوشی ہوئی جاتی تھی۔ اور اب اُس سے چلا نہ جاتا تھا۔ یکایک وہ اُسی طوفان میں اُسی گیلی زمین پر گر گیا۔

جب وہ ہوش میں آیا۔ تو وہ بارش میں بالکل بھیگ چکا تھا۔ چاروں طرف اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ اور بارش بدستور برس رہی تھی۔ وہ آہستہ سے گھٹنوں کا سہارا لیکر اٹھا۔ اب وہ بالکل ہوش میں تھا۔ اور گھر کا راستہ معلوم کر سکتا تھا۔ چلتے چلتے یکایک اُسے معلوم ہوا۔ کہ اُسکی روح کا طوفان ختم ہو چکا ہے۔ اور اُس کی زندگی ہمیشہ کے لئے بے خول اور بے نور ہو کر رہ گئی ہے۔

انسان مطالعہ سے مکمل ہوتا ہے۔ گفت و شنید سے وہ چالاک ہو جاتا ہے اور تجربے سے اس کے اندر صحت افکار پیدا ہوتی ہے۔ (بیکن)

انسانوں کو چاہیئے کہ وہ حال کے واقعات پر غور کریں اور مستقبل کو خدا پر چھوڑ دیں۔ (بیکن)

خدا آسمانوں پر ہے۔ اور زمینوں سب ٹھیک ہے۔ (براوننگ)

پانی۔ پانی! ہر جگہ پانی!
لیکن پینے کو ایک قطرہ نہیں۔ (کولرج)

کامیابی سے زیادہ کوئی کامیاب نہیں۔ (فرانڈ)

حسن، صداقت ہے اور صداقت حسن ہے۔ (کیٹس)

زندگی اصل ہے،
قبر اس کی منزل نہیں ہو سکتی (لانگ فیلو)

بڑے لوگوں کی زندگیاں بتاتی ہیں۔ کہ ہم اپنی زندگی کو بھی کامیاب بنا سکتے ہیں۔ (لانگ فیلو)

سنگین دیواریں اور آہنی سلاخیں قید خانہ نہیں بنا سکتیں۔ (لولیس)

انسانی ذہن اپنا مقام ہے۔ وہ بہشت کو دوزخ اور دوزخ کو بہشت بنا سکتا ہے۔ (ملٹن)

ریاست اور خاندان کی عظمتیں حقیقی نہیں۔ ان کی حیثیت سایوں سے زیادہ نہیں۔ موت سے بچنا محال ہے۔ موت بادشاہوں کو بھی نہیں چھوڑتی۔

(شرلے)

مسعود جاوید

ٹوٹا ہوا تارہ

نصف شب کے بعد

۱۔ بیس سال کی ایک خوبصورت عورت ـــ آنکھوں میں مئے دوشینہ کا سا خمار مگر نگاہوں سے
فولادی استقلال و سنجیدگی نمایاں لمبے سیاہ بال شانوں پر بکھرے ہوئے۔ چہرے پر لبریز بلوریں جام
کی سی رنگینی مگر انداز میں فلسفی کا سا الجھ۔ جسم ایک پیازی شال میں چھپا ہوا۔ دو برف جیسے سفید پاؤں
مسہری سے نیچے گداز قالینوں تک لٹکے ہوئے

۲۔ پچیس سال کا ایک نوجوان ـــ نگاہوں میں کرختگی اور وحشت۔ وحشیوں کے سے بال بلند
پیشانی پر لٹکے ہوئے۔ دریدہ و لباس۔ سر سے پاؤں تک مفلسی اور مصیبت کی گھناؤنی تصویر۔

وقت :۔

رات ـــ گناہ کی طرح بھیانک۔ ناگن کی طرح کالی۔ بادل بجلی اور آندھی والی رات

منظر :۔

سر بازار ایک آراستہ پیراستہ بالا خانہ

" مگر صورت سے تو تم چور معلوم نہیں ہوتے "

" صورت ہمیشہ جھوٹ بولتی ہے۔ کیا تم ایک طوائف ہو کر بھی
آج تک اتنا نہیں سمجھیں؟ جب غروبِ آفتاب سے پیشتر تم اپنے حسن و جمال
کی ساری برقی قوتوں کو بیدار کر کے اسی بالا خانے پر آ بیٹھتی ہو ـــ
جب اپنے جلو میں ہزاروں قیامتیں لئے ہوئے تم پارک کے دلربا کنجوں
سینماؤں اور بازاروں سے گزرتی ہو۔ تو کیا تمہاری جاذبِ نظر
صورت ہر دیکھنے والے کی نظروں سے چپکے چپکے یہی نہیں کہتی کہ " مجھے
تجھ سے محبت ہے " لوگ پروانہ وار تمہاری طرف بڑھتے ہیں۔ تباہی
اور غارت گری کا کھیل کھیلتے ہوئے ـــ وہ ٹھوکریں کھاتے ہیں۔
گرتے ہیں۔ مٹتے ہیں۔ کٹتے ہیں۔ صرف اس فریب میں کہ تمہاری
صورت نے جو کچھ کہا تھا۔ وہ سچ ہے ـــ تمہاری صورت ہزاروں
سے محبت کراتی ہے۔ اور بیک وقت خود ان سب سے محبت کرتی ہے
لیکن کبھی خود تم نے اپنی صورت سے ایسا بھیانک دھوکہ نہیں کھایا۔
اس لئے کہ تمہیں ابھی خود اپنے جھوٹ پر ایمان لانے کی حماقت
نصیب نہیں ہوئی اور ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ "

" مگر تمہاری باتیں بھی تو چوروں کی سی نہیں ـــ اندھیری
ڈراؤنی راتوں میں چور ڈرانے اور چرانے کے لئے نکلتے ہیں ـــ
فلسفہ لٹانے کے لئے نہیں "

" فلسفہ اور میری باتیں؟ ـــ یہ چیز میری سمجھ میں نہیں
آ سکی "

" تم یہاں کیوں آئے تھے؟ "

" چوری کرنے۔

" پھر اب تک چرا کر چلے کیوں نہیں گئے؟ "

" تم جاگ رہی تھیں "

"لیکن میں تو ایک عورت ہوں"

"تم چیخ تو سکتی ہو"

"مگر تمہارے آہنی اعصاب والے بازو میری چیخ کو میرے حلق میں ہی فنا کر سکتے تھے"

"ظلم میرے ہاتھوں نے آج تک نہیں سیکھا"

"چوری بھی تو ایک ظلم ہی ہے"

"ممکن ہے — لیکن خودکشی ایک اس سے بھی بڑا گناہ ہے"

"خودکشی"

"ہاں"

"کیا کہہ رہے ہو؟"

"یہی کہ جینے کے لئے کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی پڑتا ہے"

"چوری بھی؟"

"سب کچھ"

"لیکن تمہارا مذہب — اخلاق۔ سماج؟"

"یہ سب لفظ ہی لفظ ہیں — اور بھوک صرف لفظوں سے نہیں بجھ سکتی"

"تم بھوکے ہو؟"

"بھوکا؟ — میں تو ہمیشہ بھوکا رہتا ہوں — رات دن — صبح و شام — دنیا میں کیا کچھ نہیں — سونا چاندی۔ میٹھی نیندیں۔ سہانے خواب۔ نغمے۔ رقص۔ گناہ کی لذتیں۔ بیدردی کی آسائشیں۔ خودغرضی کی شراب — اور یہ سب کچھ انبار در انبار — لیکن میرے واسطے صرف بھوک۔ موت سے زیادہ سنگ دل..."

خاموشی — بالاخانے کے نیچے سڑک پر ہلکے قدموں کی آواز
بجلی کی چمک۔ کڑک

"کوئی راہگیر ہے شاید؟"

"راہگیر؟ — ہاں شاید"

"ڈر گئے؟"

"میں؟ — نہیں! — سوچ رہا تھا۔ کہ تم مجھ سے کیوں نہیں ڈرتیں۔ ساری دنیا تو مجھ سے ڈر ڈر کر بھاگتی ہے۔ مجھے دیکھتے ہی لوگ کترا کر پیچھے ہٹ جاتے ہیں۔ اور بچے دوڑ کر اپنے گھروں کے دروازوں میں گھس جاتے ہیں۔

"لیکن — قہقہہ"

خاموشی — بادلوں کی ہیبت ناک گرج

"تم نوجوان ہو"

"ہوں"

"تندرست ہو — توانا"

"ہاں"

"مزدوری کیوں نہیں کرتے؟"

"مزدوری! — تم ابھی جانتی نہیں۔ کہ دنیا والے مزدور کو کیا سمجھتے ہیں — بھکاری سے زیادہ ذلیل۔ کتے سے زیادہ حقیر۔ گھناؤنی کیچڑ کے غلیظ کیڑے سے زیادہ پست — سچ جانو انسان جیسے ہی مزدور بن جاتا ہے۔ پھر لوٹ کر انسانوں کے برابر کھڑا نہیں ہو سکتا۔ دن رات اپنا خون پسینہ بنا بنا کر ٹپکانے والا یہ ذلیل جانور صرف سنہری ٹھوکروں کا ہو کر رہ جاتا ہے — ظالم سماج کا کلیجہ پتھر ہے — دنیا والے خودغرض درندے ہیں"

"اتنی نفرت؟"

"نفرت؟ — (قہقہہ) نفرت تو ان کے ٹھوس کلیجوں پر اچٹ کر کند ہو جائے گی۔ ان کے واسطے تو اس سے کہیں زیادہ تیز نشتر کی ضرورت ہے۔ اونچی اونچی عمارتوں کی گرم و خواب پرور آغوش میں کالے ناگ کی طرح پھنکار مار کر سونے والے یہ کیا جانیں۔ کہ سرما کی ان برفانی راتوں میں بھوک اور سردی کے کانٹوں پر تڑپ کر نادار فاقہ کش مزدور کس طرح ہر رات سینکڑوں مرتبہ مرتے اور جیتے ہیں۔ کس نے دیکھا ہے۔ کہ اندھیری راتوں میں جب دیکھنے والا کوئی نہیں ہوتا۔ مزدوروں کی آنکھوں کے کتنے "معصوم تارے" اپنے ماں باپ کی گود سے اڑ کر آسمانوں میں گم ہو جایا کرتے ہیں۔ کتنے چاند ہیں۔ کہ چمکنے کی حسرتیں لئے ہوئے اندھیرے میں کھو جاتے ہیں — پھر مزدور بننا کوئی اپنے بس کی بات بھی تو نہیں یہ رتبہ بھی نخوت پسندوں کی ٹھوکروں میں سجدے کرنے کے بعد ہی مل سکتا ہے۔ غلام بننے کے لئے پہلے اپنی روح کو بیچ کر جانور بننا پڑتا

ہے — اور تم کہتی ہو۔ کہ مزدوری کیوں نہیں کرتے؟ — دولت کی
خون آشام دیوی تمہاری گناہگار خلوت میں آکر جس قدر بھولی بھالی
بن جاتی ہے۔ مزدور کے جھونپڑے کو اتنی ہی شقی سے اکھاڑ پھینکتی
ہے۔ تم نے جہاں اپنی عشوہ فروش نگاہوں میں ایک خفیف سا تبسم پیدا
کرکے ذرا آنکھیں اٹھائی ہیں۔ فوراً سماج کے دیوتا اپنا سارا اخلاق و
مذہب بھول کر کانپتے ہوئے سربخم ہو گئے۔ اور تم نے خوشی خوشی
اس خون سے اپنے نازک قدموں کو حنائی بنا لیا۔ جسے وہ نادار
دکھیاروں کی شریانوں سے چوس چوس کر اکٹھا کرکے لائے تھے۔"

"بہت برہم ہو گئے؟ — معلوم ہوتا ہے۔ ابھی میرا گلا گھونٹ
ڈالو گے"

"نہیں — اس میں تمہارا کوئی جرم بھی تو نہیں ہے۔ عورت کو
جسمانی اور روحانی لحاظ سے تباہ کرکے طوائف میں تبدیل کرنے والا
خود وہی سماج ہے۔ جو ایک طرف دیر و حرم کا امتیاز قائم کرکے خون
کی ندیاں بہاتا ہے۔ اور دوسری طرف گناہ اور سیاہ کاری کی
یک لمحی لذیذ دلچسپی کے واسطے روح کے سکون میں کانٹے چبھوتا ہے۔"

"پورے فلسفی ہو تم"

"میں فلسفی نہیں — میں اس سے نفرت کرتا ہوں۔ اسکے پاس
صرف دماغ ہوتا ہے — دل نہیں"

"چور بننے کے باوجود تم ابھی تک دل کے بندھن سے آزاد
نہیں ہوئے؟"

"ہاں — بھوک نے سب کچھ بھسم کر ڈالا لیکن سینے میں اب تک
دھک دھک کی آواز سنائی نہیں پڑی"

"کیوں؟"

"صرف اس لئے کہ — کہ میری ایک ماں ہے"

"ماں"

"بوڑھی۔ غمزدہ۔ بیوہ۔ جیسے سوکھی گھاس کی مسلی ہوئی پتی۔
اور وہ مر رہی ہے — آہ — وہ"

"مر رہی ہے؟"

"ہاں — فاقوں نے جو کچھ چھوڑ دیا تھا۔ اسے اب بیماری
کھا رہی ہے"

"تو تم اسکے واسطے کوئی . . . . . . "

"ہاں ہاں — میں اسکے واسطے کوئی دوا نہیں کر سکتا۔ دنیا
والوں نے شاید آجتک کبھی اپنی ماں کو مرتے سسکتے نہیں دیکھا۔
یہی تو وجہ ہے۔ کہ وہ میرے سینے کی جلن کو محسوس نہیں کر سکتے"

"کون ہیں وہ؟"

"وہ؟ — ہر جگہ — ہر طرف — سب کے سب وہی ہیں۔
ایک ہفتہ ہوا کہ میں انکے پاس گیا تھا۔ وہ کہتے ہیں تیری مزدوری نہیں
ملے گی۔ تو دفتر نہیں آیا۔ تو نے . . . "

"دفتر؟"

"ہاں میں دفتر میں قلمی مزدور تھا اور . . . "

"تعلیم یافتہ ہو تم؟ — میں پہلے ہی شک کر رہی تھی"

"اب میں کچھ نہیں — ایک مجرم۔ گناہگار — دیوانہ۔ صرف
ایک چور! — کتابوں میں جو کچھ سیکھا تھا۔ اس سے ناداری کے زخم
تو مندمل نہیں ہو سکتے۔ دنیا میں مفلسی سب سے بڑا گناہ ہے۔ تو نے
دنیا کو غریب بنکر نہیں دیکھا۔ ایک دن کے لئے بھی ایسا کر لو۔ تو خود
اپنا گلا گھونٹنے کے علاوہ اور کوئی چارہ نظر نہ آئے۔ جانتی ہو ہاں
نہ قلم کی کوئی قیمت ہے اور نہ پسینے کی — نہ جانے کتنے انسان
اپنے شانوں پر علم کے خزانے لادے پھرتے ہیں۔ لیکن انہیں کھانے
کے واسطے صرف ٹھوکریں ملتی ہیں۔ یا پھر زہر — وہاں ضرورت ہے
فریب کی — گناہ کی — درندگی کی — یہی چیزیں میں آج تمہارے
پاس سے چرانے آیا ہوں — قہقہہ"

"چوروں کے واسطے دیوانوں کی سی باتیں کرنا بڑا خطرناک ہے"

"آہ تم جانتی نہیں — وہ مر رہی ہے — سوکھی ہڈیوں کا
ڈھانچہ — ایک فاقہ کش بیٹے کی دکھیا ماں — مجھے بھیک بھی نہیں
ملی — میں نے دیکھا بازاروں میں بھکاری بھیک مانگ رہے تھے
طوائف اپنی نسائیت بیچتی ہے اور بھکاری اپنی انسانیت —
میں نے اپنا سب کچھ بیچنے کے لئے ہاتھ پھیلایا۔ لیکن وہ مجھ سے ڈر
ڈر کر بھاگنے لگے۔ گویا میں کوئی بلا تھا۔ کہ ان کو نگل جاتا۔ بزدل

کہیں کے ہوا ۔۔ ظالم بیدرد — نہیں اب میں بھیک مانگوں گا۔ ہمارے
سماج میں بھیک اسی لئے نہیں دی جاتی۔ کہ بھوکے تباہ حال بھکاریوں
کو اسکی ضرورت ہے۔ بلکہ محض اسواسطے کہ اپنے سرمایہ داری کے
مغرور احساس کو اس سے ایک راحت سی ملتی ہے۔ جب وہ ہڈیوں
کے ایک سوکھے ڈھانچے کو اپنے سامنے ہاتھ پھیلائے۔ گڑگڑاتے
تڑپتے اور بلبلاتے دیکھتے ہیں۔ تو انہیں ایک کیف سا محسوس ہوتا ہے
صرف اس لئے کہ اسطرح ان کو کم از کم تھوڑی سی دیر کے لئے خدا بننے
کا موقعہ ملتا ہے۔ مگر میں ان کو ایسے مواقع دینا نہیں چاہتا۔ اور اسی لئے
میں بھیک نہیں مانگتا۔ میں کتوں کی طرح چیتھڑے چاٹ چاٹ کر اور ذلت
کے تنفر انگیز کیڑے کی طرح رینگ رینگ کر جی سکتا ہوں۔ مگر صرف
موت سے بچنے کے لئے انسانی ٹھوکروں کو سجدے نہیں کر سکتا۔

"تمہیں اپنی ماں کے واسطے کتنی رقم کی ضرورت ہے؟"

"ماں؟ — اب وہ کہاں؟ — اُسے سماج کا عفریت نگل چکا"

"کیا کہہ رہے ہو؟"

"اور وہ مر چکی — بہت عرصہ ہوا"

"مگر تم تو کہتے تھے۔ وہ بیمار ہے؟"

"نہیں — میں نہ جانے کیا کہہ گیا — بوڑھی زندگی فاقہ اور
بیماری کے جھٹکوں میں اتنی مدت تک زندہ نہیں رہ سکتی تھی"

"پھر تم کس کے لئے یوں چوری کرتے پھرتے ہو؟"

"دل بہلانے کے لئے — سچ تو میرے دل کو چین ہی نہیں
ملتا — وہ بھولتی ہی نہیں — شراب بھی نہیں بھلا سکی اُسے"

"شراب؟ — کیسے؟"

"ہاں جب تک ہو سکا خوب ہی پی — مگر آہ — سنہرے
خوابوں والے وہ شب و روز پھر بھی بھولے نہ جا سکے — کتنا پیارا تھا
وہ زمانہ؟ — جیسے کوئی ہلکے ہلکے۔ دھیمے دھیمے نغموں میں جھول
رہا ہے"

"محبت؟"

"ہاں محبت — مگر دنیا والے کہتے تھے۔ یہ گناہ ہے۔ قصور شاید
صرف یہ تھا۔ کہ ہم نے سماج کے قوانین سے پوچھ کر محبت نہیں کی تھی۔
وہ کہتے تھے۔ محبت وہ ہے۔ جو سوچ سمجھ کر کی جائے۔ اور یہ خیال رکھا
جائے کہ اس حرکت سے سماج کے اصول کو کوئی صدمہ نہیں پہونچتا۔ انسان
جس طرح اپنے مذہب۔ اخلاق اور اقتصادی اور سماجی مرتبے کے
مطابق کھاتے پیتے اور رہتے سہتے ہیں۔ اگر اسی طرح محبت بھی کریں۔ تو
شاید گناہ نہ سمجھا جائے۔ دنیا والے اپنے رسم و روایت کے غلام ہیں
اور بدبودار کیچڑ کے ذلیل رینگتے ہوئے کیڑے کی طرح اس گندگی سے
باہر نکلنے کو اپنی موت سمجھتے ہیں۔ وہ اپنی زندگی کو ان پیمانوں سے ناپ
رہے ہیں۔ جن کو سماج کے درندوں نے اُن کا خون پینے کے واسطے
مذہب اور اخلاق کے سانچوں میں ڈھال رکھا ہے۔ وہ اس راہ
سے ذرا ہٹے۔ اور جہنم میں جھونکے گئے۔ انہوں نے اس آستانے
پر سر جھکانے سے ذرا انکار کیا۔ اور رسم و روایت کے فولادی پنجے
نے اُن کا گلا گھونٹا۔ وہ اسی کو زندگی سمجھتے ہیں۔ میں نے ایسا
نہیں سمجھا۔ اسی لئے مجھ کو تباہ کیا گیا"

"تو تمہاری محبت ناکام رہی — مگر کیوں؟"

"صرف اسلئے کہ وہ ہندو تھی۔ اور میں مسلمان"

"مگر مذہب تو . . . . "

"ہاں ہاں — لیکن وہ لکھ پتی والدین کی لڑکی تھی اور
میں بے گھر مفلس و فاقہ کش — مذہب تو تبدیل بھی کیا جا سکتا ہے۔ تم
یہی کہنا چاہتی ہو نا لیکن دولت؟؟ — پھر میں نے تو ایسا کرنے کی بھی
ساری کوششیں کر ڈالیں۔ اپنے افلاس کے داغ کو دھونے کے لئے
میں نے گناہ کے ہر ایک گندے نالے میں غوطے لگائے — تم سمجھیں؟
— میں نے جوا کھیلا — جوا — دیوانہ وار — اندھا دھند — طوفان
کی طرح — لیکن بجلی اس طرح کہیں گری بھی ہے۔ کہ میں کامیاب
ہوتا"

"پھر؟"

"پھر کیا — محرومیاں۔ مجبوریاں۔ تباہی — میں نے اُسے
مار ڈالا"

"تم نے مار ڈالا؟ — تم ایک قاتل ہو؟ — قاتل
اور آزاد؟"

ہاں — دنیا مجھ سے ڈرتی ہے۔ سب کہتے ہیں یہ پاگل ہے
(قہقہہ) — دیوانے کہیں کے! — بخدا ساری دنیا میں ایک تم ہی ملی
ہو کہ اب تک ڈر کر مجھ سے بھاگ نہیں گئیں (قہقہہ)

"تم پاگل ہو"

"ہرگز نہیں"

"اب چلے جاؤ تم"

"کیوں — ڈر گئیں؟ — چور سے؟"

"تم چلے جاؤ ذرا"

"اچھا بھئی اچھا تم ڈرو نہیں میں جاتا ہوں۔ مگر دیکھو میں کل
پھر آؤں گا۔ اپنا دروازہ یوں ہی کھلا رکھنا۔ سچ کہتا ہوں۔ تم بڑی
مہربان ہو۔ آج تم سے باتیں کر کے اس دکھتے ہوئے دل کی کرب کم
ہو گئی۔ ناراض تو نہیں تم؟"

"نہیں"

"اُف! — وہ بھی بالکل اسی طرح "نہیں" کہا کرتی تھی —
کتنی پیاری — کیسی سُندر — بالکل تمہاری ہی جیسی صورت تھی
اس کی بھی — اسی لئے ادھر چلا آیا تھا — کوئی زحمت تو نہیں ہوئی؟
اچھا اپنے چور کا سلام لو! — مگر ہاں — میں پاگل نہیں ہوں —
نہیں بخدا نہیں۔ دنیا کہتی ہے تو بکنے دو اسے — پاگل کہیں کی"

بجلی کی چمک — بادل کی گرج — خاموشی

قاضی نذرالاسلام

طوائف

تجھے طوائف کہہ کر کون حقارت سے ٹھکراتا ہے؟

تو جو بھی ہو ہماری ماؤں، بہنوں کی ہم جنس تو ہے۔ تیرے بچے بھی ہم جیسے ہیں۔ شاید کہ ہمارا ہی کوئی ماموں، اور چچا ان کا باپ ہو۔ کیا عجب کہ ان کے چہرے پر ان کا عکسِ رخ نظر آ جائے۔ وہ بھی توقیر اور عزت حاصل کر سکتے ہیں۔ ان کی آواز بھی روح القدس سے ہم آہنگ ہو سکتی ہے۔

پیدائش کے بعد انسان سے نفرت صریح کفر ہے۔

کیا گناہ کا مرتکب کبھی ثواب نہیں کر سکتا؟

تیری اولاد کو جو لوگ نطفۂ ناتحقیق کہہ کر ٹھکراتے ہیں۔ میں ان سے پوچھوں گا۔ کہ اے نیکی کے فرشتو! دنیا والوں میں سے کتنوں نے جذبۂ شہوت کو ٹھکرایا ہے۔ ان میں سے کتنے گناہ سے پاک تھے؟

ہم سب کو اسی شہوانی بھوک نے جنم دیا ہے۔ لیکن کوئی ہمارے غرور کو تو دیکھے۔

اگر عصمت فروش ماں کا بیٹا حرامی ٹھیرا تو شہوت پرست باپ کا بیٹا بھی یقیناً حرامی کہلائے گا۔

(پیامِ شباب)

بلراج ساہنی

اوورکوٹ

شام کے چھ بجے . . . اقبال ناتھ سخت فکرمند دکھائی دیتا تھا اُسے اپنے واحد سوٹ میں بہت ہی خرابیاں نظر آ رہی تھیں۔ کوٹ کی آستین پر چونے کی تہہ جمی ہوئی تھی جسے بغیر برش کی مدد کے صاف کرنا مشکل تھا۔ وہ برش کہاں سے لائے؟ بالآخر تذبذب کی حالت میں وہ اُوپر والے پڑوسی سے برش مانگ لایا۔ لیکن معلوم ہوا کہ برش کرنے سے کام نہ چلے گا۔ ایک جگہ صاف کرنے کے بعد دوسری جگہ میل نظر آنے لگتا تھا۔ وقت تھا تنگ۔ پتلون کی جیب بھری ہوئی تھی۔ بوٹ تو پالش کرا لئے تھے۔ مگر جرابوں کی پھٹی ہوئی ایڑیاں صاف نظر آتی تھیں بیرونی جیب کے لئے رومال بھی نہ تھا۔ آخر کسی طرح اس خیال کا سہارا لے کر کہ اتنے غور سے دیکھتا ہی کون ہے۔ اپنی بے روشندان کی اندھیری کوٹھڑی کو خیرباد کہہ کر وہ گاف روڈ کی طرف چل دیا۔

اگر وہ کہیں اس وقت مال روڈ پر جا نکلتا۔ تو اُس کی بے جوڑ پتلون، ناموزوں ٹائی اور پریشان بالوں کو دیکھ کر کئی واقف کار مسکرا دیتے۔ اور کالجوں کے طالب علم تو اُس کے سراپا پر ان گنت تضحیک آمیز فقرے موزوں کرتے۔

شاہ عالمی دروازے کی کھچا کھچ بھیڑ میں ایک "صاحب" چلا جا رہا ہے۔ تانگے والے نگاہ اُمید سے اُسے دیکھتے ہیں۔ بھکاری خدا سے اسکے خزانے بھرپور رکھنے کی دعائیں کرتے ہیں۔ کوئی یہ گمان بھی نہیں کرتا کہ وہ لاہور کی ایک نجس ترین گلی کے ایک صدی پرانے مکان کی ایک نمدار کوٹھڑی کا عارضی مالک ہے۔ نیز یہ کہ اُسکے قبضے میں گھریلو سامان کے نام سے صرف ایک چارپائی ہے۔ جس کے ڈھیلے ڈھالے بانوں پر پڑے پڑے وہ صبح سے شام کر دیتا ہے۔

یہ تھا بھی کیسے؟ آج جس تیزروی سے وہ بھیڑ کو چیرتا چلا جاتا تھا۔ اس سے تو یہی ظاہر ہوتا تھا۔ کہ اس عظیم الشان شہر میں وہی ایک ایسا شخص ہے جس کا ہر لمحہ قیمتی ہے۔ اسکے چہرے پر اضطراب تھا۔ اور کھوڑی بہت رونق بھی۔ کرنل نے اسے گھر پر بلایا ہے۔ اگر کوئی خاص بات نہ ہوتی۔ تو دفتر پر ہی نہ بلا لیتا؟ یہ راز ابھی اس نے اپنے قریب ترین دوستوں پر بھی نہیں کھولا۔ پہلے جب کبھی ایسا موقعہ آتا تھا۔ وہ لوگوں سے پوشیدہ نہیں رکھتا تھا۔ اور آخر کار سبھی کے سامنے اُسے نادم ہونا پڑتا تھا۔ چندر جیب چاپ جو دھپور کے کالج میں جا لگا۔ حالانکہ سب کو اس نے یقین دلا رکھا تھا۔ کہ وہ کسی اخبار کے دفتر میں نوکری ڈھونڈ رہا ہے۔ اور جمیل اور روپ کشن سبھی اس راز کو چھپا کر رکھتے تھے۔ اور اسی کی آسامیاں چھین لیجاتے تھے۔ لیکن آج اقبال ناتھ کو کامل یقین تھا کہ شگون اچھا ہے۔ ضرور کسی نے اسکے بارے میں کرنل سے دو لفظ کہلائے ہیں۔ پہلے پہل کتنی تنخواہ ملے گی؟ ایک سو بیس۔ کیسی شان ہو گی۔ ماں کس قدر خوش ہو گی۔ پتا جی سیدھے منہ بات کرینگے۔ اچھی پہننے کو ملے گا اچھا کھانے کو۔ دوستوں کے سامنے بھی سر اُٹھا کر گذارہ سکیگا۔ یہ سوچ اور یہ غم جو اندر ہی اندر اسے کھائے ڈالتے تھے۔ دور ہو جائینگے۔ اس کی زندگی کی وسیع عمارت صرف ایک ملازمت پر مبنی تھی۔ اگر کامیابی ہوئی۔ تو وہ کسما کو آج ساری رات بیٹھ کر ایک طویل محبت نامہ لکھے گا۔

بازار رفتہ رفتہ چوڑے ہوتے گئے۔ بھیڑ اور گندگی کم ہونے لگی۔ دوکانوں کے تھڑے باہر سے ہٹ کر اندر چلے گئے۔ شیشے کی آراستہ و پیراستہ کھڑکیاں دکھائی دینے لگیں۔ موٹروں کا تانتا بندھ گیا سینما کے من موہ لینے والے پوسٹر آنے لگے۔

لارنس باغ تک پہنچتے پہنچتے رات ہو گئی۔ چڑیا گھر کے پرندے کا ہے درختوں پر پناہ گزین آزاد پرندوں کے ساتھ مل کر گاتے۔ اور گاہے خاموش ہو جاتے۔ اقبال کو سردی محسوس ہونے لگی۔ ہاتھوں

کی انگلیوں کے جوڑوں میں درد شروع ہوگیا۔ سوچا اگر کرنل کی کوٹھی پر ٹھٹھرتا ہوا پہنچا۔ تو کیا خاک اثر ڈال سکوں گا۔ چنانچہ وہ ذرا دوڑنے لگا۔ ہاتھوں کو بغلوں میں دبا کر خوب گرم کرلیا۔

بنگلے کے دروازے پر پہنچ کر ایک گندے۔ وہاں سے بوٹ صاف کئے۔ تاکہ کرنل کو معلوم ہو۔ کہ وہ تانگے پر آیا ہے۔ پھر آنا میں ہر کے بال درست کئے۔ دل کڑا کیا۔ اور بجری پر پیروں سے آہٹ پیدا کرتا ہوا احاطے میں داخل ہوگیا۔ ملاقات کے کمرے کی کھڑکیاں بجلی کی روشنی میں انگاروں کی طرح دہک رہی تھیں اور موسیقی کی دلفریب تانیں کانوں میں امرت انڈیل رہی تھیں

دروازے پر کوئی چپراسی نہ تھا۔ اگر دن ہوتا۔ تو کتنی ہی دیر باہر انتظار کرنا پڑتا۔ اقبال اب حکام کی ملاقات کے آداب سے خوب واقف ہو چکا تھا۔ اُس نے بڑھ کر دھیرے سے دروازہ کھٹکھٹایا۔ کرنل کپور خود باہر نکلے۔ اور نہایت شرافت سے گویا ہوئے "آئیے آئیے۔ کم ان۔"

اقبال نے شکریہ ادا کرنے کے بعد اندر قدم رکھا۔ کمرے کی فضا باہر کی بہ نسبت کہیں گرم تھی انگیٹھی جل رہی تھی۔ اور اسکے آگے کرسیوں پر دو نوجوان ایک دوشیزہ ایک چھوٹی بچی بیٹھے تھے۔

"اتنی سردی میں آپ بغیر اوورکوٹ کے چلے آئے! سچ سچ جوانوں کو جاڑا کم لگتا ہے" کرنل نے حیرت سے کہا۔

دل ہی دل میں اقبال نے اپنے آپ کو کوسا۔ کیوں نہ وہ کوٹ کسی سے عاریتاً مانگ لایا؟ کئی بار اس نے اپنے "ہوبنہار" افسروں کو متاثر کرنے کی غرض سے تھرڈ کے بجائے سیکنڈ کلاس کا ٹکٹ خریدا تھا۔ تاکہ ان کے ساتھ والے ڈبے میں سفر کرسکے۔ بارہا شام کے وقت ہوٹلوں میں کڑوی بیر کا گلاس سامنے رکھ کر بیٹھا رہا تھا۔ کہ افسر ایک دفعہ دیکھ لے۔ کہ کسی اچھے گھرانے کا لڑکا ہے۔ سینکڑوں روپئے اسی ڈھونگ پر برباد کئے۔ لیکن آج اتنی اہم بات یکسر بھول گیا۔ "ایک دوست مانگ کر لے گیا تھا۔ اس نے ابھی واپس نہیں کیا۔" اس نے لاپروائی سے مسکرا کر کہا۔

کرنل سے ایسے ہمدردانہ رویے کی اقبال کو قطعاً امید نہ تھی وہ کب کا بھلا چکا تھا۔ کہ افسر بھی انسان ہی ہوتے ہیں۔ کرنل نے اسے بڑے پروقار انداز میں اپنے خاندان سے متعارف کرایا۔ انگیٹھی کے قریب والی اپنی کرسی پر بیٹھنے کو کہا۔ شیری کا ایک چھوٹا گلاس بھی اقبال کو پیش کیا گیا۔ ذرا ہی دیر میں اُس پر اُن لوگوں کے حسنِ سلوک نے ایسا جادو کیا۔ کہ وہ بالکل بھول گیا۔ کہ میں یہاں ہسپتال کی ہاؤس سرجنی کے لئے آیا ہوں۔ مدت دراز سے فراموش شدہ اور روندی ہوئی "خودی" کا احساس جاگ اٹھا۔ "اب خواہ ملازمت ملے کہ نہ ملے۔ ان لوگوں نے مجھے اپنا جیسا انسان تو سمجھا۔ کیا یہ کافی نہیں؟"

بعدازاں کرنل کا اشارہ پاکر لڑکے اور لڑکیاں چلے گئے ریڈیو بھی بند کر دیا گیا۔ کرنل اور اقبال اطمینان سے ایک دوسرے کے بالمقابل بیٹھ کر ادھر اُدھر کی باتیں کرنے لگے۔ جس آرام و آسائش کے اسباب کے اقبال خواب دیکھا کیا کرتا تھا۔ وہ سب یہاں موجود تھا۔ اور کرنل کی گفتگو سے ہرگز یہ ظاہر نہ ہوتا تھا۔ کہ وہ غیر آدمی ہیں

"آپ کا طالب علمی کا زمانہ اتنا اچھا رہا ہے۔ پھر آپ ولایت کیوں نہیں چلے جاتے؟"

"جاؤنگا تو ضرور۔ اور مجھے سرجری سے خاص لگاؤ ہے لیکن میری مالی حالت ابھی قابل اطمینان نہیں ہے۔ میرے والد روپئے کا انتظام بھی کرسکتے ہیں۔ مگر دراصل بات یہ ہے۔ کہ وہ مجھے ٹھیک پہچانتے ہیں۔ میں بھی آزاد طبیعت آدمی ہوں۔ جب تک عملاً ثابت نہ کر دوں۔ کہ میں اپنے پاؤں پر کھڑا ہو سکتا ہوں۔ اُن سے بے دلی امداد لینا نہیں چاہتا۔"

یہ خیال کرکے کہ کرنل اُس کی باتوں میں دلچسپی لے رہا ہے۔ اقبال بولتا ہی گیا۔ اُسے خود بھی معلوم نہ تھا۔ کہ وہ ایسی روش کیوں اختیار کر رہا ہے۔ لیکن گفتگو کرنے سے اپنے تئیں باز بھی نہ رکھ سکا اپنی زندگی کے سبھی ارمان اپنے راستے کی حائل رکاوٹیں گنتا گیا۔ جو سفارشی خطوط ساتھ لایا تھا۔ وہ دکھانا بھول گیا۔ جن بڑے آدمیوں سے دور کے رشتے تھے۔ اُن کے نام بھی لئے۔ یہی جتانے کی کوشش کرتا رہا۔ کہ میں بھی دنیا میں کچھ ہوں۔ کرنل خاموش

بیٹھا مسکرا مسکرا کر سب سنتا رہا۔ اُس نے کسی قسم کی حاشیہ آرائی نہیں کی۔ اگر اقبال کو وہ پُراسرار چہرہ ضرورت سے زیادہ خوش فکر اور باریک بین نظر آ رہا تھا۔ تو اس میں کرنل کا کوئی قصور نہ تھا۔

آخر گفتگو انجام کو پہنچی۔ کرنل نے صرف اتنا جواب دیا۔ کہ اسے اپنے ڈیپارٹمنٹ میں ایک بے غرض اور خود اعتماد نوجوان کی ضرورت تھی۔ اور وہ خوش تھا۔ کہ اقبال میں کم وبیش یہ خصوصیات موجود تھیں۔ لیکن کوئی فیصلہ کن اور قطعی بات نہیں کہہ سکتا تھا۔

اقبال نے مسکرا کر سر ہلایا۔ اور نہایت ادب سے کرنل سے ہاتھ ملاتے ہوئے بولا "نوکری ملے یا نہ ملے۔ میرے لئے یہ بات کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتی مجھے آپ جیسی ہستی سے ملاقات کا موقعہ مل گیا۔ یہی کچھ کم نہیں"

وہ وداع ہوا۔

جونہی وہ باہر آیا۔ کرنل نے اپنی خوش اخلاقی کا ایک اور ثبوت بہم پہنچایا۔ "سردی بہت ہے۔ میرے پاس ایک دوسرا اوورکوٹ ہے۔ اگر آپ کو اعتراض نہ ہو۔ تو شوق سے لیجائیے۔ کل آفس میں بھجوا دیجئے گا۔"

اقبال کی عزت افزائی اس سے زیادہ اور کیا ہو سکتی تھی۔ ملازم اوورکوٹ لے آیا۔ کرنل نے خود پہنانے میں امداد کی۔ اور کہا "یہ آپ کے جسم پر خوب جچتا ہے"

اندھیرے میں غائب ہو کر اقبال نے کوٹ کا کالر اوپر اٹھا لیا اور جیبوں میں ہاتھ ڈال کر اکڑتا ہوا چلا۔ جیسے کوئی بھولا بھٹکا سپاہی رات کسی آرام دہ کٹیا میں بتا کر صبح میدانِ جنگ کو واپس جا رہا ہو۔

چند قدم چلنے کے بعد اُس نے دیکھا۔ کہ بائیں جیب کے کونے میں ایک دونی پڑی ہے۔ اُسکے دل میں آئی۔ کہ واپس دے آئے لیکن پھر سوچا۔ "پڑی رہنے دو۔ کونسی بڑی رقم ہے؟" لیکن اس کے ساتھ ہی اس نے دوسری جیبیں بھی ٹٹولنا شروع کر دیں۔ جب اندر کی جیب میں ہاتھ پہنچا۔ تو دیکھا۔ کہ ایک پانچ روپئے کا نوٹ اور کچھ نقدی پڑی ہے۔ اقبال نے خیال کیا۔ کہ اب پیسے واپس نہ کرنا زیادتی ہے۔ لوٹ کر پھر دستک دی۔ اس بار خشک سے لہجے میں جواب آیا۔ "کون۔"

لڑکے لڑکیاں پھر آ گئے تھے۔ ریڈیو پھر بج رہا تھا۔ غیر متوقع طور پر اسے دیکھ کر وہ مبہوت ہو گئے۔ اور کرنل کی نظریں بھی صاف بتا رہی تھیں۔ کہ اس وقت اقبال کا آنا اسے بہت برا لگا ہے۔

ان کے شکوک پر جلد از جلد پانی پھیر دینے کے مقصد سے اقبال نے وہ نوٹ اور پیسے کرنل کو پیش کئے۔ "یہ آپ کے کوٹ میں پڑے تھے۔"

کرنل نے آنکھیں پھاڑ کر روپیوں کی جانب دیکھا۔

"یہ کہاں سے آ گئے؟ یہ تو پرانا کوٹ ہے۔ میں نے کبھی پہنا ہی نہیں"

باہر والی جیب میں ایک دونی پڑی تھی۔ سوچا ہضم کر جاؤں لیکن جب اندر کی جیب سے یہ رقم برآمد ہوئی۔ تو واپس کرنا ہی مناسب سمجھا۔"

اس کا یہ ریمارک، کسی کے ہونٹوں پر مسکراہٹ نہ لا سکا کرنل نے صرف اتنا کہا "تھینک یو"

ادائیگی فرض کے بعد اقبال نے کالر اوپر اٹھا یا۔ اور پھر اندھیرے میں تیز روی سے چلنا شروع کر دیا۔ مگر اب وہ پہلے جیسا شاداں و فرحاں نہیں تھا۔ اسکے دل میں شبہات جڑ پکڑ رہے تھے۔ دوسری ملاقات میں وہ بات باقی نہیں رہی تھی۔ گویا اُسے دوبارہ گھسنے کا کوئی حق ہی نہ تھا۔ نہیں نہیں محض اچنبا تھا۔ روکھا پن نہیں تھا۔ دوسری بار جانا بھی تو غیر ضروری تھا۔ پیسے کل دیئے جا سکتے تھے۔ یا نہ بھی دئے جاتے۔ تو کیا تھا۔ کرنل کو تو یاد بھی نہ تھے۔ نہ ۔ ۔ ۔ نہ بعض اصول ایسے ہوتے ہیں۔ جن پر عمر بھر عمل کرنا لازمی ہے۔ ہو سکتا ہے۔ کہ یہ ایثار بھی ملازمت دلانے میں ممد ہو۔

دل میں ایک عجیب وغریب بحث چھڑ گئی۔ انہی پانچ روپوں سے بخوبی سینما دیکھا جا سکتا تھا۔ کوئی فلم دیکھے۔ مہینے گزر گئے تھے۔ اس کے بعد کسی ریسٹوران میں جا کر مرغن اور لذیذ کھانا

کھاتا۔ فروٹ کریم، سے لطف اندوز ہوتا۔ نہ کرنل کی امارت اور نہ اس کی مفلسی میں ان پانچ روپوں سے کوئی فرق پڑتا۔ دنیا میں بس یہی ایسے پانچ روپے تھے۔ جو غریبی کو اسکے ذہن سے بھلا سکتے تھے۔

خدا جانے نوکری ملے گی بھی کہ نہیں۔ بڑے لوگوں کے التفات کا کیا بھروسہ۔ کتنا گدھا پن کیا بے لگام ہو کر بکتا چلا گیا۔ کبھی ایسی بے وقت اور احمقانہ جذباتی باتوں سے حکام بھی مرعوب ہوئے ہیں؟ یہ بھی تو ممکن ہے۔ کہ کرنل پہلے ہی اپنے کسی رشتہ دار کو اس جگہ کے لئے منتخب کر چکا ہو۔ کیا اہل ثروت عزیزوں کو نظر انداز کر تماشہ نہیں دیکھتے؟ اسکے کتنے ہی ایسے بڑبولے دوست تھے۔ جو کالج کے دنوں میں بڑے بڑے عہد و پیمان کیا کرتے تھے۔ اور اب موٹروں پر بیٹھے منہ پھیر کر نکل جاتے تھے۔ کل پھر دن چڑھے گا۔ اور اسے بے شمار مصائب کا سامنا کرنا ہوگا۔ لیکن یہ پانچ روپے کم از کم اس ایک رات کا آرام اور "لذت" تو خرید سکتے تھے۔ ان کے بل پر چند دن توجین کی بانسری بجائی جا سکتی تھی۔ پھر تو نوکری مل ہی جائے گی۔ ورنہ اولاً کرنل کو اسے گھر بلانے اور اتنا بیا اس قدر شرافت سے پیش آنے کی کیا ضرورت تھی؟ اگر حوصلہ افزائی مقصود نہ ہوتا۔ تو غیر متعلق باتیں کیوں کرتا؟ کیا جذبۂ رحم و کرم دنیا سے بالکل ہی اٹھ گیا ہے؟ ہرگز نہیں۔ دوسری بار بھی کرنل کا رویہ ایسا بیگانگی آمیز نہیں تھا۔ جیسا اُسے محسوس ہو رہا ہے

اسی طرح امید و بیم کی وادیوں میں بھٹکتا وہ چلا جا رہا تھا۔ اگر کوئی بھکاری ہاتھ بڑھا دیتا تھا۔ تو اقبال سوچنے لگتا۔ کہ ان پانچ روپوں سے پچیس بھکاریوں کو سیر کیا جا سکتا تھا۔ اور پھر ... پھر ایک خاتم دوراں، شہنشاہ کی مانند وعائیں لے کر سو رہتا۔

وہ پانچ روپے اسکے اعصاب پر سوار معلوم ہوتے تھے۔ کیونکہ اس کی رائے میں وہ کسی ایک شخص کی ملکیت نہ تھے۔ وہ پھولوں کی طرح دنیا میں کھلنے کھیلنے آئے تھے۔ مگر اپنی بے وقوفی سے اس نے انہیں پھر جیل میں ڈال دیا تھا۔ وہ روپے کیا نہیں کر سکتے تھے؟ مہینہ بھر اس کی کوٹھڑی میں برقی لیمپ روشن کیا جا سکتا تھا۔ کئی ماہ تک وہ علی الصبح رخسار محبوب سے سرخ کاشمیری سیب کھا سکتا تھا سولہ جرابیں خریدی جا سکتی تھیں۔ پانچ نکٹائیاں لائی جا سکتی تھیں۔

بتدریج بازار گھنے ہوتے گئے۔ بیمی دھمی شیشے کی کھڑکیاں پیچھے رہ گئیں۔ موٹروں کے ہارن کی جگہ تانگوں کی گھنٹیاں سنائی دینے لگیں۔ بھیڑ اور غلاظت میں اضافہ ہونے لگا۔

اقبال نے حسب معمول ایک نانبائی کی دوکان میں قدم رکھا۔ چھوٹے سے بکس کا تالہ کھولا۔ اور گھی نکال کر دوکاندار کے حوالے کر دیا۔ کھانا کھانے کے بعد سنلائٹ صابن کی گھسی ہوئی ٹکیا سے ہاتھ دھو کر پاس لٹکتے ہوئے گیلے اور بدبودار تولیے سے پونچھ ڈالے۔ تب اوورکوٹ کے بٹن کھول کر سوٹ والے کوٹ کی جیب میں پیسے نکالنے کے لئے ہاتھ ڈالا۔ لیکن اوہ بیچارہ عالم تحیری میں اپنا ہی خزانہ کرنل کو سونپ آیا تھا۔

مترجم:- بلال احمد

آرٹسٹ اپنے ذاتی محاسن آرٹ میں منتقل کر دیتا ہے۔ چنانچہ آرٹ جس قدر دلچسپ ہوتا ہے آرٹسٹ اسی قدر غیر دلچسپ ہے

آرٹ، آرٹسٹ کی ملکیت نہیں ارباب ذوق کا مشترکہ سرمایہ ہے۔

تخلیق سے ایک قلبی راحت ایک دماغی مسرت حاصل ہوتی ہے۔ یہی آرٹ کا مقصد ہے۔

آرٹسٹ نقاد کے وضع کردہ اصولوں کا پابند نہیں ہو سکتا۔

راجندر سنگھ بیدی

گھر میں، بازار میں

دیوار پر لٹکتے ہوئے شیکوشا نے صبح کے آٹھ بجا دیئے۔ درشی نے آنکھ کھولی اور ایک سوالیہ نگاہ سے ننھے آبنوسی کلاک کی طرف دیکھا جس کی آٹھ شیریں ضربیں اُس کے ذہن میں گونج پیدا کرتی ہوئی ہر لحظہ مدھم ہو رہی تھیں ...... ایک گھٹیا سا قالین تھا اور یہی ایک کلاک جو درشی کے استاد نے اُسے شادی کے موقعہ پر بطور تحفہ دیا تھا۔ شاید وہ چاہتا تھا کہ اس کی شاگرد ایک اچھی بیٹی ہونے کے علاوہ ایک اچھی بیوی بھی ثابت ہو جائے ...... اور ہر روز صبح شیکوشا اپنے مستقل طنزیہ انداز میں مسکراتا ہوا کہہ دیتا۔

"میں سب کچھ جانتا ہوں، لیکن اب تو آٹھ بج گئے ہیں، سست لڑکی!"

درشی کا پورا نام تھا پریہ درشنی۔ پریہ کا مطلب ہے پیاری اور درشی کا مطلب ہے — دیکھنے میں اچھی جو دیکھنے میں پیاری لگے، دل کو بھائے، آنکھوں میں نشہ پیدا کرے — شاید اسی لئے درشی کو رات بھر جاگنا پڑتا تھا۔ اور شیکوشا سے نظریں چرانا ہوتیں ......
درشی بچپن ہی سے طبعی طور پر نحیف اور ضرورت سے زیادہ حساس تھی۔ اور اب شادی کے بعد محبت کی بے اعتدالیوں سے وہ نسوں کی اور بھی کمزور ہو گئی۔

سسرال میں چند دن کے بعد جو سب سے بڑی دقت درشی کو پیش آئی۔ وہ اپنے خاوند رتن لال سے پیسے مانگنا تھی۔ اس سے پہلے وہ اپنے باپ سے بلا تامل پیسے مانگ لیا کرتی تھی۔ اور اگر کبھی وہ اپنے مربعوں کے کام میں چوک بھی جاتے تو درشی، ان کی لاڈلی بیٹی، انکے کوٹ کی جیب میں سے ضرورت کے مطابق نکال لیا کرتی۔ 'پاپا' کا کوٹ ہمیشہ زنانے میں کسی پیٹی کوٹ کے اوپر ٹنگا ہوا مل جاتا تھا۔ اپنے میکے سے جتنے پیسے وہ ساتھ لائی تھی وہ سب شگن کے پیسوں سمیت ایک خوبصورت طلائی گھڑی پر ختم ہو چکے تھے۔ خرچ کی یہ مدّ وہ رتن سے چھپانا نہیں چاہتی تھی۔ البتہ رتن سے ضرورت کے مطابق پیسے مانگتے ہوئے بھی شرماتی تھی۔ جب اُن کی روحوں کا ملاپ ہوگا، تب وہ پیسے مانگ لے گی۔ اس صورت میں وہ پیسے مانگ کر بکنا نہیں چاہتی۔

کئی دفعہ بازار میں کسی چیز کی خرید ہوتی تو درشی اپنی پتلی پتلی، نازک، کانپتی ہوئی انگلیاں اپنے صابر کے خوبصورت لیکن خالی بٹوے میں ڈال دیتی اور کہتی ——

"چھوڑیئے، رہنے دیجئے ...... پیسے میں دوں گی"

رتن لال اسی وقت درشی کا ہاتھ تھام لیتا۔ اور سینہ میں سے نظریں چُراتا ہوا، محبت کے انداز سے درشی کی طرف دیکھتا اور کہتا

"ایک ہی بات تو ہے، درشی"

اس وقت درشی محبت کی ایک پُرلطف ٹیس محسوس کرتے ہوئے چُپ ہو جاتی۔ اُسے یقین تھا کہ رتن کبھی بھی اُسے پیسے ادا کرنے نہیں دیگا۔ کیا وہ اُس کی بیوی نہیں ہے؟ آخر کیا اس کا فرض نہیں کہ وہ خود ہی اُس کے تمام چھوٹے موٹے خرچوں کا کفیل ہو؟

ان دنوں برسات شروع تھی۔ اور رتن کا برساتی کوٹ بہت پرانا ہو چکا تھا۔ بارش کے قطرے اس میں کسی نہ کسی طرح گھس ہی آتے تھے۔ اسے خریدنے کے لئے درشی اور رتن بازار گئے۔ سوادیشی کا سٹورز میں انہیں ایک اچھا سا کوٹ مل گیا۔ قیمت طے

ہونے سے پہلے ہی درشی نے حسبِ دستور بیگ کے بٹن کھول دیئے۔ اور بولی "پیسے میں دیتی ہوں، رہنے دیجئے"
روشن لال نے اپنے ہاتھوں میں دس کا نوٹ مسلتے ہوئے کہا۔

"اچھا، تو تمہارے پاس ریزگاری ہوگی؟"

درشی گھبرا گئی۔ اس کی ٹانگیں کانپنے لگیں۔ اس نے یونہی کچھ دیر کے لئے بیگ کو ٹٹولا۔ اور زبردستی مسکراتے ہوئے بولی۔

"اوہ! بھول گئی میں ——— ریزگاری تو میرے پاس بھی نہیں"

رتن لال نے اسی اثنا میں انگلی کے گرد نوٹ کے بہت سے چکر دے ڈالے اور عصبی طور پر کمزور درشی خاموش رہنے کی بجائے کہنے لگی "ریزگاری تو گھر ہی رہ گئی ——— میرے پاس تو پانچ پانچ کے نوٹ ہونگے"

درشی نے غالباً یہی سمجھا کہ رتن لال پھر ایک دفعہ میٹھی نگاہ سے اس کی طرف دیکھ لیگا۔ اور پھر پیسوں کی ادائیگی کا سوال ہی نہیں اُٹھیگا لیکن وہ یہ بھول ہی گئی کہ شادی کو ایک ماہ سے کچھ زیادہ عرصہ ہو چکا ہے اور اب تکلف کی چنداں بات نہیں رہی۔ رتن نے کوٹ کو اتارتے ہوئے کہا۔

"تو اچھا، پانچ پانچ کے دو نوٹ ہی دیدو، یہ لو، رکھ لو دس کا نوٹ"

اس وقت درشی کے کان گرم ہوگئے۔ جسم پر سینکڑوں چیونٹیاں رینگنے لگیں۔ اس نے بلاوجہ برساتی کو ادھر اُدھر اُلٹنا شروع کیا۔ برساتی کے ایک کنارے پر سوراخ تھا۔ اس سوراخ میں اُسے نجات کی راہ دکھائی دی۔ جس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اس نے نہایت خشمگیں انداز سے کہا۔

"یہ تو پھٹی ہوئی ہے ——— کوڑی کام کی نہیں یہ"

اور پھر دوکاندار کو مخاطب ہوتے ہوئے اسی لہجہ میں بولی "بھلا آپ نے ہمیں کیا سمجھ رکھا ہے جی، جو پھٹا وا کوٹ ہمیں مڑھ رہے ہیں"

سیلزمین بالکل گھبرا گیا اور فوراً نئے کوٹ لینے کے لئے دوکان کے اوپر چلا گیا۔ درشی کی برہمی کی وجہ سے رتن بھی سہم سا گیا۔ اور ایک مصنوعی غصے سے دوکاندار کی طرف دیکھنے لگا۔ اسی وقت درشی نے رتن کو بازو سے پکڑا اور باہر لے آئی۔ سامنے سیڑھی پر سیلزمین برساتیوں کے بوجھ سے لدا ہوا اسٹاک روم سے نیچے اتر رہا تھا۔ لیکن اس کی حیرانی کی حد نہ رہی جب اُس نے دیکھا کہ وہ حسین جوڑا نظروں سے غائب ہو چکا تھا۔ . . . .

رتن نے دیکھا۔ درشی کے منہ پر سیاہی بکھر گئی تھی اور ماتھے پر ایک بڑے سے قرمزی دھبے میں سے لپسینے کے قطرے بے تحاشہ اُمڈ رہے تھے۔ بازار سے لیکر گھر تک اس کی بیوی لکنت بھری باتیں کرتی رہی اور رتن اس کی ایک بات کا بھی مطلب نہ سمجھا۔ اور جب اس نے تانگے پر سے ہاتھ دیکر درشی کو اتارا تو اُسے معلوم ہوا کہ درشی کے ہاتھ پاؤں ٹھنڈے ہو رہے تھے . . . . اور چونکہ وہ عورت کے ایک سیدھے سادے تسلسل کی ایک کڑی کھو بیٹھا۔ اس نے مرد کی دیرینہ عادت کے مطابق کہنا شروع کیا ——— عورت ایک معما ہے! شوپنہار بھی کہتا تھا . . . . .

——— (۲) ———

اگلے دن درشی سو کر اُٹھی تو آٹھ کی بجائے آٹھ پینتیس ہو چکے تھے۔ اور سورج ان کے دریچہ پر آگیا تھا۔ اس کی شعاعیں کلاک کے شیشے میں سے منعکس ہوتی ہوئی درشی کے چہرے پر پڑنے لگی تھیں۔ کلاک کے بڑے بڑے رومن ہندسوں میں خالی سفید جگہ بڑے بڑے دانت بن گئی تھی۔ یوں دکھائی دیتا تھا جیسے شیکو شا طنز کی حد سے گذر چکا ہے اور کھلکھلا کر ہنس رہا ہے۔

. . . . . اور شیکو شا اکیلا ہی نہ تھا۔ اس کے ساتھ گلو کی ماں بھی تو شریک ہو گئی تھی۔ گلو کی ماں رتن کے ہاں نوکرانی تھی۔ وہ ایک بیوہ عورت تھی۔ صبح جب وہ چائے لیکر آئی تو رانی جی کو یوں تھکے تھکے دیکھ کر "جی جی . . . . جی جی" کے انداز سے ہنسنے لگی۔ گویا کہہ رہی ہو ہم بھی بہت دن گئے جاگا کرتی تھیں۔ ہماری آنکھوں میں بھی خمار ہوتا تھا۔ اور اب تو راتوں کو جگانے والے بھگوان کے دوارے ہی چلے گئے۔ آہ! مجھے وہ دن یاد ہے جب وہ میرے پلنگ کے لئے بہت سندر گوٹا اور کنگری لائے تھے ———

——— اس دن تو وہ پہلے اندر ہی نہیں آئے۔ دروازے پر ہی کھڑے مسکراتے رہے۔ اور جب اندر آئے تو ان کا بات کرنے کا ڈھنگ بھی عجیب تھا۔ اور وہ گوٹا دیکھ کر میری سب تکان اتر گئی تھی۔

درشی نے چلاتے ہوئے کہا: "گلو کی ماں!"

گلو کی ماں کے لبوں پر تبسم نہیں رہا صرف اسکا سایہ رہ گیا۔ ہلکی سی سرخی سے اس کا رنگ سپیدی، اور سپیدی سے زردی اور سیاہی مائل ہو گیا۔ اور وہ حیرت سے کلاک کی ٹک ٹک کو سننے لگی۔ درشی کے لیے وہ معمولی ٹک ٹک ہتھوڑے کی ضربوں سے کم نہ تھی۔ استاد کی عزت ملحوظ خاطر نہ ہوتی تو وہ پتھر مار کر اس کی ٹک ٹک کو روک دیتی . . . . . گلو کی ماں سوچ رہی تھی۔ آخر مالکن کیوں خفا ہو رہی ہے۔ حالانکہ رتن بابو نے اسے ایک نئی ساڑی خرید کر لا دی ہے۔ جس پر پورا ایک ہاتھ چوڑا طلائی بارڈر لگا ہے۔ اور اس کے اندازے کے مطابق اس کی تمام تھکاوٹ دور کر دینے کے لئے کافی ہے۔

درشی نے کہا: "آج پھر تو نے مجھ پھر چائے کے پانی میں دودھ کی گاگر انڈیل دی"۔

گلو کی ماں نے سہمے ہوئے کہا: "رتن بابو نے کہا تھا، رانی"

"کیا کہا تھا بھلا انہوں نے؟"

"کہا تھا ——— رانی بیمار ہے"۔

گلو کی ماں نے ٹرے اٹھائی اور آنکھوں سے ایک ہاتھ چوڑے طلائی بارڈر کو دیکھتی اور دل میں بھگوان کو کوستی ہوئی چلی گئی۔ درشی سوچنے لگی کیا رتن کو اس کی کمزوری کا پتہ چل گیا ہے۔ اسی لئے تو وہ اس قسم کی چائے کو میرے لئے غیر مفید سمجھنے لگا ہے۔ اور کیا معلوم جو اس نے سوتے میں میرے بیگ کی تلاشی بھی لی ہو۔ اس نے زناٹے سے ایک ہاتھ سرہانے کے نیچے مارا۔ بیگ موجود تھا۔ اور تھا بھی جوں کا توں بند۔

——— بیگ کے ایک کونے میں جھومروں کی ایک جوڑی پڑی تھی درشی جھومروں کی بہت شوقین تھی۔ لیکن اس کے بیاہ میں جتنے بھی زیور دیئے گئے تھے وہ سب کے سب وزنی تھے اور دیہاتی طرز کے بنے ہوئے۔ اکیلے جھومر ہی ڈیڑھ تولہ کے تھے۔ درشی جانتی تھی۔ کہ رتن ان لمبے جھومروں کو پہنے ہوئے دیکھ کر بہت خوش ہوتا ہے۔ وہ خود بھی رتن کو خوش رکھنا چاہتی تھی۔ لیکن اس بات کا کیا علاج۔ کہ وزنی جھومر پہننے سے اسے اپنے کان ٹوٹتے ہوئے محسوس ہوتے تھے۔ اور وہ انہیں نصف گھنٹہ سے زیادہ دیر تک نہیں پہن سکتی تھی۔

پھر یہ درشی کی خواہش تھی کہ وہ ہلکے سے جھومر خرید لیتی۔ یہی کوئی سستی سی جوڑی۔ لیکن ان کے لئے وہ رتن سے پیسے نہ مانگے گی۔ تاوقتیکہ وہ خود اپنے فرض کو محسوس کرتا ہوا پیسے اس کے ہاتھ میں نہ دیدے۔

معاً اسکا خیال پاپا کی طرف چلا گیا۔ ان سے تو وہ پیسے لڑ کر بھی مانگ لیتی تھی۔ کیسی خیال کے آنے سے درشی اٹھی۔ اور اپنے ہی کمرے میں جب اس نے الماری کھولی تو اس کی جارجٹ کی ساڑی کے اوپر رتن کا کوٹ ٹنگا ہوا تھا . . . . . درشی کے منہ پر ایک سرخی کی لہر دوڑ گئی۔ اس نے سوچا تمام مرد ایک ہی سے لاپرواہ ہوتے ہیں۔ یہی مردوں کا جوہر ہے۔ اور پھر زنانے میں پٹی کوٹ یا جارجٹ

کی ساڑی تھما دی۔ پر اپنا کوٹ شاید عمداً بھول جانے کا کیا یہ مطلب نہیں کہ اس کوٹ کے ساتھ جیسا سلوک مناسب سمجھا جائے، کیا جائے گویا کوٹ زبانِ حال سے کہہ رہا ہو "میں نے تجھے مسل ڈالا ہے، تو اس کے عوض میں میری جیبیں کاٹ ڈال" درشی نے دروازے پر نظر گاڑے جیب میں ہاتھ ڈالا تو اس کے ہاتھ میں دس دس کے چار نوٹ اور کچھ ریزگاری آگئی۔ اس نے سوچا اگر وہ اس میں سے ضرورت کے مطابق کچھ اڑا لے تو رتن کیا کہے گا . . . . لیکن . . . . چوری تو ایک ذلیل حرکت ہے . . . . . ابھی تو روحوں کا ملاپ نہیں ہوا۔ . . . . . وہ یوں جیب میں سے پیسے اڑا کر بیوانہ کہلائے گی۔

———(۳)———

دو تین دن تک درشی کو ہری پال پورا اپنے مربعوں سے بذریعہ تار سو روپے آچکے تھے۔ ٹنگن کے کچھ اور روپے اکٹھے ہوگئے۔ انہوں نے بہت حد تک درشی کی عصبی کمزوری کو آرام پہنچایا۔ گگو کی ماں بھی خوش تھی اور بھگوان کو کم یاد کرتی تھی۔ درشی نے کئی مرتبہ رتن کو کہا کہ بازار جا کر برساتی کوٹ خرید لینا چاہیئے۔ برسات کے بعد اس کا کیا فائدہ ہوگا۔ لیکن چند دنوں سے رتن لال اپنے دفتر میں اسمبلی کے لئے ہندسے تیار کر رہا تھا۔ اور اُس کے لئے اسے بارش، دھوپ، ساڑی کسی چیز کی پروا نہ تھی۔ اور اس بات نے درشی کو بہت غمگین کر دیا تھا۔

ایک شام رتن گھر واپس آیا۔ تو درشی کی حیرانی کی حد نہ رہی۔ اس کے ہاتھ میں جھومروں کی ایک جوڑی تھی۔ جو کہ تھی بھی بہت ہلکی اور جدید فیشن کی۔ درشی خوش نہیں ہوئی۔ کیونکہ وہ جھومر اس نے خود نہیں خریدے تھے۔ رتن نے انہیں اپنی خاطر خریدا تھا۔ وہ خود بھی تو اُسے جھومر پہنے ہوئے دیکھ کر خوش ہوتا تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ مرد کبھی بھی عورت کی فرمائش پر زیور خریدنا پسند نہیں کرتے بلکہ اُن کو اپنے لئے سجانے کو خریدتے ہیں۔ درشی کو تسکین ہوئی بھی تو محض اسی لئے کہ رتن انہیں خود بخود خرید لایا۔ اور ایسا کرنے میں اُس نے اپنی فرض شناسی کا ثبوت دیا۔

جھومروں کی جوڑی کو ہاتھ میں لیتے ہوئے وہ طنزیہ انداز سے بولی۔

"ختم ہوگئے آپ کے ہندسے؟"

"ختم ہوگئے"

رتن نے درشی کا ہاتھ پکڑا تو اس نے جھٹکے سے چھڑا لیا۔ بولی "اب میرے ہندسے شروع ہیں۔ سردیاں آنے والی ہیں کم سے کم تین بھتیجوں کے لئے سویٹر بننے ہیں"

رتن نے پھر ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا "تو کیا تمہیں جھومر پسند نہیں؟"

"جھومر؟ ——— اوہ! ہاں" درشی منہ پھلاتے ہوئے بولی "آپ نے بہت تکلیف کی"

مشیکو شاید بدستور مسکرا رہا تھا۔ وہ محض ایک کلاک ہی نہیں تھا۔ چوبیس گھنٹے متواتر ٹک ٹک ٹک ٹک کرنے والا۔ وہ درشی کا استاد بھی تھا۔ جس کے ڈائل اور سوئیوں نے درشی کو ایک اچھی لڑکی کے طور پر دیکھا تھا۔ اور اب شاید ایک اچھی بیوی کی صورت میں دیکھنا چاہتا تھا۔

رتن پہلی کڑی کھو دینے سے منزلِ مقصود پر نہ پہنچ سکا۔ وہ درشی کے باتوں میں طنز نہ پا سکا۔ تو وہ اس انداز میں بولی۔

"آپ تو یونہی میرے لئے پیسے برباد کرتے ہیں ——— بھلا اور بھی کوئی ایسے کرتا ہے؟"

رتن پھٹی پھٹی آنکھوں سے درشی کے خوبصورت چہرے کی طرف دیکھنے لگا۔ اگر درشی اُسی وقت وہ جھومر اپنے کانوں میں ڈال

یعنی۔ تو دنیا کی تاریخ کسی اور ہی ڈھب سے لکھی جاتی۔ رتن کی زخم خوردہ فردیت کو سہارا دینے یا بچانے کے لئے اس نے نہ صرف جھومیے۔ بلکہ اپنی گردن کو عجب انداز سے اِدھر اُدھر ہلا دیا۔ اور رتن ایک ایماندار آدمی کی طرح اس کی گردن اور اس کے ہلتے ہوئے جھومروں کے متعلق سوچنے لگا۔

یوں معلوم ہوتا تھا جیسے ابھی تک درشی کی تسلی نہیں ہوئی۔ وہ بولی۔

"کیا لاگت اُٹھی ہے اس پر؟"

کوئی بہت نہیں۔"

"تو بھی"

"ساڑھے اکتیس روپے۔"

درشی نے اپنے صابرے بیگ کو ٹٹولنا شروع کیا۔ رتن ایک لمحہ کے لئے ٹھٹک گیا۔ وہ شاید اس بات کو مذاق سمجھ کر جانے دیتا لیکن درشی کے چہرے نے اسے مذاق کی حدود سے بلند و بالا اُٹھا دیا تھا...... کچھ دیر بعد رتن نے اندھیرے میں اپنے پاؤں تلے زمین محسوس کی۔ گویا کوئی کھوئی ہوئی گڈی اس کے ہاتھ آگئی ہو۔ اس نے اپنی جیب میں سے تمام نقدی نکالی اور اندھیرے میں درشی کے قدموں پر رکھتے ہوئے بولا "تم اُس دن اپنی کسی ضرورت کا ذکر کر رہی تھیں ——— لو یہ اپنی مرضی سے خرچ کر لینا!"

درشی نے ایک ثانیہ کے لئے سوچا۔ رتن نے ایسا کرنے میں عورت کو سب سے بڑی گالی دی ہے ——— "بیسوا!"

(۴)

بیاہ کو ایک دو سال گزر گئے۔ لیکن دونوں کی روحوں میں کوئی خاص بالیدگی نہیں آئی۔ بلکہ رتن اب کچھ کھچا کھچا سا رہنے لگا۔ اس عرصہ میں درشی بیوی کے تمام ہنر سے واقف ہو چکی تھی۔ وہ حساس ویسے ہی تھی۔ آج تک اس نے کھلے بندوں رتن سے پیسے نہیں مانگے تھے۔ وہ بسا اوقات اپنی کمزوری پر اپنے آپ کو کوسا کرتی۔ عموماً یوں ہوتا کہ بچے کے فراکوں یا اُسے کیلشیم دینے کا ذکر ہوتا تو وافر پیسے مل جاتے اور پھر رتن اس کی ضرورت اور اپنے شوق سے متاثر ہو کر خود بھی اُسے کچھ نہ کچھ لا دیا کرتا۔ ہری پال پور میں بھی آنا جانا بنا ہی ہوا تھا۔ اگرچہ درشی کی ماں سوتیلی تھی۔ باپ تو سوتیلا نہیں تھا۔ بڑا بھائی ایگزکٹو انجینئر ہو چکا تھا۔ اور پھر دفتر اور ہندسوں کے بعد رتن کا کوٹ اس کے پیٹی کوٹ پر ٹنگا ہوتا........

اس ایک دو برس کے عرصہ میں شیکو شا کا چہرہ قدرے پیلا ہو گیا تھا۔ اس کی نگاہوں میں وہ پہلی سی شرارت اور طنز آمیز مسکراہٹ نہ رہی تھی۔ کبھی کبھی اس کا کوئی پرزہ خراب ہو جاتا تو اس کی مرمت کر دی جاتی۔

ایک دن رتن لال شب کو کسی دوست کے ہاں ٹھہر گیا۔ صبح واپس آیا تو درشی کو مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔

"آج صبح میں نے ایک واقعہ دیکھا ہے۔"

درشی نے بچے کو اس کی گود میں دیتے ہوئے کہا "کیا دیکھا ہے آپ نے؟"

رتن بولا "میں کہتا ہوں ——— یہ بازاری عورتیں کتنی بے حیا ہوتی ہیں۔ آج میں نے ایک ایسی عورت کو دیکھا۔ جس کے بال اُلجھے ہوئے تھے۔ جس کی آنکھیں خمار آلودہ تھیں۔ جسم سے بیمار دکھائی دیتی تھی۔ صبح صبح سر بازار اس نے ایک بابو کو کالر سے پکڑا ہوا تھا اور پیسے مانگ رہی تھی۔ وہ بابو بیچارہ کوئی بہت ہی شریف آدمی تھا۔ وہ چیختا تھا چلاتا تھا۔ کہتا تھا میں نے اسے ایک خوبصورت ساڑی لا کر دی ہے۔ گرگابی خرید دی ہے اور اب پیسے طلب کرتی ہے......

وہ بے غیرت بھرے بازار میں کہہ رہی تھی کہ وہ تو سب حسن کی نیاز ہے۔ اس نے اپنے لئے مجھے وہ ساڑھی پہنوائی تھی۔ اپنے لئے گرگابی ڈلوائی جسے پہنکر میں اس کے ساتھ لارنس باغ کی سیر کو گئی۔ لیکن مجھے پیسے چاہئیں۔ مجھے بھوک لگ رہی ہے، مجھے اپنے بچے کے لئے کپڑے چاہئیں، میں نے کرایہ دینا ہے، مجھے پوڈر کی ضرورت ہے . . . . . ."

اور اس کے بعد رتن ہنسنے لگا۔ بے معنیٰ بے مطلب ہنسی۔ اور اس عرصہ میں اپنا ہلوٹوں سے بھرا ہوا کالر چھپاتا رہا۔ اس بات کو سُنکر درشی کی ساری طبعی کمزوری واپس آگئی۔ درشی نے محسوس کیا اس میں جتنی کمزوریاں تھیں وہ بسیوا میں مفقود تھیں۔ وہ اس کے جسم کا بقیہ حصہ تھی جسے اپنے آپ میں محسوس کرتے ہوئے وہ ایک مکمل عورت ہوگئی تھی۔ درشی نے سر سے پاؤں تک شعلہ بنتے ہوئے کہا۔

"وہ بابو پاجی آدمی ہے ـــ کمینہ ہے . . . . . اور وہ بسیوا کسی گرہستن سے کیا بُری ہے؟"

رتن لال کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔ مشکوک نگاہوں سے اس نے درشی کے چہرے کا مطالعہ کرتے ہوئے کہا۔

"تو تمہارا مطلب ہے ــــ اس جگہ اور اس جگہ میں کوئی فرق نہیں؟"

درشی نے اُسی طرح بپھرے ہوئے کہا۔ "فرق کیوں نہیں! . . . . یہاں بازار کی نسبت شور کم ہوتا ہے۔"

ـــــ کلاک کی ٹک ٹک بند ہوگئی۔ رتن لال سوچنے لگا "عورت سچ مچ ایک معما ہے۔ اور شوپنہار نے . . . . . !"

۱۔ دنیا میں مجھے اگر ایک آدمی بھی ایسا مل جائے جو اپنے نفس کا غلام نہ ہو تو میں اُسکو اپنے دل کے معزز ترین گوشے میں جگہ دونگا۔ (شیکسپیر)

۲۔ دنیا انسان کے لئے ہے۔ نہ کہ انسان دنیا کے لئے۔ (علامہ اقبال)

۳۔ صرف وہی لوگ قابلِ احترام ہیں۔ جن کے اقوال و افعال انسانی ضروریات کے معاون ہوتے ہیں۔ اور ہم کو غارِ گمنامی سے نکال کر شہرت کی بلندی پر پہنچادیں۔ (لانگ فیلو)

۴۔ کسی شخص کی عظمت پر حسد نہ کرو۔ کیونکہ اس طرح تم اپنے کو بدترین خلائق ثابت کرتے ہو۔ اور تفاوت بشری کو اور زیادہ نمایاں (ہربرٹ)

۵۔ جس طرح سورج کی روشنی تاریک سے تاریک بادلوں کے باہر آجاتی ہے۔ اسی طرح جوہر شرافت میلے سے میلے اور بد سے بدتر لباس سے تاباں ہوتا ہے۔ (شیکسپیر)

۶۔ متردد انسان ہمیشہ ذراسی مصیبت کو بڑا محسوس کرتا ہے۔ اور اپنی حالت کو انجام کار بد سے بدتر بنا لیتا ہے (ڈکنس)

۷۔ جو شخص اپنی زبان کو محفوظ رکھتا ہے۔ وہ اپنی آبرو کو بچائے رکھتا ہے (حضرت علیؓ)

۸۔ موت کو آسان رکھو۔ کیونکہ موت کی تلخی صرف اس کے خوف سے پیدا ہوتی ہے۔ (ارسطو)

۹۔ عظمت کا دوسرا نام ارادہ ہے۔ (نپولین)

۱۰۔ بہت سی باتوں میں کامیابی صرف یہ خیال کرنے کی وجہ سے نہیں ہوتی۔ کہ کامیاب ہونے میں بڑا عرصہ لگے گا۔ (مانٹی گوبن)

۱۱۔ رات کو بھوکا سونا اچھا ہے۔ بہ نسبت اس کے کہ تم صبح کو قرض میں اُٹھو۔ (ٹیگور)

۱۲۔ زندگی میں اپنے دوستوں کا محتاج ہونے سے بہتر ہے کہ بعد مرگ اپنے دشمنوں کے لئے مال چھوڑ جاؤ۔ (افلاطون)

۱۳۔ عورت ایک گلاب کا پھول ہے۔ اور اس میں خودداری کا ایک چھوٹا سا کانٹا لگا ہوتا ہے۔ (ٹینی سن)

۱۴۔ ہماری سب سے بڑی خوبی کبھی نہ گرنے میں نہیں بلکہ ہر دفعہ گرجانے کے بعد اُٹھنے میں ہے۔ (گولڈسمتھ)

۱۵۔ دنیا میں اس کے لئے کوئی بات ناممکن نہیں جو کوشش کرے۔ (سکندر اعظم)

سعادت حسن منٹو

بانجھ

میری اور اس کی ملاقات آج سے ٹھیک دو برس پہلے اپولو بندر پر ہوئی۔ شام کا وقت تھا۔ سورج کی آخری کرنیں سمندر کی اُن دور دراز لہروں کے پیچھے غائب ہو چکی تھیں۔ جو ساحل کے بنچ پر بیٹھ کر دیکھنے سے موٹے کپڑے کی تہیں معلوم ہوتی تھیں۔ میں گیٹ اوف انڈیا کے اس طرف پہلا بنچ چھوڑ کر جس پر ایک آدمی چمپی والے سے اپنے سر کی مالش کرا رہا تھا۔ دوسرے بنچ پر بیٹھا تھا اور حدِ نظر تک پھیلے ہوئے سمندر کو دیکھ رہا تھا۔ دُور بہت دُور، جہاں سمندر اور آسمان گھل مل رہے تھے۔ بڑی بڑی لہریں آہستہ آہستہ اُمڈ رہی تھیں۔ اور ایسا معلوم ہوتا تھا۔ کہ ایک بہت بڑا گدلے رنگ کا قالین ہے۔ جسے اُس طرف سے اِدھر کو سمیٹا جا رہا ہے

ساحل کے سب قمقمے روشن تھے۔ جن کا عکس کنارے کے لرزاں پانی پر کپکپاتی ہوئی موٹی موٹی لکیروں کی صورت میں جگہ جگہ رینگ رہا تھا۔ میرے پاس پتھریلی دیوار کے نیچے کئی کشتیوں کے پیٹے ہوئے بادبان اور بانس ہولے ہولے حرکت کر رہے تھے۔ فضا میں سمندر کی لہروں اور تماشائیوں کی آواز ایک گنگناہٹ بن کر گھلی ہوئی تھی۔ کبھی کبھی کسی آنے یا جانے والی موٹر کے ہارن کی آواز بلند ہوتی۔ اور ایسا معلوم ہوتا۔ کہ بڑی دلچسپ کہانی سننے کے دوران میں کسی نے زور سے "ہوں" کی ہے۔

ایسے ماحول میں سگریٹ پینے کا بہت مزا آتا ہے۔ میں نے جیب میں ہاتھ ڈال کر سگریٹ کی ڈبیا نکالی۔ مگر ماچس نہ ملی۔ جانے کہاں بھول آیا تھا۔ سگریٹ کی ڈبیا واپس جیب میں رکھنے ہی والا تھا۔ کہ پاس سے کسی نے کہا: "ماچس لیجئے گا"

میں نے مڑ کر دیکھا۔ بنچ کے پیچھے ایک نوجوان کھڑا تھا۔ یوں تو بمبئی کے عام باشندوں کا رنگ زرد ہوتا ہے۔ لیکن اُس کا چہرہ خوفناک طور پر زرد تھا۔ میں نے اُس کا شکریہ ادا کیا۔ "آپ کی بڑی عنایت ہے"

یہ سُن کر اُس نے ماچس کی ڈبیا جو اُس کے ہاتھ ہی میں تھی میری طرف بڑھا دی۔ میں نے پھر شکریہ ادا کیا۔ اور کہا۔ "تشریف رکھئے"

اُس نے جواب دیا "آپ سگریٹ سُلگا لیجئے، مجھے جانا ہے"

مجھے ایسا محسوس ہوا۔ کہ اُس نے جھوٹ بولا ہے، کیونکہ اُس کے لہجے سے اس بات کا پتہ چلتا تھا۔ کہ اُسے کوئی جلدی نہیں ہے اور نہ اُسے کہیں جانا ہے۔ آپ کہیں گے۔ کہ لہجے سے ایسی باتوں کا پتہ کیسے چل سکتا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے۔ کہ مجھے اُس وقت ایسا ہی محسوس ہوا۔ چنانچہ میں نے ایک بار پھر کہا۔ "ایسی جلدی کیا ہے — تشریف رکھئے"۔ اور یہ کہہ کر میں نے سگریٹ کی ڈبیا اُس کی طرف بڑھا دی۔ "شوق فرمائیے"۔

اُس نے سگریٹ کے چھاپ کی طرف دیکھا۔ اور جواب دیا۔ "شکریہ، لیکن میں اپنا برانڈ پیا کرتا ہوں"

آپ مانیں یا نہ مانیں۔ مگر میں قسمیہ کہتا ہوں۔ کہ اس بار اُس نے پھر جھوٹ بولا۔ اس مرتبہ پھر اُس کے لہجے نے چغلی کھائی۔ اور مجھے اُس سے دلچسپی پیدا ہو گئی۔ اس لئے کہ میں نے اپنے دل میں قصد کر لیا تھا کہ اُسے ضرور اپنے پاس بٹھاؤنگا۔ اور اُسے اپنا سگریٹ پلاؤنگا میرے خیال کے مطابق اس میں مشکل کی کوئی بات ہی نہ تھی۔ کیونکہ اُسکے دو جملوں ہی نے مجھے بتا دیا تھا۔ کہ وہ اپنے آپ کو دھوکا دے رہا ہے۔ اُس کا جی چاہتا ہے۔ کہ میرے پاس بیٹھے۔ اور سگریٹ پیئے۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ اُس کے دل میں یہ خیال بھی پیدا ہوتا ہے۔ کہ وہ میرے پاس نہ بیٹھے۔ اور میرا سگریٹ نہ پیئے۔ چنانچہ ہاں اور نہ

کا یہ تضاد مُ اُس کے لہجے میں صاف طور پر مجھے نظر آیا تھا۔ آپ یقین جانئیے۔ کہ اُس کا وجود بھی ہونے اور نہ ہونے کے بیچ میں لٹکا ہوا تھا

اُس کا چہرہ جیسا کہ میں بیان کر چکا ہوں۔ بے حد پیلا تھا، اس پر اُس کی ناک آنکھوں اور منہ کے خطوط اس قدر مدغم تھے کہ معلوم ہوتا تھا۔ کسی نے تصویر بنائی ہے اور اُس کو پانی سے دھو ڈالا ہے۔ کبھی کبھی اُس کی طرف دیکھتے دیکھتے اُسکے ہونٹ اُبھر سے آتے۔ لیکن پھر راکھ میں لپٹی ہوئی چنگاری کے مانند سو جاتے۔ اُسکے چہرے کے دوسرے خطوط کا بھی یہی حال تھا۔ آنکھیں گدلے پانی کی دو بڑی بڑی بوندیں تھیں۔ جن پر اُس کی چھدری پلکیں جھکی ہوتی تھیں بال کالے تھے۔ مگر اُن کی سیاہی جلے ہوئے کاغذ کے مانند تھی۔ جس میں بھوسلا پن بھی ہوتا ہے۔ قریب سے دیکھنے پر اُس کی ناک کا صحیح نقشہ معلوم ہو سکتا تھا۔ مگر دور سے دیکھنے پر وہ بالکل چپٹی معلوم ہوتی تھی۔ کیونکہ جیسا کہ میں اس سے پیشتر بیان کر چکا ہوں۔ اُس کے چہرے کے خطوط بہت ہی مدغم تھے۔

اس کا قد عام لوگوں جتنا تھا۔ یعنی نہ چھوٹا نہ بڑا۔ البتہ جب وہ ایک خاص انداز سے یعنی اپنی کمر کی ہڈی کو ڈھیلا چھوڑ کے کھڑا ہوتا۔ تو اُسکے قد میں نمایاں فرق پیدا ہو جاتا۔ اس طرح جب وہ ایک دم اُٹھ کھڑا ہوتا۔ تو اُس کا قد جسم کے مقابلے میں بہت بڑا دکھائی دیتا تھا۔

کپڑے اُس کے خستہ حالت میں تھے۔ لیکن میلے نہیں تھے کوٹ کی آستینوں کے آخری حصے کثرت استعمال کے باعث گھس گئے تھے۔ اور چھیچھڑے نکل آئے تھے۔ کالر کھلا تھا۔ اور قمیص بس ایک اور دھلائی کی مار تھی۔ مگر ان کپڑوں میں بھی وہ خود کو ایک باوقار انداز سے پیش کرنے کی سعی کر رہا تھا۔ میں نے سعی کر رہا تھا۔ اس لئے کہا ہے۔ کہ جب میں نے اُس کی طرف دیکھا تھا۔ تو اُسکے سارے وجود میں بے چینی کی لہر سی دوڑ گئی تھی۔ اور مجھے ایسا معلوم ہوا تھا۔ کہ وہ اپنے آپ کو میری نگاہوں سے اوجھل رکھنا چاہتا ہے۔

میں اُٹھ کھڑا ہوا۔ اور سگریٹ سلگا کر اُس کی طرف پھر بڑھا دی۔ "شوق فرمائیے"

یہ میں نے کچھ اس طریقے سے کہا۔ اور فوراً ہی ماچس سلگا کر اُس کو اس انداز سے پیش کی۔ کہ وہ سب کچھ بھول گیا۔ اور اُس نے ڈبیا میں سے سگریٹ نکال کر منہ میں دبا لیا۔ اور اُسے سلگا کر پینا بھی شروع کر دیا۔ لیکن ایکا ایکی اُسے اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ اور اُس نے منہ میں سے سگریٹ نکال کر مصنوعی کھانسی کے آثار اپنے حلق میں پیدا کرتے ہوئے کہا "کیونڈر مجھے راس نہیں آتے۔ ان کا تمباکو بہت تیز ہے۔ میرے گلے میں فوراً خراشیں پیدا ہو جاتی ہیں"

میں نے اُس سے پوچھا۔ آپ کون سے سگریٹ پسند کرتے ہیں"

اُس نے تتلا کر جواب دیا "میں ...میں۔ . میں دراصل سگریٹ بہت کم پیتا ہوں، کیونکہ ڈاکٹر اروالکر نے منع کر رکھا ہے۔ ویسے ہی تھری فائیو پیتا ہوں۔ جن کا تمباکو تیز نہیں ہوتا۔

اُس نے جس ڈاکٹر کا نام لیا۔ وہ بمبئی کا بہت بڑا ڈاکٹر ہے۔ جس کی فیس دس روپے ہے۔ اور جن سگرٹوں کا اُس نے حوالہ دیا۔ اُن کے متعلق آپ کو بھی معلوم ہوگا۔ کہ بہت مہنگے داموں پر ملتے ہیں۔ اُس نے ایک ہی سانس میں دو جھوٹ بولے۔ جو مجھے ہضم نہ ہوئے۔ مگر میں خاموش رہا حالانکہ میں آپ سے سچ عرض کرتا ہوں۔ کہ اُس وقت میرے دل میں یہی خواہش چٹکیاں لے رہی تھی۔ کہ اُس کا غلاف اُتار دوں۔ اور اُس کی دروغ گوئی کو بے نقاب کر دوں۔ اس طور پر کہ اُسے شرمندہ کروں۔ کہ وہ مجھ سے معافی مانگے۔ مگر اُس کی طرف میں نے جب دیکھا۔ تو مجھے ایسا محسوس ہوا۔ کہ اُس نے جو کچھ کہا ہے۔ اُس کا جزو بن کر رہ گیا ہے۔ جھوٹ بول کر چہرے پر جو ایک سرخی سی دوڑ جایا کرتی ہے۔ وہ مجھے نظر نہ آئی۔ بلکہ میں نے یہ دیکھا کہ وہ جو کچھ کہہ چکا ہے۔ اُس کو حقیقت سمجھتا ہے۔ اُس کے جھوٹ میں اس قدر اخلاص تھا۔ یعنی اُس نے اتنے پُرخلوص طریقے پر جھوٹ بولا تھا۔ کہ اُس کی میزانِ احساس میں ہلکی سی جنبش بھی نہ پیدا ہوئی تھی۔ خیر اس قصے کو چھوڑیئے، ایسی باریکیاں اگر میں آپ کو بتانے لگوں۔ تو مضمون کے صفحے کالے ہو

جائیں گے۔ اور افسانہ بہت خشک ہو جائیگا۔

تھوڑی سی رسمی گفتگو کے بعد میں نے اُس کو راہ پر لگا لیا۔ اور ایک اور سگرٹ پیش کر کے میں نے سمندر کے دلفریب منظر کی بات چھیڑ دی۔ چونکہ میں افسانہ نگار ہوں۔ اس لئے میں نے کچھ اُسے دلچسپ طریقے پر اُسے سمندر، اپولو بندر اور وہاں آنے جانیوالے تماشائیوں کے بارے میں چند باتیں سنائیں۔ کہ چھ سگرٹ پینے پر بھی اُسکے حلق میں کھرکھراہٹ پیدا نہ ہوئی۔ اُس نے میرا نام پوچھا جب میں نے بتایا۔ تو وہ اُٹھ کھڑا ہوا اور کہنے لگا "آپ۔۔۔۔ آپ ہیں۔۔۔۔ آپ کے کئی افسانے میں پڑھ چکا ہوں۔ مجھے۔۔۔۔ مجھے معلوم نہ تھا۔ کہ آپ ہی۔۔۔ میں۔۔۔۔ مجھے آپ سے مل کر بہت خوشی ہوئی ہے، واللہ بہت خوشی ہوئی ہے۔"

میں نے اُس کا شکریہ ادا کرنا چاہا۔ مگر اُس نے اپنی بات شروع کر دی "۔۔۔ ہاں خوب یاد آیا، ابھی حال ہی میں آپ کا ایک افسانہ میں نے پڑھا ہے۔۔۔ عنوان بھول گیا ہوں۔۔۔۔ اس میں آپ نے ایک لڑکی پیش کی ہے۔ جو کسی مرد سے محبت کرتی تھی۔ مگر وہ مرد اُسے دھوکا دے گیا۔ اسی لڑکی سے ایک اور مرد بھی محبت کرتا تھا۔ جو افسانہ سناتا ہے۔ جب اُس کو لڑکی کی افتاد کا پتہ چلتا ہے۔ تو وہ اُس سے ملتا ہے۔ اور اُس سے کہتا ہے "زندہ رہو۔۔۔۔ اُن چند گھڑیوں کی یاد میں اپنی زندگی کی بنیادیں کھڑی کر دو جو تم نے اُس کی محبت میں گزاری ہیں۔ اُس مسرت کی یاد پر جیو جو تم۔۔۔ نے چند لمحات کے لئے حاصل کی تھی"۔۔۔ مجھے اصل عبارت یاد نہیں رہی۔ لیکن میں پوچھتا ہوں۔ کیا ایسا ممکن ہے؟۔۔۔ ممکن کو چھوڑیئے، آپ یہ بتایئے۔ کہ وہ آدمی کیا آپ تو نہیں تھے؟ ——— معاف کیجئے گا۔ میں ایسے سوال پوچھ رہا ہوں جو مجھے نہیں پوچھنے چاہئیں۔ مگر۔۔۔ کیا آپ ہی نے اُس سے کوٹھے پر ملاقات کی تھی۔ اور اُس کی تھکی ہوئی جوانی کو اونگھتی ہوئی چاندنی میں چھوڑ کر نیچے اپنے کمرے میں سونے کے لئے چلے آئے تھے۔۔۔۔ "یہ کہتے ہوئے وہ ایک دم ٹھہر گیا۔" مگر مجھے ایسی باتیں نہیں پوچھنی چاہئیں ——— اپنے دل کا حال کون بتاتا ہے"

اسپر میں نے کہا "میں آپ کو بتاؤنگا ——— لیکن پہلی ملاقات میں سب کچھ پوچھ لینا۔ اور سب کچھ بتا دینا اچھا معلوم نہیں ہوتا ——— آپ کا خیال ہے؟" وہ جوش جو گفتگو کرتے وقت اُسکے اندر پیدا ہو گیا تھا۔ ایک دم ٹھنڈا پڑ گیا۔ اور اُس نے دھیمے لہجے میں کہا "آپ کا فرمانا بالکل درست ہے۔ مگر کیا پتہ ہے۔ کہ آپ سے پھر کبھی ملاقات نہ ہو"

اسپر میں نے کہا "اس میں شک نہیں بمبئے بہت بڑا شہر ہے۔ لیکن ہماری ایک نہیں۔ بہت سی ملاقاتیں ہو سکتی ہیں۔ میں ایک بے کار آدمی ہوں یعنی افسانہ نگار۔۔ شام کو ہر روز اسی وقت بشرطیکہ میں بیمار نہ ہو جاؤں، آپ مجھے ہمیشہ اسی جگہ پر پائیں گے ——— یہاں بے شمار لڑکیاں سیر کو آتی ہیں۔ اور میں اس لئے آتا ہوں۔ کہ خود کو کسی کی محبت میں گرفتار کر سکوں۔۔۔ محبت بری چیز نہیں ہے"

"محبت۔۔۔۔ محبت۔۔۔۔" اُس نے اسکے آگے کچھ کہنا چاہا۔ مگر نہ کہہ سکا اور جلتی ہوئی رسی کی طرح آخری بل کھا کر خاموش ہو گیا۔

میں نے ازراہِ مذاق اُس سے محبت کا ذکر کیا تھا۔ دراصل اُس وقت فضا ایسی دلفریب تھی۔ کہ اگر میں کسی عورت پر عاشق ہو جاتا۔ تو مجھے افسوس نہ ہوتا جب دونوں وقت آپس میں مل رہے ہوں، نیم تاریکی میں بجلی کے قمقمے قطار اندر قطار آنکھیں جھپکنا شروع کر دیں، ہوا میں خنکی پیدا ہو جائے۔ اور فضا پر ایک افسانوی کیفیت سی چھا جائے۔ تو کسی اجنبی عورت کے پاس ہونے کی ضرورت محسوس ہوا کرتی ہے۔ ایک ایسی ضرورت جس کا احساس تحتِ شعور ہی میں چھپا رہتا ہے

خدا معلوم اُس نے کس افسانے کی بابت مجھ سے پوچھا تھا۔ مجھے اپنے سب افسانے یاد نہیں۔ اور خاص طور پر وہ تو بالکل یاد نہیں۔ جو رومان ہیں۔ میں اپنی زندگی میں بہت کم عورتوں سے ملا ہوں۔ وہ افسانے جو میں نے عورتوں کے متعلق لکھے ہیں۔ یا تو کسی خاص ضرورت کے ماتحت لکھے گئے ہیں۔ یا

محض دماغی عیاشی کے لئے۔ میرے ایسے افسانوں میں چونکہ غرض نہیں ہے۔ اس لئے میں نے کبھی اُن کے متعلق غور نہیں کیا۔ ایک خاص طبقے کی عورتیں میری نظر سے گزری ہیں۔ اور ان کے متعلق میں نے چند افسانے لکھے ہیں۔ مگر وہ رومان نہیں ہیں۔ اُس نے جن افسانے کا ذکر کیا تھا۔ وہ یقیناً کوئی ادنےٰ درجے کا رومان تھا جو میں نے اپنے چند جذبات کی پیاس بجھانے کے لئے لکھا ہوگا۔۔ لیکن میں نے تو اپنا افسانہ بیان کرنا شروع کر دیا ہے۔

ہاں، تو جب وہ محبت کہہ کر خاموش ہوگیا۔ تو میرے من میں خواہش پیدا ہوئی۔ کہ محبت کے بارے میں کچھ اور کہوں۔ چنانچہ میں نے کہنا شروع کیا" محبت کی یوں تو بہت سی قسمیں ہمارے باپ دادا بیان کر گئے ہیں۔ مگر میں سمجھتا ہوں۔ کہ محبت خواہ ملتان میں پیدا ہو یا سائبریا کے یخ بستہ میدان میں، سردیوں میں پیدا ہو یا گرمیوں میں، امیر کے دل میں پیدا ہو یا غریب کے دل میں۔۔۔ محبت خوبصورت کریں یا بدصورت، بدکردار کرے یا نیکوکار۔۔۔ محبت محبت ہی رہتی ہے۔ اس میں کوئی فرق پیدا نہیں ہوتا۔ جس طرح بچے پیدا ہونے کی صورت ہمیشہ سے ایک جیسی چلی آرہی ہے۔ اسی طرح محبت کی پیدائش بھی ایک ہی طریقے پر ہوتی ہے۔ یہ جُدا بات ہے۔ کہ سعیدہ بیگم ہسپتال میں بچہ جنے اور راج کماری جنگل میں۔ غلام محمد کے دل میں۔ بھنگن محبت پیدا کر دے اور اشوک کمار کے دل میں ایک رانی جس طرح بعض بچے وقت سے پہلے پیدا ہوتے ہیں۔ اور کمزور رہتے ہیں۔ اسی طرح وہ محبت بھی کمزور رہتی ہے۔ جو وقت سے پہلے جنم لے۔ بعض دفعہ بچے بڑی تکلیف سے پیدا ہوتے ہیں۔ بعض دفعہ محبت بھی بڑی تکلیف دے کر پیدا ہوتی ہے۔ جس طرح عورتوں کا حمل گر جاتا ہے۔ اسی طرح محبت بھی گر جاتی ہے۔ بعض دفعہ بانجھ پن پیدا ہو جاتا ہے۔ ادھر بھی آپ کو ایسے کئی آدمی نظر آئیں گے جو محبت کرنے کے معاملے میں بانجھ ہیں۔۔۔ اس کا یہ مطلب نہیں۔ کہ محبت کرنے کی خواہش ہی اُنکے دل سے ہمیشہ کے لئے مٹ جاتی ہے۔ یا اُن کے اندر وہ جذبہ ہی نہیں رہتا۔ نہیں یہ خواہش اُن کے دل میں موجود ہوتی ہے۔ مگر وہ اس قابل نہیں رہتے۔ کہ محبت کر سکیں۔ جس طرح عورت اپنے جسمانی نقائص کے باعث بچے پیدا کرنے کے قابل نہیں رہتی۔ اسی طرح یہ لوگ چند روحانی نقائص کی وجہ سے کسی کے دل میں محبت پیدا کرنے کی قوت نہیں رکھتے۔۔۔ محبت کا اسقاط بھی ہو سکتا ہے۔۔۔"

مجھے اپنی گفتگو دلچسپ معلوم ہو رہی تھی۔ چنانچہ میں اُس کی طرف دیکھے بغیر لکچر دئے چلا جا رہا تھا۔ مگر جب میں نے اُس کی جانب دیکھا۔ تو مجھے معلوم ہوا۔ کہ وہ دُور سمندر کے اُس پار خلا میں دیکھ رہا ہے۔ اور اپنے خیالات میں گم ہے۔ میں خاموش ہو گیا۔ لیکن میری خاموشی نے اُس کو میری طرف متوجہ نہ کیا۔

جب زور سے کسی موٹر کا ہارن بجا۔ تو وہ چونکا۔ اور خالی الذہن ہو کر کہنے لگا " جی۔۔۔ آپ نے بالکل درست فرمایا ہے!"

میرے جی میں آئی کہ اُس سے پوچھوں" میں نے کہا درست فرمایا ہے؟ ـــــ اسکو چھوڑیئے آپ یہ بتائیے۔ کہ میں نے کہا کیا ہے" لیکن میں خاموش رہا۔ اور اُسکو موقع دیا۔ کہ وہ اپنے وزنی خیالات دماغ سے جھٹک دے۔

وہ کچھ دیر سوچتا رہا۔ اس کے بعد اُس نے پھر کہا" آپ نے بالکل ٹھیک فرمایا ہے، لیکن۔۔۔ خیر چھوڑیئے اس قصے کو"

مجھے اپنی گفتگو بہت اچھی معلوم ہوئی تھی۔ اور میں چاہتا تھا۔ کہ کوئی میری باتیں سنتا چلا جائے۔ چنانچہ میں نے پھر سے کہنا شروع کیا" تو میں یہ عرض کر رہا تھا۔ کہ بعض آدمی بھی محبت کے معاملے میں بانجھ ہوتے ہیں۔ یعنی اُن کے دل میں محبت کرنے کی خواہش تو موجود ہوتی ہے۔ لیکن اُن کی یہ خواہش کبھی پوری نہیں ہوتی۔ میں سمجھتا ہوں۔ کہ اس بانجھ پن کا باعث روحانی نقائص ہیں۔ آپ کا کیا خیال ہے؟"

اُس کا رنگ اور بھی زرد پڑ گیا۔ جیسے اُس نے بھوت دیکھا ہے۔ یہ تبدیلی اُس کے اندر اتنی جلدی پیدا ہوئی۔ کہ میں نے گھبرا

کہ اُس سے پوچھا "خیریت تو ہے . . . آپ بیمار ہیں"
"نہیں تو . . . نہیں تو . . ." اُس کی پریشانی اور بھی زیادہ ہوگئی . "مجھے کوئی بیماری وِیماری نہیں ہے . . . لیکن آپ نے یہ کیسے سمجھ لیا . کہ میں بیمار ہوں"

میں نے جواب دیا "اس وقت آپ کو جو کوئی بھی دیکھے گا . یہی کہے گا . کہ آپ بہت بیمار ہیں . آپ کا رنگ خوفناک طور پر زرد ہو رہا ہے . . . . میرا خیال ہے . آپ کو گھر چلا جانا چاہیئے . آئیے میں آپ کو چھوڑ آؤں"

"نہیں میں خود چلا جاؤنگا . مگر میں بیمار نہیں ہوں . . . کبھی کبھی میرے دل میں معمولی سا درد پیدا ہو جایا کرتا ہے ، شاید یہ وہی ہو . . . . میں ابھی ٹھیک ہو جاؤنگا . آپ اپنی گفتگو جاری رکھئے"

میں تھوڑی دیر خاموش رہا . کیونکہ وہ اس حالت میں نہیں تھا . کہ میری بات غور سے سُن سکتا . لیکن جب اُس نے اصرار کیا . تو میں نے کہنا شروع کیا "میں آپ سے یہ پوچھ رہا تھا کہ اُن لوگوں کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے . جو محبت کرنے کے معاملے میں بانجھ ہوتے ہیں . . . میں ایسے آدمیوں کے جذبات اور اُن کی اندرونی کیفیات کا اندازہ نہیں کر سکتا . مگر جب میں اُس بانجھ عورت کا تصور کرتا ہوں . جو صرف ایک بیٹا یا بیٹی حاصل کرنے کے لئے دعائیں مانگتی ہے . خدا کے حضور میں گڑگڑاتی ہے . جب وہاں سے کچھ نہیں ملتا . تو ٹونے ٹوٹکوں میں اپنا گوہرِ مقصود ڈھونڈتی ہیں . مسانوں سے راکھ لاتی ہیں . کئی کئی راتیں جاگ کر سادھوؤں کے بتائے ہوئے منتر پڑھتی ہے منتیں مانتی ہے . چڑھاوے چڑھاتی ہے . تو میں خیال کرتا ہوں کہ اُس آدمی کی بھی یہی حالت ہوتی ہوگی . جو محبت کے معاملے میں بانجھ ہو . . . . ایسے لوگ واقعی ہمدردی کے قابل ہیں . مجھے اندھوں پر اتنا رحم نہیں آتا . جتنا اِن لوگوں پر آتا ہے"

اُس کی آنکھوں میں آنسو آگئے . اور وہ تھوک نگل کر فوراً اُٹھ کھڑا ہوا . اور بیلی طرف منہ کر کے کہنے لگا "اوہ ، بہت دیر ہوگئی . مجھے ضروری کام سے جانا تھا . یہاں باتوں باتوں میں کتنا وقت گزر گیا .

میں بھی اُٹھ کھڑا ہوا . وہ پلٹا اور جلدی سے میرا ہاتھ دبا کر لیکن میری طرف دیکھے بغیر اُس نے "اب رخصت چاہتا ہوں" کہا اور چل دیا .

* * * * * *

دوسری مرتبہ اُس سے میری ملاقات پھر اپولو بندر ہی پر ہوئی . میں سیر کا عادی نہیں ہوں . مگر اُس زمانے میں ہر شام اپولو بندر پر جانا میرا دستور ہو گیا تھا . ایک مہینے کے بعد جب مجھے آگرہ کے ایک شاعر نے ایک لمبا چوڑا خط لکھا . جس میں اُس نے نہایت ہی جذباتی طور پر اپولو بندر اور وہاں جمع ہونے والی پریوں کا ذکر کیا . اور مجھے اِس لحاظ سے بہت خوش قسمت کہا . کہ میں بمبئے میں ہوں . تو اپولو بندر سے میری دلچسپی ہمیشہ کے لئے فنا ہو گئی . اب جب کبھی کوئی مجھے اپولو بندر جانے کو کہتا ہے تو مجھے آگرے کے شاعر کا خط یاد آ جاتا ہے . اور میری طبیعت متلا جاتی ہے . لیکن میں اُس زمانے کا ذکر کر رہا ہوں . جب یہ خط مجھے نہ ملا تھا . اور میں ہر روز جا کر شام کو اپولو بندر اُس بینچ پر بیٹھا کرتا تھا . جس کے اس طرف کئی آدمی چپّی والوں سے اپنی کھوپڑیوں کی مرمت کراتے رہتے ہیں .

دن پوری طرح ڈھل چکا تھا . اور اُجالے کا کوئی نشان بھی باقی نہ رہا تھا . لیکن اکتوبر کی گرمی میں کمی واقع نہ ہوئی تھی . ہوا چل رہی تھی . لیکن تھکے ہوئے مسافر کی طرح . سیر کرنے والوں کا ہجوم زیادہ تھا . میرے پیچھے موٹریں ہی موٹریں کھڑی تھیں . بینچ بھی سب کے سب پُر تھے . میں جہاں بیٹھا تھا . وہاں دو بالوں ایک گجراتی اور ایک پارسی نہ جانے کب کے جمے ہوئے تھے . یہ دونوں گجراتی بولتے تھے . مگر مختلف لب و لہجے سے . پارسی کی آواز میں دو سُر تھے . کبھی وہ باریک سُر میں بات کرتا تھا . اور کبھی موٹے سُر میں . جب دونوں تیزی سے بولنا شروع کر دیتے . تو ایسا معلوم ہوتا . جیسے طوطے مینا کی لڑائی ہو رہی ہے .

میں اُن کی لامتناہی گفتگو سے تنگ آ کر اٹھا۔ اور ٹہلنے کی خاطر تاج محل ہوٹل کا رُخ کیا ہی تھا۔ کہ سامنے سے مجھے وہ آتا دکھائی دیا۔ مجھے اُس کا نام معلوم نہیں تھا۔ اس لئے میں اُسے پکار نہ سکا۔ لیکن جب اُس نے مجھے دیکھ لیا۔ تو اُس کی نگاہیں ساکن ہو گئیں۔ جیسے اُسے وہ چیز مل گئی ہے۔ جس کی اُسے تلاش تھی۔

کوئی بنچ خالی نہیں تھا۔ اس لئے میں نے اُس سے کہا۔ "آپ سے بہت دیر کے بعد ملاقات ہوئی ---- چلئے سامنے ریسٹوران میں بیٹھتے ہیں۔ یہاں کوئی بنچ خالی نہیں"

اُس نے رسمی طور پر چند باتیں کیں۔ اور میرے ساتھ ہو لیا چند گزوں کا فاصلہ طے کرنے پر ہم دو نو ریسٹوران کی بید کی بڑی بڑی کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ چار کا آرڈر دے کر میں نے اُس کی طرف سگرٹوں کا ٹین بڑھا دیا۔ اتفاق کی بات ہے۔ کہ میں نے اُسی روز دس روپے دے کر ڈاکٹر ارولکر سے مشورہ لیا تھا۔ اور اُس نے مجھ سے کہا تھا۔ کہ اوّل تو سگریٹ پینا ہی موقوف کردو۔ اور اگر تم ایسا نہیں کر سکتے۔ تو اچھے سگرٹ پیا کرو۔ مثال کے طور پر پانچ ششپین . . . . . چنانچہ میں نے ڈاکٹر کے کہنے کے مطابق یہ ٹین اُسی شام خریدا تھا۔ اُس نے ڈبے کی طرف غور سے دیکھا؛ پھر میری طرف نگاہیں اٹھائیں، کچھ کہنا چاہا۔ مگر خاموش رہا

میں ہنس پڑا۔ "آپ یہ نہ سمجھئے گا۔ کہ میں نے آپ کے کہنے پر یہ سگرٹ پینا شروع کئے ہیں --- اتفاق کی بات ہے۔ کہ آج مجھے بھی ڈاکٹر ارولکر کے پاس جانا پڑا۔ کیونکہ کچھ دنوں سے میرے سینے میں درد ہو رہا ہے، چنانچہ اُس نے مجھ سے کہا۔ کہ یہ سگرٹ پیا کرو۔ لیکن بہت کم . . . . . .

میں نے یہ کہتے ہوئے اُس کی طرف دیکھا۔ اور خیال کیا۔ کہ اُس کو میری یہ باتیں ناگوار معلوم ہوئی ہیں، چنانچہ میں نے فوراً اپنی جیب سے وہ نسخہ نکالا۔ جو ڈاکٹر ارولکر نے مجھے لکھ کر دیا تھا۔ یہ کاغذ میز پر میں نے اُسکے سامنے رکھ دیا۔ یہ عبارت مجھ سے پڑھی تو نہیں جاتی۔ مگر ایسا معلوم ہوتا ہے۔ کہ ڈاکٹر صاحب نے وٹامن کا سارا خاندان اِس کاغذ پر جمع کر دیا ہے۔

اُس کاغذ کو جس پر اُبھرے ہوئے کالے حروف میں ڈاکٹر ارولکر کا نام اور پتہ مندرج تھا۔ اور تاریخ بھی لکھی ہوئی تھی۔ اُس نے چور نگاہوں سے دیکھا۔ اور وہ اضطراب کی جو اُسکے چہرے پر پیدا ہو گیا تھا۔ فوراً دور ہو گیا۔ چنانچہ اُس نے مسکرا کر کہا۔ کیا وجہ ہے۔ کہ اکثر لکھنے والوں کے اندر وٹامنز ختم ہو جاتی ہیں؟"

میں نے جواب دیا۔ "اس لئے کہ انہیں کھانے کو کافی نہیں ملتا۔ کام زیادہ کرتے ہیں۔ لیکن اجرت بہت ہی کم ملتی ہے"

اس کے بعد چائے آ گئی۔ اور دوسری باتیں شروع ہو گئیں

پہلی ملاقات اور اس ملاقات میں غالباً ڈھائی مہینے کا فاصلہ تھا۔ اُس کے چہرے کا رنگ پہلے سے زیادہ پیلا تھا آنکھوں کے اردگرد سیاہ حلقے پیدا ہو رہے تھے۔ اُس کو غالباً کوئی روحانی تکلیف تھی۔ جس کا احساس اُسے ہر وقت رہتا تھا کیونکہ باتیں کرتے کرتے وہ بعض اوقات ٹھہر جاتا۔ اور اُس کے سینے سے غیر ارادی طور پر آہ نکل جاتی۔ وہ اگر ہنسنے کی کوشش بھی کرتا تو اُسکے ہونٹوں میں زندگی پیدا نہیں ہوتی تھی

میں نے یہ کیفیت دیکھ کر اُس سے اچانک طور پر پوچھا۔ "آپ اُداس کیوں ہیں؟"

"اداس . . . اداس" ایک پھیکی سی مسکراہٹ جو اُن مرنے والوں کے لبوں پر پیدا ہوا کرتی ہے۔ جو یہ ظاہر کرنا چاہتے ہیں۔ کہ موت سے وہ بالکل خائف نہیں۔ اُسکے ہونٹوں پر پھیلی۔ "میں اداس نہیں ہوں۔ آپ کی طبیعت اداس ہو گی"

یہ کہہ کر اُس نے ایک ہی گھونٹ میں چائے کی پیالی خالی کر دی۔ اور اٹھ کھڑا ہوا۔ "اچھا تو میں اجازت چاہتا ہوں ---- مجھے ایک ضروری کام سے جانا ہے"

مجھے یقین تھا۔ کہ اُسے کسی ضروری کام سے نہیں جانا ہے مگر میں نے اُسے نہ روکا۔ اور اُس کو جانے دیا۔ اس دفعہ پھر میں اُس کا نام دریافت نہ کر سکا۔ مجھے اتنا پتہ چل گیا۔ کہ وہ ذہنی اور روحانی طور پر بے حد پریشان ہے۔ وہ اداس تھا۔ بلکہ یوں کہیئے

کر اداسی اُسکے رگ و ریشہ میں سرایت کر چکی تھی۔ مگر وہ یہ نہیں چاہتا تھا کہ اُس کی اُداسی کا دوسروں کو علم ہو۔ وہ دو زندگیاں بسر کرنا چاہتا تھا۔ ایک وہ جو حقیقت میں تھی۔ اور ایک وہ جس کی تخلیق میں وہ ہر گھڑی ہر لمحہ مصروف رہتا تھا۔ لیکن اُس کی زندگی کے یہ دونو پہلو ناکام تھے۔ کیوں؟ — یہ مجھے معلوم نہیں۔

اُس سے تیسری مرتبہ میری ملاقات پھر اپولو بندر پر ہوئی اس دفعہ میں اُسے اپنے گھر لے گیا۔ راستے میں ہماری کوئی بات چیت نہ ہوئی۔ لیکن گھر پر اُس سے بہت سی باتیں ہوئیں۔ جب وہ میرے کمرے میں داخل ہوا۔ تو اُس کے چہرے پہ چند لمحات کے لئے اداسی چھا گئی۔ مگر وہ فوراً ہی سنبھل گیا۔ اور اُس نے اپنی عادت کے خلاف اپنے کو بہت تروتازہ اور باتونی ظاہر کرنے کی کوشش کی۔ اُسکو اس حالت میں دیکھ کر مجھے اُس پر اور بھی ترس آیا۔ وہ ایک موت جیسی یقینی حقیقت کو جھٹلا رہا تھا۔ اور مزا یہ ہے۔ کہ اس خود فریبی سے کبھی کبھی وہ مطمئن نظر آتا تھا۔

باتوں کے دوران میں اُس کی نظر میرے میز پر پڑی۔ شیشے کے فریم میں اُس کو ایک لڑکی کی تصویر نظر آئی۔ اٹھ کر تصویر کی طرف جاتے ہوئے کہا "کیا میں آپ کی اجازت سے یہ تصویر دیکھ سکتا ہوں"

میں نے کہا "بصد شوق"

اُس نے تصویر کو ایک نظر دیکھا۔ اور دیکھ کر وہ کرسی پر بیٹھ گیا "اچھی خوبصورت لڑکی ہے۔ ۔ ۔ میں سمجھتا ہوں کہ آپ کی۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

"جی نہیں۔ ۔ ۔ ایک زمانہ ہوا اس سے محبت کرنے کا خیال میرے دل میں پیدا ہوا تھا۔ بلکہ یوں کہیئے کہ تھوڑی سی محبت میرے دل میں پیدا بھی ہو گئی تھی۔ مگر افسوس یہ ہے۔ کہ اس کو اس کی خبر تک نہ ہوئی اور میں۔ ۔ ۔ میں۔ ۔ ۔ میں نہیں بلکہ وہ بیاہ دی گئی۔ ۔ ۔ ۔ یہ تصویر میری پہلی محبت کی یادگار ہے۔ جو اچھی طرح پیدا ہونے سے پہلے ہی مر گئی —"

"یہ آپ کی محبت کی یادگار ہے — اس کے بعد تو آپ نے اور بہت سے رومان لڑائے ہونگے" اُس نے اپنے خشک ہونٹوں پہ زبان پھیری "یعنی۔ ۔ ۔ یعنی آپ کی زندگی میں تو ایسی کئی نامکمل اور مکمل محبتیں موجود ہوں گی"

میں کہنے والا تھا۔ کہ جی نہیں خاکسار بھی محبت کے معاملے میں آپ جیسا ہی بنجر ہے۔ مگر نہ جانے میں کیوں یہ کہتا کہتا رُک گیا اور میں نے خواہ مخواہ جھوٹ بولا "جی ہاں۔ ۔ ۔ ایسے سلسلے ہوتے ہی رہتے ہیں — آپ کی کتابِ زندگی بھی تو ایسے واقعات سے بھرپور ہو گی"

وہ کچھ نہ بولا اور بالکل خاموش ہو گیا۔ جیسے وہ کسی گہرے سمندر میں غوطہ لگا گیا ہے۔ دیر تک جب وہ اپنے خیالات میں غرق رہا - اور میں اُس کی خاموشی سے اداس ہونے لگا تو میں نے کہا "اجی حضرت آپ کن خیالات میں کھو گئے ہیں"

وہ چونک پڑا "میں۔ ۔ ۔ میں۔ ۔ ۔ کچھ نہیں میں ویسے ہی کچھ سوچ رہا تھا"

میں نے پوچھا "کوئی بیتی ہوئی کہانی یاد آ گئی — کوئی بچھڑا ہوا سپنا مل گیا۔ ۔ ۔ پرانے زخم ہرے ہو گئے" خواب ہی ہو کے رہا

"زخم۔ ۔ ۔ پرانے۔ ۔ ۔ زخم۔ ۔ ۔ کئی زخم تو نہیں۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ صرف ایک ہی ہے۔ بہت گہرا۔ بہت کاری۔ ۔ ۔ اور زخم میں چاہتا بھی نہیں۔ ایک ہی زخم کافی ہے" یہ کہہ کر وہ کھڑا ہوا۔ اور میرے کمرے میں ٹہلنے کی کوشش کرنے لگا۔ کیونکہ اُس چھوٹی سی جگہ میں جہاں کرسیاں، میز اور چارپائی وغیرہ سب کچھ پڑا تھا۔ ٹہلنے کے لئے کوئی جگہ نہیں تھی۔ میز کے پاس اُسے رُکنا پڑا۔ تصویر کو اب کی دفعہ گہری نظروں سے اُس نے دیکھا۔ اور کہا۔ اُس میں اور اس میں کتنی مشابہت ہے۔ ۔ ۔ مگر اُس کے چہرے پہ ایسی شوخی نہیں تھی۔ اُس کی آنکھیں بڑی تھیں مگر ان آنکھوں کی طرح اُن میں شرارت نہیں تھی۔ وہ فکرمند آنکھیں تھیں۔ ایسی آنکھیں جو دیکھتی بھی ہیں۔ اور سمجھتی بھی ہیں۔ ۔ ۔ یہ کہتے ہوئے اُس نے ایک سرد آہ بھری اور کرسی پر بیٹھ گیا۔ موت بالکل ناقابلِ فہم چیز ہے۔ خاص طور پر اُس وقت جب کہ

پر جوانی میں آئے . . . میں سمجھتا ہوں کہ خدا کے علاوہ ایک اور طاقت بھی ہے۔ جو بڑی حاسد ہے۔ جو کسی کو خوش دیکھنا نہیں چاہتی . . . مگر چھوڑیئے اس قصے کو . . . . . "

میں نے اُس سے کہا۔ "نہیں نہیں۔ آپ سناتے . . . جائیے . . لیکن اگر آپ ایسا مناسب سمجھیں . . سچ پوچھئے تو میں یہ سمجھ رہا تھا۔ کہ آپ نے کبھی محبت کی ہی نہ ہوگی"

"یہ آپ نے کیسے سمجھ لیا کہ میں نے کبھی محبت کی ہی نہیں۔ اور ابھی ابھی تو آپ کہہ رہے تھے۔ کہ میری کتاب زندگی ایسے کئی واقعات سے بھری پڑی ہوگی۔" یہ کہہ کر اُس نے میری طرف سوالیہ نگاہوں سے دیکھا۔ "میں نے اگر محبت نہیں کی۔ تو دکھ میرے دل میں کہاں سے پیدا ہو گیا ہے؟ — میں نے اگر محبت نہیں کی تو میری زندگی کو یہ روگ کہاں سے چمٹ گیا ہے؟ — میں اُداس کیوں رہتا ہوں؟ — مجھے اپنے آپ کا ہوش کیوں نہیں ہے؟ . . . میں روز بروز موم کی طرح کیوں پگھل رہا ہوں"

بظاہر یہ تمام سوال وہ مجھ سے کر رہا تھا۔ مگر دراصل وہ سب کچھ اپنے آپ سے ہی پوچھ رہا تھا۔

میں نے کہا۔ "میں نے جھوٹ بولا تھا۔ کہ آپ کی زندگی میں ایسے کئی واقعات ہونگے۔ مگر آپ نے بھی تو جھوٹ بولا تھا۔ کہ میں اداس نہیں ہوں۔ اور مجھے کوئی روگ نہیں ہے . . . کسی کے دل کا حال جاننا آسان بات نہیں ہے۔ آپ کی اُداسی کی اور بہت سی وجہیں ہو سکتی ہیں۔ مگر جب تک مجھے آپ خود نہ بتائیں میں کسی نتیجے پر کیسے پہنچ سکتا ہوں . . . اس میں کوئی شک نہیں کہ آپ واقعی روز بروز کمزور ہوتے جا رہے ہیں۔ آپ کو یقیناً بہت بڑا صدمہ پہنچا ہے۔ اور . . . اور . . . مجھے آپ سے ہمدردی ہے"

"ہمدردی . . ." اُس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے "دو مجھے کسی کی ہمدردی کی ضرورت نہیں۔ اس لئے کہ ہمدردی اُسے واپس نہیں لا سکتی . . . اُس عورت کو موت کی گہرائیوں سے نکال کر میرے حوالے نہیں کر سکتی۔ جس سے مجھے پیار تھا . . . آپ نے محبت نہیں کی . . . مجھے یقین ہے۔ آپ نے محبت نہیں کی۔ اس لئے کہ اس کی ناکامی نے آپ پر کوئی داغ نہیں چھوڑا! — میری طرف دیکھئے" یہ کہہ کر اُس نے خود اپنے آپ کو دیکھا "کوئی جگہ آپ کو ایسی نہیں ملے گی۔ جہاں میری محبت کے نقش موجود نہ ہوں . . . میرا وجود خود اس محبت کی ٹوٹی ہوئی عمارت کا ملبہ ہے . . . میں آپ کو یہ داستان کیسے سناؤں۔ اور پھر کیوں سناؤں۔ کیونکہ آپ اُس کو سمجھ ہی نہیں سکیں گے . . . . . . کسی کا یہ کہہ دینا کہ میری ماں مر گئی ہے۔ آپ کے دل پر وہ اثر پیدا نہیں کر سکتا۔ جو موت نے بیٹے پر کیا تھا . . . میری داستانِ محبت آپ کو . . . کسی کو بھی بالکل معمولی معلوم ہوگی۔ مگر مجھ پر اُس نے جو اثر کیا ہے۔ اُس سے کوئی بھی آگاہ نہیں ہو سکتا۔ اس لئے کہ محبت میں نے کی ہے۔ اور سب کچھ صرف مجھی پر گزرا ہے"

یہ کہہ کر وہ خاموش ہو گیا۔ اُس کے حلق میں تلخی پیدا ہو گئی تھی۔ کیونکہ وہ بار بار تھوک نگلنے کی کوشش کر رہا تھا۔

"کیا وہ آپ کو دھوکا دے گئی" میں نے اُس سے پوچھا "یا کچھ اور حالات تھے؟"

"دھوکا . . . وہ دھوکا دے ہی نہیں سکتی تھی۔ خدا کے لئے دھوکا نہ کہیئے۔ وہ عورت نہیں فرشتہ تھی۔ مگر بُرا ہو اس موت کا وہ ہمیں خوش نہ دیکھ سکی۔ اور اُسے ہمیشہ کے لئے اپنے پروں میں سمیٹ کر لے گئی . . . آہ! . . . آپ نے میرے جگر پر خراشیں پیدا کر دی ہیں۔ سُنیئے . . . سُنیئے میں آپکو اس دردناک داستان کا کچھ حصہ سناتا ہوں . . . وہ ایک بڑے اور امیر گھرانے کی لڑکی تھی۔ جس زمانے میں اُس کی اور میری پہلی ملاقات ہوئی۔ میں اپنے باپ دادا کی ساری جائداد عیاشیوں میں برباد کر چکا تھا۔ میرے پاس ایک کوڑی بھی نہیں تھی۔ اپنا وطن چھوڑ کر میں لکھنؤ چلا آیا۔ اپنی موٹر چونکہ میرے پاس ہوا کرتی تھی۔ اس لئے میں صرف موٹر چلانے کا کام جانتا تھا۔ چنانچہ میں نے اسی کو اپنا پیشہ قرار دینے کا فیصلہ کیا۔ پہلی ملازمت مجھے

ڈپٹی صاحب کے یہاں ملی جن کی وہ اکلوتی لڑکی تھی ... یہ کہتے کہتے وہ اپنے خیالات میں کھوگیا۔ اور دفعتہً چُپ ہوگیا۔ میں بھی خاموش رہا۔

تھوڑی دیر کے بعد وہ چونکا۔ اور کہنے لگا " میں کیا کہہ رہا تھا ؟ "

" آپ ڈپٹی صاحب کے یہاں ملازم ہوگئے "

" وہ انہی ڈپٹی صاحب کی اکلوتی لڑکی تھی —— ہر روز صبح نو بجے میں زہرہ کو موٹر میں سکول لے جایا کرتا تھا۔ وہ پردہ کرتی تھی۔ مگر موٹر ڈرائیور سے کوئی کب تک چھپ سکتا ہے۔ میں نے اُسے دوسرے روز ہی دیکھ لیا۔ . . . . وہ صرف خوبصورت ہی نہیں تھی۔ بلکہ اُس میں ایک خاص بات بھی تھی . . . . . وہ بڑی سنجیدہ اور متین لڑکی تھی۔ اُس کی سیدھی مانگ نے اُس کے چہرے پر ایک خاص قسم کا وقار پیدا کردیا تھا۔ وہ . . . . . . وہ . . میں کیا عرض کروں وہ کیا تھی۔ میرے پاس الفاظ نہیں ہیں کہ میں اُس کی صورت اور سیرت بیان کرسکوں . . . . "

بہت دیر تک وہ اپنی زہرہ کی خوبیاں بیان کرتا رہا۔ اس دوران میں اس نے کئی مرتبہ اُس کی تصویر کھینچنے کی بہت کوشش کی۔ مگر ناکام رہا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا۔ کہ خیالات اُسکے دماغ میں ضرورت سے زیادہ جمع ہوگئے ہیں۔ کبھی کبھی بات کرتے کرتے اُس کا چہرہ تمتما اٹھتا۔ لیکن پھر اُداسی چھا جاتی۔ اور وہ آہوں میں گفتگو کرنا شروع کردیتا۔ وہ اپنی داستان بہت آہستہ آہستہ سُنا رہا تھا۔ جیسے خود بھی مزا لے رہا ہے۔ ایک ایک ٹکڑا جوڑ کر اُس نے اپنی ساری کہانی پوری کی۔ جس کا ماحصل یہ تھا۔

زہرہ سے اُسے بے پناہ محبت ہوگئی۔ کچھ دن تو موقع پاکر اُس کا دیدار کرنے اور طرح طرح کے منصوبے باندھنے میں گزر گئے۔ مگر جب اُس نے سنجیدگی سے اس محبت پر غور کیا۔ تو خود کو زہرہ سے بہت دُور پایا۔ ایک موٹر ڈرائیور اپنے آقا کی لڑکی سے محبت کیسے کرسکتا تھا، چنانچہ جب اُس تلخ حقیقت کا احساس اُسکے دل میں پیدا ہوا۔ تو وہ مغموم رہنے لگا۔ لیکن ایک روز اُس نے بڑی جرأت سے کام لیا۔ کاغذ کے ایک پرزے پر اُس نے زہرہ کو چند سطریں لکھیں . . . یہ سطریں مجھے یاد ہیں:۔

" زہرہ —— میں اچھی طرح جانتا ہوں۔ کہ میں تمہارا نوکر ہوں۔ تمہارے والد صاحب مجھے تیس روپے ماہوار دیتے ہیں مگر میں تم سے محبت کرتا ہوں —— میں کیا کروں۔ کیا نہ کروں، میری سمجھ میں نہیں آتا —— "

یہ سطریں کاغذ پر لکھ کر اُس نے کاغذ اُسکی ایک کتاب میں رکھ دیا۔ دوسرے روز جب وہ اُسے موٹر میں اسکول لے گیا تو اُسکے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ ہینڈل کئی بار اُسکے گرفت سے نکل گیا۔ مگر خدا کا شکر ہے۔ کوئی ایکسیڈنٹ نہ ہوا۔ اُس روز اُس کی کیفیت عجیب رہی۔ شام کو جب وہ زہرہ کو اسکول سے واپس لا رہا تھا۔ تو راستے میں اُس لڑکی نے اُسے موٹر روکنے کے لئے کہا۔ اُس نے جب موٹر روک لی تو زہرہ نے نہایت سنجیدگی کے ساتھ اُس سے کہا۔ " دیکھو نعیم۔ آئندہ تم ایسی حرکت کبھی نہ کرنا میں نے ابھی تک اباجی سے تمہارے اُس خط کا ذکر نہیں کیا جو تم نے میری کتاب میں رکھ دیا تھا۔ لیکن اگر پھر تم نے ایسی حرکت کی تو مجھے مجبوراً اُن سے شکایت کرنا پڑے گی۔ سمجھے . . . چلو اب موٹر چلاؤ "

اس گفتگو کے بعد اُس نے بہت کوشش کی۔ کہ ڈپٹی صاحب کی نوکری چھوڑ دے۔ اور زہرہ کی محبت کو اپنے دل سے ہمیشہ کے لئے مٹا دے۔ مگر وہ کامیاب نہ ہوسکا۔ ایک مہینہ اس کش مکش میں گذر گیا۔ ایک روز اُسنے پھر جرأت سے کام لے کر خط لکھا۔ اور اُس کی ایک کتاب میں رکھ کر اپنی قسمت کے فیصلے کا انتظار کرنے لگا۔ اُسے یقین تھا۔ کہ دوسرے روز صبح کو اُسے نوکری سے برطرف کردیا جائیگا۔ مگر ایسا نہ ہُوا۔ شام کو اسکول سے واپس آتے ہوئے زہرہ اُس سے ہمکلام ہوئی۔ اور اُس نے ایک بار پھر اُس کو ایسی حرکتوں سے باز رہنے کے لئے کہا۔ " اگر تمہیں اپنی عزت کا خیال نہیں۔ تو کم از کم میری عزت و آبرو کا

تو کچھ خیال نہیں ہونا چاہیئے"۔ یہ اُس نے ایک بار پھر اُس کو کچھ اس سنجیدگی اور متانت سے کہا۔ کہ نعیم کی ساری امیدیں فنا ہو گئیں۔ اور اُس نے قصد کر لیا۔ کہ وہ نوکری چھوڑ دے گا۔ اور لکھنؤ سے ہمیشہ کے لئے چلا جائے گا۔ مہینے کے آخیر میں نوکری چھوٹنے سے پہلے اُس نے اپنی کوٹھڑی میں لالٹین کی مدھم روشنی میں زہرہ کو آخری خط لکھا۔ اس میں اُس نے نہایت درد بھرے لہجے میں اُس سے کہا: "زہرہ میں نے بہت کوشش کی ہے۔ کہ میں تمہارے کہے پر عمل کر سکوں۔ مگر دل پر میرا اختیار نہیں ہے۔ یہ میرا آخری خط ہے کل شام کو میں لکھنؤ چھوڑ دونگا۔ اس لئے تمہیں اپنے والد صاحب سے کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ تمہاری خاموشی میری قسمت کا فیصلہ کر دے گی۔ مگر یہ خیال نہ کرنا۔ کہ تم سے دور رہ کر میں تم سے محبت نہیں کرونگا۔ میں جہاں کہیں بھی رہونگا۔ میرا دل تمہارے قدموں میں ہوگا —— میں ہمیشہ اُن دنوں کو یاد کرتا رہونگا۔ جب میں موٹر اس لئے آہستہ آہستہ چلاتا تھا۔ کہ تمہیں دھکا نہ لگے . . . . . میں اس کے سوا اور تمہارے لئے کر ہی کیا سکتا تھا . . ."

یہ خط بھی اُس نے موقع پا کر اُس کی کتاب میں رکھ دیا۔

صبح کو زہرہ نے اسکول جاتے ہوئے اُس سے کوئی بات نہ کی اور شام کو بھی راستے میں اُس نے کچھ نہ کہا۔ چنانچہ وہ بالکل ناامید ہو کر اپنی کوٹھڑی میں چلا آیا۔ جو تھوڑا بہت اسباب اُسکے پاس تھا۔ باندھ کر اُس نے ایک طرف رکھ دیا۔ اور لالٹین کی اندھی روشنی میں چارپائی پر بیٹھ کر سوچنے لگا۔ کہ زہرہ اور اُس کے درمیان کتنا بڑا فاصلہ ہے۔

وہ بے حد مغموم تھا۔ وہ اپنی پوزیشن سے اچھی طرح واقف تھا۔ اُسے اس بات کا احساس تھا۔ کہ وہ ایک ادنٰے درجے کا ملازم ہے۔ اور اپنے آقا کی لڑکی سے محبت کرنے کا کوئی حق نہیں رکھتا۔ لیکن اس کے باوجود وہ کبھی کبھی سوچتا تھا۔ کہ اگر وہ اُس سے محبت کرتا ہے۔ تو اس میں اسکا کیا قصور ہے۔ اور پھر اس کی محبت فریب تو نہیں۔ وہ اسی ادھیڑبن میں تھا۔ کہ آدھی رات کے قریب اُس کی کوٹھڑی کے دروازے پر دستک ہوئی۔ اس کا دل دھک سے رہ گیا۔ لیکن پھر اُس نے خیال کیا۔ کہ مالی ہوگا ممکن ہے۔ اُسکے گھر میں کوئی ایکا ایکی بیمار پڑ گیا ہو۔ اور وہ اُس سے مدد لینے کے لئے آیا ہو۔ لیکن جب اُس نے دروازہ کھولا تو زہرہ سامنے کھڑی تھی —— جی ہاں زہرہ . . . . . دسمبر کی سردی میں وہ بغیر شال کے اُسکے سامنے کھڑی تھی۔ اُس کی زبان گنگ ہو گئی۔ اُس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ کیا کہے۔ چند لمحات قبر کی سی خاموشی میں گزر گئے۔ آخر زہرہ کے ہونٹ وا ہوئے۔ اور تھرتھراتے ہوئے لہجے میں اُس نے کہا "نعیم میں تمہارے پاس آ گئی ہوں۔ بتاؤ اب تم کیا چاہتے ہو . . . لیکن اس سے پہلے کہ تمہاری اس کوٹھڑی میں داخل ہوں۔ میں تم سے چند سوال پوچھنا چاہتی ہوں"

نعیم خاموش رہا۔ لیکن زہرہ اُس سے سوال پوچھنے لگی "کیا تم واقعی مجھ سے محبت کرتے ہو"

نعیم کو جیسے ٹھیس سی لگی۔ اُس کا چہرہ تمتما اٹھا "زہرہ تم ایسا سوال پوچھ رہی ہو۔ جسکا جواب اگر میں دوں۔ تو میری محبت کی توہین ہوگی . . . میں تم سے پوچھتا ہوں۔ کیا میں محبت نہیں کرتا؟"

زہرہ نے اس سوال کا جواب نہ دیا۔ اور تھوڑی دیر خاموش رہ کر اپنا دوسرا سوال کیا "میرے باپ کے پاس کافی دولت ہے مگر میرے پاس ایک پھوٹی کوڑی بھی نہیں۔ جو کچھ میرا کہا جاتا ہے وہ میرا نہیں۔ اُن کا ہے۔ کیا تم مجھے دولت کے بغیر بھی ویسا ہی عزیز سمجھو گے؟"

نعیم بہت جذباتی آدمی تھا۔ چنانچہ اس سوال نے بھی اُس کے وقار کو زخمی کیا۔ بڑے دکھ بھرے لہجے میں اُس نے زہرہ سے کہا "زہرہ خدا کے لئے مجھ سے ایسے سوال نہ پوچھو۔ جن کا جواب اس قدر عام ہو چکا ہے۔ کہ تمہیں تھرڈ کلاس عشقیہ ناولوں میں بھی مل سکتا ہے . . . . "

زہرہ اُس کی کوٹھڑی میں داخل ہو گئی۔ اور اُس کی چارپائی پر بیٹھ کر کہنے لگی "میں تمہاری ہوں اور ہمیشہ تمہاری رہونگی۔"

زہرہ نے اپنا قول پورا کیا۔ جب دونوں لکھنؤ چھوڑ کر دہلی چلے آئے۔ اور شادی کر کے ایک چھوٹے سے مکان میں رہنے لگے

تو ڈپٹی صاحب ڈھونڈتے ڈھونڈتے وہاں پہنچ گئے۔ نعیم کو نوکری مل گئی تھی، اس لئے وہ گھر میں نہیں تھا۔ ڈپٹی صاحب نے زہرہ کو بہت برا بھلا کہا۔ اُن کی ساری عزت خاک میں مل گئی تھی۔ وہ چاہتے تھے۔ کہ زہرہ نعیم کو چھوڑ دے۔ اور جو کچھ ہو چکا ہے۔ اُسے بھول جائے۔ وہ نعیم کو دو تین ہزار روپیہ دینے کے لئے بھی تیار تھے۔ مگر انہیں ناکام لوٹنا پڑا۔ اس لئے کہ زہرہ نعیم کو کسی قیمت پر بھی چھوڑنے کے لئے تیار نہ ہوئی۔ اُس نے اپنے باپ سے کہا۔ "ابا جی میں نعیم کے ساتھ بہت خوش ہوں۔ آپ اُس سے اچھا شوہر میرے لئے کبھی تلاش نہ کر سکتے۔ میں اور وہ آپ سے کچھ نہیں مانگتے اگر آپ ہمیں دعائیں دے سکیں۔ تو ہم آپ کے ممنون ہونگے۔"

ڈپٹی صاحب نے جب یہ گفتگو سنی۔ تو بہت خشم آلود ہوئے انہوں نے نعیم کو قید کرا دینے کی دھمکی بھی دی۔ مگر زہرہ نے صاف صاف کہہ دیا۔ "ابا جی اس میں نعیم کا کیا قصور ہے۔ سچ تو یہ ہے۔ کہ ہم دونوں بے قصور ہیں۔ البتہ ہم ایک دوسرے سے محبت ضرور کرتے ہیں۔ اور وہ میرا شوہر ہے . . . یہ کوئی قصور نہیں ہے۔ میں نابالغ نہیں ہوں"

ڈپٹی صاحب عقلمند تھے۔ فوراً سمجھ گئے۔ کہ جب اُن کی بیٹی ہی رضامند ہے۔ تو نعیم پر کیسے جرم عائد ہو سکتا ہے۔ چنانچہ وہ زہرہ کو ہمیشہ کے لئے چھوڑ کر چلے گئے۔ لیکن کچھ عرصے کے بعد ڈپٹی صاحب نے مختلف لوگوں کے ذریعے سے نعیم پر دباؤ ڈالنے اور اُس کو روپے پیسے سے لالچ دینے کی کوشش کی۔ مگر ناکام رہے۔

دونوں کی زندگی بڑے مزے میں گزر رہی تھی۔ گو نعیم کی آمدنی بہت ہی کم تھی۔ اور زہرہ کو جو نازو نعمت میں پلی تھی بدن پر کھردرے کپڑے پہننے پڑتے تھے۔ اور اپنے ہاتھ سے سب کام کرنے پڑتے تھے۔ مگر وہ خوش تھی۔ وہ خود کو ایک نئی دنیا میں پاتی تھی۔ جہاں قدم قدم پر نعیم کی محبت کے نئے نئے پہلو اُس پر منکشف ہوتے تھے۔ وہ بہت سکھی تھی — بہت سکھی۔ نعیم بھی بہت خوش تھا۔ لیکن ایک روز خدا کا کرنا ایسا ہوا۔ کہ زہرہ کے سینے میں ایک موذی درد اٹھا۔ اور پیشتر اس کے کہ نعیم اُسکے لئے کچھ کر سکے۔ وہ اس دنیا سے رخصت ہو گئی۔ اور نعیم کی دنیا ہمیشہ کے لئے تاریک کر گئی۔

یہ داستان، اُس نے رُک رُک کر اور خود مزا لے کر قریباً چار گھنٹوں میں سنائی۔ جب وہ اپنا حال دل سنا چکا۔ تو اُس کا چہرہ بجائے زرد ہونے کے تمتما اٹھا۔ جیسے اُسکے اندر آہستہ آہستہ کسی نے خون داخل کر دیا ہے۔ لیکن اُس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ اور اُسکا حلق سوکھ گیا تھا۔

داستان جب ختم ہو گئی۔ تو وہ فوراً اٹھ کھڑا ہوا۔ جیسے اُسے بہت جلدی ہے۔ اور کہنے لگا۔ "میں نے بہت غلطی کی کہ آپ کو اپنی داستان محبت سنا دی . . . میں نے بہت غلطی کی . . . زہرہ کا ذکر صرف مجھ تک ہی محدود رہنا چاہیئے تھا . . . لیکن . . . لیکن . . ." اُس کی آواز بھرا گئی . . . "میں زندہ ہوں۔ اور وہ . . . وہ . . ." وہ اس سے آگے کچھ نہ کہہ سکا۔ اور جلدی سے میرا ہاتھ دبا کر کمرے سے باہر چلا گیا۔

* * * * *

نعیم سے پھر میری ملاقات نہ ہوئی۔ میں ایک دو دفعہ کئی مرتبہ اُس کی تلاش میں گیا۔ مگر وہ نہ ملا۔ چھ یا سات مہینے کے بعد اُس کا ایک خط مجھے ملا۔ جس کو میں یہاں پر نقل کر رہا ہوں:۔

—— صاحب۔

آپ کو یاد ہوگا۔ میں نے آپ کے مکان پر اپنی داستان عشق آپ کو سنائی تھی — وہ محض فسانہ تھا۔ ایک جھوٹا فسانہ۔ نہ کوئی زہرہ ہے۔ اور نہ کوئی نعیم . . . میں ویسے موجود تو ہوں مگر وہ نعیم نہیں ہوں جسنے زہرہ سے محبت کی تھی۔ آپ نے ایک بار کہا تھا۔ کہ بعض لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں۔ جو محبت کے معاملے میں بانجھ ہوتے ہیں۔ میں بھی اُن بدقسمت آدمیوں میں سے ایک ہوں جس کی ساری جوانی اپنا دل بہلانے میں گذر گئی۔ زہرہ سے نعیم کی محبت ایک دل بہلاوا تھا۔ اور زہرہ کی موت . . . میں ابھی تک نہیں سمجھ سکا۔ کہ میں نے اُسے کیوں مار دیا۔ بہت ممکن ہے

کہ اس میں بھی میری زندگی کی سیاہی کا دخل ہو۔

مجھے معلوم نہیں۔ کہ آپ نے میرا افسانہ جھوٹا سمجھا۔ یا سچا لیکن میں آپ کو ایک عجیب بات بتا تا ہوں۔ کہ میں نے . . . یعنی میں جھوٹے افسانے کے خالق نے اس کو بالکل سچا سمجھا۔ سو فیصدی حقیقت پر مبنی۔ مجھے ایسا محسوس ہوا کہ میں نے واقعی زہرہ سے محبت کی ہے۔ اور وہ سچ مچ مر چکی ہے۔ آپ کو یہ سن کر اور بھی تعجب ہوگا۔ کہ جوں جوں وقت گزرتا گیا۔ اس فسانے کے اندر حقیقت کا عنصر زیادہ ہوتا گیا۔ اور زہرہ کی آواز۔ اس کی ہنسی بھی میرے کانوں میں گونجنے لگی۔ میں اُسکے سانس کی گرمی تک کو محسوس کرنے لگا۔ افسانے کا ہر ذرّہ جاندار ہو گیا۔ اور میں نے . . . . اور میں نے یوں اپنی قبر اپنے ہاتھوں سے کھود دی . . .

زہرہ فسانہ نہیں۔ مگر میں تو فسانہ ہوں۔ وہ مر چکی ہے اس لئے مجھے بھی مر جانا چاہیئے۔ یہ خط آپ کو میری موت واقع ہو جانے کے بعد ملے گا . . . الوداع . . . زہرہ مجھے ضرور ملے گی . . . کہاں ؟ . . . یہ مجھے معلوم نہیں۔

میں نے یہ چند سطور صرف اس لئے آپ کو لکھ دی ہیں کہ آپ افسانہ نگار ہیں۔ اگر اس سے آپ افسانہ تیار کریں۔ تو آپ کو سات آٹھ روپے مل جائینگے۔ کیونکہ ایک مرتبہ آپ نے کہا تھا۔ کہ ایک افسانے کا معاوضہ آپ کو سات سے دس روپے تک مل جایا کرتا ہے۔ یہ میرا تحفہ ہوگا۔ اچھا الوداع۔

آپکا ملاقاتی نعیم

* * * * *

نعیم نے اپنے لئے زہرہ بنائی اور مر گیا —— میں نے اپنے لئے یہ افسانہ تخلیق کیا ہے۔ اور زندہ ہوں —— یہ میری زیادتی ہے۔

* * * * *

۱۔ انسان ہونے کے لحاظ سے دنیا میں کچھ کر کے واپس جانا چاہیئے ورنہ یوں تو لاکھوں اور کروڑوں انسان بھی ہیں اور حیوان بھی۔
۲۔ دنیا میں اس شخص سے بڑھکر کوئی فاتح نہیں جس نے اپنے دل پر قابو حاصل کر لیا ہے۔ اور جس نے دل پر فتح پالی اس نے ہر چیز کو فتح کر لیا۔
۳۔ خوشی کی تہ میں غم اور غم کی تہ میں خوشی پیدا ہوتی ہے۔
۴۔ نیچے دیکھنے کی بجائے اوپر۔ پیچھے دیکھنے کی بجائے آگے اور اندر دیکھنے کی بجائے باہر دیکھو۔
۵۔ تو پکار پکار کر کل کہہ رہا ہے۔ اور وقت چیخ چیخ کر آج۔
۶۔ جو انسان دوسروں کی برائیوں کو نہیں بھولتا وہ اُس پل کو توڑتا ہے۔ جس پر سے اُسے خود گزرنا ہے۔
۷۔ امید سورج کی مانند ہے۔ ہم جتنے زیادہ اس کی طرف بڑھیں گے مایوسی کا اتنا ہی زیادہ بوجھ وہ ہمارے سر سے پھینکتی جائے گی۔
۸۔ حکومت کا تاج ان لوگوں کے سروں پر چمکتا ہے۔ جنہوں نے فرمانبرداری کے موتی حاصل کئے۔
۹۔ دولت اس کی نہیں ہوتی جو حاصل کرتا ہے۔ بلکہ اُس کی ہے جو اُس سے فائدہ اٹھاتا ہے۔
۱۰۔ کمزور آدمی کو اگر کامیابی کا یقین ہو تو وہ ضرور کامیاب ہوتا ہے۔ لیکن وہ طاقتور جو بے امید ہو جائے کبھی کامیاب نہیں ہوتا۔
۱۱۔ خدا ہر پرندہ کو خوراک دیتا ہے۔ لیکن اُس کے گھونسلے میں نہیں پھینکتا۔
۱۲۔ کھڑے ہونے کی طاقت انسان کو خدا دیتا ہے لیکن گرنے کی طاقت اس کی اپنی ہوتی ہے۔
۱۳۔ جو شخص جتنی زیادہ تکلیفیں اُٹھاتا ہے۔ اتنی ہی زیادہ مشقت کر سکتا ہے۔ اچھی طرح وہی حکومت کر سکتا ہے۔ جس نے اچھی طرح اطاعت کی ہو
۱۴۔ نفرت سے بڑھ کر چنگاری اور غصہ سے بڑھ کر کوئی آگ نہیں ٭

حسن عباس بی۔اے

بابوجی

اُس کی تنخواہ صرف پچیس روپے ماہوار تھی۔۔ ———

سرنیش کی زندگی پر مفلسی کا داغ کچھ اس طرح نمایاں تھا کہ اُسکے چھپائے نہ چھپ سکا۔ اور مٹانے کی کوشش میں تو اور بھی اُبھر آیا۔ اُسے اپنے سمیت چھ انسانوں کے لئے روزانہ دو وقت پیٹ کا ایندھن مہیا کرنا تھا۔ اس سے علاوہ زندگی کی دوسری ضروریات بھی تھیں۔ اور پھر اُس کی فیشن کی متوالی بیوی کے ناز و نخرے کے لئے روپیہ کہاں سے آتے۔ ! سردیوں میں اس کی اندھی ماں کوٹھڑی کے کچے فرش پر جس نے کبھی دھوپ کی ایک شعاع نہ دیکھی تھی۔ چٹائی بچھائے پھٹا پرانا سا کمبل اوڑھے پڑی رہتی۔ مگر وہ اُس کے لئے کچھ نہ کر سکا۔ اُسکا ایک بچہ نمونیہ میں مبتلا ہوکر اُس کی آنکھوں کے سامنے سرد ہوگیا۔ مگر وہ دوسرے بچوں کی حفاظت کے لئے فوراً ہی گرم کپڑے نہ سلا سکا اُس کا اپنا کوٹ جو اُس نے دو سال پہلے لنڈے بازار سے خریدا تھا۔ اب کہنیوں سے بالکل پھٹ چکا تھا۔ اور اُس کا کالر گردن کے نیچے اس طاق کی طرح میلا ہو رہا تھا جس پر روزانہ کئی چراغ جلائے جائیں۔ موسم سرما کی برفانی راتوں کو جب کبھی وہ اپنے غموں سے جلتے ہوئے سینے کو ٹھنڈک پہنچانے کے لئے ویرانوں کو نکل جاتا تو اُسے اپنی زندگی زمین پر بکھرتی ہوئی چاندنی سے زیادہ ویران اور خاموش نظر آتی۔ اُس کی حالت اُس کمزور گدھے کی سی تھی جس کی ٹانگیں انتہائی بوجھ کے مارے پھسلتی جا رہی ہوں۔ لیکن وہ خوف کے مارے اپنا بوجھ نہ گرا سکے۔

اُسے وہ باتیں یاد تھیں۔ جب دونوں مٹھیاں بھر بھر کر اپنی جوانی اور مرحوم باپ کی کمائی ہوئی دولت کسبیوں کے کوٹھوں پر لٹایا کرتا تھا۔ شب و روز کی مصروفیتوں نے اس کی جھولی جلدی خالی کردی بادل کے اُس ٹکڑے کی طرح جو صرف چند منٹ برس کر خاموش ہوجاتا ہے۔ اپنی بربادی کا احساس مٹانے کے لئے اُس نے اپنی شکستہ ناؤ کے لئے ایک دوسرا ملاح تلاش کیا۔ لیکن بے سود۔ نئی نویلی دلہن نے اُس کے رہے سہے اساسے کو بھی آگ لگا دی۔ وہ اب چار بچوں کی ماں ہونے پر بھی اُسی رفتار سے بڑھنا چاہتی تھی۔ لیکن سرنیش کے لئے اُس کے ساتھ ایک قدم بھی اٹھانا محال تھا۔

اُس کی تنخواہ صرف پچیس روپے ماہوار تھی۔ کل رات جب وہ تھک کر چور بستر پر لیٹا تو۔ کانتا نے دیوالی کے بہانے نئی ساڑھی اور چپل کی فرمائش کی۔ اُس نے کہا کہ اس کی ہمسائی بھاگونتی کے خاوند نے اُسے نیلے رنگ کی ساڑھی خرید دی ہے۔ لاجو نے بھی نئے کپڑے سلوانے ہیں۔ محلہ بھر میں دیوالی کے چرچے ہیں۔ آخر میری ہی قسمت ایسی کیا بُری ہے کہ کچھ نصیب نہیں۔ وہ اپنی کہے جا رہی تھی۔ لیکن سرنیش کا ذہن کسی اور طرف متوجہ تھا۔ ———

——— دفعتہً کانتا کی چوڑیاں کھنکھنائیں اور اُسے احساس ہوا کہ اُس کی زندگی میں ایک مدت سے کوئی آواز پیدا نہیں ہوئی۔ اُس نے سوچا بہت سوچا ساری دنیا میں اُسے صرف دفتر کے وہ چند چپڑاسی ہی ایسے انسان نظر آئے۔ جو بظاہر اس کی عزت کرتے تھے لیکن اس پر بھی جب وہ اُسے "بابوجی" کہکر پکارتے تو اُسے یوں محسوس ہوتا۔ جیسے اُسے کسی نے منہ پر گالی دی ہو۔ دُکھتی رگ کو چھیڑ دیا ہو۔ شاید اس لئے کہ ان الفاظ میں اُسے اپنی گذشتہ زندگی کی صدائے بازگشت سنائی دیتی تھی۔ کبھی زمانے میں کسبیاں بھی تو اُسے انہی الفاظ سے مخاطب کیا کرتی تھیں!

× × × × × × × × × ×

آج وہ دن ڈھلے جب دفتر سے لوٹا تو اُسے محسوس ہوا کہ اُس کا دل بند ہو رہا ہے۔ کام کی زیادتی نے اُسے کچھ دنوں

تو کچھ خیال نہیں ہونا چاہیئے"۔ یہ اُس نے ایک بار پھر اُس کو کچھ اس سنجیدگی اور متانت سے کہا۔ کہ نعیم کی ساری امیدیں فنا ہو گئیں۔ اور اُس نے قصد کر لیا۔ کہ وہ نوکری چھوڑ دے گا۔ اور لکھنؤ سے ہمیشہ کے لئے چلا جائے گا۔ مہینے کے آخر میں نوکری چھوڑنے سے پہلے اُس نے اپنی کوٹھڑی میں لالٹین کی مدھم روشنی میں زہرہ کو آخری خط لکھا۔ اس میں اُس نے نہایت درد بھرے لہجے میں اُس سے کہا: "زہرہ میں نے بہت کوشش کی ہے۔ کہ میں تمہارے کہے پر عمل کر سکوں۔ مگر دل پر میرا اختیار نہیں ہے۔ یہ میرا آخری خط ہے کل شام کو میں لکھنؤ چھوڑ دونگا۔ اس لئے تمہیں اپنے والد صاحب سے کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ تمہاری خاموشی میری قسمت کا فیصلہ کر دے گی۔ مگر یہ خیال نہ کرنا۔ کہ تم سے دور رہ کر میں تم سے محبت نہیں کرونگا۔ میں جہاں کہیں بھی رہونگا۔ میرا دل تمہارے قدموں میں ہو گا —— میں ہمیشہ اُن دنوں کو یاد کرتا رہونگا۔ جب میں موٹر اس لئے آہستہ آہستہ چلاتا تھا۔ کہ تمہیں دھکا نہ لگے . . . . . میں اس کے سوا اور تمہارے لئے کر ہی کیا سکتا تھا . . . "

یہ خط بھی اُس نے موقع پا کر اُس کی کتاب میں رکھ دیا۔ صبح کو زہرہ نے اسکول جاتے ہوئے اُس سے کوئی بات نہ کی اور شام کو بھی راستے میں اُس نے کچھ نہ کہا۔ چنانچہ وہ بالکل نا امید ہو کر اپنی کوٹھڑی میں چلا آیا۔ جو تھوڑا بہت اسباب اُسکے پاس تھا۔ باندھ کر اُس نے ایک طرف رکھ دیا۔ اور لالٹین کی اندھی روشنی میں چارپائی پر بیٹھ کر سوچنے لگا۔ کہ زہرہ اور اُس کے درمیان کتنا بڑا فاصلہ ہے۔

وہ بے حد مغموم تھا۔ وہ اپنی پوزیشن سے اچھی طرح واقف تھا۔ اُسے اس بات کا احساس تھا۔ کہ وہ ایک ادنےٰ درجے کا ملازم ہے۔ اور اپنے آقا کی لڑکی سے محبت کرنے کا کوئی حق نہیں رکھتا۔ لیکن اس کے باوجود وہ کبھی کبھی سوچتا تھا۔ کہ اگر وہ اُس سے محبت کرتا ہے۔ تو اس میں اسکا کیا قصور ہے۔ اور پھر اس کی محبت فریب تو نہیں۔ وہ اسی ادھیڑبن میں تھا۔ کہ آدھی رات کے قریب اُس کی کوٹھڑی کے دروازے پر دستک ہوئی۔ اس کا دل دھک سے رہ گیا۔ لیکن پھر اُس نے خیال کیا۔ کہ مالی ہوگا ممکن ہے۔ اُسکے گھر میں کوئی ایکا ایکی بیمار پڑ گیا ہو۔ اور وہ اُس سے مدد لینے کے لئے آیا ہو۔ لیکن جب اُس نے دروازہ کھولا تو زہرہ سامنے کھڑی تھی —— جی ہاں زہرہ . . . . . دسمبر کی سردی میں وہ بغیر شال کے اُسکے سامنے کھڑی تھی۔ اُس کی زبان گنگ ہو گئی۔ اُس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ کیا کہے۔ چند لمحات قبر کی سی خاموشی میں گزر گئے۔ آخر زہرہ کے ہونٹ وا ہوئے۔ اور تھرتھراتے ہوئے لہجے میں اُس نے کہا، "نعیم میں تمہارے پاس آگئی ہوں۔ بتاؤ اب تم کیا چاہتے ہو . . . لیکن اس سے پہلے کہ تمہاری اس کوٹھڑی میں داخل ہوں۔ میں تم سے چند سوال پوچھنا چاہتی ہوں"

نعیم خاموش رہا۔ لیکن زہرہ اُس سے سوال پوچھنے لگی "کیا تم واقعی مجھ سے محبت کرتے ہو"

نعیم کو جیسے ٹھیس سی لگی۔ اُس کا چہرہ تمتما اٹھا، "زہرہ تم ایسا سوال پوچھ رہی ہو۔ جسکا جواب اگر میں دوں۔ تو میری محبت کی توہین ہوگی . . . میں تم سے پوچھتا ہوں۔ کیا میں محبت نہیں کرتا؟"

زہرہ نے اس سوال کا جواب نہ دیا۔ اور تھوڑی دیر خاموش رہ کر اپنا دوسرا سوال کیا، "میرے باپ کے پاس کافی دولت ہے مگر میرے پاس ایک پھوٹی کوڑی بھی نہیں۔ جو کچھ میرا کہا جاتا ہے وہ میرا نہیں۔ اُن کا ہے۔ کیا تم مجھے دولت کے بغیر بھی ویسا ہی عزیز سمجھو گے"

نعیم بہت جذباتی آدمی تھا۔ چنانچہ اس سوال نے بھی اُس کے وقار کو زخمی کیا۔ بڑے دکھ بھرے لہجے میں اُس نے زہرہ سے کہا، "زہرہ خدا کے لئے مجھ سے ایسے سوال نہ پوچھو۔ جن کا جواب اس قدر عام ہو چکا ہے۔ کہ تمہیں تھرڈ کلاس عشقیہ ناولوں میں بھی مل سکتا ہے . . . . "

زہرہ اُس کی کوٹھڑی میں داخل ہو گئی۔ اور اُس کی چارپائی پر بیٹھ کر کہنے لگی "میں تمہاری ہوں اور ہمیشہ تمہاری رہونگی۔"

زہرہ نے اپنا قول پورا کیا۔ جب دونوں لکھنؤ چھوڑ کر دہلی چلے آئے۔ اور شادی کر کے ایک چھوٹے سے مکان میں رہنے لگے

ڈپٹی صاحب ڈھونڈتے ڈھونڈتے وہاں پہنچ گئے۔ نعیم کو نوکری مل گئی تھی۔ اس لئے وہ گھر میں نہیں تھا۔ ڈپٹی صاحب نے زہرہ کو بہت بُرا بھلا کہا۔ اُن کی ساری عزت خاک میں مل گئی تھی۔ وہ چاہتے تھے۔ کہ زہرہ نعیم کو چھوڑ دے۔ اور جو کچھ ہو چکا ہے۔ اُسے بھول جائے۔ وہ نعیم کو دو تین ہزار روپیہ دینے کے لئے بھی تیار تھے۔ مگر انہیں ناکام لوٹنا پڑا۔ اس لئے کہ زہرہ نعیم کو کسی قیمت پہ بھی چھوڑنے کے لئے تیار نہ ہوئی۔ اُس نے اپنے باپ سے کہا۔ "اباجی میں نعیم کے ساتھ بہت خوش ہوں۔ آپ اُس سے اچھا شوہر میرے لئے کبھی تلاش نہ کر سکتے۔ میں اور وہ آپ سے کچھ نہیں مانگتے اگر آپ ہمیں دعائیں دے سکیں۔ تو ہم آپ کے ممنون ہونگے"

ڈپٹی صاحب نے جب یہ گفتگو سنی۔ تو بہت خشم آلود ہوئے انہوں نے نعیم کو قید کرا دینے کی دھمکی بھی دی۔ مگر زہرہ نے صاف صاف کہہ دیا۔ "اباجی اس میں نعیم کا کیا قصور ہے۔ سچ تو یہ ہے۔ کہ ہم دونوں بے قصور ہیں۔ البتہ ہم ایک دوسرے سے محبت ضرور کرتے ہیں۔ اور وہ میرا شوہر ہے . . . یہ کوئی قصور نہیں ہے۔ میں نابالغ نہیں ہوں"

ڈپٹی صاحب عقلمند تھے۔ فوراً سمجھ گئے۔ کہ جب اُن کی بیٹی ہی رضامند ہے۔ تو نعیم پر کیسے جرم عائد ہو سکتا ہے۔ چنانچہ وہ زہرہ کو ہمیشہ کے لئے چھوڑ کر چلے گئے۔ لیکن کچھ عرصے کے بعد ڈپٹی صاحب نے مختلف لوگوں کے ذریعے سے نعیم پر دباؤ ڈالنے اور اُس کو روپے پیسے سے لالچ دینے کی کوشش کی۔ مگر ناکام رہے۔

دونوں کی زندگی بڑے مزے میں گزر رہی تھی۔ گو نعیم کی آمدنی بہت ہی کم تھی۔ اور زہرہ کو جو نازو نعمت میں پلی تھی بدن پر کھردرے کپڑے پہننے پڑتے تھے۔ اور اپنے ہاتھ سے سب کام کرنے پڑتے تھے۔ مگر وہ خوش تھی۔ وہ خود کو ایک نئی دنیا میں پاتی تھی۔ جہاں قدم قدم پر نعیم کی محبت کے نئے نئے پہلو اُس پر منکشف ہوتے تھے۔ وہ بہت سکھی تھی — بہت سکھی۔ نعیم بھی بہت خوش تھا۔ لیکن ایک روز خدا کا کرنا ایسا ہوا۔ کہ زہرہ کے سینے میں ایک موذی درد اٹھا۔ اور پیشتر اس کے کہ نعیم اُسکے لئے کچھ کر سکے۔ وہ اس دنیا سے رخصت ہو گئی۔ اور نعیم کی دنیا ہمیشہ کے لئے تاریک کر گئی۔

یہ داستان اُس نے رُک رُک کر اور خود مزا لے لے کر قریباً چار گھنٹوں میں سنائی۔ جب وہ اپنا حال دل سُنا چکا۔ تو اُس کا چہرہ بجائے زرد ہونے کے تمتما اٹھا۔ جیسے اُسکے اندر آہستہ آہستہ کسی نے خون داخل کر دیا ہے۔ لیکن اُس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ اور اُسکا حلق سوکھ گیا تھا۔

داستان جب ختم ہو گئی۔ تو وہ فوراً اٹھ کھڑا ہوا۔ جیسے اُسے بہت جلدی ہے۔ اور کہنے لگا۔ "میں نے بہت غلطی کی کہ آپ کو اپنی داستانِ محبت سنا دی . . . . میں نے بہت غلطی کی . . . زہرہ کا ذکر صرف مجھ تک ہی محدود رہنا چاہیئے تھا . . . لیکن . . . لیکن . . ." اُس کی آواز بھرا گئی . . . . "میں زندہ ہوں۔ اور وہ . . . . وہ . . ." وہ اس سے آگے کچھ نہ کہہ سکا۔ اور جلدی سے میرا ہاتھ دبا کر کمرے سے باہر چلا گیا۔

* * * * *

نعیم سے پھر میری ملاقات نہ ہوئی۔ میں ایبٹ آباد کئی مرتبہ اُس کی تلاش میں گیا۔ مگر وہ نہ ملا۔ چھ یا سات مہینے کے بعد اُس کا ایک خط مجھے ملا۔ جس کو میں یہاں پہ نقل کر رہا ہوں:-

—— صاحب۔

آپ کو یاد ہوگا۔ میں نے آپ کے مکان پہ اپنی داستانِ عشق آپ کو سنائی تھی — وہ محض فسانہ تھا۔ ایک جھوٹا فسانہ۔ نہ کوئی زہرہ ہے۔ اور نہ کوئی نعیم . . . میں ویسے موجود تو ہوں مگر وہ نعیم نہیں ہوں جسنے زہرہ سے محبت کی تھی۔ آپ نے ایک بار کہا تھا۔ کہ بعض لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں۔ جو محبت کے معاملے میں بانجھ ہوتے ہیں۔ میں بھی اُن بدقسمت آدمیوں میں سے ایک ہوں جس کی ساری جوانی اپنا دل بہلانے میں گذر گئی۔ زہرہ سے نعیم کی محبت ایک دل بہلاوا تھا۔ اور زہرہ کی موت . . . میں ابھی تک نہیں سمجھ سکا۔ کہ میں نے اُسے کیوں مار دیا۔ بہت ممکن ہے

کہ اس میں بھی میری زندگی کی سیاہی کا دخل ہو۔

مجھے معلوم نہیں۔ کہ آپ نے میرا افسانہ جھوٹا سمجھا۔ یا سچا لیکن میں آپ کو ایک عجیب بات بتاتا ہوں۔ کہ میں نے . . . یعنی میں جھوٹے افسانے کے خالق نے اُس کو بالکل سچا سمجھا۔ سو فیصدی حقیقت پر مبنی۔ مجھے ایسا محسوس ہوا کہ میں نے واقعی زہرہ سے محبت کی ہے۔ اور وہ سچ مچ مر چکی ہے۔ آپ کو یہ سن کر اور بھی تعجب ہوگا۔ کہ جوں جوں وقت گزرتا گیا۔ اُس فسانے کے اندر حقیقت کا عنصر زیادہ ہوتا گیا۔ اور زہرہ کی آواز۔ اُس کی ہنسی بھی میرے کانوں میں گونجنے لگی۔ میں اُسکے سانس کی گرمی تک کو محسوس کرنے لگا۔ افسانے کا ہر ذرہ جاندار ہو گیا۔ اور میں نے . . . ۔ اور میں نے یوں اپنی قبر اپنے ہاتھوں سے کھود دی . . .

زہرہ فسانہ نہ سہی مگر میں تو فسانہ ہوں۔ وہ مر چکی ہے اِس لئے مجھے بھی مر جانا چاہیئے۔ یہ خط آپ کو میری موت واقع ہو جانے کے بعد ملے گا . . . الوداع . . . زہرہ مجھے ضرور ملے گی . . . . کہاں؟ . . . . یہ مجھے معلوم نہیں۔

میں نے یہ چند سطور صرف اس لئے آپ کو لکھ دی ہیں کہ آپ افسانہ نگار ہیں۔ اگر اس سے آپ افسانہ تیار کرلیں۔ تو آپ کو سات آٹھ روپے مل جائینگے۔ کیونکہ ایک مرتبہ آپ نے کہا تھا۔ کہ ایک افسانے کا معاوضہ آپ کو سات سے دس روپے تک مل جایا کرتا ہے۔ یہ میرا تحفہ ہوگا۔ اچھا الوداع۔

آپکا ملاقاتی نعیم

* * * * *

نعیم نے اپنے لئے زہرہ بنائی اور مر گیا —— میں نے اپنے لئے یہ افسانہ تخلیق کیا ہے۔ اور زندہ ہوں —— یہ میری زیادتی ہے۔

* * * * *

۱۔ انسان ہونے کے لحاظ سے دنیا میں کچھ کرکے واپس جانا چاہیئے۔ ورنہ یوں تو لاکھوں اور کروڑوں انسان بھی ہیں اور حیوان بھی۔

۲۔ دنیا میں اس شخص سے بڑھکر کوئی فاتح نہیں جس نے اپنے دل پر قابو حاصل کر لیا ہے۔ اور جس نے دل پر فتح پالی اس نے ہر چیز کو فتح کر لیا۔

۳۔ خوشی کی تہ میں غم اور غم کی تہ میں خوشی پیدا ہوتی ہے۔

۴۔ نیچے دیکھنے کی بجائے اوپر۔ پیچھے دیکھنے کی بجائے آگے اور اندر دیکھنے کی بجائے باہر دیکھو۔

۵۔ تو پکار پکار کر کل کہہ رہا ہے۔ اور وقت چیخ چیخ کر آج۔

۶۔ جو انسان دوسروں کی برائیوں کو نہیں بھولتا وہ اُس پل کو توڑ رہا ہے۔ جس پر سے اُسے خود گزرنا ہے۔

۷۔ امید سورج کی مانند ہے۔ ہم جتنے زیادہ اس کی طرف بڑھیں گے مایوسی کا اتنا ہی زیادہ بوجھ وہ ہمارے سر سے پھینکتی جاتے گی۔

۸۔ حکومت کا تاج ان لوگوں کے سروں پر چمکتا ہے۔ جنہوں نے فرمانبرداری کے موتی حاصل کئے۔

۹۔ دولت اس کی نہیں ہوتی جو حاصل کرتا ہے۔ بلکہ اُس کی ہے جو اُس سے فائدہ اٹھاتا ہے۔

۱۰۔ کمزور آدمی کو اگر کامیابی کا یقین ہو تو وہ ضرور کامیاب ہوتا ہے۔ لیکن وہ طاقتور جو بے امید ہو جائے کبھی کامیاب نہیں ہوتا۔

۱۱۔ خدا ہر پرندہ کو خوراک دیتا ہے۔ لیکن اس کے گھونسلے میں نہیں پھینکتا۔

۱۲۔ کھڑے ہونے کی طاقت انسان کو خدا دیتا ہے لیکن گرنے کی طاقت اس کی اپنی ہوتی ہے۔

۱۳۔ جو شخص جتنی زیادہ تکلیفیں اُٹھاتا ہے۔ اتنی ہی زیادہ مشقت کر سکتا ہے۔ اچھی طرح وہی حکومت کر سکتا ہے۔ جس نے اچھی طرح اطاعت کی

۱۴۔ نفرت سے بڑھ کر چنگاری اور غصہ سے بڑھ کر کوئی آگ نہیں ٭

حسن عباس بی۔اے

بابوجی

اُس کی تنخواہ صرف پچیس روپے ماہوار تھی۔۔ ——

سریش کی زندگی پر مفلسی کا داغ کچھ اس طرح نمایاں تھا کہ اُسکے چھپائے نہ چھپ سکا۔ اور مٹانے کی کوشش میں تو اور بھی اُبھر آیا۔ اُسے اپنے سمیت چھ انسانوں کے لئے روزانہ دو وقت پیٹ کا ایندھن مہیا کرنا تھا۔ اس سے علاوہ زندگی کی دوسری ضروریات بھی تھیں۔ اور پھر اُس کی فیشن کی متوالی بیوی کے ناز نخرے کے لئے روپیہ کہاں سے آتے۔۔! سردیوں میں اس کی اندھی ماں کوٹھڑی کے کچے فرش پر جس نے کبھی دھوپ کی ایک شعاع نہ دیکھی تھی۔ چٹائی بچھائے پھٹا پرانا سا کمبل اوڑھے پڑی رہتی۔ مگر وہ اُس کے لئے کچھ نہ کرسکا۔ اسکا ایک بچہ نمونیہ میں مبتلا ہوکر اُس کی آنکھوں کے سامنے سرد ہو گیا۔ مگر وہ دوسرے بچوں کی حفاظت کے لئے فوراً ہی گرم کپڑے نہ سلا سکا اُس کا اپنا کوٹ جو اُس نے دو سال پہلے لنڈے بازار سے خریدا تھا۔ اب کہنیوں سے بالکل پھٹ چکا تھا۔ اور اُس کا کالر گردن کے نیچے اس طاق کی طرح میلا ہو رہا تھا جس پر روزانہ کئی چراغ جلائے جائیں۔ موسم سرما کی برفانی راتوں کو جب کبھی وہ اپنے غموں سے جلتے ہوئے سینے کو ٹھنڈک پہنچانے کے لئے ویرانوں کو نکل جاتا تو اُسے اپنی زندگی زمین پر بکھرتی ہوئی چاندنی سے زیادہ ویران اور خاموش نظر آتی۔ اُس کی حالت اُس کمزور گدھے کی سی تھی جس کی ٹانگیں انتہائی بوجھ کے مارے پھسلتی جارہی ہوں۔ لیکن وہ خوف کے مارے اپنا بوجھ نہ گرا سکے۔

اُسے وہ باتیں یاد تھیں۔ جب دونوں مٹھیاں بھر بھر کر اپنی جوانی اور مرحوم باپ کی کمائی ہوئی دولت کسبیوں کے کوٹھوں پر لٹایا کرتا تھا۔ شب و روز کی مصروفیتوں نے اس کی جھولی جلدی خالی کردی بادل کے اُس ٹکڑے کی طرح جو صرف چند منٹ برس کر خاموش ہو جاتا ہے۔ اپنی بربادی کا احساس مٹانے کے لئے اُس نے اپنی شکستہ ناؤ کے لئے ایک دوسرا ملاح تلاش کیا۔ لیکن بے سود۔ نئی نویلی دلہن نے اُس کے رہے سہے اساسے کو بھی آگ لگا دی۔ وہ اب چار بچوں کی ماں ہونے پر بھی اُسی رفتار سے بڑھنا چاہتی تھی۔ لیکن سریش کے لئے اُس کے ساتھ ایک قدم بھی اُٹھانا محال تھا۔

اُس کی تنخواہ صرف پچیس روپے ماہوار تھی۔ کل رات جب وہ تھک کر چوبستر پر لیٹا تو۔ کانتا نے دیوالی کے بہانے نئی ساڑھی اور چپل کی فرمائش کی۔ اُس نے کہا کہ اس کی ہمسائی بھاگونتی کے خاوند نے اُسے نیلے رنگ کی ساڑھی خرید دی ہے۔ لاجو نے بھی نئے کپڑے سلوائے ہیں۔ محلہ بھر میں دیوالی کے چرچے ہیں۔ آخر میری ہی قسمت ایسی کیا بری ہے کہ کچھ نصیب نہیں۔ وہ اپنی کہے جارہی تھی۔ لیکن سریش کا ذہن کسی اور طرف متوجہ تھا۔ ——

—— دفعتہً کانتا کی چوڑیاں کھنکھنائیں اور اُسے احساس ہوا کہ اُس کی زندگی میں ایک مدت سے کوئی آواز پیدا نہیں ہوئی۔ اُس نے سوچا بہت سو چلساری دنیا میں اُسے صرف دفتر کے وہ چند چپڑاسی ہی ایسے انسان نظر آئے۔ جو بظاہر اس کی عزت کرتے تھے لیکن اس پر بھی جب وہ اُسے "بابوجی" کہکر پکارتے تو اُسے یوں محسوس ہوتا۔ جیسے اُسے کسی نے منہ پر گالی دی ہو۔ دُکھتی رگ کو چھیڑ دیا ہو۔ شاید اس لئے کہ ان الفاظ میں اُسے اپنی گذشتہ زندگی کی صدائے بازگشت سنائی دیتی تھی۔ کبھی زمانے میں کسبیاں بھی تو اُسے اُنہی الفاظ سے مخاطب کیا کرتی تھیں!

× × × × × × × × × ×

آج وہ دن ڈھلے جب دفتر سے لوٹا تو اُسے محسوس ہوا کہ اُس کا ہمہ بند بند درد کر رہا ہے۔ کام کی زیادتی نے اُسے کچھ دنوں

سے بے حال ساکر دیا تھا۔ اور وہ اس وقت اپنے آپ کو زبردستی گھر کی طرف گھسیٹ رہا تھا۔ شہر کی ساری فضا ایک دھند لکے کی لپیٹ میں تھی۔ تانگے والوں کے آوازے، لوگوں کا شور و غل اور موٹروں کے ہارن کی آوازیں مدھم پڑ چکی تھیں۔ لیکن وہ کیچڑ بھری سڑک پر جوتیاں چٹخاتا، اپنے خیالات کے شور میں گم ہوا جا رہا تھا کبھی کبھی وہ آسمان کی طرف نگاہیں اُٹھا کر ماتھے پر بل ڈال لیتا۔ اور پھر اپنا ہونٹ کاٹ کر زبردستی تھوک نگلنے کی کوشش کرتا۔ شاید وہ اپنے دل کے دکھ میں زبان کو شریک نہ کرنا چاہتا تھا۔ اسی تگ و دو میں وہ اپنے آپ کو سردی میں سمیٹتا، اپنے دونوں ہاتھوں کی انگلیاں بغلوں میں دباتا۔ اُس تنگ گلی کے نکڑ پر پہنچا۔ جہاں سے اُس کا مکان بالکل تاریکی میں چھپا معلوم ہوتا تھا۔

اس کی ماں بیمار تھی۔ یوں تو وہ ایک عرصہ سے دمہ کی مریض تھی۔ لیکن آج اُسے زیادہ تکلیف تھی۔ وہ اُس گھوڑی کی طرح ہانپتی معلوم ہوتی تھی۔ جو ابھی ابھی لمبی دوڑ سے واپس آئی ہو۔ مدہم چراغ کی روشنی میں اُس کا سایہ سیاہ بھوت کی طرح دیوار سے چمٹ رہا تھا سرلیش حیران تھا۔ اگر صبح اُسے ماں کی بیماری کی خبر ہوتی تو وہ ضرور کسی نہ کسی حیلے دفتر میں کسی ساتھی سے ایک روپیہ قرض لے لیتا۔ اس نے سوچنا شروع کیا۔ لیکن دوا حاصل کرنے کی کوئی صورت نظر نہ آئی باہر صحن میں اُس کا چھوٹا لڑکا ماں کے کندھے پر جھکا سکول کی کتاب خریدنے کے لئے رو رہا تھا۔

× × × × × ×

اُس رات وہ دیر تک جاگتا رہا۔ اور آخر اکتایا ہوا اُس کوٹھڑی سے نکل کر اپنے بچھونے کی طرف آیا۔ وہ اس انداز سے چارپائی پر گرا کہ کانتا کی آنکھ کھل گئی ——

کانتا جاگ اُٹھی۔ اور اُس کے ساتھ اُس کی تمام وہ خواہشات بیدار ہو گئیں۔ جن کے سپنے آنکھوں میں لئے وہ سو گئی تھی۔ اُس نے بوڑھی ساس کا ذکر چھیڑا۔ اس یقین کے ساتھ وہ اس طرح چکنی چپڑی باتوں سے خاوند کے ذہن پر قابو پا کر اُسے نئی ساڑھی اور چپل خریدنے پر آمادہ کر لے گی۔ لیکن سرلیش کسی اور دنیا میں تھا۔ اس دنیا کے راگ رنگ اور دُکھ سُکھ سے بالکل الگ تھلگ۔ جہاں عزت اور امارت کی آندھیاں نہیں چلتیں، نہ پت جھڑ نہ بہار، نہ برق نہ آشیاں، صید نہ صیاد۔ اجرام فلکی کی گردشوں سے بے نیاز دُنیا نورانی لہریں ہیں کہ بہتی جا رہی ہیں۔ معصوم چہرے دولت کی ترنگوں، افلاس کے تھپیڑوں سے بے خبر . . . . . اطمینان اور سکون . . . .

وہ خاموش تھا۔ اور کانتا اپنی باتوں سے زور ڈال کر کام نکالنا چاہتی تھی۔ اس شہد کی مکھی کی طرح جو بھنبھناتی ہوئی بے زبان پھولوں کا سارا رس چوس لیتی ہے۔ سرلیش اُس سامنے غلیظ طاق پر دھرے ہوئے بوڑھے چراغ کی طرح بے حس تھا۔ جس کی لَو ہر لحظہ تیل کی کمی کی وجہ سے مدھم ہوئی جاتی تھی۔ بیوی کی باتیں اُس کے کانوں میں کنسلائی کی طرح رینگ رینگ کر داخل ہو رہی تھیں اور پیشتر اس کے وہ کچھ کہے نیند کا ایک ہی جھونکا اُسے خوابوں کی دنیا میں اُڑا لے گیا۔

پَو پھٹنے لگی اور مزدوروں کی دنیا میں ایک کھلبلی سی مچ گئی۔ تاریک کوٹھڑیوں میں، سڑکوں اور تھڑوں پر سوئے ہوئے مزدور پیٹ کی آگ بجھانے کے لئے لمبی لمبی دھوئیں دار چمنیوں والے کارخانے کی طرف بھاگنے لگے۔ مؤذن کی صدا اور مندروں کی گھنٹیوں نے فضا میں ایک ارتعاش پیدا کر دیا۔ لیکن مزدور کے افلاس میں جکڑے ہوئے قدم اپنا رستہ نہ بدل سکے۔ سرلیش آج بہت دیر تک نیند کے غوطے میں گم رہا۔ وہ یکایک چونک اُٹھا۔ جیسے کوئی ڈراؤنا خواب دیکھا ہے۔ اس کے چہرے پر برسوں کے افلاس کی تھکاوٹ نمایاں تھی۔ وہ پشیمان سا تھا۔ اس شرابی کی طرح جس نے رات نشہ کی حالت میں بہت سی دولت جوئے میں کھو دی ہو۔ سورج کی شعاعیں اب زینے سے اتر کر صحن میں بکھر رہی تھیں۔ گویا اُس کے دفتر جانے کا وقت ہو چکا تھا۔ اُس کے پاس گھڑی تو تھی نہیں۔ صرف دھوپ کا اندازہ تھا۔

وہ سڑک پر ہولے ہولے دفتر جا رہا تھا تو اسے بیڑی کی ضرورت محسوس ہوئی۔ جیب میں ہاتھ ڈالا تو خالی۔ [illegible] ہو رہا کر دہ

رام چند بیڑی والے کی دوکان پر ایک بنڈل بیڑی لینے کی غرض سے رک گیا۔ اودھار لینے والے غریب گاہک کی طرف دوکاندار کم توجہ دیتا ہے۔ وہاں اس وقت ویسے بھی گاہکوں کا زور تھا اور وہ خاموش دوکان کے تختے کے ساتھ ایک طرف کھڑا ہوگیا پاس قصائی کی دوکان کے سامنے ایک کتا ہڈی کی امید میں منہ کھولے کھڑا تھا۔ سریش نجانے وہاں سے کیوں فوراً ہی چل دیا۔ اس کے قدم اُسے تیزی کے ساتھ آگے کو لیجا رہے تھے لیکن اُس کے خیالات ابھی تک رام چند بیڑی والے کی دوکان کے گرد گھوم رہے تھے۔ سامنے ایک چوراہے کے پاس ایک عطائی زمین پہ انسانی پنجر کے مختلف نقشے بچھائے اپنے گرد بڑا مجمع اکٹھا کئے صحت کے قوانین پر لیکچر دے رہا تھا۔ وہ بھیڑ بھاڑ دیکھ کر ذرا رک گیا۔ سڑک کے کنارے ایک تانگے والا اپنی مریل گھوڑی کو چابک مار مار کر زخمی کر رہا تھا۔ چوراہے میں بڑے کھمبے کے نیچے ایک ادھیڑ عمر کی عورت کھڑی بار بار اپنی رنگین ساڑھی کے بورڈر کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اور ایک بوڑھا فقیر اس کے سامنے ہاتھ باندھے کھڑا افیم کے لئے دو پیسے مانگ رہا تھا۔ سریش کے لئے یہ سڑک پر چلتے ہوئے مرد عورتیں، تانگے موٹریں بالکل فلمی تصویریں تھیں جنہیں وہ بظاہر آنکھوں سے دیکھ رہا تھا لیکن دماغ پر اُن کا کوئی اثر نہ تھا۔

وہ گرتا پڑتا اس بڑی عمارت تک پہنچا جہاں سے اُسے ہر مہینہ کی پہلی تاریخ کو پچیس روپے ملتے تھے۔ اُسے آج شاید دیر ہوگئی تھی۔ وہ سیڑھیوں کی طرف لپکا۔ اور تیزی سے اُس کمرے کے دروازے پر پہنچا۔ جہاں بیشمار فائلیں اور رجسٹر میز پہ پڑے اُسکا انتظار کر رہے تھے۔ دفتر کا ایک چپڑاسی پنچو فائلوں کا ایک بڑا گٹھا سنبھالے باہر نکل رہا تھا۔ اچانک گھبرائے ہوئے سریش کا پاؤں اُسکے پاؤں تلے دب گیا۔ اور اُس کی زبان سے بے اختیار "بیوقوف" نکل گیا۔

"خبردار! جو پھر ایسا کہا۔ بڑے صاحب سے کہکر سیدھا کرا دوں گا"۔

سریش کا تو گویا ذہن ایک لمحے کیلئے ساکت ہوگیا۔ اُسکے پسینہ بھرے ماتھے پر ایک لکیر سی کھنچ گئی۔ اور ہونٹ یوں ایک دوسرے سے جدا ہو گئے کہ پھر کبھی نہ ملیں گے۔ وہ حیرت زدہ نگاہوں سے پنچو کے شانوں کی طرف دیکھتا رہ گیا۔ جو آہستہ آہستہ سیڑھیاں اتر رہا تھا۔

وہ نہایت آہستگی سے اپنی سیٹ کی طرف بڑھا میز کی دراز کھولی اور کل کی بجھی ہوئی بیڑی سلگا کر ایک لمبا کش لگایا۔ اُسے دھوئیں کی زنجیروں میں پنچو کی گھنی مونچھیں اب بھی غصہ سے کانپتی نظر آ رہی تھیں ؎

اللہ! اللہ! اس دل نادان کو دیکھنا۔ کتنا بے قرار ہو رہا تھا اور آمد بہار کے گیت گا رہا تھا۔
مگر میری آنکھوں میں کیوں آنسو آگئے۔
میں کیوں سہم گیا۔
میرے نصیب میں نہ حسن ہے نہ عشق!
نہ مے ہے نہ ساغر!
مجھے پینے کو زہر ملتا ہے اور کھانے کو غم و یاس،

بدبخت! اس دکھیاری دنیا میں جینا تیرے بس کی بات نہیں!
تو نے افلاس کی گود میں پرورش پائی ہے
درد تیری کتاب زندگی کا عنوان ہے۔

(قاضی نذرالاسلام)

پریشس

گاؤں کا دِلدادہ

اس روز خسرو پور گاؤں کے دوکاندار دیویندر کے ہاں دو تین سبزیاں پک رہی تھیں۔ ان لوگوں کو جگدیش کا انتظار تھا۔ جو آج سے چھ سال پہلے بھی خسرو پور میں آیا تھا۔ اس وقت اس کی عمر اٹھارہ سال کے لگ بھگ تھی تب اسکے دن کھیلنے کودنے کے تھے اُن دنوں وہ اپنے چچا زاد بھائی دیویندر سے اپنی صحت ٹھیک کرنے آیا تھا۔ جو دودھ دہی گاؤں میں میسر آتا ہے۔ وہ شہر کے امیروں کے پاس بھی نہیں ملتا۔ تین سال ہوئے جگدیش ولایت گیا تھا۔ اور ابھی ابھی واپس ہوا تھا۔ وہ اب ترقی پسند فرقے کا ایک درخشاں ستارہ بننے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ گاؤں کے لوگوں کا حال: اُن کے رہنے سہنے کا طریقہ، اُن کی خستہ حالت سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھنا چاہتا تھا۔ جب تک اُس میں کسانوں کی غمی خوشی محسوس کرنے کی قابلیت نہ آئے۔ وہ اُن کی حالت کیسے سدھار سکتا ہے۔ اور دماغی ہمدردی اسے پسند نہیں تھی۔ وہ کسانوں سے دلی طور پر بھی ایک ہو جانا چاہتا تھا

اس برآمدے میں اُسکے چچا زاد بھائی کی بیوی چھایا سرسوں کا ساگ تیار کر رہی تھی۔ اسی برآمدے سے رسوئی کا کام بھی لیا جاتا تھا۔ اس کے پاس ہی دیویندر کی بیوہ بہن برتن مانجھ رہی تھی۔ برآمدے کے پیچھے ایک کال کوٹھڑی بھی تھی۔ اُس کی دہلیز پر بیٹھی کنتی کی لڑکی شنو مٹر کی پھلیوں میں سے دانے نکال رہی تھی۔ اب تک تو گھر میں ایک ہی دئیے پر اکتفا ہوتی تھی۔ لیکن آج دیئے جل رہے تھے۔ ایک دیا تو بالٹی کو اوندھا کرکے رکھ دیا گیا تھا۔ اور دوسرا دو ڈبل اینٹوں کو ایک دوسرے کے اوپر سیدھا کھڑا کرکے اُسپر رکھ دیا گیا تھا۔ اس وقت جگدیش کا باپ مکھن لال اور اس کا چچا زاد بھائی دیویندر گھر پر موجود نہیں تھے۔ شاید وہ دوکان پر بیٹھے حقہ پی رہے ہونگے۔

یہاں یہ بات وضاحت طلب ہوگی۔ کہ مکھن لال نے شہر میں گندم کے سٹہ سے کافی روپیہ کمایا تھا۔ اتناکہ اُس میں وہ اپنے بیٹے کو ولایت بھیجنے کے بھی قابل ہو گیا۔ شہری ہو جانے پر بھی اُسے کوئی چیز گاؤں کی طرف کھینچتی تھی وہ مکھن لال کی سادگی تھی۔ جب کبھی موقع ملتا۔ وہ گاؤں میں آجاتا۔ ویسے بھی اُسے اپنے مرحوم بھائی کے لڑکے سے بہت اُنس تھا۔ اور سچ پوچھیں تو دیویندر تھا بھی اس اعتنا کے قابل۔ بڑا سیدھا سادا آدمی تھا۔ اور دیہاتیوں کے تمام اوصاف کا حامل۔ اُن کے تمام خلوص کا نمائندہ۔ اُس کی بیوی بہتوں میں سے ایک تھی۔ شہر میں ہوتی۔ تو وہ سوسائٹی کی جان ہوتی۔ کیونکہ وہ زیادہ باتیں نہیں کرتی تھی۔ لیکن اُس کے ہر ایک فقرے میں طنز ہوتی تھی۔ اس طنز سے شہر میں کئی پھلوں پر لاٹھیاں چل جاتیں۔ چھایا جتنی خاموش تھی۔ کنتی اتنی ہی باتونی تھی۔ اُس کی ناکام زندگی نے اُس کو باتونی بنا دیا تھا۔ وہ ہر چیز کا جواز پیدا کرتی تھی۔ ہر چیز کے وقوع پذیر ہونے کی وجہ بیان کرتی۔ اور بسا اوقات بے مطلب ہی بولتی چلی جاتی۔ اور شنو تو ابھی تھی ہی بہت معصوم۔ اسے باتیں کرنے کا اتنا خیال نہیں تھا۔ جتنا باتیں سننے کا۔

ابھی چھایا نے ساگ میں کڑچھی ہلائی۔ تو کھٹ سے ڈیوڑھی کا دروازہ کھلا۔ اور جگدیش انگریزی پوشاک پہنے ہوئے اندر داخل ہوا۔ اُسے دیکھتے ہی کنتی برتن مانجھنا چھوڑ کر لپک اٹھی۔ اور کہنے لگی۔

"شنو ——— اٹھ، چڑیل! بھاگ، دوڑکر چاچی اور دیویندر کو بلا۔ دیکھتی نہیں، جگدیش بھائی کتنی دور سے آئے ہیں

اری . . . . چھایا . . . . اری جلدی دھو ہاتھ . . . . اور پانی کا گلاس لے کر کھڑی ہو۔ جگدیش کے سر پر سے کچھ وارے گی بھی کہ نہیں . . . . جگدیش بھیا، میں تو دو دن سے جانے ہوا میں اڑی اڑی پھرتی ہوں، پرسوں جب چچا لاہور گئے۔ تو کہنے لگے کہ جگدیش آج منگل کے دن آئے گا یہاں۔ خسرو پور! تبھی سے تب را راستہ دیکھ رہی ہوں۔"

جگدیش نے سر کھجاتے ہوئے کہا۔ "یہاں گاڑی ہی بہت دیر سے پہنچی، میں کیا کرتا۔ پورا ایک گھنٹہ لیٹ ہے۔"

"ہاں! یہ گاڑی ہمیشہ ہی دیر سے آتی ہے۔ ہم غریب گاؤں والوں کی کسی کو کیا پروا . . . . پروا! میں بھی کتنی بیوقوف ہوں۔ ابھی تک تمہیں بٹھایا بھی نہیں . . . . بیٹھو بیٹھو اری چھایا! یہ مونڈھا رکھ دے میرے پاس . . . اور لے آ اندر سے لالٹین۔ میری چارپائی کے نیچے پڑی ہو گی۔ میں نے کل اس میں تیل ڈلوایا تھا۔ مجھے پتہ تھا۔ اس کی ضرورت بھی پڑے گی جگدیش، ذرا اس لالٹین کا شیشہ ٹوٹا ہوا ہے۔ اسلئے کچھ دھواں دیتی ہے —— پر خیر روشنی تو کافی ہو جائے گی۔"

اتنی دیر میں مکھن لال اور دیویندر بھی آ گئے۔ اُن کے پیچھے شنو خوشی سے ہاتھ ملتی آ رہی تھی۔ جگدیش کو دیکھ کر لالہ مکھن لال کہنے لگے۔ "آ گئے بیٹا! چلو پہلے کپڑے بدل لو —— کمرہ اوپر ہے۔"

دیویندر بات پکڑتے ہوئے بولا۔ "چلو میں تمہیں کمرہ دکھاؤں —— ذرا لالٹین لے لوں۔"

ادھر یہ دونوں اوپر گئے۔ اُدھر شنو تالیاں پیٹ پیٹ ناچنے لگی۔ کہنے لگی۔ "آج تو میں ماموں کو سونے بھی نہیں دوں گی ولایت کی ساری باتیں سنوں گی۔ سمندر پار کی ساری کہانیاں"

چھایا اُسی طنزیہ انداز میں بولی "—— ذرا اپنا منہ تو شیشے میں دیکھ لے —— میرا دیور تو تم سے بات بھی نہیں کرنے کا . . . بڑی آئی ہے چودھرانی۔"

شنو نے اپنی مسرت میں طعنوں کا خیال بھی نہ کیا۔ اور مکھن لال سے پوچھنے لگی۔ ماموں جان کتنے دن خسرو پور میں اور ٹھہریں گے۔ مکھن لال مسکرا کر بولا۔ بس کوئی دو چار دن۔ ہاں بابا! اس لاہور کے باسی کا خسرو پور میں جی نہیں لگنے کا . . . .

ابھی مکھن لال اپنی بات ختم بھی نہ کرنے پایا تھا کہ جگدیش سیڑھیوں سے نیچے اترتا ہوا کہنے لگا

"آپ نے بھی ایک ہی کہی پتا جی! . . . میں تو یہاں ڈٹ کر رہوں گا۔ ایک دو دن کی بات کیا ہے۔ پورے دس بارہ روز رہوں گا میں اب وہ جگدیش تھوڑے ہوں۔ جو چار سال پہلے تھا۔"

مکھن لال نے سوائے "اوہ! . . . . اوہ!" کے کچھ جواب نہ دیا۔

جگدیش بولا۔ "اُن دنوں میں کالج کا طالب علم تھا۔ میری دنیا ہی اور تھی پڑھنا۔ دوستوں کے ساتھ پھرنا گپیں لڑانا اور شام کو سینما کی سیر یہی میری زندگی کے مقصد تھے۔ ولایت کے قیام میں میری آنکھیں کھل گئیں۔

"ہاں ہاں!" شنو پھر تالی بجاتے ہوئے بولی۔ "ہمیں ولایت کی کہانیاں سناؤ۔"

" . . . . میں نے اب سمجھا ہے۔ کہ زندگی کا مقصد خود غرضی ہی نہیں ہے۔ غریبوں کا عملی طور پر ہاتھ بٹانے میں زندگی ہے ولایت میں امیر لوگ سو سو میلوں سے غریبوں کی مدد کے لئے تیار رہتے ہیں۔ وہاں ہسپتال لوگوں کے دان پر چلتے ہیں۔ غریبوں کو وکیل اور ڈاکٹر مفت ملتے ہیں۔ بیکاروں کو روٹی کپڑے کا خرچ ملتا ہے۔ خانہ بدوشوں کو رہنے کے لئے گھر مہیا کیا جاتا ہے"

چھایا بولی۔ "شہر کا پانی پی کر تو میرا دیور خوب باتیں کرنے لگا"

مکھن لال حقے کا کش لگاتا ہوا بولا: "معلوم ہوتا ہے۔ یہ لڑکا باز نہیں آئے گا۔ ہمارے بھائی، ماموں، چچا، سب سرکاری نوکری کرتے ہیں۔ یہ اُن سب سے بھیک منگوائے گا۔ گاڑی میں پھر کوئی ترقی پسند فرقے کی کتاب پڑھتا آیا ہو گا۔"

کنتی سہم کر پوچھنے لگی۔ "چچا جی —— یہ ترقی پسند فرقہ

لیا ہے؟

مکھن لال نے جواب دیا " یہ موجودہ زمانہ کا نیا شگوفہ ہے، بیٹی امیروں کو مار پیٹ کر اُن کی دولت سے گلچھرے اُڑانے کی تعلیم کو ہی آج کل ترقی پسند نظریہ کہتے ہیں "

کنتی کانوں پر ہاتھ رکھتی ہوئی اور جگدیش کی طرف شکوہ انداز سے دیکھتی ہوئی بولی " رام رام! ——— ایسے بھی کبھی ہو سکتا ہے، اگر سب امیر آدمی مر گئے۔ تو غریبوں کو خیرات دینے والا کون بچے گا؟ "

جگدیش چمکتی ہوئی آنکھ سے اپنے باپ کی طرف دیکھنے لگا۔ اور بولا " پتا جی! مجھے حیرانی ہے۔ کہ آپ بھی ایسی باتیں کرتے ہیں صرف ترقی پسند نظریہ ہی انصاف کا نظریہ ہے۔ یہ لوگوں کو لوٹنے کے نظام کا نام نہیں۔ یہ بھی کوئی انصاف ہے۔ کہ موٹر پر چڑھنے اور سارا دن عیاشی کرنے والوں کی تو پو جا ہو۔ اور دن بھر خون پسینہ ایک کر کے چکی پیسنے والوں کو بھوکا مرنا پڑے۔ ایک کی بیٹی کو ذرا چھینک بھی نکل آئے۔ تو وہ ویانا سے ڈاکٹر منگوا سکے۔ اور دوسرے کے مرے ہوئے بچے کو کفن بھی میسر نہ ہو۔ کیا خوب! میں تو یہاں کسانوں کو دیکھنے آیا ہوں۔ جو جان مار کر کام کرتے ہیں۔ نہ صبح دیکھتے ہیں نہ شام، نہ رات اور اس پر بھی اُن کو دو بار پیٹ بھر روٹی کھانا نہیں ملتا۔ جن کی کل کائنات ایک جریب بھر ماپ کی زمین ہے۔ لیکن اس کو وہ اپنا سمجھتے ہوئے بھی اُس کی پیداوار کے مالک نہیں ہوتے۔ میں دیکھنا چاہتا ہوں۔ کس طرح اُن کے بچے ایک گھونٹ دودھ کے لئے چیختے ہیں۔ گندی، چھوٹی، اندھیری جھونپڑیوں میں رہنے والے ہڈیوں کے پنجروں کو دیکھنے آیا ہوں۔ میں ... "

" بس بس کافی ہو گیا " مکھن لال بات کاٹتے ہوئے بولا " جنہیں تو ہڈیوں کے پنجر کہتا ہے۔ وہ ساڑھے چھ چھ فٹ کے قد آور جاٹ ہیں۔ جنہیں تو . . . . . "

جگدیش نوجوان تھا۔ اور اس لئے بے صبر۔ اُس کا منہ آہستہ آہستہ بڑھنے لگا۔ بولا " ایک آدھ جاٹ ہٹا کٹا ہو گیا۔ تو کیا سارا گاؤں پہلوان بن گیا۔ اور پھر یہ تو صرف پنجاب میں ہے ذرا یو پی کے کسانوں کو تو دیکھو . . . وُہ ناتوان بچے، تپ دق کی ماری ہوئی عورتیں۔ یہ ہندوستان کے دیہات میں نہیں ملتے تو اور کہاں ملتے ہیں "

" تم تو لال پیلے ہونے لگے یونہی " کنتی بولی " دیکھو تو تمہاری باتوں میں میری دال بھی نیچے جل گئی۔ تم یہاں کچھ دن رہنے آئے ہو یا صحت ٹھیک کرنے۔ ابھی دو چار دن سرسوں کا ساگ اور مکی کی روٹیاں کھاؤ۔ گھر مندھی ہوئی بھینس کا دودھ پیو تو یہ سب بہکی بہکی باتیں خود بخود ہی چھوٹ جائیں گی "

" بہکی ——— یہ بہکی باتیں ہیں " جگدیش آنکھیں پھاڑ کر کنتی کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

موقعہ پا کر چھایا نے ایک فقرہ کس دیا۔ منہ پھیلاتے ہوئے بولی " ہاں بہن! ہم اَلھڑ دیہاتیوں کی عقل اور سمجھ میں میرے بیرو کی باتیں کیسے سما جائیں؟ "

بے چارہ دیویندر اس فقرے بازی سے گھبرانے لگا۔ وہ سادگی سے جگدیش سے پوچھنے لگا " اگر جگدیش حُقہ پیتا ہو تو اپنا جو نیا حقہ صبح جگو لے گیا تھا۔ اُس کے ہاں سے لے آؤں؟ اگرچہ اُس کے گھر میں بھی مہمان آئے ہوئے ہیں "

کنتی نے جھٹ سے کہا " ہاں ہاں، لے کیوں نہیں آتے اور کالو کی ماں سے بھی کہنا۔ کہ وہ ولایت والے جگدیش آ گئے ہیں ویسے تو میں نے سب کو پہلے ہی کہہ چھوڑا ہے۔ کہ وہ آج آئیں گے "

جگدیش غرّا کر بولا " تو کیا میری نمائش ہو گی؟ کہو تو آنکھوں میں کاجل ڈال کر بیٹھ جاؤں۔ گلے میں ہار پہن لوں . . . . اور . . . اور . . . میں حقہ نہیں پیتا "

مکھن لال نے بات بگڑتے دیکھ کر رُخ پلٹا دیا۔ کہنے لگا " کنتی بیٹی ——— کل کھانا جلدی تیار کر دینا ——— میں اور جگدیش جالندھر جائیں گے۔ "

" جالندھر کس لئے؟ " جگدیش مشکوک لہجہ میں پوچھنے لگا۔

" کیا اتنی جلدی اپنے سگے رشتہ داروں کو بھول گئے۔

تمہاری ، پھوپھی ، بوا ، تائی سبھی تو وہاں رہتے ہیں ۔ اور تمہارے آنے کے بارے میں کئی بار مجھ سے پوچھ بھی چکی ہیں ۔ اور جالندھر یہاں سے دُور بھی کیا ہے ۔ یہی کوئی نو میل ہی تو ہوگا "

" میں وہاں نہیں جاؤں گا ۔" جگدیش ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے بولا ۔

چھایا اور کنتی حیرانی سے پوچھنے لگیں : " ہیں ! کیوں ؟ "

جگدیش کی خود اعتمادی قابل رشک تھی ۔ وہ کہنے لگا : " میں وہاں جا کر کیا کروں گا ۔ وہ مجھے دیکھ کر جلیں گے مجھے بھی دکھ ہوگا ۔ اور نہیں بھی ۔ . . . اپنے رشتہ دار بھی کبھی کسی کی ترقی دیکھ کر خوش ہوتے ہیں ۔ "

مکھن لال سمجھانے لگا : " بیٹا ! اپنے پھر اپنے ہی ہوتے ہیں ۔ کیا ناخنوں سے کبھی ماس بھی جُدا ہوا ہے ؟ "

جگدیش نے جواب دیا : " میرے پاس جو تھوڑا بہت وقت ہے میں وہ رشتہ داروں کی اناپ شناپ سننے میں ضائع نہیں کر سکتا میں یہاں کسانوں کے حالات کا مطالعہ کرنے آیا ہوں ۔ اس کے سوا مجھے کسی اور کام کی خواہش نہیں "

کنتی دکھ بھرے لہجہ میں بولی : " مجھے تمہاری باتیں حیرت میں ڈال رہی ہیں ۔ جگدیش ! "

چھایا مسکرا کر بولی : " بہت بدل گیا ہے میرا دیور تو "

پیشتر اس کے کہ جگدیش جواب دے ۔ ڈیوڑھی کا دروازہ کھلا ۔ اور پڑوسن پاربتی ہانپتی ہوئی داخل ہوئی ۔ اور آتے ہی پوچھنے لگی : " ابھی اور تم سے کوئی ملنے نہیں آیا نا ۔۔۔ تنو کی ماں ؟ "

کنتی بولی : " نہیں ! ابھی تو کسی کو خبر ہی نہیں ہوئی کہ . . ."

پاربتی کے چہرے پر فتح کی مسکراہٹ دوڑ گئی ۔ وہی سب سے پہلے بدھائی دینے آئی ہے ۔ کیا یہ کم خوشی کی بات ہے ۔ اور وہ جگدیش کو مخاطب کر کے پوچھنے لگی ! ! کیوں کیسے ہو میرے لال ،،

جگدیش منہ پھیلاتے ہوئے بولا ، " اچھا ہوں ،،

پھر مکھن لال کی باری آئی ۔ اُن کی طرف دیکھتی ہوئی پاربتی بولی : " جگدیش کے باپ بنے بیٹھے ہو ۔ منہ تو میٹھا کرواتے ۔ لڑکا صحیح سلامت پردیس سے واپس لوٹا ہے ۔"

مکھن لال نے تنو کو اشارہ کیا ۔ کہ اندر کوٹھڑی سے گڑ کے دو ٹکڑے اٹھا لائے ۔ اور پھر وہ پڑوسن پاربتی کو دیدے ۔

اتنے میں پاربتی کا چھ سال کا لڑکا بھی اپنے ننھے بھائی کو اٹھائے ہوئے آ پہنچا ۔ بچہ ہونے کی وجہ سے وہ ذرا شرما رہا تھا ۔ وہیں ڈیوڑھی میں کھڑا ہو کر جگدیش کی طرف دیکھنے لگا ۔ پاربتی بولی " کالو ! لا ، ذرا بچے کو تو دے ۔ دیکھو تو شیطان کس طرح بڑے بھائی کے پاس جانے کے لئے ہاتھ پاؤں مار رہا ہے ۔۔۔ بھائی کو پہچانتا ہے نا ۔۔۔ چاہے وہ پردیس سے ہی آیا ہو ۔ . . . لو بیٹا جگدیش ذرا اپنے چھوٹے بھائی کو کھلاؤ تو ۔ دیکھو ! کیسا خوبصورت کھلونا ہے یہ "

یہ کہ کر پاربتی بچے کو کالو سے لے کر جگدیش کو دینے کی کوشش کرنے لگی ۔ جگدیش آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر کبھی پاربتی کی طرف اور کبھی اپنے کپڑوں کی طرف دیکھتا ۔ اُسے یوں محسوس ہوا جیسے اُس کی پیشانی پسینہ سے بھیگ گئی ہے ۔ وہ رومال نکال کر پیشانی کو پونچھنے لگا ۔ اور پیچھے کو سرکتا ہوا بولا : " نہ بھئی ، اسے اپنے پاس ہی رکھو میرے پاس تو بچے رونے لگتے ہیں "

چھایا بولی " لے لو ، لے لو گود میں اسے ۔ . ۔ دیکھو تو کیسا پھول سا بچہ ہے ۔ تمہاری ہی طرح سانولے رنگ کا ہی ہے "

جگدیش کے ماتھوں کی نسیں پھولنے لگیں ۔ وہ اُسی طرح " نہ نہ " کہے گیا ۔ اور اس کھینچا تانی میں بچہ رونے لگا ۔ پاربتی اُسے چُپ کرانے کی کوشش کرتی ہوئی صحن میں ٹہلنے لگی ۔ اور کہنے لگی " اچھا ! نہ سہی ، نہ سہی ۔۔۔ اپنے گھر خوش رہو ۔ میری اور کالو کے باپ کی تو یہی دعا ہے "

یہ کہہ کر پاربتی چلنے کو اٹھ کھڑی ہوئی ۔ لیکن ڈیوڑھی تک پہنچ کر پھر رک گئی ۔ پڑوسیوں کی طرح اُسے بھی اصل مطلب کی بات تبھی یاد آتی تھی ۔ جب واپس ڈیوڑھی کی دہلیز پر پہنچ جاتے وہ مڑ کر بولی : " ہاں ۔۔۔ وہ تو میں بھول ہی گئی چھایا ۔۔۔ پرسوں والی بات یاد رکھنا ۔ اپنی ہی لڑکی ہے ، خوبصورت بھی ہے ۔ گھر کے کام کاج میں بھی سلیقہ رکھتی ہے ۔ کل ہم اُس کی فوٹو اتروانے

جالندھر جا رہے ہیں۔ تمہارا دیور تو ابھی کچھ دن ٹھہرے گا نا؟"
چھایا مسکرا کر بولی۔ "ہاں، ہاں! تو کوئی فکر نہ کر۔ میں سب کچھ دیکھ لوں گی، کالو کی ماں! ادھر کالو کی ماں ڈیوڑھی سے باہر ہوئی، ادھر جگدیش نے تسکین کا ایک لمبا سانس لیا۔ لیکن اُس کے دماغ کی پریشانی اور جھنجلاہٹ مکمل طور پر نہ گئی۔ ایسے معلوم ہوتا تھا۔ جیسے وہ معمولی سی بات پر پھٹ پڑے گا۔ توقع کے مطابق سادہ لوح دیویندر ہی، اس پھٹ پڑنے کا موجب ہوا۔ وہ سہما سا مکھن لال سے پوچھنے لگا۔ "چچا جی! میں اوپر چل کر بستر لگاؤں ——— سونے کا وقت ہونے لگا ہے"
مکھن لال نے جواب دیا۔ "ہاں، نو بج چکے" جگدیش منہ پھیلاتے پوچھنے لگا: "مجھے کہاں سونا ہوگا؟"
مکھن لال بولا ——— "اوپر"
"اوپر کہاں؟ کوٹھے پر؟ مار ڈالنے کی صلاح ہے، سردی میں"
"نہیں بیٹا۔ کمرے میں"
"اور آپ کہاں سوئیں گے؟"
"اوپر کے کمرے میں"
"اور دیویندر بھائی"
"میں اور تمہاری بھابی بھی اوپر کے کمرہ میں ہی سوئیں گے" دیویندر بہت عاجزانہ لہجے میں بولا۔ گویا معافی مانگ رہا ہو
چھایا پھر طنز سے بولی: "ہاں دیور صاحب ——— ہم تو عجیب لوگ ہیں، ہم ولایت نہیں گئے نا"
جگدیش جل بھن کر کوئلہ ہوگیا۔ پوچھنے لگا۔ "اور بچے؟" جواب ملا۔ "وہ بھی ہمارے پاس ہی سوئینگے، اور تو کیا انہیں باہر میدان میں سلا دینگے؟"
اب گفتگو جگدیش کے لئے ناقابلِ برداشت ہوگئی۔ وہ چلّا کر بولا: "کیا ساری دنیا ہی اوپر کے کمرے میں سوئے گی؟"
کُنتی نرمی سے بولی۔ "نہیں میں اور شنو اور میرے باقی دونو بچے، گوردھن اور شیبو ——— اس اندر کے کمرے میں سوئینگے"
جگدیش شش و پنج میں پڑ گیا۔ اُس کے دماغ میں گویا ایک آگ سُلگنے لگی۔ "کمرہ کتنا بڑا ہے؟" وہ پوچھنے لگا۔
"کوئی اس برآمدے جتنا"
اتنا چھوٹا ——— میرے لئے، میں ولایت سے واپس آیا ہوں، اتنا چھوٹا کمرہ، توبہ! اور اس کے ساتھ ہی جگدیش چلّا کر بولا۔
"میں وہاں سب کے ساتھ نہیں سو سکتا"
چھایا بولی ——— "اوہ!"
کُنتی کہنے لگی "کیوں"
دیویندر دبی زبان میں کہنے لگا "چھوٹے کمرے میں تو سردی بھی نہیں لگتی"
خیریت رہی۔ کہ دیویندر کے الفاظ کو جگدیش نے نہیں سُنا وہ تو خیر سنتے ہی آپے سے باہر ہو رہا تھا ——— ایک کوٹھڑی میں اتنے لوگ، جانوروں سے بھی بدتر ہیں۔ یوں میں، سب کے سانسوں والی گندی فضا میں نہیں سو سکتا۔ میں قیدی کی طرح اندھیری کوٹھڑی میں بھی مقید ہو کر اپنی صحت کو غارت نہیں کر سکتا۔ میں ہاں نہیں سوؤنگا۔
چھایا بولی "کیا ولایت میں سب لوگ علیحدہ . . . . "
کُنتی بات کاٹ کر بولی: "پہلے جگدیش اور اس جگدیش میں بہت فرق ہے"
شنو اس کے باوجود خوش نظر آ رہی تھی۔ تال بجا کر پوچھنے لگی۔ "ماما جی! آپ سوئیں گے نہیں تو خوب باتیں ہونگی"
مکھن لال اس معاملہ کو رفع دفع کرنے کی غرض سے بولا "ہمارے پڑوس میں جو جاٹ بستے ہیں، ان کے نہ صرف بیوی بچے ——— بلکہ مویشی بھی ایک ہی کوٹھڑی میں سوتے ہیں"
"اور وہاں کوئی روشندان بھی نہیں ہوتا" دیویندر وضاحت کرتے ہوئے بولا، "ہمارے کمرے میں ایک چھوڑ دو روشندان ہیں"
"اور وہ لوگ زمین پر سوتے ہیں" کُنتی بولی۔

—"اور بچے تڑا رہیں"، چھایا کہنے لگی۔

جگدیش میں تو گویا سوچنے کی طاقت سلب ہو گئی۔ وہ سب کچھ گوارا کر سکتا ہے۔ لیکن ایک کوٹھڑی میں اتنے لوگوں کے ساتھ سونا نہیں۔ "لاہور میں اس ہوٹل کا کمرہ کتنا کھلا ہے"، وہ بولا۔

اور یہ صرف وہمی تک ہی محدود نہیں تھا۔ وہ جیب میں سے گھڑی نکال کر دیکھنے لگا۔ نو بج کر بیس منٹ ہوتے تھے۔ لاہور کی گاڑی پونے دس پر چھوٹے گی۔ سٹیشن بھی ایک میل سے کم فاصلہ پر تھا۔ وہ لپک کر اٹھا۔ اور کہنے لگا "میں پونے دس بجے کی گاڑی جا رہا ہوں"

مکھن لال بولا۔ "کتنے بیوقوف ہو جگدیش"

کنتی بولی —"بھیا تو دل لگی کر رہا ہے"

چھایا کہنے لگی۔ "میرا دیور تو بڑا چالاک ہے"

اسے بیوقوفی کہا جائے یا مذاق۔ جگدیش اپنے ارادے سے بالکل نہیں ٹلا، اوپر کپڑے لینے کے لئے جاتے ہوئے بولا "میرا تو اس فضا میں دم گھٹ رہا ہے۔ اور اس لالٹین کی روشنی میں تو دکھائی بھی نہیں دیتا۔ اور نہ ہی میں اس مونڈھے پر بیٹھ کر اپنی تیوروں کی کریہ ستیاناس کر سکتا ہوں — ان لوگوں کی باتیں کتنی خشک اور بے رومانی ہیں۔ ۔ ۔ ۔ اور وہ بچہ۔ ۔ ۔ وہ سنکڑا ہوا بچہ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

سب ایک ہی کمرہ میں سوئیں گے، ہرشی بھی لاکر باندھ دیں تاکہ حسرت پوری ہو جائے اور بند کر دیں روشندان۔ ۔ ۔ ڈیم اٹ۔۔"

مکھن لال بولا۔ "ٹھہرو بھئی۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

شنو بولی۔ "گئے ماماجی — میری ولایت کی کہانیاں"

دیویندر حیرانی سے بڑبڑانے لگا۔ "سچ مچ؟"

اور سب ایک دوسرے کی طرف خاموش پھٹی پھٹی نگاہوں سے دیکھنے لگے

~~~

میرے دوستو! اور میرے ہم سفیرو! اس قوم کی حالت کس قدر قابل رحم ہے جو اعتقادات سے بھری ہوئی ہو لیکن مذہب سے خالی ہو۔ اس قوم کی حالت کس قدر قابل رحم ہے کہ وہ ایسی روٹی کھاتی ہے۔ جس کی فصل اس نے اپنے ہاتھوں سے نہیں کاٹی۔ ایسی شراب پیتی ہے۔ جو اس کی اپنی انگور کی بیلوں سے کشید نہیں کی گئی۔ اس قوم کی حالت کس قدر قابل رحم ہے جو ایک جذبے سے خواب میں تو نفرت کرتی ہے۔ لیکن بیداری کے وقت اس کے آگے سر جھکا دیتی ہے۔ اس قوم کی حالت کس قدر قابل رحم ہے۔ جس کی آواز جنازے کے جلوس کے سوا کہیں بلند نہیں ہوتی۔ (مسائل حیات)

~~~

انسان کی زندگی اس کے کاموں سے ظاہر ہوتی ہے نہ کہ سانس کے چلنے سے (بیسل)

~~~

اولاد کو اپنے زمانہ کے رنگ ڈھنگ کا عادی نہ بناؤ۔ بلکہ اسے ان کے طور طریق کی تعلیم دو اس لئے کہ وہ اس زمانہ کے لئے نہیں ہیں۔ جس میں تم بسر کر رہے ہو بلکہ وہ ایک دوسرے زمانہ کے منتظر ہیں۔ جو آنے والا ہے۔ جس کو اس زمانہ کی رفتار سے کوئی تعلق نہ ہو گا۔

~~~

محترمہ سرو ج ماتھر ایم۔اے

بے سُرا

دروازہ آدھا کھلا ہوا تھا۔ اور وہ اُس کے سہارے کھڑی تھی اُس کے لمبے لمبے بال لٹک رہے تھے۔ اور اس کا ڈھیلا ڈھالا بلوز اُس کی چھاتیوں کو پوری طرح سے ڈھانپ نہیں رہا تھا۔

"کیا ہے؟" اُس نے کہا۔

یہ پھیری والا ایک چینی نوجوان تھا۔ اور اُن لوگوں میں سے تھا جو ہندوستان میں چائنا سِلک اور خوبصورت چینی عورتوں کے کیلنڈر بیچنے آتے ہیں۔ اُس کی عمر سترہ اٹھارہ برس کی ہو گی۔ اس کی جلد نرم تھی۔ منہ چپٹا تھا۔ اور آنکھیں دو لمبی لکیروں کی طرح تھیں جن میں ڈر، وہم سب کچھ تھا۔ اور خوبصورتی بھی تھی۔ اُس کی پیٹھ پر سلک کے کپڑے کے علاوہ خوبصورت تصویریں تھیں۔ کیلنڈروں کی تصویریں اُن میں سے چند فریم کی ہوئی بھی تھیں۔ اور اُس کے کندھے پر ایک مضبوط رسی سے لٹک رہی تھیں۔

"تنشویر اے (تصویر ہے)" اُس نے کہا۔ "کیا تم لے گی"

اس نیم خستہ مکان کے اندر سے کسی بڑھی عورت کی ایک کرخت سی آواز آئی۔ "کیا ہو رہا ہے باہر؟"

"دکھاؤ تو" اُس نوجوان عورت نے اپنے بالوں کو آنکھوں پر سے ہٹاتے ہوئے کہا۔

"تنشویر" پھیری والا بولا۔ "اچھا والا"

"کیسی بھی ہو — ذرا دکھا دو" اُس نے اپنی بات کو دہراتے ہوئے کہا۔

شام ہو رہی تھی۔ معمولی سی ہوا چلنے پر درختوں کے پتے کھڑکھڑانے لگے۔ باہر گلی کے اس طرف کھیت میں ایک گائے اپنے بچے کو لئے ہانک رہی تھی۔ اور بہت سی بکریاں اپنی ٹانگیں اٹھا کر کیکر کے کانٹوں سمیت کھانے لگیں۔

چینی پھیری والے نے اپنے جسم کو ایک بل دیا۔ اور اُس کا تمام بوجھ نیچے آ رہا۔ اُس نے ایک ٹھنڈا سانس لیا۔ اور اپنے ہاتھ سے ماتھے کا معمولی سا پسینہ پونچھ ڈالا۔ قریب ہی صحن میں اندھیرا ہو رہا تھا۔ اور ایک ادھیڑ عمر کا کبڑا سا آدمی اُس اندھیرے میں اُس نوجوان عورت کی طرف دیکھ رہا تھا: "کب وہ آئے گی اور مجھے کھانا کھلائے گی!" لڑکی نے اپنی چھاتیوں کو ڈھانپنے کے لئے بلوز کو اوپر اٹھا دیا۔ اور دروازے کو اور کھول دیا۔ اور پھر بولی۔

"دکھاتے کیوں نہیں؟"

چینی نے ایک ڈبہ کھولا۔ اور اُس میں سے ایک تصویر نکالی ...... یہ ایک عورت کی تصویر تھی۔ حسب دستور . . . . کسی کا انتظار کر رہی تھی۔ کچھ کھوئی کھوئی سی دکھائی دیتی تھی۔ اُس کے کھلے بالوں میں کچھ پھول ٹنگے ہوئے تھے۔ اس کے نیچے چینی زبان میں کچھ لکھا ہوا تھا۔ جسے وہ نوجوان عورت سمجھ نہ سکی۔ بولی۔

"کیا اس کے نیچے لیلٰے لکھا ہوا ہے؟"

چینی نے دو تصویریں اُس کے سامنے بڑھا دیں۔ تاکہ وہ اچھی طرح دیکھ سکے۔

گائے نے زور سے ہانک دی۔ اور ٹھنڈی ہوا کا ایک زبردست جھونکا درختوں کے پتوں سے سرسراتا ہوا گزر گیا۔

"کیا تم خریدے گی؟" پھیری والے نے کہا۔ "بُہت سستا۔ (بہت سستا)"

"کوئی اور اچھی سی تصویر دکھاؤ" عورت نے کہا۔

"کیسی"؟

عورت نے اپنے بال سنوارتے ہوئے، جھک کر ڈھیر میں سے ایک تصویر اٹھالی۔ اس عورت کے کندھے چوڑے تھے۔

کندھے مضبوط تھے۔ اور کشادہ۔ اُس کے نقش تیکھے تھے اور خوبصورت جسم گھنایا ہوا تھا۔

"پسند کیا؟" پھیری والے نے کہا۔ "لے گی؟"

"مجھے یہ پسند ہے" لڑکی نے کہا۔ اور پھیری والے کی طرف دیکھنے لگی۔ بولی۔ "بالکل لیلےٰ مجنوں دکھائی دیتے ہیں۔" اور پھر اپنی ساس کو دکھانے کے لئے اندر کی طرف دوڑی۔ اُس کی ساس آگ کے پاس کُبڑی ہو کر بیٹھی تھی۔ بوڑھی عورت نے پرانے کمبل کو اچھی طرح سے لپیٹتے ہوئے کہا۔ "کیا دیکھوں میں —— میں تو اب اندھی ہو گئی۔"

دراصل وہ اندھی نہیں تھی۔ وُہ نیم پاگل تھی۔

پھیری والے نے اپنی باقی چیزیں سمیٹ لیں۔ اور دہلیز پر کھڑا ہوا۔ دونو عورتیں اُس کی طرف دیکھنے لگیں۔ اُس نے اپنے ہاتھ کو لبوں تک لا کر کچھ پینے کا اشارہ کیا۔

"کچھ پینا چاہتا ہے۔ ماں" اس نوجوان عورت نے کہا۔ اور اُسے پوچھنے لگی۔ "دودھ پیو گے —— ابھی ابھی دوہا ہے میں نے"

پھیری والا مسکرایا۔ اور اس نے اثبات میں اپنا سر ہلا دیا "دودھ . . . ہاں . . . ہاں!"

لڑکی نے دُودھ کا ایک گلاس بھرا۔ اور پھیری والے کو دے دیا۔ پھیری والے نے لے لیا، مسکرایا، اور غٹ غٹ پی گیا۔ اس کے بعد بے تحاشا شکریہ کرنے لگا۔

لڑکی نے حیران ہوتے ہوئے کہا "کیا تمہیں پسند نہیں ہے - - تازہ ہے بالکل ابھی ابھی تو دوہا ہے"

چینی نے گلاس واپس کر دیا۔ اور اپنی تصویر لینے کے لئے ہاتھ بڑھا دیا۔

"ساڑھے آٹھ آنہ" وہ بولا "لے گی؟"

"خریدوں گی" وُہ بولی "لیکن اتنی قیمت پہ نہیں۔ تم کل آنا خدا کے واسطے کل ضرور آنا —— اس وقت میری ساس بیٹھی ہے۔ اور میرا بوڑھا کمبخت خاوند بھی گھر میں ہے، کل آنا — خریدو نگی تصویر سودا ہو جائیگا"

آخر کار پھیری والے نے اُس لڑکی کی بات کو سمجھ لیا۔ اور اُسے دوسری تصویروں میں رکھ کر۔ اپنے سب بوجھ کو کندھے پہ لٹا دیا۔ جاتے ہوئے بولا۔

"اچھا . . . اچھا . . . کَرب شورت . . . بورت شنتا . . کل آئے گا"

لڑکی دروازے میں کھڑی ہو گئی۔ اور پھیری والے کو جاتا ہوا دیکھنے لگی۔ وہ بھی اپنے بوجھ کے نیچے کُبڑا ہو کر چلتا تھا۔ اگرچہ اُسے کُبڑوں سے سخت نفرت تھی۔ لیکن وہ جانتی تھی۔ کہ پھیری والا دراصل کُبڑا نہیں ہے۔ اُس کی سانس بانسکے خاوند کی طرح —— اور درختوں کے پتوں کی سرسراہٹ سے طوفان کی سی آواز سنائی دیتی تھی۔

* * * * *

دروازہ اُسی طرح آدھا کھلا ہوا تھا۔ اور وہ اپنے ہاتھوں کو اپنی قمیص سے پونچھتی ہوئی باہر چلی آئی۔ اُس دن ہوا بہت تیز تھی اس لئے اُسے اپنے بال بار بار سنوارنے پڑتے تھے۔ چھوٹے چھوٹے چوزے صحن میں اِدھر اُدھر دوڑ رہے تھے۔ اور مرغی —— اُن کی ماں۔ بڑے اطمینان اور غرور سے اِدھر اُدھر دیکھ رہی تھی۔

پھیری والا نہایت صبر سے انتظار کر رہا تھا۔

ٹھنڈی ہوا سے پھیری والے کے گالوں پہ سرخی آگئی تھی۔ اور اُس کے چھوٹے چھوٹے بال اُس کی مانگ پر سے اِدھر اُدھر بکھر گئے تھے۔ اُس نے ایک سبز رنگ کا کوٹ پہنا ہوا تھا جس پہ سبز رنگ کے بٹن لگے ہوئے تھے۔ اُس کے جوتے ٹوٹے ہوئے تھے۔ اور مٹی سے اٹے پڑے تھے۔ وہ تھکا تھکا سا دکھائی دیتا تھا۔ اُس نے ایک دیوار کے ساتھ اپنا بوجھ رکھ دیا۔

وہ اپنا ہاتھ دیر تک لبوں پر رکھے اُس کی طرف دیکھتی رہی کچھ نہ بولی۔ اور آخر ایک کرخت سی آواز میں کہنے لگی۔

"آ جاؤ، اندر"

پھیری والے نے اپنا بوجھ اٹھایا۔ اور اندر آیا۔ آج لڑکی کی ساس خدا معلوم کہاں چلی گئی تھی۔ اب وہ دونو تھے۔ اندر پہنچ کر پھیری والے نے اپنی تصویروں کے گٹھے کو کھولنا شروع کیا۔

"تم کہاں سے آتے ہو؟" عورت نے مشکل سے اُسے

سمجھاتے ہوئے پوچھا۔

"ماراٹرلک، ہمارا ملک" اُس نے ہاتھ کو پورا پھیلاتے ہوئے کہا۔ "دُور، چاشنے!"

"چین،" عورت نے دہرایا۔ "جہاں بڑی افیم ہوتی ہے۔۔۔ میری ساس افیم کی بڑی عادی ہے۔"

"ایم" پھیری والے نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "ایم۔۔۔ ہاں۔۔۔ ہاں۔۔۔ ایم"

اس کے بعد اُس نے لڑکی کی انتخاب کردہ تصویر نکال لی اور اُسے چولھے کی دیوار کے ساتھ رکھ دیا۔ تاکہ وہ لڑکی اسے دیکھ کر اس کی خوبصورتی سے پوری طرح متاثر ہو سکے۔

"یہاں آج کوئی بھی نہیں ہے۔" لڑکی بولی۔ "تم ذرا ٹھہرو میں چائے کا ایک پیالہ بنا دوں۔"

وہ خاموشی سے میٹھا چائے پیتا رہا۔ اور لڑکی اپنی دونوں کہنیاں ایک اونچے صندوق پہ ٹکائے اُس کی طرف دیکھتی رہی۔ "یہاں پر میرا جی نہیں لگتا،" وہ بولی: "وہ کبڑا خود تو بہت سی راتیں باہر ہی گزار دیتا ہے۔

پھیری والا کچھ بھی نہ سمجھا۔ لڑکی نے کہا۔ "اوہ! تم تو کچھ بھی نہیں سمجھتے؛ ورنہ ہم یہاں بیٹھے مزے سے رات بھر باتیں کرتے۔"

وہ چائے کے دو پیالے ختم کر چکا تھا۔ اسکے بعد بولا۔

"اچھا۔۔۔ آؤ۔۔۔ بولو۔۔۔ ساڑھے آٹھ آنہ"

"کیا تم بھاگ جانا چاہتے ہو یہاں سے۔۔۔ تمہیں ہمارا یہ چھوٹا سا مکان پسند نہیں ہے؟"

"کیسے؟" وہ حیرانی سے بولا۔

"کیسے کا کیا مطلب؟" وہ بولی۔ "دیکھو ـــــ یہاں آگ جل رہی ہے، باہر کتنی سردی ہے۔۔۔ یہاں دھوپ کی خوشبو آتی ہے میری ساس ہر روز پوجا کیا کرتی ہے۔ میں آرتی اتارتی ہوں۔ مورتی کی۔ کل ہی میں نے نئے کپڑے سلائے تھے۔ قمیص ـــــ دیکھو یہ قمیص میرے جسم پر کیسے پوری آتی ہے"

پھیری والا پھر اُس کی طرف حیرت سے دیکھنے لگا۔ وہ بولی ـــــ "دیکھو، میرے بازو کتنے نرم ہیں، اگر وہ بُڈھا نہ ہوتا۔ تو میں کئی خوبصورت بچوں کی ماں ہوتی۔۔۔ اگر گھر میں کوئی رونق نہیں تو اس میں میرا کیا قصور ہے؟"

"ساڑھے آٹھ آنہ" ـــــ پھیری والا اُسے لگی"

لڑکی مسکرانے لگی۔ اُس کے صحت مند، خوبصورت دانت دکھائی دینے لگے۔ وہ بولی۔ "تمہیں جلدی کاہے کی ہے ـــــ ساڑھے آٹھ آنے ہی ہیں نا ـــــ مل جائیں گے۔۔۔ کل رات جب وہ خراٹے لے رہا تھا۔ تو میں نے اُس کی جیب میں سے آٹھ آنے نکال لئے تھے اُسے بالکل پتہ نہیں چلا۔ وہ بہت ہی بوڑھا ہے۔ میرے لئے بہت بوڑھا ہے۔

اس کے بعد وہ ہنسنے لگی۔ اور اگرچہ پھیری والا کچھ نہ سمجھا لیکن وہ بھی بے تحاشا ہنسنے لگا۔

"کتنا آچا دن اے" وہ بولا۔

"اور تمہیں پیسوں کی ضرورت ہو گی، ہے نا؟" لڑکی نے پوچھا۔

"پیئی سا۔۔۔ پیئی سا۔۔۔ ہاں ہاں!"

اب وہ دونوں ہنس رہے تھے۔ اور ایک دوسرے کے بالمقابل کھڑے تھے۔

لڑکی نے اُس کے کوٹ کا دامن پکڑ لیا۔ اور بولی۔ "تمہارے ملک میں عجیب بے ڈھنگے کوٹ پہنتے ہیں، یہ بے معنی دامن! یہ! ہمارے یہاں اچکنیں ہوتی ہیں۔ بہت خوبصورت اچکنیں ـــــ"

پھیری والے نے کوئی جواب نہ دیا۔ تو وہ بولی۔ "تم عجیب آدمی ہو"

اس کے بعد لڑکی نے ہاتھ اوپر اٹھائے۔ گویا وہ بالوں کو سنوارنا چاہتی ہو۔ اور سچ مچ قمیص اُس کے جسم پر پوری آتی تھی۔

اس کے بعد اُس نے ایک جمائی لی۔ اور اپنا ہاتھ منہ پر رکھ لیا۔

پھیری والے نے جھک کر اپنی بکھری ہوئی تصویروں کو اکٹھا کرنا شروع کیا۔ اور وہ اُس کی طرف دیکھتی ہوئی بولی۔

"تمہاری عمر کتنی ہے ـــــ ابھی تم بہت چھوٹے ہو۔ اگرچہ

نوجوان ہو۔ . . . لیکن تم نہیں جانتے۔ دنیا کیا ہوتی ہے؟" اُس نے بے معنی طور پر کہا۔

"کیسے؟" پھیری والا بولا۔ "پسند نہیں؟ —— کوئی تصویر؟ آٹھ آنے ساڑھے آٹھ نہیں —— پورا آٹھ آنے"

"چلے جاؤ باہر یہاں سے"، لڑکی نے فوراً ہی خشمگین ہوتے ہوئے کہا۔ اور پھر خود بھی جلدی سے اُس کی تصویریں سمیٹنے لگی اسکے بعد اُس نے زور سے پھیری والے کو دروازے کے باہر دھکیلا۔ اور وہیں آ کر صندوق پر بیٹھ گئی۔ اس وقت اس کا سانس دھونکنی کی مانند چل رہا تھا۔

پھیری والے نے ایک قدم پیچھے اٹھایا۔ اور التجا آمیز نگاہوں سے اُسکی طرف دیکھ کر بولا۔ "صرف آٹھ آنا —— اچھا تصویر"

"لے جاؤ اپنی تصویر"، اُس نے دہلیز کے پاس پڑی ہوئی تصویر کو اٹھاتے ہوئے کہا۔ "لے جاؤ اپنے ماں باپ کی تصویر"

اور ایسا کہتے ہوئے اُس نے لیلےٰ مجنوں کی تصویر زور سے اُسکے قدموں میں پھینک دی۔ شیشہ ٹوٹتا ٹوٹتا بچ گیا۔ پھیری والے نے جھک کر تصویر اٹھالی۔ اور بڑی حیرت سے اُس عورت کی طرف دیکھنے لگا۔

"ہمارا آنا —— بغیر فریم کا"، وہ بولا۔ "بڑت شفتا"

لڑکی نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ صندوق کو زور سے دبائے ہوئے بیٹھی رہی۔ اُس کا رنگ زرد ہو رہا تھا۔ اور اُسکے شانے تنے ہوئے تھے اسوقت اُس نے وہی چائے کی خالی پیالی اٹھائی۔ اور زور سے اسے پھیری والے پر پھینک دی۔ پیالہ اُسے چھاتی پر لگا۔ اور وہ پیچھے ہٹ گیا۔ وہ ایک عجیب انداز سے چیخا جیسے گلہری چیختی ہو جب اُس پہ فوراً ہی کوئی بلی حملہ کرے۔ اُسکے بعد وہ اپنی تصویر کو بڑی مضبوطی سے تھامے ہوئے چلا گیا۔

اُس لڑکی نے دروازے میں سے دیکھا۔ پھیری والا بڑی جلدی جلدی جا رہا تھا۔ اور اُس کے کوٹ کا بے معنی دامن ہوا میں اڑ رہا تھا۔ اُس وقت درخت ہوا سے زور آزمائی کر رہے تھے۔ اور ادھر اُدھر بھاگتے ہوئے بادلوں میں سے سورج کی چندھیا دینے والی روشنی طوفان کی صورت میں اتر رہی تھی، زمین بہار کے موسم کی وجہ سے ہنستے لگی تھی اور وہ دروازے پر کھڑی اپنے بال سنوارتی رہی۔ اور دیر تک اُس چینی پھیری والے کو دیکھتی رہی۔ اس کے بعد اُسے یاد آیا۔ کہ اُس نے ابھی گائے کو بھی چارہ ڈالنا ہے!

سیاست کا فلسفہ پانچویں صدی قبل مسیح سے شروع ہوتا ہے۔ اس سے قبل مصر، بابل، ایشیاء کوچک اور جزیرہ قرص میں بھی اسکے آثار نظر آتے ہیں۔ ہمیں مشرق کی مقدس کتابوں سے پتہ چلتا ہے۔ کہ ہندوستان اور چین میں بھی سیاسی معاملات پہ کافی غور و فکر کئے جا چکے تھے۔ مگر یہ ابتدائی ریاستیں اور ہی حکومتیں تھیں۔ جنکے قوانین خدائی احکام متصور ہوتے تھے۔ مصر کے فراعنہ کو لوگ خدا مانتے تھے۔ اور شاہ بابل دیوتاؤں کی نسل سے شمار کیا جاتا تھا۔ اس ابتدائی دور میں سیاست اور مذہب دونوں ایک ساتھ وابستہ تھے۔ یونانیوں نے سب سے پہلے اشیاء کو ان کی اصلی ماہیت میں دیکھنے کی کوشش کی لیکن اس سے یہ مقصد نہیں۔ کہ انہوں نے مذہب کو بالکل چھوڑ دیا تھا۔ کیونکہ اس زمانہ کا ایک مقولہ ہے کہ یونان کے شہر ایتھنز میں دیوتاؤں کی تعداد سے بہت زیادہ تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ یونانیوں نے مذہب کو شدید اہمیت نہیں دی تھی۔ اس قسم کے فلسفیوں میں سب سے پہلا نمبر فیثا غورث کا ہے جو محض ایک فطری فلسفی تھا۔ سیاسی مدبر نہیں تھا (سندی گورکھپوری)

سہیل عظیم آبادی

بخیر تمام

بڈھے رام داس کو ایک ہی کام کرتے بائیس سال گزر چکے تھے ایک ہی کام کسی دن بھی شمار کار میں کوئی فرق نہیں آیا

صبح سویرے اٹھ کر دور تک ریلوے لائن کو دیکھ آتا۔ کہ کہیں کوئی خرابی تو نہیں ہے۔ پھر اپنی "گمٹی" میں واپس چلا آتا۔ اور بہت سے ایسے کام کرتا جس سے چند پیسوں کی روزانہ آمدنی بڑھ جاتی "گمٹی" کے بغل سے شہر کی طرف سڑک جاتی تھی، یہ سڑک گمٹی کے پاس ریلوے لائن کو کاٹتی تھی۔ لائن کے دونوں طرف سڑک پر لوہے کا دروازہ تھا، جس پر اسے کامل اختیار تھا۔ اس اختیار سے وہ بعض ناجائز فائدے بھی اٹھا لیا کرتا تھا۔ شہر کو جانے والی گاڑیوں سے ہلکا پھلکا ٹیکس وصول کر لیا کرتا۔ اس ٹیکس میں پاٹ خاص طور پر ملتا تھا جس سے وہ بہت ہی باریک ڈوری بٹتا اور بازار جا کر بیچ دیا کرتا۔

ریل گاڑیوں کے آنے کے وقت وہ بہت مستعد رہا کرتا تھا۔ دونوں طرف کے دروازے بند کر کے وہ اُس وقت تک نہ کھولتا۔ جب تک گاڑی چل نہ جاتی۔ اُس وقت بڑی سے بڑی رشوت بھی وہ قبول نہیں کرتا تھا۔ یہی وجہ تھی۔ کہ بائیس برس کی لمبی مدت میں اس کی گمٹی کے راستے پر ایک حادثہ بھی نہیں ہوا تھا۔ ہمیشہ یہی دیکھا گیا۔ کہ دن کے وقت دروازے بند کر کے وہ ہری جھنڈی اور رات کے وقت ہری بتی دکھا رہا ہے۔ اور دروازے کے دوسری طرف کے آدمیوں کو سمجھا رہا ہے۔

اُس کا نام کم لوگ جانتے تھے۔ عام طور پر اُسے جمعدار کہا جاتا تھا۔ اور وہ خود بھی اپنے آپ کو جمعدار ہی سمجھتا تھا۔ کبھی کبھی وہ دروازہ بند کر کے بیل گاڑیوں کا راستہ روک دیتا۔ اور بیل گاڑی والے ضد کرتے۔ کہ اُنہیں جانے دے۔ تو وہ کہہ دیا کرتا" اس وقت لاٹ صاحب بھی کہیں۔ تو پھاٹک نہیں کھل سکتا" اس وقت گاڑی والوں اور مسافروں کی خوشامد میں اُسے بڑا لطف آتا۔

* * * * *

صبح سویرے جب وہ دور تک لائن دیکھ کر واپس آیا۔ تو اُس نے دیکھا کہ گمٹی کے پاس ہی ٹرالی کھڑی ہے۔ ٹرالی پر لال جھنڈی لگی ہے۔ صاحب بیٹھا ہے۔ اور چار قلی کھڑے ہیں۔ رام داس نے دیکھتے ہی جھک کر سلام کیا۔ لیکن "صاحب" کی اور وہ بھی ہندوستانی صاحب" کی سب سے بڑی شان یہ ہوتی ہے۔ کہ وہ اپنے ماتحت کام کرنے والوں سے اچھی طرح بات نہیں کرتا۔ چنانچہ رام داس کے سلام کا جواب صاحب نے منہ بنا کر دیا۔

"تم اِتنا دیر کہاں گیا تھا —— ؟"

رام داس صاحب کا رنگ دیکھ کر سہم گیا۔ اور بولا۔

"صاحب! میں لائن دیکھنے گیا تھا ——"

صاحب نے اُسی شان کے ساتھ مُنہ بنا کر جواب دیا۔

"اور ہمارا کام کرو۔ اچھا سنو —— پرسوں کا دن ادھر سے لاٹ صاحب کا اسپیشل جائے گا۔ تم اپنا لائن اور گمٹی صاف رکھے گا۔ سُن لیا ——"

رام داس نے گردن جھکا کر اُس کا جواب دیا۔

"ہاں صاحب!"

قلیوں نے ٹرالی کو دھکا دے کر آگے بڑھایا۔ پھر دوڑنے لگے۔ ٹرالی تیزی سے چلنے لگی۔ رام داس دیر تک اُدھر دیکھتا رہا۔ صاحب کی شانِ بے نیازی۔ اُس کا رُعب، اُس کے کپڑے، اس کا حکم۔ بڑے آدمی کی بڑی بات۔

جب صاحب کی ٹرالی نظر سے اوجھل ہونے لگی۔ تو وہ اپنی

جگہ پر واپس آیا۔ اُس کی بیوی کھڑی صاحب کی باتیں سُن رہی تھی اور انتظار کر رہی تھی۔ کہ صاحب جائے۔ تو رام داس کو کھچڑی کھانے کو کہے۔ اُس کو فکر تھی۔ کہ کھچڑی ٹھنڈی ہو جائے گی۔ تو بدمزہ ہو جائے گی۔ اُس نے لہسن مرچ کا کوچا" خاص طور پر بنایا تھا۔ دھنیا کا ہرا تنا پتلا پتلا کاٹ کر اُس نے کوچا میں ملایا تھا۔ اور رام داس کو ایسا کوچا بہت پسند تھا۔ اور وہ خوش تھی۔ کہ دوسرے دنوں سے زیادہ کھانا کھائیگا۔

رام داس واپس آیا۔ تو بہت خوش تھا۔ ہر روز کی طرح صاحب کی باتوں کا، اُسپر کوئی اثر نہ تھا۔ اس قسم کی باتیں تو روز ہی ہوا کرتی ہیں۔ اس قسم کی باتیں سننا اور خواہ مخواہ کی افسروں کی جھڑکیاں سہنا، چھوٹے کام کرنے والوں کی ڈیوٹی میں شامل ہے۔ اسلئے وہ اگر کچھ خیال کرتا تو احمق تھا۔ لیکن اس کی بیوی نے سوال کر ہی دیا

"صاحب کاہے کو بول رہا تھا—؟"

"رام داس نے اپنی ٹوٹی چارپائی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

جھوٹ موٹ کچھ: کچھ بگڑنا افسر کا کام ہے — ہاں کا پکا ہے لاؤ تو —اور ذرا تاریاں چھڑا دے"

اُس کی بیوی کوٹھڑی میں چلی گئی۔ رام داس نے گمٹی کو دیکھا۔ چھوٹے سے سائبان میں کھانا پکانے کی وجہ سے چھت اور دیوار دھوئیں سے کالی ہو گئی تھی۔ اُس نے سوچا کہ اب کوئی گاڑی شہر سے چونا لے کر جائے گی۔ تو تھوڑا سا چونا اُس سے لے لیگا۔ تھوڑا سا چونا اس سائبان کی سفیدی کے لئے کافی ہوگا۔ پھر اُس نے اپنی لگائی ہوئی ننھی سی پھلواڑی کو دیکھا۔ جو گمٹی سے ملی ہوئی زمین میں اُس نے بڑی محنت سے لگائی تھی۔ اُس ننھی سی پھلواڑی میں گیندا، جٹا دھاری سورج مکھی، بیلا اور کنیل کے لال پیلے اور اُجلے پھول کھلے تھے عشق پیچاں کی بیل بانس کی قمچی کے سہارے چڑھ کر گمٹی کے اوپر پہنچ چکی تھی۔ اور گمٹی کا نمبر ۴۲ آدھا ڈھک گیا تھا۔ لہلہاتے ہوئے پھولوں کو دیکھ کر اُس کا دل خوش ہو گیا۔ اتنے میں اس کا طوطا بول اٹھا "رام مٹھو، مٹھو کھاؤ، کھاؤ" طوطا جو کچھ سنتا تھا۔ وہی دہراتا تھا۔ اور جب رام داس چارپائی چھوڑ کر کھانے پر بیٹھا۔ تو طوطے نے رام داس ہی کی سکھائی ہوئی بات دہرائی "پہلے کہو رادھے شیام رادھے کرشن، پھر کھاؤ بیٹا"

رام داس نے طوطے کو دیکھا۔ بےساختہ اُس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ دوڑ گئی اور بولا۔

"اچھا اچھا — بیٹا"

یہ کہتے ہوئے رام داس اٹھا۔ اور تھوڑی سی کھچڑی طوطے کی کٹوری میں دے کر بولا

"پہلے کہو رادھے شیام رادھے کرشن، پھر کھاؤ بیٹا"

لیکن طوطا باتوں کو دہرا سکتا ہے۔ حکم کی تعمیل اُس کے بس سے باہر ہے۔ اُس نے بغیر رادھے شیام رادھے کرشن کہے کھانا شروع کر دیا۔ رام داس نے بھی—

رام داس کو کھانے میں بڑا مزہ آیا۔ اُسی وقت اُس نے اپنی بیوی سے کہا۔

"چھٹی ملے تو مچھلی مار لائیں۔ بہت دن ہوئے۔ مچھلی کھائے ایک جگہ کھاتے میں مچھلی ہے۔ پانی بھی تھوڑا ہے۔ اور پھلواڑی میں دھنیا کا ساگ بھی ہے بڑا مزا آئے گا۔"

اُس کی بیوی نے بھی ہاں میں ہاں ملائی

* * * * * *

رام داس کو جب سے صاحب، نے آ کر خبر دی۔ کہ لاٹ کی اسپیشل جانے والی ہے۔ وہ اپنے کاموں میں لگ گیا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اُسے کیا کیا کام کرنے ہونگے۔ اس کو کسی سے کچھ پوچھنا نہ تھا۔ وہ بائیس سال کی مدت سے یہی کام کرتا آیا تھا۔ ایک دو بار نہیں بیسیوں مرتبہ لاٹ صاحب کی گاڑی اِدھر سے گزر چکی تھی۔

جمعہ کا دن آ گیا۔ اُس نے اپنے علاقہ کی لائن دیکھ لی۔ ہر جگہ دیکھ لی۔ ہر جگہ اچھی تھی۔ لائن کے دونوں طرف کی گھاس اُس نے خود ہی صاف کی تھی۔ گمٹی کا سائبان جو کالا ہو گیا تھا۔ اب وہ بھی مانگے کے چونا سے سفید ہو چکا تھا۔ ٹوٹی ہوئی چارپائی کو اُس نے گمٹی کے پیچھے رکھ دیا تھا۔ گیندا، بیلا، جٹا دھاری اور کنیل کے پھول کھلے ہوئے تھے۔ عشق پیچاں کی بیل بانس کی قمچی کے سہارے

چڑھ کر گمٹی کے اوپر پہنچ چکی تھی۔ اُس نے ہر طرف نگاہ دوڑائی اُس کا دل خوش ہوگیا۔ اُس کی بیوی نے ناریل چڑھا دیا۔ اور وہ ٹہل ٹہل کر پینے اور دھواں اڑانے لگا۔

اُسے دور سے مال گاڑی آتی دکھائی دی۔ رام داس نے دوسری طرف کا دروازہ بند کر دیا۔ پھر گمٹی کی طرف کا اور اطمینان سے بیٹھ کر ناریل پینے لگا۔ مال گاڑیوں کے آنے پر وہ مطمئن رہتے تھے۔ اس کی عورت سائبان میں بیٹھی ہوئی۔ اس کی لائی ہوئی مچھلی بنا رہی تھی۔ پھلواڑی میں سے تنبیا کا ساگ پہلے ہی وہ لا کر صاف کر چکی تھی۔

رام داس بے چینی سے وقت کا انتظار کر رہا تھا۔ لاٹ صاحب کی سپیشل چلی جائے تو پھر اطمینان نصیب ہو۔ بہت سی سپیشل اور مال گاڑیاں آئیں اور چلی گئیں۔ اُس نے اپنا کام مستعدی سے کیا۔ لیکن اُس کو یہی محسوس ہوتا رہا کہ یہ سب معمولی کام تھا۔ اصل کام باقی ہے۔

آخر وہ وقت بھی قریب آگیا، جب لاٹ صاحب کی اسپیشل ٹرین گزرنے والی تھی۔ ایک گھنٹہ سے پہلے وہی صاحب کہہ گیا کہ اسپیشل آنے میں اب زیادہ دیر نہیں ہے۔ لائن پر جگہ جگہ چوکیدار کھڑے کر دئے گئے۔ تاکہ لائن کو کوئی بدمعاش خراب نہ کرنے پائے۔

سورج ڈوبتا جا رہا تھا۔ اور بہت ہی ہلکی ٹھنڈک پیدا ہو چلی تھی۔ اب وقت بہت کم تھا۔ شاید دس منٹ لاٹ صاحب کی اسپیشل ٹرین کا کوئی خاص وقت مقرر تو تھا نہیں۔ اس کی بیوی نے کہا۔ کہ مچھلی پک گئی کھا لو۔ لیکن اُس نے جواب دیا۔ "اب گاڑی چلی جائے تو اطمینان سے کھائینگے۔"

وہ اپنی جگہ سے اٹھا۔ اور دوسری طرف کا دروازہ بند کرنے چلا ایک دو بیل گاڑیاں دروازے سے ادھر آ چکی تھیں۔ چار پانچ ادھر باقی رہ گئیں تھیں، جو دوسری طرف رہ گئیں۔ اس کے گاڑی بان ضد کر رہے تھے۔ کہ جب اُن کو جانے دیا۔ تو ہمیں بھی جانے دے۔ رام داس نے پہلے سمجھایا۔ پھر اپنی نوکری کا واسطہ دیا۔ خوشامدیں کیں۔ لیکن گاڑی بان موٹی عقل کے ہوتے ہیں۔ کوئی بات اُن کی سمجھ میں آسانی سے آتی کب ہے۔ وہ اپنی ضد پہ قائم تھے۔ دوسری طرف کا دروازہ کھلا تھا۔ ایک دو گاڑی والے جو دوسری طرف سے آ رہے تھے۔ اُسی طرف رُک گئے تھے۔

بحث جاری تھی۔ رام داس سمجھا رہا تھا۔ گاڑی بان الجھ رہے تھے۔ وہ دوسری طرف کا دروازہ بھی بند نہ کر سکا۔ شاید ہم گاڑی بان پھاٹک کھول کر گاڑی ہانک دیں۔ جب سارا سمجھانا بجھانا بے کار ہوا تو اُس نے صاف کہہ دیا۔

"اس وقت تو اگر لاٹ صاحب بھی کہیں۔ تو دروازہ نہیں کھل سکتا۔"

ایک جوان گاڑی بان اس کا مذاق اُڑا کر ہنسنے لگا۔ رام داس نے اپنے لفظوں پر زور دے کر کہا۔

"ہاں ہاں ۔۔۔"

یکایک گاڑی کے آنے کی آواز اُس کے کانوں میں آئی۔ اُس نے پلٹ کر دیکھا۔ لاٹ کی اسپیشل ٹرین بہت قریب آ چکی تھی۔ دوسری طرف کا پھاٹک، کھلا ہوا تھا۔ اب کیا ہوگا؟ ڈیوٹی میں بے فکری۔ نوکری کا چلے جانا تو ضروری بات تھی۔ اگر نہ بھی گئی۔ تو لمبی ڈانٹ تو ضروری تھی ۔۔۔"

وہ بوکھلا سا گیا۔ کچھ نہیں سوچ سکا۔ تیزی سے وہ بڑھا کہ لائن کو پار کر کے گاڑی کے جانے سے پہلے۔ پھاٹک، بند کر دے لیکن وہ بند نہ کر سکا۔ لاٹ صاحب کی اسپیشل ٹرین گذر گئی۔

لائن کے ایک طرف رام داس کی لاش کے ٹکڑے جیسے قصاب کی دکان سے آیا ہوا گوشت۔ اُس کی عورت روتی چلاتی رہی ۔۔۔ اور ڈوبتے ہوئے سورج کی مٹتی ہوئی روشنی میں لاٹ صاحب کی اسپیشل ٹرین تیزی سے چلی گئی۔

دوسرے دن اخبارات میں خبریں موٹے حرفوں میں چھپیں۔ "لاٹ صاحب کی اسپیشل ٹرین بخیر تمام پہنچ گئی۔"

شعرستان!
جگر مراد آبادی
ن۔ م۔ راشد
جوش ملیح آبادی
فیض احمد فیض
سیماب اکبر آبادی
گوپال متل
جلیل مانکپوری
علی اختر
اثر صہبائی
عبد الحمید عدم
آزاد انصاری
کرپال سنگھ بیدار

جگر مراد آبادی

غزل

دل میں کسی کے راہ کئے جا رہا ہوں میں
کتنا حسیں گناہ کئے جا رہا ہوں میں

فردِ عمل سیاہ کئے جا رہا ہوں میں
رحمت کو بے پناہ کئے جا رہا ہوں میں

ایسی بھی اک نگاہ کئے جا رہا ہوں میں
ذرّوں کو مہر و ماہ کئے جا رہا ہوں میں

دنیائے دل تباہ کئے جا رہا ہوں میں
صرفِ نگاہ و آہ کئے جا رہا ہوں میں

تنقیدِ حسن مصلحتِ خاص عشق ہے
یہ جُرم گاہ گاہ کئے جا رہا ہوں میں

اُٹھتی نہیں ہے آنکھ مگر اس کے روبرو
نادیدہ اِک نگاہ کئے جا رہا ہوں میں

یوں زندگی گذار رہا ہُوں ترے بغیر
جیسے کوئی گناہ کئے جا رہا ہوں میں

گلشن پرست ہوں مجھے گُل ہی نہیں عزیز
کانٹوں سے بھی نباہ کئے جا رہا ہوں میں

مجھ سے لگے ہیں عشق کی عظمت کو چار چاند
خود حُسن کو گواہ کئے جا رہا ہوں میں

ن۔م۔راشد۔ایم۔اے

اجنبی عورت

ایشیا کے دور افتادہ شبستانوں میں بھی۔
میرے خوابوں کا کوئی روماں نہیں۔
کاش اِک دیوارِ ظلم
میرے ان کے درمیاں حائل نہ ہو!
یہ عمارات قدیم
یہ خیاباں، یہ چمن، یہ لالہ زار۔
چاندنی میں نوحہ خواں۔
اجنبی کے دستِ غارت گر سے ہیں!
زندگی کے اِن نہاں خانوں میں بھی
میرے خوابوں کا کوئی روماں نہیں
کاش اِک دیوارِ رنگ
میرے ان کے درمیان حائل نہ ہو
یہ سیہ پیکر، برہنہ راہرو
یہ گھروں میں خوب صورت عورتوں کا زہر خند
یہ گذرگاہوں پہ دیو آسا جواں
جن کی آنکھوں میں گرسنہ آرزوؤں کی لپک
مشتعل بے باک مزدوروں کا سیلاب عظیم!
ارضِ مشرق! ایک مبہم خوف سے لرزاں ہوں میں
آج ہم کو جن تمناؤں کی حرمت کے سبب
دشمنوں کا سامنا مغرب کے میدانوں میں ہے۔
اُن کا مشرق میں نشاں تک بھی نہیں!

جوش ملیح آبادی

غزل

زباں ساکت ہے لیکن لن ترانی اب بھی ہوتی ہے
لب خاموش سے جادو بیانی اب بھی ہوتی ہے

حدیث نفس کی صورت میں اکثر خود بخود پہروں
زبان کیف کی افسانہ خوانی اب بھی ہوتی ہے

رسول شادمانی ہوں مگر چھڑتے ہیں جب نغمے
نظر سے سوز غم کی ترجمانی اب بھی ہوتی ہے

خدائے خندہ ہوں لیکن جب اُن کی یاد آتی ہے
مری آنکھوں سے اشکوں کی روانی اب بھی ہوتی ہے

بہ ایں مشق تحمل بارہا خاموش راتوں میں
کسی کی یاد مرگ ناگہانی اب بھی ہوتی ہے

کبھی جب عہد رنگینی کی راتیں یاد آتی ہیں
عروس شوق کی پوشاک دھانی اب بھی ہوتی ہے

وفور یاس سے گو دل رہین برف و شبنم ہے
کبھی پچھلے پہر آتش فشانی اب بھی ہوتی ہے

خرد کا دور ہے لیکن مرے کمبخت سینے میں
جنوں کی گاہے گاہے پر فشانی اب بھی ہوتی ہے

ترانوں سے مری محفل کو گو فرصت نہیں ملتی
مگر تنہائیوں میں نوحہ خوانی اب بھی ہوتی ہے

نہ جانے جوش کس ارماں میں اب تک جان باقی ہے
کہ اکثر آرزوئے زندگانی اب بھی ہوتی ہے

پروفیسر فیض۔ ایم۔ اے

افسردگی

بام و در خامشی کے بوجھ سے چُور

آسمانوں سے جوئے درد رواں

چاند کا دُکھ بھرا فسانۂ نُور

شاہراہوں کی خاک میں غلطاں

خوابگاہوں میں نیم تاریکی

مضمحل لَے ربابِ ہستی کی

ہلکے ہلکے سروں میں نوحہ کناں

پروفیسر کرپال سنگھ بیدؔار

نغماتِ بیدؔار

(۱)

مپرس اے دوست از تاب و تبِ من ہمہ برق و شرر حرفِ لبِ من

دلم پر داغ و ہر داغ آفتابے ست جبینِ صبح تابد از شبِ من

(۲)

درِ افلاک یکسر باز کردم جہاں را آشنائے راز کردم

بہ اہلِ خاک بخشیدم پرِ شوق زمیں را آسماں پرواز کردم

(۳)

دگر رطلِ گراں لبریز کردم جہانِ کہنہ را نوخیز کردم

گرفتم از دلِ ساغر شعاعے نگہ را آفتاب انگیز کردم

سیماب اکبر آبادی

عرفانِ لاالہ

ملی ہے محرمِ انسانیت نگاہ مجھے ‏ فقیر بھی نظر آتا ہے بادشاہ مجھے

جہانِ ہوش پر اب بھی ہے دستگاہ مجھے ‏ بنا رہا ہے نوائے بیخودی تباہ مجھے

نہ دی اُدھر مری خودداریوں نے راہ مجھے ‏ اشارے کرتے رہے افسر و کلاہ مجھے

ملی نہ جب کہیں دنیا میں امن گاہ مجھے ‏ خود اپنے سائے میں لینی پڑی پناہ مجھے

بنا کے حسنِ حقیقت کی جلوہ گاہ مجھے ‏ کیا فضول پریشانِ رسم و راہ مجھے!

متاعِ عمر ہوئی صرفِ سعیِ لاحاصل ‏ مری سکوں طلبی نے کیا تباہ مجھے

گرفتگی ہے کمالِ شگفتگی کا مآل ‏ ہر ایک پھول ہے رنگیں اک انتباہ مجھے

گلا نہ کیجئے میری شگفتہ سنجی کا ‏ بدلنے دیجئے تقدیرِ اشک و آہ مجھے

یہ حسنِ ظن ہی رہا مانعِ نظارۂ حسن ‏ سمجھ لیا کہ نہیں جرأتِ نگاہ مجھے

نہ ہوتے یوں مرے لیل و نہار کے نگراں ‏ جو کم نگاہ سمجھتے نہ مہر و ماہ مجھے

اسی لئے تو ہوا میں رجوعِ حجابِ دل ‏ کوئی بتا نہ سکا تیری جلوہ گاہ مجھے

نہیں مجھے ہوسِ قیصری و دارائی ‏ ملی ہے دولتِ عرفانِ لاالہ مجھے

کل آئینہ میں رہی زیرِ غورِ خودبینی ‏ کہیں نگاہ کو دیکھا کیا نگاہ مجھے

میں کس کے آگے گناہوں پہ منفعل ہوتا ‏ ملا نہ کوئی بھی دنیا میں بے گناہ مجھے

فرشتہ مجھ کو سمجھ لیں وہ کس طرح سیماب
جو دیکھتے ہیں بقیدِ دل و نگاہ مجھے

گوپال متل

دوراہا

دوراہے پہ ہے کارواں زندگی کا

اِدھر عیش کی بزم آراستہ ہے ۔ اُدھر فرض کا پُرخطر راستہ ہے
اُدھر فاقہ مستوں کی آہ و بکا ہے ۔ رباب مسرت اِدھر نغمہ زا ہے
اُدھر سرفروشی، اِدھر دلنوازی ۔ اِدھر کچھ حسیں اُس طرف چند غازی
اِدھر کامرانی کی دلکش امیدیں ۔ اُدھر دلشکن روح فرسا شکستیں
اِدھر کیف و مستی اُدھر تلخئ غم ۔ اِدھر قہقہے اُس طرف چشمِ پُرنم
میں اے دل قدم کس طرف کو بڑھاؤں ۔ میں یہ راہ پکڑوں کہ اُس سمت جاؤں

دوراہے پہ ہے کارواں زندگی کا

اِدھر ہے غلامی کا بے روح نغمہ ۔ اُدھر جانفزا حریت کا ترانہ
اِدھر بے حسی سے ہر اک جبر سہنا ۔ اُدھر دل میں جو کچھ ہو بیباک کہنا
اِدھر پائے دولت[1] پہ سر کو جھکانا ۔ اُدھر شہریاری سے پنجہ لڑانا
اِدھر خوار ہونا خود اپنی نظر میں ۔ اُدھر نشۂ سرکشی کی ترنگیں
اِدھر مال و دولت، اِدھر جنسِ ایماں ۔ ہے انہیں سے کیا تیری راحت کا ساماں
میں اے دل کسے اپنا مقصد بناؤں ۔ میں یہ راہ پکڑوں کہ اُس سمت جاؤں

دوراہے پہ ہے کارواں زندگی کا

غریبی کا اپنے کو خوگر بنالوں ۔ کہ فطرت کا اپنی گلہ گھونٹ ڈالوں
سنبھالے رکھوں حق پرستی کا پرچم ۔ کہ میں بھی کروں مال و دولت فراہم
اسے پاؤں پر لکشمی کے جھکا دوں ۔ کہ سر اپنا راہ وطن میں کٹا دوں
بغاوت کی تانیں اُڑانا چلوں میں ۔ کہ خواب آفریں گیت گانے لگوں میں
وہ بزم طرب سے ہوا پھر اشارہ ۔ سر دار اُدھر وہ کسی نے پکارا
میں اے دل کسے بڑھ کے لبیک کہدوں ۔ میں اس سمت جاؤں کہ وہ راہ پکڑوں

دوراہے پہ ہے کارواں زندگی کا

[1] دولت کی دیوی

فصاحت جنگ جلیلؔ

غزل

آپ ہی سے گھر مرا آباد ہے — صورت آنکھوں میں ہے دل میں یاد ہے

کر گئی سونا چمن بادِ خزاں — صید ہے نہ کوئی اب صیاد ہے

وہ نظر جس سے لیا تھا تم نے دل! — مدتیں گزریں ابھی تک یاد ہے

ہر کلی گلشن کی مرجھائی ہوئی — سوگوارِ بلبلِ ناشاد ہے

جو کھٹک دل میں ہے کیا سمجھوں اُسے — تیر ہے تیرا کہ تیری یاد ہے

رنگ کیا بدلا ہے جاتے ہی بہار — تھا وہی نغمہ جواب فریاد ہے

کائناتِ زندگی کہتے اسے — دل ہے جب تک دل میں اسکی یاد ہے

خندۂ گل، گریۂ شبنم نہیں! — حال تیرا ہے مری روداد ہے

دردِ دل کہنے کی کیا حاجت جلیلؔ

میری خاموشی لب فریاد ہے

علی اختر

رازِ سکوں

اِک شام، کہ شام بیکسی تھی — ہر نبضِ دماغ تھک چکی تھی
فکروں سے خیال مضمحل تھا — میں اور الم نصیب دل تھا
آلام کے نقش ابھر رہے تھے — اجزائے سکوں بکھر رہے تھے
ہر جنبشِ دل، پیامِ غم تھی — ہر سانس فسانۂ الم تھی
غم روح کو کھائے جا رہا تھا — ہر سمت دھواں سا چھا رہا تھا

القصہ بہت ملول تھا میں
آخر اِک سمت چل دیا میں

کچھ دُور فضائے دشت میں تھا — اِک چشمہ لطافتوں کی دنیا
خود رو غنچے مہک رہے تھے — سبزہ، پودے، لہک رہے تھے
چشمے کی وہ دل کشا روانی — پھولوں کی صبیح ترجمانی
شاداب کلی چٹک رہی تھی — صحرا کی جبیں دمک رہی تھی
مرغانِ ہوا چہک رہے تھے — یا ساغرِ مے کھنک رہے تھے
روحوں کو جگائے جا رہے تھے — نمناک ہوا کے تر جھونکے
فطرت نے یہاں بہم کیے تھے — راحت، جلوے، شراب، نغمے
آئینِ سکوں بتا رہے تھے — پانی، سبزہ، طیور، پودے
دیکھا جو یہ حسن یہ ہوائیں — محسوس ہوا کہ جی گیا میں

دل میں شررِ حیات چمکا
وہ صبر شکن حجاب اُٹھا

عدمؔ

داستاں سرا

یہ کس کی داستاں ہے اے داستاں سرا
اس داستاں میں تپتے ہوئے سانس ہیں رواں
ٹوٹے ہوئے رباب کا نغمہ ہے پرفشاں!
صحرا میں اڑتی پھرتی ہیں پھولوں کی پتیاں!
کھم کھم کے واقعات کے رُخ سے نقاب اُٹھا

یہ کس کی داستاں ہے اے داستاں سرا
کچھ سائے، کچھ بہار، بگولوں کا کچھ خرام
کچھ صبح کی نسیم خنک، کچھ غبارِ شام
خونریز غم کی دھند میں اِک کانپتا سا جام
رقصاں ہے سوتی جاگتی افسانے کی فضا

یہ کس کی داستاں ہے اے داستاں سرا
بوجھل سے آنسوؤں میں محبت کی سسکیاں
وحشت کا سجدہ، زلفِ پریشاں کا آستاں
نخوت کا پائے ناز، جوانی کی کہکشاں
الفاظ کے لبوں پہ ہے کس ساز کی صدا

یہ کس کی داستاں ہے اے داستاں سرا
دھندلے سے کچھ چراغ ہیں مدھم سے کچھ شرار

عدم

داستاں سرا

یہ کس کی داستاں ہے اے داستاں سرا
اس داستاں میں تپتے ہوئے سانس ہیں رواں
ٹوٹے ہوئے رباب کا نغمہ ہے پرفشاں!
صحرا میں اڑتی پھرتی ہیں پھولوں کی پتیاں!
تھم تھم کے واقعات کے رُخ سے نقاب اُٹھا

ـــــــــــ

یہ کس کی داستاں ہے اے داستاں سرا
کچھ سائے، کچھ بہار، بگولوں کا کچھ خرام
کچھ صبح کی نسیمِ خنک، کچھ غبارِ شام
ضو ریز غم کی دھند میں اک کانپتا سا جام
رقصاں ہے سوتی جاگتی افسانے کی فضا

ـــــــــــ

یہ کس کی داستاں ہے اے داستاں سرا
بوجھل سے آنسوؤں میں محبت کی سسکیاں
وحشت کا سجدہ، زلفِ پریشاں کا آستاں
نخوت کا پائے ناز، جوانی کی کہکشاں
الفاظ کے لبوں پہ ہے کس ساز کی صدا

ـــــــــــ

یہ کس کی داستاں ہے اے داستاں سرا
دھندلے سے کچھ چراغ ہیں مدھم سے کچھ شرار

ہے راکھ کچھ پتنگوں کی، شمعوں کے کچھ مزار
بنتے ہیں اور بجھتے ہیں، کچھ نقش او رنگار
ہے ہاتھ میں جنوں کے کسی روح کی قبا

یہ کس کی داستاں ہے اسے داستاں سرا
کرنوں کا رقص، موج کی تشنہ لبی کا راگ؛
کلیوں کے جھینپ رنگ کی انگڑائی، مے کی جھاگ!
جاڑے میں جل رہی ہے کہیں ٹھنڈی ٹھنڈی آگ
سینہ دھڑک رہا ہے پجارن کے عشق کا

یہ کس کی داستاں ہے اے داستاں سرا
گرتے ہوئے کنارے کی مغموم سی صدا
حسرت کی یاس، غم کی مہک، ہجر کی ہوا
زخموں کا رس، تڑپ کی چبھن، درد کا مزا
فریاد کر رہا ہے محبت کا دیوتا

یہ کس کی داستاں ہے اے داستاں سرا
آنکھیں مہ وستارہ کی ہیں گرم واشک ریز
نبضیں دھڑک رہی ہیں عناصر کی تیز تیز
ہے کچھ قریب رات کا انجام خشر خیز
ٹکڑا اِک اور آگ لگاتا ہوا سنا!
اور دو جہاں کو پھونک دے اے داستاں سرا

حکیم آزاد انصاری

حکیم عمرِ خیّام کی بعض مشہور رباعیات کا آزاد ترجمہ

عمرِ خیّام

گویند، بہ خلد حوضِ کوثر باشد ‏ ‏ وانجا مئے ناب و شہد و شکر باشد
یک جام بدہ ز بادہ ام اے ساقی ‏ ‏ نقدے ز ہزار نسیہ بہتر باشد

ترجمہ

جو کہتے ہیں خلد عشرت افزا گھر ہے ‏ ‏ اور مرکز حوران و مئے و ساغر ہے
یارو! انہیں کہنے بھی دو، تم جام اٹھاؤ ‏ ‏ اک نقد ہزار ادھار سے بہتر ہے

عمرِ خیّام

با ایں دوسہ ناداں کہ چناں می دانند ‏ ‏ از جہل کہ دانائے جہاں ایشانند
خوش باش، کہ از خری ایشاں بمثل ‏ ‏ ہر کو نہ خراست، کافرش می خوانند

ترجمہ

یہ چند گدھے جو کچھ نہیں جانتے ہیں ‏ ‏ ان کی فطرت کو کچھ نہیں جانتے ہیں
جو ان کی طرح گدھا نہیں، یہ اُس کو ‏ ‏ کافر کہتے ہیں اور لعین جانتے ہیں

عمرِ خیّام

من بندہ عاصیم، رضائے تو کجاست ‏ ‏ تاریک دلم، نور و صفائے تو کجاست؟
ما را تو بہشت اگر بہ طاعت بخشی ‏ ‏ آں بیع بود، لطف و عطائے تو کجاست؟

ترجمہ

طاعت کے عوض عطائے باغِ رضواں ‏ ‏ اک بیع و شریٰ ہے نہ کہ فضل و احساں
جسکے دعوے تھے وہ تلطف ہے کدھر؟ ‏ ‏ جسکا اعلان تھا، وہ رحمت ہے کہاں؟

عمر خیام

ناکردہ گناہ در جہاں کیست بگو   واں کس کہ گنہ نہ کرد چوں زیست بگو
من بد کنم و تو بد مکافات دہی   پس فرق میان من و تو چیست بگو

ترجمہ

یہ سچ ہے کہ میں نیک نہیں ہوں اصلا   یہ سچ ہے بد ہوں اور بد حد سے سوا
پر جب تو بھی ہے مائل بد پاشی   مجھ میں اور تجھ میں فرق کیا ہے یہ بتا

عمر خیام

دل سر حیات را کماہی دانست   در موت ہم اسرار الٰہی دانست
امروز کہ با خودی نہ دانستی ہیچ   فردا کہ زخود روی چہ خواہی دانست

ترجمہ

گر آج وقوف کی نہیں ٹھانے گا   کل اپنی بھی صورت نہیں پہچانے گا
آج آپ میں ہو کے جب نہ کچھ جان سکا   کل آپ کو کھو کے کس طرح جانے گا

اختر انصاری

آہیں

خدا کے واسطے اختر تجھے ہوا کیا ہے   یہ رات اور یہ شعلہ فشانیاں تیری
نہ چاندنی کی رعایت نہ خنکیوں کا پاس   عجیب دھن ہے تجھے آہ آہ کرنے کی

آرزوئے جواں

تپش میں سوزِ غم میں کرب میں آرام پاتا ہوں   خلش میں درد میں تکلیف میں راحت سی ملتی ہے
خدا رکھے جواں ہے آرزو میری ابھی اختر   ابھی دل کے تڑپنے میں مجھے لذت سی ملتی ہے

کیا قہر ہے یہ؟

نغموں سے کبھی تھا کام ہمیں آہوں میں جی کو کھوتے ہیں   تھا شغل فقط ہنسنا ہی کبھی اب آنکھوں بھر خوں روتے ہیں
اللہ یہ کیسی آفت ہے؟ کیا ظلم ہے یہ؟ کیا قہر ہے یہ؟   ہوتا ہے انہیں کے درپے غم جو نازوں کے پالے ہوتے ہیں

عبدالمجید سالک

بیدل شاہجہانپوری

ابوالبیان مولانا سید حامد حسین بیدل مرحوم غالباً ۱۲۸۲ھ میں سادات شاہجہانپور کے ایک معزز خاندان میں پیدا ہوئے۔ جس میں کئی نسلوں سے علم و ارشاد کا سلسلہ چلا آتا تھا۔ ابتدائی تعلیم اپنے والدین کے زیر سایہ حاصل کی۔ اس کے بعد اس زمانے کے مشہور علماء سے فارسی اور عربی کی کتابیں پڑھیں۔ اور کچھ مدت تک آگرہ اور بریلی کے مدرسوں میں معلمی کرتے رہے۔ اسی زمانے میں شادی ہو گئی لیکن سال دو سال ہی کے بعد بیوی کا انتقال ہو گیا۔ اس حادثہ نے بیدل کے دل و دماغ پر کچھ ایسا اثر ڈالا۔ کہ گھر اور اس کے ماحول سے طبیعت متنفر سی ہو گئی۔ اور پھر عمر بھر شادی نہیں کی۔ بزرگوں کی صحبت اور طبیعت کی صلاحیت کی وجہ سے شعر و سخن کا ذوق تو ابتدا ہی سے تھا لیکن اس حادثہ جانکاہ نے دل میں سوز و گداز کے شعلے بھی روشن کر دیئے۔ چنانچہ اس زمانے کے رواج کے مطابق غزل کہنے لگے۔

یہ وہ دن تھے۔ جبکہ ہندوستان کے طول و عرض میں نواب فصیح الملک داغ مرحوم کا طوطی بول رہا تھا۔ بیدل نے بھی "استادِ جہاں" کی شاگردی اختیار کی۔ آگے چلکر میں آپ کے کلام کا نمونہ پیش کرونگا جس سے سننے والوں کو معلوم ہو جائیگا۔ کہ اگرچہ بیدل نے بہت کم کہا ہے۔ لیکن جو کچھ کہا ہے۔ وہ غزل کے بلند ترین معیار پر پورا اترتا ہے۔ اور وہ بلاشبہ داغ کے شاگردوں میں نہایت ممتاز درجہ رکھتے تھے۔

کوئی تیس سال کی عمر ہوگی، جب وطن کو خیر باد کہا۔ اور یوپی کے مختلف شہروں میں پھرتے پھراتے آخر بمبئی پہنچ گئے۔ اس عروس البلاد کی دلفریبیوں اور علمی صحبتوں نے ایسا گرویدہ کیا۔ کہ وہیں مقیم ہو جانے کا ارادہ کر لیا۔ اور کمیشن ایجنسی کے ایک چھوٹے سے کاروبار کی طرح ڈال دی۔ دولت کی فراوانی بیدل کے ذوق کے خلاف تھی۔ اکیلا دم تھا۔ ضروریات کم تھیں۔ صرف صاف ستھری عزت اور وضعداری کی زندگی بسر کرنا چاہتے تھے۔ سو دو سو روپیہ مہینہ پیدا کر لیتے تھے۔ اور مزے سے گزران کرتے تھے۔ علمی مذاق کی وجہ سے بدرالدین طیب جی کے خاندان اور بیگم صاحبہ جنجیرہ کے ہاں ان کی اچھی آؤ بھگت ہوتی تھی۔ وہیں علامہ شبلی مرحوم سے تعلقات پیدا ہوئے۔ اور چند ہی روز میں علامہ ممدوح بیدل کے اس قدر گرویدہ ہوئے۔ کہ جتنے دن بمبئی میں قیام فرماتے۔ بیدل کی ملاقات میں ایک دن کا ناغہ بھی نہ فرماتے تھے۔ چنانچہ علامہ نے اپنے فارسی کلام کا مجموعہ "بوئے گل" بیدل ہی کے اصرار سے مرتب فرمایا۔ اور اس حقیقت کو سرنامہ کے ان دو اشعار میں بیان بھی کر دیا کہ

هرزه چند بهم بافتن و پیش کسان
عرضه دادن نه پسندیدهٔ عاقل باشد
من هم این کار نمی خواستم از دل اما
چه توان کرد چو فرمودهٔ بیدل باشد

گیارہ بارہ سال بمبئی میں بسر کرنے کے بعد بعض ایسے واقعات رونما ہوئے۔ کہ بیدل کا جی اچاٹ ہو گیا۔ اور انہوں نے بمبئی کو چھوڑ دینے کی ٹھان لی۔ چنانچہ وہاں سے نکل کر چند مہینے لکھنؤ، آگرہ، شاہجہانپور، اور دہلی میں اپنے احباب کے ہاں بسر کئے۔ اور ۱۹۱۰ء میں لاہور آن پہنچے۔ یہاں ڈپٹی برکت علی خاں مرحوم کے صاحبزادے خان بہادر بشیر علی خاں زندہ تھے۔ ان کا خاندان بھی شاہجہانپور ہی کا تھا۔ اور ان کے بزرگوں اور بیدل کے بزرگوں کے درمیان مدت دراز سے گہرے تعلقات [illegible] بیدل صاحب سب سے پہلے انہی کے ہاں [illegible] ہوئے۔ انہی دنوں خان بشیر حسین خاں صاحب کی مہربانی سے بیدل سے

بیدل شاہجہانپوری

نظیر اور حالی

غالب کا امتیازی وصف

عمر خیام

لسان العصر

میری ملاقات ہوئی۔ اور ایسے تعلقات قائم ہوئے۔ کہ مرتے دم تک ان میں ذرہ بھر فرق نہ آیا۔ لاہور میں بیدل کے تعلقات کا دائرہ بہت محدود تھا۔ سید امتیاز علی تاج۔ سید احمد شاہ بخاری۔ شفاء الملک حکیم فقیر محمد مرحوم۔ خان بہادر میاں سراج الدین مرحوم سے خصوصیت تھی۔ اسی دوران میں مفید عام پریس میں ملازم ہو گئے۔ اور دیوان غالب کا ایک ایڈیشن درست کر کے چھاپا۔ انارکلی بازار میں ایک دہلی مسلم ہوٹل ہوتا تھا۔ ہم لوگ وہیں جمع ہوا کرتے تھے۔ اور شعر و ادب کی وہ پُر بہار صحبتیں رہا کرتی تھیں۔ کہ اب تک ان کی یاد سے سینے میں ہوک اُٹھتی ہے۔ ہوٹل کے مالک منشی نعمت اللہ کو ہم سے اس قدر وابستگی ہو گئی تھی۔ کہ مسافروں کا خیال چھوڑ چھاڑ کر ہر وقت بیدل۔ تاج۔ بخاری اور سالک ہی کی خاطرداری میں مصروف رہا کرتے تھے۔ کچھ مدت بعد بیدل ہوٹل کو چھوڑ کر انارکلی بازار کی پشت پر چنگڑ محلے کے ایک مکان میں اُٹھ آئے۔ اور وہاں احباب کا جمگھٹا رہنے لگا۔ جولائی ۱۹۲۱ء میں بیدل صاحب نے مفید عام پریس کی ملازمت ترک کر کے "مخزن" کی ایڈیٹری اختیار کی۔ اور اس پرانے ادبی رسالے میں جو کچھ مدت سے جان توڑ رہا تھا۔ از سرِ نو زندگی پیدا کر دی۔ اور اپنے بے شمار احباب کو اس کی قلمی و مالی امداد پر آمادہ کر دیا۔ لیکن چند ہی مہینے میں یہاں سے بھی طبیعت اُکھڑی۔ اور آپ لاہور چھوڑ کر پھر یو۔پی کی طرف چلے گئے۔ ۱۹۲۵ء میں پھر ایک دو دن کے لیے لاہور آئے۔ حزب الاحناف کے جلسے میں حضرت سجادہ نشین کچھوچھہ شریف آئے تھے۔ بیدل صاحب سے اُن کے خاندانی تعلقات تھے۔ حضرت ان کو اپنے ساتھ لوا لائے۔ دوستوں کو بیدل کی غیر متوقع ملاقات سے اتنی خوشی ہوئی۔ کہ سوکھے دھانوں پانی پڑ گیا۔ اس زمانے میں صحت اچھی نہ تھی۔ احباب نے کہا کہ آپ اب یہیں رہ جائیے۔ ہم آپ کو پہاڑ پر لے چلیں گے انشاء اللہ دو تین مہینے میں صحت بہتر ہو جائے گی۔ کہنے لگے۔ سجادہ نشین صاحب کا ساتھ یہیں چھوڑ دینا تو کچھ اچھا نہیں معلوم ہوتا۔ مجھے اس وقت ان کے ساتھ واپس جانے دو۔ آٹھ دس دن کے بعد آ جاؤں گا۔

لیکن اس ملاقات پر ابھی دو ہی چار مہینے گزرے تھے کہ دفعتہً خبر آئی۔ کہ بھوپال میں انتقال ہو گیا۔ بیمار تھے۔ دن بھر تو دوست پاس بیٹھے رہتے تھے۔ رات کو اکثر اکیلے ہی ہوتے تھے۔ ایک رات کسی ضرورت سے اُٹھے۔ بیماری۔ ضعف۔ اندھیرا۔ دو قدم چلے تھے کہ گر پڑے۔ اور حرکتِ قلب بند ہو گئی۔ خدا کی شان! ایسا کثیر الاحباب آدمی جس کے مخلص دوستوں سے ہندوستان کا کوئی شہر اور کوئی قصبہ خالی نہ تھا۔ اس بے کسی کے عالم میں دنیا سے رخصت ہوا ؎

مجھ کو دیارِ غیر میں مارا وطن سے دور
رکھ لی مرے خدا نے مری بیکسی کی شرم

بیدل اردو۔ عربی۔ فارسی تینوں زبانوں کے ماہر تھے۔ اور ان زبانوں میں نہایت صحیح ادبی ذوق رکھتے تھے۔ دوستی اور خلوص اور محبت کے پیکر تھے۔ حسن تقریر کا یہ عالم تھا۔ کہ محفل میں منہ سے پھول جھڑتے تھے۔ پرلے درجے کے بذلہ گو اور لطیفہ سنج۔ دوستوں پر جان چھڑکتے تھے۔ کیا مجال کوئی شخص ان کے سامنے ان کے دوست کی غیبت کر جائے۔ اور وہ خاموش بیٹھے سنتے رہیں۔ مزاج بے حد نفاست پسند پایا تھا۔ خورش میں پوشش میں اور رہنے سہنے میں صفائی اور خوش وضعی کے پابند تھے۔ سر پر ایرانی وضع کی سیاہ ٹوپی ہوا کرتی تھی۔ عینک لگاتے تھے۔ بہترین سلی ہوئی شیروانی اور تنگ موہری کا پاجامہ۔ پاؤں میں بوٹ یا کبھی کبھی دہلی کا سلیم شاہی۔ جس کمرے یا مکان میں رہتے۔ اس کے سامان میں سادگی کے ساتھ ساتھ انتہائی صفائی اور سلیقہ شعاری کو ملحوظ رکھتے۔ گفتگو شستہ و شگفتہ۔ روزمرے کے تیوروں اور محاورے کی انوٹوں سے لبریز۔ ہم نے بہت کم اہلِ زبان کی بولی ٹھولی میں وہ لطف اور وہ پاکیزگی پائی ہے۔ جو بیدل میں بے تکلف موجود تھی۔ اور لطف یہ ہے۔ کہ کچھے پن کا نام و نشان نہ تھا۔ پاکیزہ ظرافت کے ساتھ ہی ساتھ علمی متانت کا دامن کبھی ہاتھ سے نہ چھوڑتے۔

مرزا غالب کی نظم و نثر پر اکثر نقادوں کو تعجب ہوتا ہے کہ اردو نظم میں تو فارسی ترکیبوں کی بھرمار۔ اور معانی کی دقت

...رفتار رکھتے ہیں۔ لیکن نثر کی سادگی اور سلاست کا یہ عالم ہے۔
...یا ایک دریا ہے۔ کہ بے تکلف بہتا چلا جاتا ہے۔ سید حامد حسین بیدل
...معاملہ اس سے بالکل مختلف ہے۔ وہ نظم میں سادگی۔ سلاست اور
...صاحت کے پابند ہیں۔ لیکن نثر بہت پیچیدہ اور مشکل لکھتے ہیں۔ یہاں
...ک کہ بعض اوقات مضحکہ خیز معلوم ہونے لگتی ہے۔ ان کی نثر کے زیادہ
...ونے تو اس مختصر گفتگو میں پیش نہیں کئے جا سکتے۔ چند سطریں سن لیجئے۔
"مخزن" کے ریویو پر کسی رسالے نے کسی قدر تنگدلی سے کام
لیا۔ اس پر لکھتے ہیں۔ کہ
اس رسالے کی اس خصوصیت تطاول سے صرف "مخزن" ہی کی
توقعات مجروح نہیں ہیں۔ بلکہ عام حامیانِ ادب لطیف خواہ اربابِ علم
وقلم ہوں یا صحائفِ انشا و ادب۔ اس موضوعِ خاص میں بالاتفاق شکوہ
سنج استغنا اور گلہ مند کم نگہی ہیں"۔

ایک مضمون "معاشقۂ عرب" کی تقریب پر ارشاد فرماتے ہیں:۔
"دورِ حاضرہ کی بادہ پیمائیوں سے خمخانۂ مشرق کی سرجوشیاں اور
خوش مستیاں نہ صرف وقفِ خمار و خمیازہ ہو گئیں۔ بلکہ ہماری تنک
ظرفیاں اسکے نشۂ نور آفریں کے عدم کو بھی مجوب امتداد کر چکیں۔ مگر
حقیقت یہ ہے کہ عرب کے ذرہ گاہِ حسن میں اب بھی وہ ہوشربا ذخائرِ برق
شرر مدفون ہیں۔ جن کی خزاں رسیدہ تجلیاں خوارقِ ادب کی گلبار
بہاروں سے حزن سوز و فطرت قریب ہونے میں کم نہیں"۔

ایک دفعہ کسی دوست نے یہ رائے ظاہر کی۔ کہ مولانا بیدل بچوں
کے اخبار کے لئے ہرگز نہیں لکھ سکیں گے۔ کیونکہ ان کی مشکل پسندی
سادگی کی اس انتہا تک ہرگز نہ پہنچ سکے گی۔ لیکن جب ان سے
بچوں کے لئے مضمون لکھوائے گئے۔ تو ہم یہ دیکھ کر حیران رہ گئے۔
کہ سادہ لکھنے میں بھی مولانا مثال نہیں رکھتے۔ ذرا اس رنگ کے چند
فقرے بھی سن لیجئے۔ فرماتے ہیں۔
"مرزا نکھٹو کو نہ گھر کا ہوش، نہ کھانے کمانے کی فکر۔ انہیں یہ
بھی خبر نہ ہوتی تھی [illegible]۔ کہ گھر میں کیا پکا ہے گھر بیچاری
بیوی روز اپنا ہاتھ گلا نوچ کھسوٹ کے گھر کا دھندا چلاتی اور گھر
آنگن سے جوڑ بٹوں کے ہنڈیا چولھے کو آگ لگا دیتی۔ آخر کب تک
بزرگوں کی دھری بیتی پونجی کوئی جنم بھر تو ساتھ دیتی نہیں۔ اللہ
پھر بیٹھے بیٹھے تو گھٹتے خالی ہو جاتے ہیں۔ فاقوں پر فاقے ہونے لگے"۔

ذرا وہ "مخزن" والے فقرے یاد کیجئے۔ اور ان کو اُن میں ڈھلے
ہوئے جملوں کو ملاحظہ فرمایئے۔ تو کوئی نہیں کہہ سکتا۔ کہ یہ کسی ایک
ہی فرد کی تحریر ہے۔ حقیقت یہ ہے۔ کہ ادب عالیہ کے متعلق مولانا
کا نقطۂ نگاہ قدیم تھا۔ اور اتنا قدیم کہ ابوالفضل اور نعمت اللہ خاں عالی
جی نہیں۔ بلکہ سہ نثر ظہوری اور ذرّہ نادرہ تک پہنچتا تھا لیکن اب
ذرا اُن کا شاعرانہ کلام سنئے۔ جو حقیقت میں انکے کمال کا سب سے بڑا مظہر ہے
فارسی کے نامور شاعر مولانا عزت بخاری کے دو شعر ہیں اُن
پر مولانا نے اردو میں تضمین کی ہے۔ شعر یہ ہیں۔

ادب گاہیست در زیرِ زمیں از عرش نازکتر
نفس گم کردہ می آید جنید و بایزید اینجا
چناں مدہوش جامِ آرزوئے وصل شد عزت
کہ از مستی بدوشِ دیگراں بیخود رسید اینجا

مولانا بیدل فرماتے ہیں ؎

سنبھل کر پاؤں دھر تربت پہ میری شورشِ محشر
کہ اس مٹی کے ذروں میں ہے اک ذرا خدا کا گھر
مری تعمیر میں ہے کعبۂ دل کی بنا مضمر
ادب گاہیست در زیرِ زمیں از عرش نازکتر
نفس گم کردہ می آید جنید و بایزید اینجا

اس شعر پر دوسری تضمین سُنئے ؎

نہ کر گستاخیاں شمع لحد سے دامن صرصر
یہ داغِ دل کی ایک لَو ہے چراغِ کعبہ سے ہمسر
نہیں تربت مری ہے جلوہ گاہِ خالقِ اکبر
"ادب گاہیست در زیرِ زمیں از عرش نازکتر
نفس گم کردہ می آید جنید و بایزید اینجا

مقطع پر تضمین ہوئی ہے ؎

نشے میں زندگی کے [illegible]
تو بعدِ مرگ بھی [illegible]

رہی ممنونِ رسم میکدہ غفلت بہرصورت
چناں مدہوش جامِ آرزوئے وصل شُد عزّت
کہ از مستی بدوش دیگراں بیخود رسید اینجا
اسی شعر پر ظرافت کے رنگ میں لکھا ہے ۔
سبھی کرتے ہیں شغل مے سبھی کو اسکی چاہت ہے
سبھی حرص شراب شوق میں ہوتے ہیں بدنیت
مگر توبہ۔ نہ ہو دنیا میں اتنی بھی کسی کو لت
چناں مدہوش جامِ آرزوئے وصل شد عزّت
کہ از مستی بدوش دیگراں بیخود رسید اینجا
اسی رنگ میں ایک اور تضمین سنیئے ۔
یہ مانا شوق سے مجبور ہے انسان کی عادت
مگر لازم ہے پہلے دیکھ اپنے ظرف کی وسعت
یہ کیا جتنی ملی پی لی۔ بلا سے کچھ بھی ہو حالت
چناں مدہوش جامِ آرزوئے وصل شد عزّت
کہ از مستی بدوش دیگراں بیخود رسید اینجا

اب بعض غزلوں کے دو دو تین تین اشعار پیش کرتا ہوں
فرماتے ہیں :۔
مریضِ جاں بلب کرتا دمِ آخر فغاں کب تک
جو اُٹھتا بھی تو اُٹھتا شمع کشتہ سے دھواں کب تک
ملے گا بھی نہیں آرام ہم بے خانمانوں کو
زمین وادیٔ غربت رہے گی آسماں کب تک
چلو اُٹھو۔ عدم کی راہ لو۔ بیٹھے ہو کیا بیدل
رہے گی انتظارِ مرگ میں عمرِ رواں کب تک

[فر]ماتے ہیں :۔
مرے یار رقیب کے دم بھر کے یار ہو
جسکی بھی زندگی ہو غرض مستعار ہو
لپٹا رہا ہو سینے سے دل کر شبِ فراق
مطلب یہ ہے بغل میں کوئی بیقرار ہو

ارشاد ہوتا ہے :۔
دونوں جل بجھتے ہیں یہ فیصلہ اب تک نہ ہوا
شمع میں سوز زیادہ ہے کہ پروانے میں
چھلکی پڑتی ہے تری آنکھ سے مستی ساقی
اتنی مے ہے کہ سماتی نہیں پیمانے میں

ایک اور غزل کے دو شعر سن لیجئے۔ فرماتے ہیں ۔
یوں دن مرے شباب کا چڑھتے ہی ڈھل گیا
جو نکلا تھا اک ہوا کا کہ سن سے نکل گیا
یاد آ گئی جو نشے میں ساقی کی چشمِ مست
میں گرتے گرتے ساغرِ مے پر سنبھل گیا

ایک بہت دلگداز غزل ہے۔ جسکے چند اشعار سنتے جائیے :۔
تسلی دل کو دینے دے خدا کا نام لینے دے
بس اب یادِ بتِ کافر ذرا آرام لینے دے
پھرانا در بدر اچھا نہیں ہم بدنصیبوں کا
کہیں تو چین دم بھر گردشِ ایام لینے دے
تری ہر جنبشِ لب ہے مجھے موجِ طرب ساقی
نہ دے لطفِ سخن کیونکر مجھے دشنام لینے دے
اور کیا شعر ہوا ہے۔ جو بیدل مرحوم کے حسب حال ہے ۔
سن لیجئے اور مجھ نوحہ خواں کو رخصت دیجئے ۔
نہ میٹ اے بیکسی سنگِ لحد سے نقشِ بدنامی
کسی کو تو مری تربت پہ میرا نام لینے دے

(باجازت آل انڈیا ریڈیو)

نظیر اور حالی

پروفیسر فیض احمد۔ ایم۔ اے

نظیر اکبر آبادی اور مولینا حالی کو ایک ہی تقریر میں جمع کر دینا ہم زمین کی دوستی ہے آسمان سے۔ رتبہ کے لحاظ سے نہیں طبیعت و مزاج کے لحاظ سے۔ اگر نقاد ان ادب شمس العلماء مولینا الطاف حسین حالی یہ سن پائیں کہ انہیں نظیر جیسے رند شاہد باز کے پہلو میں بٹھا دیا گیا ہے۔ تو معلوم نہیں کیا کہیں۔ لیکن طبیعتوں کے اس اختلاف کے باوجود حالی اور نظیر میں بہت سی باتیں مشترک ہیں۔ اسی وجہ سے مولینا حالی نے مقدمہ شعر و شاعری میں نظیر کی بے حد تعریف کی ہے۔ نظیر اور حالی دونوں باغی شاعر تھے۔ دونوں پرانی درباری شاعری کی رسوم و روایات سے بیزار اور ایک نئی طرز سخن ایجاد کرنے کے خواہاں تھے۔ دونوں کی یہ کوشش رہی کہ شاعری جھوٹے اور رسمی جذبات سے ہٹ کر واقعات اور حقیقت کی طرف لوٹ آئے دونوں نے مختلف طریقوں سے شعر اور زندگی کا درمیانی فاصلہ کم کرنا چاہا۔ شعر کو ایک محدود طبقہ کے چنگل سے چھڑا کر اس کی لذتیں عوام میں بانٹنا چاہیں۔ لیکن یہ مشابہت یہیں ختم ہو جاتی ہے۔ حالی اور نذیر کا طرز بیان۔ ان کی زبان، ان کے مضامین سب مختلف ہیں۔ حالی کے کلام میں بڑھاپے کی متانت اور سکون ہے۔ نظیر کے اشعار میں جوانی کا جوش اور چلبلاپن۔ حالی کی نظر عموماً واقعات کے دردناک اور سبق آموز پہلوؤں پر پڑتی ہے۔ نظیر اکثر ان کے مضحکہ خیز اور طربناک پہلو واضح کرتے ہیں۔ طنز اور مذاق کسی قدر حالی کی طبیعت میں بھی موجود ہے۔ وہ بھی واعظ پر پھبتی کہہ جاتے ہیں۔ اور بار بار علماء کی پگڑی اچھالنے سے باز نہیں رہ سکتے۔ لیکن ان کا طنز زہر خند یا ہلکے سے تبسم سے آگے نہیں بڑھتا۔ وہ نظیر کی طرح گلا پھاڑ کر قہقہہ نہیں لگاتے نہ بچوں کی طرح تالیاں بجاتے ہیں۔ حالی کو مجرد اخلاقی مضامین کا چسکا ہے۔ لیکن نظیر مادیت پرست ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ چیزوں کی اخلاقی قیمت ان کی مادی قیمت پر منحصر ہے۔ وہ اخلاقی مسائل کو جانچتے ہیں۔ تو مادی فائدوں کے اعتبار سے اگر ہم حالی اور نظیر کی کلیات پر نظر ڈالیں۔ تو یہ بات فہرست مضامین سے ہی واضح ہو جاتی ہے۔ مثلاً حالی کی نظموں کے نام ہیں "مناظرۂ رحم و انصاف"، "جھوٹ اور ایکے کا مناظرہ"، "حب وطن"، "تنگ خدمت"، "دولت اور وقت" وغیرہ اس کے مقابلے میں نظیر کی نظموں کے عنوان ہیں "کوڑی کا فلسفہ"، "پیسہ کا فلسفہ"، "روپیہ کا فلسفہ"، "آٹے دال کا فلسفہ"، "مکھی"، "ریچھ کا بچہ" وغیرہ۔ باوجود سادگی اور سلاست کے حالی کی زبان پھر بھی اونچے طبقوں کی مستند زبان ہے۔ انہوں نے طریق اظہار میں کوئی اچھوتے تجربے نہیں کئے وہ خود فرماتے ہیں کہ نئے خیالات کے شاعر کو بھی سخت ضرورت ہے کہ طرز بیان میں قدما کے طرز بیان سے بہت دور نہ جا پڑے اور جہاں تک ممکن ہو اپنے خیالات کو انہیں پیرایوں میں ادا کرے جن سے لوگوں کے کان مانوس ہوں۔ نظیر اس سمجھوتہ یا مفاہمت کے قائل نہیں۔ انہوں نے نہ صرف عوام کا نقشہ کھینچا بلکہ بہت حد تک زبان بھی انہیں کی استعمال کی اور عملاً یہ ثابت کر دکھایا کہ شاعرانہ اور غیر شاعرانہ الفاظ کا فرق محض سطحی ہے۔ اور ایک نہایت غیر شاعرانہ لفظ کو رنگین اور دلآویز بنا دینا شاعر کی فنی قابلیت پر منحصر ہے۔

مولینا حالی کے متعلق بہت کچھ کہا سنا جا چکا ہے لیکن نظیر کے نام پر عام طور پر نقاد کچھ شرما کر سر جھکا لیتے ہیں۔ خیال یہ کیا جاتا ہے۔ کہ نظیر ایک اوباش قسم کا شاعر۔ بھانڈوں طوائفوں اور چکلوں کے قصے سناتا ہے۔ جسمانی لذتوں کے گیت گاتا ہے اور دیکھئے نہ ہم بہو بیٹیاں یہ کیا جانیں۔ اس لئے ہم پہلے نظیر ہی کے

کلام پر نظر ڈالتے ہیں۔

نظیر اردو کا پہلا جمہوری شاعر ہے۔ نظیر کی شاعری ایک احتجاج، ایک ردِ عمل ہے۔ اس مریضانہ درباری شاعری کے خلاف جس پر دہلی اور لکھنؤ کے آخری امرا جان دیتے ہیں۔ ان درباروں کے شعرا کی پہلی خصوصیت یہ ہے کہ نوابوں کی طرح عوام سے دامن بچا کر چلتے ہیں۔ نوابوں کے سراپے بناتے اور درباروں کی تصویریں دکھاتے ہیں۔ لیکن عوام کی زندگی ان کے مسائل ان کے تجربات کا بھول کر بھی ذکر نہیں کرتے۔ نظیر عوام کے شاعر تھے۔ انہیں کے میلے ٹھیلے، انہیں کے دکھ اور راحتیں، کدورتیں اور محبتیں انہیں کی زندگی کا حسن اور بدنمائی نظیر کے مضامین ہیں اسی وجہ سے نظیر کی نظموں میں خلوص بھی ہے۔ اچھوتا پن بھی۔

دوسری بات یہ ہے کہ جب اردو شاعری پہ بہار آئی تو پرانے درباروں میں پت جھڑ کا موسم تھا۔ اصلی نواب اور نوابیاں ختم ہو چکی تھیں۔ خیالی دربار اور خیالی بادشاہ باقی تھے۔ انکے شاعر اور اُن کی شاعری بھی سراسر خیالی تھی۔ شاعر کسی معمولی خیال یا تجربہ کو زندگی سے اکھاڑ کر ایک مضمون یا موضوعِ سخن بنا لیتے اور پھر ریشم کے کیڑے کی طرح اس کے اردگرد الفاظ و خیالات کا خول بننے لگتا تھا کہ پہاڑ کے خد و خال میں چیونٹی کا سراغ لگانا مشکل ہو جاتا۔ وہ کڑوی حقیقتوں کو مٹھاس سے لپیٹتے رہتے زندگی کی تصویر بناتے وقت اس کے تلخ اور بدنما پہلوؤں یا قطعاً فراموش کر دیتے یا لکھنؤ کے آخری عہد کی عمارتوں کی طرح نقش و نگار تلے دبا ڈالتے۔ ان کے کلام کے بنیادی پتھر پر ایک مصنوعی عشق اور اس کے خیالی آداب، ایک فرضی محبوب اور اُس کی خیالی صفتیں، نظیر نے زندگی کے چہرے سے یہ روحانی بیل بوٹے چھیل ڈالے، روزمرہ تجربات کو خیال آرائیوں کے خول سے نکالا۔ اور اپنے ماحول کو بے نقاب اور عریاں پیش کرنے کی کوشش کی۔ نظیر نے محسوس کیا کہ امرا کے لئے ہوائی قلعوں میں بیٹھے رہنا چنداں مشکل نہیں ہے۔ نوابوں کی روحانیت پر گزران ہو سکتی ہے۔ اس لئے کہ وہ زندگی کی تلخی اور بدصورتی سے الگ تھلگ رہ سکتے ہیں۔ لیکن عوام کے لئے یہ فرار کے راستے بند ہیں۔ انہیں تو ہر وقت عزبت، غلاظت اور مصائب سے دوچار رہنا پڑتا ہے۔ وہ ہر بات کو روحانی نظر سے دیکھنے لگیں تو زندہ کیسے رہیں، چنانچہ نظیر واقعات، تجربات اور مناظر کو خیالی نہیں۔ اصلی رنگ میں پیش کرتے ہیں۔ نہ ان کی بدصورتی کو غیر شاعرانہ سمجھتے ہیں۔ نہ ان کی بدنمائی کرتے گھبراتے ہیں مثلاً برسات ہمارے ہاں نہایت روحانی موسم گنا جاتا ہے۔ ذرا نظیر زبانی اس کا حال سنئے۔

سبزوں پہ ہر پھوٹی نیلوں پر سفید رو ... پتوں سے پچھڑ لتا رائے کوئی ابھونے
پچھونی کو کاٹے اکھڑا کسی کو گھورے ... آنگن میں کوئی کھڑا کی کونوں میں کنکھجورے

کیا کیا مچی ہیں یارو برسات کی بہاریں

یہ برسات وبرسات تو امیروں کے کھیل ہیں۔ ہمارا نقطہ نظر تو یہ ہے۔ کہ

جو اس ہوا میں یارو دولت میں کچھ بڑے ہیں
ہے انکے سر پہ چھتری ہاتھی اُپر چڑھے ہیں
ہم سے غریب غربا کیچڑ میں گر پڑے ہیں
ہاتھوں میں جوتیاں ہیں اور پائنچے چڑھے ہیں
کیا کیا مچی ہیں یارو........

جیسا کہ میں نے ابھی عرض کیا تھا۔ نظیر روحانی اقدار کا قطعاً قائل نہیں ہے۔ وہ عشق و محبت کو جسمانی ملاپ سے زیادہ وقعت نہیں دیتا مشرقی شعرائے محبوبوں کو ان کے صحیح روزمرہ ناموں سے یاد کرتا ہے۔ اور ہجر و وصال کی لاتعداد کیفیتوں کو ان کے منطقی نتائج تک پہنچا کے دم لیتا ہے۔ اسی وجہ سے لوگ اسے گندہ کہتے ہیں۔ اور اس کے کلام میں جگہ جگہ الفاظ کی بجائے نقطے اور ستارے ڈال دیتے ہیں لیکن نظیر رند نہیں محض صحت مند اور صاف گو ہے۔ اسے ان کیفیتوں کے بیان میں ذرا بھی دریغ نہیں۔ جنہیں خلوت میں اپنے آپ سے یا چند مخصوص دوستوں سے سبھی بیان کرتے ہیں۔ لیکن بر سرِ عام بیان کرنے کی جرأت نہیں رکھتے۔ یہی مادی فلسفہ اس کے کلام میں جا بجا نظر آتا ہے۔ وہ زندگی کی تین بنیادی ضرورتیں

یعنی روٹی، پیسہ اور جنسیاتی لذت کا بار بار ذکر کرتا ہے۔ اور یہ بھی جانتا ہے کہ ان تینوں میں سے روٹی سب پر مقدم ہے۔ مثلاً آٹے دال کی فلاسفی کا ایک بند ہے۔

آٹے کے واسطے ہے ہوس ملک و مال کی

آٹا جو پاس ہے تو سب دال تال کی!

آٹے ہی دال سے ہے درستی یہ حال کی

اس سے ہی سب کی خوبی ہو چال ڈھال کی

یا، دیکھ اپنی فکر کر آٹے دال کی

نظیر اور دوسرے پرانے شعرا میں تیسرا فرق یہ ہے کہ ذہنی تکان اور مایوسی جو اس زمانہ کے درباروں پہ طاری تھی۔ شعرا کے کلام پر بھی غالب ہے۔ شعرا یاس پسند آہوں اور آنسوؤں کے عادی زندگی سے بیزار اور موت کے شیدا ہیں نظیر کی شاعری میں یہ بات نہیں۔ وہ ان لوگوں کا نمائندہ ہے۔ جن کی کمر صدیوں کے مظالم کے باوجود خم نہیں ہوئی جن کے خون کی گرمی جسمانی مشقت سے برقرار رہتی ہے۔ اور جن کے اعضا عیش و عشرت سے شل نہیں ہو جاتے۔ چنانچہ نظیر کے اشعار میں زندہ دلی ہے۔ اور والہانہ پن۔ زندگی کی باوجود اس کی لذتوں کا احساس، تندرست حواس کا سرور۔ رگوں میں دوڑتے ہوئے خون کا نشہ۔ یہ ٹھیک ہے کہ آخری عمر میں نظیر صوفی ہو گئے تھے۔ انہوں نے دنیا کی بے ثباتی پر نظمیں لکھیں۔ ترک دنیا کا سبق دیا۔ لیکن ان نظموں میں بھی بد دلی اور مایوسی نہیں پائی جاتی۔ فقر و تصوف بھی وجدانی کیفیتیں ہیں۔ اور ایک والہانہ مسرت سے خالی نہیں۔ ایک نظم 'وجد و حال' کے یہ بند ملاحظہ ہوں۔

کیا علم اُنہوں نے سیکھ لئے جو بن لکھے کو باچے ہیں

اور بات نہیں منہ سے نکلے بِن ہونٹھ ہلاتے جاچے ہیں

دل ان کے تار ستاروں کے، تن اُنکے طبل طمانچے ہیں

منہ چنگ زباں، دل سارنگی، پا گھنگھرو، ہاتھ کمانچے ہیں

ہیں راگ اُن کے رنگ بھرے اور بھاؤ نہیں کے سانچے ہیں

جو بے گت بے سر تال ہوئے بن تال پکھاوج ناچے ہیں

جو آگ جگر میں بھڑکی ہے اس مشعل کی اجیالی ہے

جو منہ پہ حسن کی زردی ہے اس زردی کی سب لالی ہے

جس گت پر ان کا پاؤں پڑا اس گت کی چال نرالی ہے

جس مجلس میں وہ ناچے ہیں وہ مجلس سب سے خالی ہے

ہیں راگ اُن کے . . . . .

آپ نے دیکھا اس فقر میں رقص اور بے خودی کی کیفیت ہے۔ جمود اور مردہ دلی کی نہیں۔ اب کوئی صاحب اعتراض کریں گے کہ یہ تو سب خارجی باتیں ہیں۔ فن کی باتیں کیجئے۔ نظیر کی فنی اور ادبی خوبیاں بتلایئے۔ میں تو خیر اس اعتراض کو مانتا ہی نہیں۔ اور میرے خیال میں شاعر کے مضمون کو اُس کے فن سے جدا نہیں کرنا چاہیئے۔ لیکن آپ کی تسلی کے لئے یہ بھی سہی۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ نظیر کو الفاظ اور اظہار پر بے پناہ قدرت ہے۔ اس نے مکھی اور مچھر سے لیکر خدائے برتر و تعالیٰ تک قریباً ہر مضمون پر قلم اٹھایا ہے۔ شاعری کی قریباً ہر صنعت میں طبع آزمائی کی ہے۔ اور سوائے غزل کے کہیں ٹھوکر نہیں کھائی۔ خالص الفاظ کے فن میں نظیر کے مقابلہ میں صرف ایک شاعر پیش کیا جا سکتا ہے یعنی انیس۔ لیکن جیسا کہ مولینا حالی فرماتے ہیں ان دونوں میں سے نظیر کو فوقیت حاصل ہے۔ اس لئے کہ انیس صرف خوبصورت مناظر باندھتا ہے۔ اور خوبصورت الفاظ استعمال کرتا ہے۔ لیکن نظیر نے ثقیل اجنبی الفاظ کو شعر میں ڈھالا ہے۔ اور ان کی پوشیدہ موسیقی اور حسن سے زبان کی صلاحیتوں میں اضافہ ہوا ہے یا ہونا چاہیئے تھا۔ ہونا چاہیئے تھا اس لئے کہ نظیر کے تجربہ سے کسی نے فائدہ نہیں اُٹھایا۔ کسی نے اُس کی طرح عوام کے دماغ سے عوام کی زبان میں سوچنے کی کوشش نہ کی۔ نظیر کی مہارتِ فن کا اندازہ اس کی ایک غزل سے ہو سکتا ہے۔ جس کا ہر شعر ایک مختلف زبان میں ہے۔ اس میں اردو، ہندی، فارسی، عربی، پنجابی اور سنسکرت استعمال کی گئی ہے۔

نظیر نے غزل کے چند اچھے اشعار لکھے ہیں:۔

تیرے جمال کی سورج جھلک نہ دیکھ سکا

کھلی نقاب رہی جب تلک نہ دیکھ سکا

تو وہ ہے نور سراپا کہ تیری صورت کو

بشر تو کیا مری جاں ملک نہ دیکھ سکا
نہ سرخی غنچۂ گل میں تیرے دہن کی سی

نہ یاسمن میں صفائی تیرے بدن کی سی
میں کیوں نہ پھولوں اس گلبدن کے آنے سے

بہار آج میرے گھر میں ہے چمن کی سی
پھر ہو کے خفا روٹھ گیا ہم سے وہ لالا

اے داغ مبارک ہو تجھے منصب والا
لے لیکے بلائیں مجھے یہ کہتی ہیں آنکھیں

صدقے تیرے پھر ایک نظر مجھ کو دکھا لا

لیکن غزل کی باریک پُرسوز کیفیتوں کے لئے نظیر کی طبیعت موزوں نہیں ہے۔ ان کے مزاج میں طنز اور ہنسی مذاق بہت زیادہ ہیں اس لئے اُنہیں دو تین اشعار کے بعد غالباً اپنے کئے پہ ہنسی آجاتی ہے۔ اور وہ ایسے اشعار لکھنے لگتے ہیں۔

کیا جانئے کس حال میں ہوویگا عزیزو
دل آج میرا سلمہٗ اللہ تعالیٰ
بوسے کی طلب کی تو کہا ناز سے چل دور
اور دل کو کہا "لے" تو وہیں ہنس کے کہا "لا"

نظیر کے کلام میں نہ میر کا سوز ہے نہ غالب کی گہرائی۔ نہ داغ کی نفاست لیکن ان کے الفاظ میں ایک حرکت ہے۔ ایک تندی اور روانی جس کی وجہ سے ان کا کلام شعر کی سطح سے نیچے نہیں گرتا۔ وہ باریک اور نازک نقش و نگار کی بجائے سیدھے سادے خطوط اور شوخ رنگوں سے تصویر بناتے ہیں۔ لیکن یہ تصویر بے جان کبھی نہیں ہوتی۔ الفاظ کی موسیقی اور آوازوں سے مضامین پیدا کرنا ان کی دل پسند صنعت ہے۔ منظر نگاری اور تصویر کشی ان کا خاص میدان ہے۔ ایک سراپا کے دو بند ملاحظہ ہوں۔

بے درد ستمگر بے پروا۔ بیکل چنچل چٹکیلی سی
دل سخت قیامت پتھر سا اور باتیں نرم رسیلی سی
آنوں کی بان ہٹیلی سی۔ کاجل کی آنکھ کٹیلی سی
وہ انکھیاں مست نشیلی سی، کچھ کالی سی کچھ پیلی سی

چتون کی دغا نظروں کی کپٹ سینہ کی لاوٹ لیتی ہی
وہ کافر دیکھ جی دیکھ جیسے سو بار قیامت کا اٹھے

پازیب کڑے پائل گھنگرو، کڑیاں جھڑیاں گجرے توڑے
ہر جنبش میں سو جھنکاریں۔ ہر ایک قدم پر سو جھگڑے

وہ چنچل چال جوانی کی۔ اونچی ایڑی۔ نیچے پہنچے
کفشوں کی کھٹک۔ اُن کی جھنک۔ ٹھوکر کی لگاوٹ دیتی ہی

مولانا حالی کو موجودہ شاعری کا باوا آدم کہا جاتا ہے۔ لیکن حقیقت نگاری میں نظیر پہل کر چکے تھے۔ پُرخلوص اور دلگداز جذبات کو غالب نے لباس شعر پہنا دیا تھا۔ اور یہی موجودہ شاعری کی خصوصیتیں گنی جاتی ہیں۔ لیکن مولانا حالی پہلے مصنف ہیں۔ جنہوں نے اس نئی شاعری کے اصول و قواعد مرتب کئے۔ اس کی ضرورت بتلائی اور اس کی تفسیر اور تجزیہ کیا۔ مولانا حالی موجودہ شاعری کے موجد ہوں نہ ہوں تنقید نگاری کے پیشرو ضرور ہیں میرا خیال یہ ہے کہ مولانا کی ادبی اور تاریخی اہمیت زیادہ ان کے فعل کی وجہ سے نہیں۔ اُن کے قول کی وجہ سے ہے۔ اُس کی وجہ یہ ہے کہ سوائے مسدس کے حالی نے اپنے اصولوں کے مطابق جتنی بھی نظمیں لکھی ہیں ان میں شاعری دس بیس فیصدی سے زیادہ نہیں بات یہ ہے کہ نہ مولانا کی طبیعت میں اتنی گرمی تھی۔ کہ وہ اخلاقی مضامین میں جان ڈال سکتے۔ نہ انہیں قدرت سے اتنا لگاؤ تھا کہ مناظر فطرت کی جیتی جاگتی تصویریں بنا سکتے۔ یہ نظمیں ان کی شخصیت کا صحیح اظہار نہیں ان کے عقلی اور دماغی عقائد کا نتیجہ ہیں۔ اور شاعری اصول و قواعد کی نہیں۔ تجربہ اور جذبات کی پیداوار ہے۔ پرانی غزلیہ کیفیتوں کے علاوہ حالی کے دل میں صرف دو تار ایسے ہیں۔ جن سے نغمے پھوٹتے ہیں۔ ایک اپنی قوم کا درد دوسرے اپنے وطن کی محبت۔ پہلے جذبہ نے مسدس اور اس مشہور دعا کے روپ میں جنم لیا جس کا پہلا مصرعہ ہے۔ "اے خاصۂ خاصانِ رسل وقت دعا ہے"۔ دوسرا جذبہ ان کی کئی ایک دوسری نظموں میں ظاہر ہوتا ہے۔ مثلاً برکھا رت یادِ وطن وغیرہ۔ برکھا رت ایک روکھی پھیکی نظم ہے۔ لیکن اس

ہیں یہ مخمل کا پیوند لگا ہے۔

بیزار اک اپنے جان و تن سے   بچھڑا ہوا صحبت وطن سے
دیکھے کوئی اُس گھڑی کا عالم   وہ آنسوؤں کی جھڑی کا عالم
وہ آپ ہی آپ گنگنانا   اور جوش میں آ کے کبھی یہ گانا
"اے چشمۂ آب زندگانی   تھیو نہ کبھی تیری روانی
جاتی ہے جدھر تیری سواری   بستی ہے اُسی طرف ہماری
پاتے جو کہیں تیری صبا کو   دیتا ہوں بیچ میں خدا کو
اول کہیو سلام میرا   پھر دیجیو یہ پیام میرا
قسمت میں یہی تھا اپنی لکھا   فرقت میں تمہاری آئی برکھا
جب سبزۂ گل ہیں لہلہاتے   صحبت کے مزے ہیں یاد آتے
جب پیڑ سے آم ہے ٹپکتا   میں تم کو اِدھر اُدھر ہوں تکتا
آخر نہیں پاتا جب کسی کو   دیتا ہوں دعائیں بے کسی کو"

یا وہ مشہور غزل "ڈھونڈھے گا دلِ شوریدہ بہانے مطرب درد انگیز غزل کوئی نہ گانا ہرگز" حالی فطرتاً واعظ نہیں شاعر تھے۔ ان کی طبیعت میں سوز و گداز کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ قوم کی ذلت کے احساس اور وطن کی جدائی نے ان جذبات کو اور بھی تیز کر دیا تھا۔ جب وہ ان سے ہٹ کر اخلاقی اور اصلاحی شاعری کرنا چاہتے تھے۔ تو انہیں طبیعت پر جبر کرنا پڑتا تھا یہ نظمیں مثلاً "عدل و انصاف۔ جھوٹ اور اپنے کا مناظرہ۔ مناجات بیوہ۔ نگِ خدمت وغیرہ ادائے فرض کے طور پر لکھی گئی ہیں۔ اور فرض کو ادا کرنا کچھ بہت خوشگوار امر نہیں ہے۔ غزلیات کے علاوہ مولانا حالی کی عظمت انکی مسدس کی وجہ سے برقرار ہے۔ اس لئے کہ ان کی فطرتی ودیعتوں کا بہترین اظہار اسی میں ہے۔ اظہار کی سادگی اور توازن۔ الفاظ کی سلاست اور روانی جذبات کی گرمی اور خلوص اس نظم میں اس بےساختگی سے جمع ہو گئی ہیں۔ کہ پڑھنے والے کو کہیں بھی تصنع اور فن کاری کا شبہ نہیں ہوتا اور فن کی سب سے بڑی خوبی یہی ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ لکھنے والے کو کہیں اظہار میں دقت نہیں ہوئی۔ نہ الفاظ ٹٹولنے کی ضرورت پیش آئی ہے۔ غالباً تمام نظم ایک ہی وقت ایک ہی مجلس میں ختم کی گئی ہے اس لئے کہ نظم میں کوئی جوڑ دکھائی نہیں دیتا۔ اس کی کوئی لڑی ڈھیلی نہیں ہے۔ ابھی حالی کی غزلوں کا تذکرہ باقی ہے۔ حالی نے غزل کے خلاف اتنا کچھ لکھا ہے کہ لوگ اُس کی غزلگوئی قریباً فراموش کر چکے ہیں۔ ذرا انوکھی سی بات ہے لیکن میں سمجھتا ہوں کہ اگر حالی غالب کے رنگ میں غزلیں لکھتے رہتے تو ان کی شاعرانہ عظمت میں غالباً بہت زیادہ فرق نہ آتا۔ اس لئے کہ غزل کے میدان میں حالی کی طبیعت لڑتی ہے۔ عاشقانہ معاملہ بندیاں درد و گداز کی نازک نفسیاتی کیفیتیں ہلکے پھلکے موثر الفاظ کی موزونی اور تناسب۔ حالی کی پرانی غزلوں میں یہ سب خوبیاں موجود ہیں۔ اُس کی چند ایک مثالیں ملاحظہ ہوں۔

وہ وقتِ وداع ہم سے ہنس ہنس کے ہوئے رخصت
رونا تھا بہت ہم کو رو تے بھی تو کیا ہوتا

دھوم تھی اپنی پارسائی کی   کی بھی اور کس سے آشنائی کی
کیوں بڑھاتے ہو اختلاط بہت   ہم کو طاقت نہیں جدائی کی
ذوق ہیں ہیں لگاؤ کی باتیں   صلح میں چھیڑ ہے لڑائی کی
نہ ملا کوئی غارتِ ایماں   رہ گئی شرم پارسائی کی
رنج اور رنج بھی تنہائی کا   وقت پہنچا مری رسوائی کا

ایسی کئی ایک غزلیں ہیں اور جب ہم انکا "اے عشق تو نے اکثر قوموں کو کھا کے چھوڑا" اور حالی کے بعد کی لکھی ہوئی اخلاقی غزلوں سے مقابلہ کرتے ہیں تو ہمیں محسوس ہوتا ہے کہ حالی نے اصول کی خاطر کتنی قربانی کی ہے۔ اگر مسدس نہ لکھی جاتی تو غالباً مولینا حالی کو جدیدیت یعنی MODERNISM کا شہید کہنا پڑتا۔ پھر بھی شہید وفا کا خون رنگ لائے بغیر نہیں رہتا۔ یہ کیا کم ہے کہ حالی کا بویا ہوا بیج اقبال کی شاعری میں ایک تناور درخت بن گیا۔ جسکے برگ و بار آج سب کے لئے راحت اور چین کا باعث ہیں۔ حالی اردو کا پہلا سائنٹفک نقاد ہے۔ اردو کا پہلا قومی شاعر۔ نظیر کو ہم قومی شاعر اس لئے نہیں کہتے کہ عوام کی کوئی قوم نہیں ہے ان دونوں شاعروں کی ادبی اور تاریخی اہمیت کے متعلق مبالغہ کرنا غالباً مشکل ہے۔

ماہر القادری

غالب کا امتیازی وصف

حسین ترکیبوں کی تخلیق

اگر غالب پیدا نہ ہوتا۔ تو اردو شاعری سچ مچ گل و بلبل کا افسانہ اور زلف و کمر کی داستان ہو کر رہ جاتی۔ غالب سے پہلے اردو شاعروں نے آہ و فریاد کے بہت سے ساز چھیڑ دئے تھے، لیکن ان سازوں کے آتشیں میں کوئی ایسا پردہ نہ تھا، جس سے زندگی کا نغمہ نکلتا۔ آہ و فریاد، اور گریہ و شیون اپنا ایک مقام رکھتے ہیں، مگر "زندگی" کو سانس کے جھٹکوں اور نزع کی ہچکیوں کی نہیں، بلکہ خونِ گرم، دلِ بے باک اور نگاہِ بلند کی ضرورت ہے۔ شعر موت کا نہیں، زندگی کا پیام ہے۔ حقیقی شاعر زندگی کا پیامبر ہوتا ہے، اور اس کے خیال و فکر کی جولانگاہ وہ منزل ہوتی ہے، جہاں:-

— نبضِ جادہ تپید و سینۂ خضر اگرم است —

اُس وقت جبکہ حسرتؔ زہیدی کے اشعار نے دلوں کو بجھا دیا تھا، طبیعتیں افسردہ ہو چلی تھیں، غالب نے پکار کر کہا:-

نفس نہ انجمنِ آرزو سے باہر کھینچ
اگر شراب نہیں انتظارِ ساغر کھینچ

اردو شعراء معشوق کی کمر کو تلاش کر رہے تھے۔ لیکن غالب نے :-

"ثابت ہوا ہے گردنِ مینا پہ خونِ خلق
لرزے ہے موجِ مے تری رفتار دیکھ کر

کی بلندی سے آواز دے کر، فضا میں گونج پیدا کر دی۔

اردو غزل کا معشوق ہاتھ پاؤں میں مہندی لگائے، اور خوب گہرے رنگ کا جوڑا پہنے چلمن کی آڑ میں بیٹھا تھا۔ عاشق کی نگاہیں ڈر کے مارے چلمن کو چھو بھی نہ سکتی تھیں، لیکن غالب کی جرأت بے باک آگے بڑھی، یہاں تک کہ:-

وا کر دئے ہیں شوق نے بندِ نقابِ حسن
غیر از نگاہ اب کوئی حائل نہیں رہا!

اٹھارویں صدی کے اردو شاعروں کا عاشق سوکھ کر کانٹا ہو گیا ہے، دن رات بے چارہ چلاتا اور فریاد کرتا ہے، مگر رحم آنا تو بڑی بات ہے، معشوق کو یہ بھی خبر نہیں ہوتی۔ کہ تڑپنے والا کس کے لئے اور کیوں تڑپ رہا ہے، لیکن غالب کا عاشق ایک "چینِ جبیں" سے ساری داستان سُنا دیتا ہے:-

وہ مری چینِ جبیں سے غمِ پنہاں سمجھا
رازِ مکتوب بہ بے ربطیِ عنواں سمجھا۔

چوٹ لگتی ہے۔ تو آہ نکل ہی جاتی ہے، غالب بھی فریاد کرتا ہے، مگر اس شان کے ساتھ:-

قمری کفِ خاکستر و بلبل قفسِ رنگ
اے نالہ! نشانِ جگرِ سوختہ کیا ہے؟

غالب کے ان نغموں کو سُن کر لوگوں کے کان کھڑے ہوئے کہ یہ صدائیں بالکل نئی اور نامانوس سی ہیں، لوگوں نے اُس پر آوازے کسے، اُس کا مذاق اُڑایا گیا۔ کسی نے اُسے "مشکل پسند" کہا، کسی نے "مہمل گو" بتایا۔ مگر غالب لعن و مخالفت کے تیر کھا کھا کر، زندگی کے نغمے سناتا رہا، یہاں تک کہ اس کے قلم کی آواز، "نوائے سروش" بن کر رہ گئی۔ اور آج وہی "نوائے سروش" ہمارے کانوں میں گونج کر، فکر و خیال کی نئی نئی راہیں سجھا رہی ہے۔

غالب کا امتیازی وصف — غالب بہت سی حیثیتوں سے ایک ممتاز درجہ رکھتا ہے، اور بعض باتوں میں تو اردو کا کوئی شاعر اس کا مدِ مقابل

نہیں۔ میں غالب کی شاعری پر متعدد مضامین کہہ چکا ہوں، جن لوگوں کی نظروں سے وہ مضامین گزرے ہونگے، اُن کو اس بات کا اندازہ ہوگیا ہوگا۔ کہ میں نے غالب کو کس نا ویۂ نگاہ سے دیکھا ہے۔ یہ مضمون، غالب کی اُس امتیازی حیثیت کو ظاہر کرتا ہے، جس حیثیت میں کوئی اُردو شاعر اُس کا حریف نہیں۔

غالب اُردو کا وہ پہلا شاعر ہے، جس نے اردو شاعری میں بالکل جدید ترکیبیں استعمال کیں، غالب کو الفاظ برتنے کا خاص سلیقہ ہے۔ اُس کے استعمال کئے ہوئے الفاظ اشعار میں آکر "نغمۂ تمام" بن جاتے ہیں۔ کہ گنگنا لیجئے۔ اور وجد کیجئے۔ کون نہیں جانتا کہ شعر و ادب میں الفاظ ہی کا تو سارا کھیل ہے۔ اور غالب کے وجدان پر قدرت نے "استعمالِ الفاظ" کے تمام راز کھول دئے تھے

غالب کی بنائی ہوئی ترکیبیں آج اُردو ادب کے لئے سرمایۂ افتخار بنی ہوئی ہیں۔ زبان نے اُن کو خوشی کے ساتھ قبول کر لیا ہے غالب کے اس احسان سے اُردو ادب عہدہ برآ نہیں ہو سکتا۔ کہ اُردو ادب میں سب سے پہلے غالب ہی نے "ایجادِ تراکیب" کی بنا ڈالی۔ اور آج اس سلسلہ میں جو کچھ ہو رہا ہے۔ اُس کا "رہبرِ اول" غالب ہی ہے۔

نئی ترکیب بنانے کا مسئلہ بڑا نازک ہے۔ ہر شخص جدید ترکیب کا خلاق نہیں بن سکتا۔ غالب کی دیکھا دیکھی، بعض لوگوں نے (جو الفاظ کے استعمال اور مصرف سے واقف نہیں ہیں) جدید ترکیبیں بنا کر ایک تو خود اپنے کو بدنام و رسوا کر لیا ہے، دوسرے زبان و ادب کے ساتھ ناروا سلوک کر کے، گمراہی کی راہیں کھول دی ہیں۔ ہر شخص کا ایک منصب ہوتا ہے، جب آدمی اپنے منصب سے ہٹ کر کوئی کام کریگا، ٹھوکر کھائے گا۔ تلوار سے سیب تراشے جا سکتے ہیں۔ لیکن انگلیاں خون آلود ہو جائیں گی۔ لوگ شہرت اور نمود کی چاٹ میں بڑے آدمیوں کی ریس کرنے لگتے ہیں اور بڑائی کا جوہر پیدا کئے بغیر، بڑا بننا چاہتے ہیں، تو وہ جو کسی نے کہا ہے۔ کہ "کوّا چلا ہنس کی چال، اپنی بھی بھول گیا" تو ایسے لوگ اپنے مقام سے بھی گر جاتے ہیں۔

جدید ترکیبوں کو انتہائی رواں اور شستہ ہونا چاہیئے کہ زبان اُن سے بہت جلد مانوس ہو جائے۔ غالب کی بنائی ہوئی ترکیبوں میں زبان و ادب کی تمام خوبیاں پائی جاتی ہیں، اسی لئے غالب کی ایجاد کردہ ترکیبیں زبان میں بہت جلد گھل مل گئیں۔

مثالیں میں نے اسی نظریہ کے تحت غالب کے دیوان کا مطالعہ کیا، اور ایک نشست میں جو کچھ کر سکا، وہ ناظرینِ ادبِ لطیف کی خدمت میں حاضر ہے۔

آگہی دامِ شنیدن جس قدر چاہے بچھائے
مُدعا عنقا ہے اپنے عالمِ تقریر کا۔

"دامِ شنیدن" کو کس خوبی سے شعر میں سمو دیا ہے۔

"تالیفِ نسخہ ہائے وفا کر رہا تھا میں۔
مجموعۂ خیال ابھی فرد فرد تھا۔

پورے کا پورا شعر "تراکیبِ جدید" کا آئینہ دار ہے۔

دہر میں نقشِ وفا وجہِ تسلی نہ ہُوا
ہے یہ وہ لفظ کہ شرمندۂ معنی نہ ہُوا

"شرمندۂ معنی" کی ترکیب نے شعر کی معنویت کو کہاں سے کہاں پہنچا دیا۔

مقدمِ سیلاب سے دل کیا نشاط آہنگ ہے!
خانۂ عاشق مگر سازِ صدائے آب تھا

"نشاطِ آہنگ" کی موسیقیت کو دیکھئے!

خانہ زادِ زلف ہیں زنجیر سے بھاگیں گے کیوں
ہیں گرفتارِ وفا زنداں سے گھبرائیں گے کیا۔

"خانہ زادِ زلف" کی ہی ترکیب کی بدولت "خانہ زادِ غم" اور "خانہ زادِ محبت" وغیرہ ترکیبیں اُردو زبان میں ایجاد ہوئیں

ہوس کو ہے نشاطِ کار کیا کیا!
نہ ہو مرنا تو جینے کا مزا کیا۔

"نشاطِ کار" کی نشاط انگیزی محسوس کرنے کی چیز ہے

عشرتِ قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا!
درد کا حد سے گزرنا ہے دوا ہو جانا!

"عشرتِ قطرہ"، کی ترکیب نے غالباً تصوف کے لٹریچر میں اضافہ کر دیا۔

حریفِ مطلبِ مشکل نہیں فسونِ نیاز
دُعا قبول ہو یا رب کہ عمرِ خضر دراز

پُورا مصرعِ اولیٰ "ترکیبِ جدید" کی حیثیت رکھتا ہے!

اے ترا جلوہ! یک قلم انگیز
اے ترا ظلم! سر بسر انداز

اِس شعر کا بھی یہی حال ہے!

لے گئی ساقی کی نخوت قلزم آشامی مری
موجِ مے کی آج رگ مینا کی گردن میں نہیں

"قلزم آشامی"، کی روانی، حدِ ستائش سے بہت بلند ہے!

ہے آدمی بجائے خود اک محشرِ خیال
ہم انجمن سمجھتے ہیں۔ خلوت ہی کیوں نہ ہو

"محشرِ خیال"، کی قیامت آفرینی کا کون کافرِ ادب" منکر ہو سکتا ہے۔

یا میرے زخمِ رشک کو رسوا نہ کیجیے
یا پردۂ تبسمِ پنہاں اٹھائیے!

"پردۂ تبسمِ پنہاں" نے کتنی بہت سی ادبی حقیقتوں کو نمایاں کر دیا۔

گوش مہجورِ پیام و چشم محرومِ جمال
ایک دل، تس پہ یہ نا امیدواری ہائے ہائے

"مہجورِ پیام"، کی ترکیب کا زبان کی نزاکت سے کیسا میل ہو گیا!

ہے ہے! خدا نخواستہ وہ اور دشمنی!
اے شوقِ منفعل! یہ تجھے کیا خیال ہے

"شوقِ منفعل"، کتنی نادر ترکیب ہے!

دل ہی تو ہے سیاستِ درباں سے ڈر گیا
میں اور جاؤں در سے ترے بن صدا کیے

"سیاستِ درباں"، میں لفظوں کا دروبست ملاحظہ کیجیے!

دیکھو تو دل فریبیِ اندازِ نقشِ پا!
موجِ خرامِ یار بھی کیا گل کتر گئی۔

"موجِ خرامِ یار"، کی شوخی کا کون اندازہ کر سکتا ہے!

ہاں اہلِ طلب کون سُنے طعنۂ نایافت!
دیکھا کہ وہ ملتا نہیں اپنے ہی کو کھو آئے

"طعنۂ نایافت"، ترکیب کیا ہے، یوں کہو کے زبان کو خزانہ مل گیا۔

دیدار بادہ، حوصلہ ساقی، نگاہ مست
بزمِ خیال میکدۂ بے خروش ہے!

شعر کا شعر "ترکیبِ جدید"، کے حسین قالب میں ڈھلا ہوا ہے۔

لطفِ خرامِ ساقی و ذوقِ صدائے چنگ
یہ جنتِ نگاہ، وہ فردوسِ گوش ہے

"جنتِ نگاہ"، اور "فردوسِ گوش"، کو آنکھوں سے چومیے! دل کی آنکھوں سے!

دیکھو مجھے جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو
میری سُنو جو گوشِ نصیحت نیوش ہے

"دیدۂ عبرت نگاہ"، اور "گوشِ نصیحت نیوش" جیسی ترکیبیں اُردو ادب کا غیر فانی سرمایہ ہیں!

یہ شعر

گردشِ ساغرِ صد جلوۂ رنگیں تجھ سے
آئینہ داریِ یک دیدۂ حیراں مجھ سے

اور یہ

کرے ہے بادہ ترے لب سے کسبِ رنگِ فروغ
خطِ پیالہ سراسر نگاہِ گلچیں ہے!

دونوں کے دونوں "جدید ترکیبوں"، کے سدا بہار گلدستے ہیں۔

اسدؔ ہے نزع میں، چل بے وفا! برائے خدا
مقامِ ترکِ حجاب و وداعِ تمکیں ہے!

"مقامِ ترکِ حجاب" و "وداعِ تمکین" کا رکھ رکھاؤ تو دیکھیئے!

سنبھلنے دے مجھے اے ناامیدی کیا قیامت ہے
کہ دامانِ خیالِ یار چھوٹا جائے ہے مجھ سے

"دامانِ خیالِ یار" نے اُردو ادب میں کتنی وسعت پیدا کر دی۔

کبھی شکایتِ رنجِ گراں نشیں کیجے
کبھی حکایتِ صبرِ گریز پا کہیئے۔

"رنجِ گراں نشیں" اور "صبرِ گریز پا" کی لفظی اور معنوی ہم آہنگی ملاحظہ فرمایئے!

پھر وضعِ احتیاط سے رکنے لگا ہے دم
برسوں ہوئے ہیں چاک گریباں کئے ہوئے

"وضعِ احتیاط" کے رحمِ بے اندازہ پرستائش کے پھول

حرفِ آخر! میں نے انتہائی اختصار سے کام لیا ہے، ورنہ:
"گنجینۂ گوہر عرضِ گراں جانی کرے"

اور

گلشن میں بندوبست برنگِ دگر ہے آج
قمری کا طوق حلقۂ بیرونِ در ہے آج

جیسے بہت سے اشعار اس ضمن میں پیش کئے جا سکتے ہیں ممکن ہے کہ بعض ترکیبیں الفاظ کی خفیف تبدیلی کے ساتھ فارسی ادب میں پہلے سے موجود ہوں۔ لیکن جہاں تک میری معلومات کا تعلق ہے۔ اُردو زبان میں غالب نے سب سے پہلے ان کو استعمال کیا ہے۔

غالب پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے، مگر میرے خیال میں اُس پر اتنا کچھ لکھے جانے کے باوجود، ابھی بہت کچھ لکھنے کی گنجائش ہے۔ میں نے اوپر کی سطروں میں چند لکیریں کھینچ دی ہیں، دوسرے لوگ چاہیں، تو ان لکیروں سے تصویریں بنا سکتے ہیں۔

شاعری

شاعری محبت ہے اور محبت شاعری جس محبت کا عنصر ناکامی و نامرادی ہے وہ سوز و گداز کی شاعری ہے۔ جو محبت کامرانی اور شادمانی سے متعلق ہے۔ وہ عیش و عشرت کی شاعری ہے

کوئی شاعر بغیر محبت کے شاعر نہیں ہو سکتا۔

زندگی ہو یا موت۔ شاعر ہر ایک میں اپنی ذات کو کسی خاص شے کی کش مکش میں دیکھتا اور بیان کرتا ہے۔

شاعر شعر نہیں کہتا۔ بلکہ اپنے زخموں اور ناسوروں سے کھیلتا ہے۔

شاعر کا سب سے اہم منظہر محبت ہے۔

موسیقی

نغمہ ایک آئینہ ہے۔ جس میں انسان اپنے عہدِ ماضی کو دیکھتا ہے۔

نغمہ ایک آگ ہے۔ جو ساز سے پیدا ہوتی ہے لیکن اسکا دھواں دل سے اُٹھتا ہے۔ مطرب کی آواز لفظوں میں جان ڈالتی ہے۔ اور یہی الفاظ تیر بنکر جان نکالتے ہیں۔

گانے والے کے ساتھ سننے والے کا دل بھی گاتا ہے۔ گویا نغمہ ایک مضراب ہے۔ جو سازِ دل کے تاروں کو چھیڑتا ہے۔

دل کو عشق لوٹتا ہے اور صبر کو نغمہ

کیا تلوار کی جھنکار دنیا کی بہترین موسیقی نہیں۔

احمد آفاق نوری

عمرِ خیام کی کاغذی تصویر

اس وقت ہمارے سامنے دو عمر خیام ہیں۔ ایک مغربی اور دوسرا مشرقی۔ مغربی خیام کی زندگی اس کی شاعری کے پیش نظر منظرِ عام پر لائی گئی ہے۔ جس میں وہ ایک خرابا تی شاعر نظر آتا ہے۔ جس کی زندگی کا مقصد ع:۔ "خوش باش دمے کہ زندگانی این است" اور جس کا ایمان یہ ہے۔ کہ "سے تے قوتِ جسم و جانست مرا"۔

مشرقی خیام کو ہم زبردست فلسفی۔ بہترین حکیم۔ مشہور نجومی۔ اور حاذق طبیب کی صورت میں دیکھتے ہیں۔ جو قدر ناشناس زمانہ کے ہاتھوں آلام و مصائب کا شکار ہے۔ تلاشِ معاش و فکرِ تن پروری میں امراء و رؤسا کے دروازوں پر دستکیں دیتا پھرتا ہے۔

کسی شخص کی زندگی مکمل اور دلچسپ طور سے اس وقت پیش کی جا سکتی ہے۔ جبکہ حقائق و واقعات کی روشنی میں تاریک و روشن دونوں پہلوؤں کو نمایاں کیا گیا ہو۔ چونکہ یہ تصویر ہنوز منصۂ شہود پر نہیں آئی۔ اس لئے ہم نہیں کہہ سکتے۔ کہ ان مشہور فلمی نقادوں نے کس خیام کو اپنی کہانی کا ہیرو بنایا ہے۔ اس سے پہلے کہ ہم کسی رائے کا اظہار کریں۔ دو متضاد خیاموں میں سے اصلی و حقیقی خیام کی تلاش ضروری معلوم ہوتی ہے۔

عمر خیام نیشاپور کا باشندہ تھا۔ علوم فلسفہ۔ نجوم۔ دینیات ادب۔ تاریخ۔ ریاضی اور طب میں دستگاہ کامل رکھتا تھا۔ لیکن دورِ حاضر میں وہ صرف آزاد خیال۔ مفکر اور شاعر کی حیثیت سے روشناس خلق ہے۔ ہندوستان کے مایہ ناز مورخ مولانا شبلی خیام کے متعلق تحریر فرماتے ہیں۔ "کہ یہی خیام کی رباعیاں گذشتہ آٹھ صدیوں سے اسکے نام کو زندہ و روشن کئے ہوئے ہیں"۔ پروفیسر براؤن اپنی مایہ ناز کتاب "تاریخ ادب ایران" میں لکھتے ہیں: "حقیقت تو یہ ہے۔ کہ آج خیام کو لوگ صرف اس کی رباعیوں سے جانتے ہیں"۔ لیکن روحتہ فیلڈ کی رائے ہے۔ وہ خیام اپنی زندگی میں اپنے علم و فضل۔ فلسفہ و نجوم کی وجہ سے مشہور تھا۔ رباعیاں تو صرف تفننِ طبع اور وقت گذاری کے لئے موزوں کرتا تھا"۔ مگر انہیں چند رباعیوں کی وجہ سے جس کا ترجمہ فٹز جیرالڈ نے انگریزی میں کیا ہے۔ اس کا نام اپنے آبائی وطن سے زیادہ یورپ اور امریکہ میں شہرت کا حامل ہے۔

تیرہویں صدی عیسوی تک مشاہیرِ شعرا کے حالات میں جو تذکرے تصنیف ہوئے۔ ان میں صرف پانچ ایسے ہیں۔ جن میں عمر خیام کا ذکر ہے۔ وہ بھی مختصر اور نامکمل:۔

۱۔ چہار مقالہ (نظامی عروضی سمرقندی) اس کتاب میں نظامی نے خیام کو علم نجوم کا ماہر ظاہر کرتے ہوئے اس کی دو پیشگوئیوں کا ذکر کیا ہے۔

۲۔ مرصاد العباد میں نجم الدین رازی نے خیام کو مصیبت زدہ محروم فلسفی۔ دہریہ اور مادہ پرست ظاہر کیا ہے۔ جو عوام میں بے دینی کی تبلیغ کیا کرتا تھا۔

۳۔ تاریخ الحکما (قفطی) میں ہم خیام کو حکمت و فلسفۂ یونان کا بہترین عالم پاتے ہیں۔

۴۔ نزہتہ الارواح (شہرزوری) میں لکھا ہے۔ کہ خیام اشراقی و رواقی مدرسہ کا فیلسوف تھا۔

۵۔ آثار البلاد (قزوینی) میں بھی خیام کو انہیں الفاظ میں یاد کیا گیا ہے۔ جن سے شہرزوری نے یاد کیا ہے۔

ان تمام کتابوں سے خیام کے متعلق صرف اس قدر معلوم ہوتا ہے۔ کہ وہ فلسفی۔ نجومی۔ مہندس اور طبیب تھا۔ اور خیام کے معاصر صوفی نجم الدین رازی نے خیام کے تصوف سے انکار کیا ہے۔ انکے قول کے مطابق خیام حکمائے یونان کے طریقہ پر تزکیہ نفس کے لئے

یا نسبت شاقہ کرتا تھا۔

چودہویں صدی میں صرف دو ایسی کتابیں ملتی ہیں جن میں خیام کا ذکر ہے۔ جامع التواریخ در رشید الدین فضل اللہ اور تاریخ الفی موخرالذکر میں خیام کے عقائد کے بارے میں درج ہے۔ کہ خیام فلسفۂ تناسخ پر عقیدہ رکھتا تھا۔ اس قول کی تائید خود خیام کی ایک رباعی سے ہوتی ہے جس کے متعلق مشہور ہے۔ کہ خیام نے یہ رباعی اس وقت موزوں کی تھی۔ جب اینٹوں سے لدے ہوئے ایک گدھے نے نیشاپور کے ایک زیر مرمت مدرسہ کے احاطہ میں داخل ہونے سے پیش و پیش کیا تھا مگر جب خیام نے رباعی پڑھی۔ تو وہ سیدھا چلا گیا۔ لوگوں نے خیام سے اس کی وجہ پوچھی۔ اس نے جواب دیا۔ کہ اس گدھے کے جسم میں جو روح کار فرما ہے۔ قبل ازیں اسی مدرسہ کے کسی استاد کی روح تھی۔ اسی وجہ سے وہ مدرسہ میں داخل نہیں ہو رہی تھی۔ مگر جب اس نے دیکھا۔ کہ میرے رفقائے کار نے پہچان لیا۔ تو چلی گئی

متذکرہ بالا ذرائع سے خیام کے جو کچھ خیالات اور واقعات ہم کو ملے ہیں۔ اُن سے یہ نتیجہ نکلتا ہے۔ کہ خیام کے معاصر اس کو جملہ علوم و فنون میں اکمل تسلیم کرتے تھے۔ لیکن مسلمان نہیں سمجھتے تھے۔ اس موقع پر مناسب معلوم ہوتا ہے۔ کہ علماء و حکمائے اسلام کے متعلق بھی تھوڑی سی وضاحت کر دی جائے۔ تاکہ آگے چل کر خیام کے عقائد کے سمجھنے میں رسائی ہو خیام کی تصانیف دیکھنے سے پتہ چلتا ہے۔ کہ خود خیام اپنے کو حکماء کے گروہ میں شامل کرتا تھا۔ لیکن فرقۂ حکماء سے مقصود کیا ہے۔ اس سے مقصود فلاسفروں کی وہ جماعت ہے جس کا مقصد عقل و نقل اور مذہب و فلسفہ میں تطبیق تھا۔ ان کے خیال میں حکمائے آرا اور انبیا کی تعلیمات یکساں صداقت پر مبنی ہیں۔ اور دونوں برابر کی سچائیاں ہیں۔ یہ فرقہ حکمائے یونان اور انبیا کو ہم پایہ تسلیم کرتے ہوئے دونوں کی تعلیمات میں تطابق پیدا کرتا تھا۔

حکمائے اسلام میں تین مختلف عقائد اور خیالات کے لوگ تھے۔ جن کو ہم تین گروہوں میں اس طرح تقسیم کرتے ہیں:-

۱۔ ایک وہ جو صرف حکیمانہ خیالات رکھتے تھے۔ لیکن عملاً دنیا طلب اور عیش پرست تھے

۲۔ دوسرے وہ جن کے خیالات حکیمانہ اور اخلاق زاہدانہ تھے۔ یہ اسکندریہ کے افلاطونی حکیموں اور یونان کے رواقی حکیموں کی طرح خشک فلسفیانہ زندگی بسر کرتے تھے۔ اُن کو صوفی حکیم بھی کہہ سکتے ہیں

۳۔ تیسرا فرقہ وہ تھا وہ فلسفیانہ خیالات کے ساتھ ایک امام کی اطاعت مطلقہ کا قائل تھا۔ اور اس امام کی اطاعت کو نجات کا ذریعہ سمجھتا تھا۔ یہ باطنیہ فرقہ کہلاتا تھا۔

عمر خیام نے اپنے رسالہ کلیات الوجود کے آخری باب میں اپنے عقائد کے بارے میں بھی لکھا ہے۔ جس سے ظاہر ہوتا ہے۔ کہ وہ فلسفیانہ تصوف کا معتقد تھا۔ یا بالفاظ دیگر صوفی حکیم تھا۔ فلسفیانہ تصوف فلسفہ سے الگ کوئی چیز نہیں ہے۔ دراصل تصوف کی دو قسمیں ہیں۔ مذہبی تصوف اور فلسفیانہ تصوف۔ مذہبی تصوف کا مرکز خیال نبوت ہے۔ اور اس میں انبیا کے اقوال کی پیروی ہوتی ہے۔ فلسفیانہ تصوف کا مرکز حکمت ہے۔ اور اس میں فلاسفہ و حکما کے اقوال کی پیروی کیجاتی ہے۔ خیام کا تصوف مذہبی نہیں۔ بلکہ حکیمانہ تھا۔

کاتب اصفہانی اپنی کتاب میں لکھتا ہے۔ کہ: "جب اس کے اہلِ زمانہ نے اس کے دین پر اعتراض کیا۔ تو وہ جان کے ڈر سے دفع تہمت کے لئے حج کو گیا۔ جب بغداد پہنچا تو اس کے اہلِ طریقہ نے کوشش کی۔ کہ اس سے فائدہ اٹھائیں۔ لیکن اس نے اپنا دروازہ بند کر لیا۔ اور حج سے واپس آکر اپنے گھر میں گوشہ گزیں ہو گیا۔"

ہر شخص اس چیز کو برباد کرتا ہے۔ جس سے اُسے محبت ہوتی ہے۔
بزدل بوسے سے، اور بہادر تلوار سے (آسکر وائیلڈ)

صادق قریشی ایم۔ اے

لسان العصر (اکبر الہ آبادی)

اکبر الہ آبادی کی شاعری ان تمام ادبی اور معاشرتی رجحانات کی حامل تھی جن کا تعلق ان کے عہد سے تھا۔ اکبر کی شاعری کے متعلق کوئی رائے قائم کرنے سے پہلے اس عہد کا مختصر پس منظر دکھانا ضروری ہے۔ ہم اس بیان کو سن ستاون کے اہم ہنگامے سے شروع کرینگے اس ہنگامہ میں ہندوستانی سیاست نے سات سمندر پار والی سیاست کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے۔ اور دو عظیم الشان تہذیبوں کے درمیان کشمکش جاری ہوگئی۔ جو اس وقت سے آجتک جاری ہے۔

کرۂ ارض پر جب کبھی حادثاتِ روزگار سے دو تہذیبیں اکٹھی ہوئیں۔ کئی قسم کے مسائل پیدا ہوگئے۔ جو تہذیب کمزور ہوئی اُس نے دوسری کے سامنے سرِ تسلیم خم کردیا۔

عصرِ حاضرہ میں مغربی تہذیب نے زندگی کے تمام شعبوں میں بہت زیادہ ترقی کی۔ بہت سی مشرقی قوموں نے مغربی تہذیب کی خوبیوں کو بھانپ کر انہیں اختیار کرلیا۔ یہ تقلید قدرتی طور پر ہوتی ہے۔ کیونکہ ہر ایک قوم میں اوجِ ترقی پر پہنچنے کی فطری خواہش ہوتی ہے۔ اور پسماندہ قوم ترقی یافتہ اقوام کے طریقے اختیار کرکے ان کا اوج حاصل کرنا چاہتی ہے۔ زیرک اقوام تو کامیاب قوم کی سیرت کے ان محاسن کو اپنے میں پیدا کرنے کی سعی کرتی ہیں۔ جن کی وجہ سے وہ بامِ ترقی پر پہنچی۔ لیکن بعض عاقبت نااندیش اقوام اس کے بعض ظاہری خواص کی نقل میں مصروف رہتی ہیں۔ اور اپنے آپ کو قسم قسم کے مصائب میں گرفتار کرلیتی ہیں

جب ہندوستان پر مغربی تہذیب کے دروازے کھلے۔ تو بے شمار ہندوستانیوں کی آنکھیں اس لعبت کی چمک دمک سے خیرہ ہو گئیں۔ اور اُنہوں نے اس تہذیب کی روح کو نظر انداز کرکے ظواہر میں اپنے آپ کو کھو دیا۔ اس کے خلاف اہلِ جاپان کو لیجئے اُنہوں نے پہلے مغربی اقوام کے طریقِ کار کو سمجھنے کی کوشش کی۔ اور پھر وہ خود اس راہ پر گامزن ہوکر ترقی کے معراجِ کمال تک پہنچ گئے۔ اسی طرح ترکیہ میں اتاترک کی دوررس نگاہوں نے اپنی کوتاہی کو بھانپ لیا۔ اور ملک میں مغربی اصولِ تمدن کے ماتحت نئی زندگی کو رواج دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہی پسماندہ ترک بڑی بڑی یورپین حکومتوں کے حلیف بن گئے۔

ہندوستان میں اپنی پستی اور زبوں حالی کا بغور مطالعہ کرنے کے بعد بہت سی حقیقت بین نگاہوں نے مغربی تہذیب کی آمد پر اس کا خیر مقدم کیا۔ جن لوگوں کے بنیادی اصولوں کو اپنے ہاں رائج کرنے کی کوشش کی۔ ان میں سرسید پیش پیش تھے۔ سرسید نے تہذیب مغرب کی روح کو دیکھ لیا تھا۔ اور ارتقائی تشخص، پابندیٔ آئین، آزادی، قومیت اور جمہوریت کے اصولوں کے مفاد کو سمجھ کر ان کی پرزور حمایت شروع کردی تھی۔ وہ "انگریزی دان" نہیں تھا۔ بلکہ "انگریز دان" تھا۔

سرسید کی حمایت اگرچہ ان تمام اصولوں پر حاوی نہ تھی۔ مگر پھر بھی اقتضائے وقت کے مطابق اس نے بہت کچھ کیا۔ اور اپنی مردہ قوم کے جسم میں رُوح پھونکنے کے لئے خوب تگ و دو کی۔

سرسید اور اس کے رفقا تہذیب جدید کا خیر مقدم کرنے میں حق بجانب تھے۔ اُنہوں نے قوم کو اعلیٰ تعلیم کی طرف توجہ دلائی۔ حالی نے قوم کی پراگندہ حالی کا حال دل کھول کر ماتم کیا۔ اور پھر وہ "چلو تم ادھر کو ہوا ہو جدھر کی" کا نعرہ لگا کر سرسید کا زبردست وکیل بن

گیا۔ اس نے بھی جدید تہذیب کے بنیادی اصولوں کو صحیح طور پر سمجھا اور تحریر و تقریر کے ذریعہ انہیں پیش کیا۔

سید اور حالی کی مساعی مستحسن تھیں۔ مگر قوم کے افراد صحیح طور پر ان کی پیروی نہ کر سکے۔ بہت سے افراد نے مغربیت کے سطحی رنگ میں اپنے آپ کو رنگنا شروع کیا۔ نتیجۃً جغرافیائی اور اقتصادی حالات کی بنا پر کئی ایک مجبوریاں اور الجھنیں پیدا ہو گئیں۔ انہیں الجھنوں اور مجبوریوں کے خلاف اکبر نے اجتہاد کیا۔

جب مشرقی اور مغربی سیاست کی آخری ٹکر ہوئی۔ اور مشرقی سیاست نے ہتھیار ڈال دئے۔ تو اس ہونے والے لسان العصر کی عمر صرف گیارہ سال تھی۔ جب وہ سنِ بلوغ کو پہنچا تو مغربی تہذیب کے ظواہر پر نوجوان فریفتہ ہو رہے تھے۔ اس نے بھی سید اور حالی کا رستہ اختیار کیا۔ اور تہذیب کے اصولوں کو سمجھا۔ وہ ایک غریب گھرانے کا فرد تھا۔ اس کا باپ دنیا کے علائق چھوڑ کر کسی آستانے پر معتکف ہو چکا تھا۔ اُن جدید اصولوں کی مدد سے اس نے ترقی کی۔ اور انتہائی ترقی کی۔ یہ سید زادہ اپنی ذہنی استعداد کی بدولت پروان چڑھا۔ منصف سب جج اور سشن جج بنا۔

سید اکبر حسین فطری طور پر ایک حساس دل، دماغ کے مالک تھے۔ اور وہ اپنے گردوپیش کے بدلتے ہوئے حالات کو بغور دیکھ رہے تھے۔ حالی اور سرسید کے تعلیمات کی انہوں نے شبلی کی طرح کبھی مخالفت نہ کی۔ بلکہ جن طبیعتوں میں ان تعلیمات کی غلط طور پر پیروی ہو رہی تھی۔ اُن کو اپنی تمام تر طعن وتشنیع کا نشانہ بنایا۔ شبلی نے سرسید اور حالی کے طریق کار کی مخالفت اگر کی۔ تو وہ شرعی نقطۂ نظر سے تھی۔ علامہ شبلی نے اپنا نظریۂ تعلیم خالص اسلامی اصولوں پر قائم کیا تھا۔ اُس نے آغازِ کار میں سرسید ہی کا دامن سنبھالا تھا۔ اور اس کے ساتھ عمر کا بہترین حصہ صرف کیا تھا مگر سرسید کی پھیلائی ہوئی جدید تعلیم کے نتائج سے وہ سخت مایوس ہوا۔ اُس نے دیکھا۔ کہ اس گروہ میں تعلیم و تربیت کا وہ صحیح اثر ناپید تھا۔ جو مغرب میں عام طور پر دیکھا جاتا ہے۔ اس نتیجہ کے استخراج میں شبلی اور اکبر بالکل ہم خیال تھے۔ مگر شبلی کی مخالفت کی زیادہ تر وجہ اس جدید تعلیم یافتہ گروہ کا اپنے مذہب سے انحراف تھا۔ اکبر کی مخالفت عام معاشرتی خرابیوں کے پیدا ہونے کی وجہ سے تھی۔ وہ تو مغربیت کے اس بڑھتے ہوئے سیلاب کی راہ میں کھڑے ہو گئے۔ جو افراد قوم کو تباہی کی طرف بہا کر لیجا رہا تھا اس مغربیت سے ہماری مراد مادہ پرستی، کھوکھلا پن اور وہ لوازمات ہیں۔ جو دیدہ زیبی اور سامانِ تزئینِ حسن کے ساتھ اخلاقی کمزوری پر منتج ہوتی ہیں۔

اکبر اردو کا پہلا شاعر تھا جس نے اپنی گردوپیش کی معاشرت کی اصلاح نظم کے ذریعہ کرنی چاہی۔

اکبر مغربی تہذیب کے مفید اصولوں کا دلدادہ تھا۔ اُس نے خود کوٹ پتلون پہنا، اپنے لڑکے کو انگلستان بھیجا۔ اور انگریزی تمدن سے کبھی پرہیز نہ کیا۔ اگر اسے ضد تھی۔ تو مغربیت کی اندھا دھند تقلید سے۔ مثال کے طور پر وہ عورتوں کی بے پردگی کا سخت مخالف تھا۔ مشرقیت میں جو خوبیاں ہیں۔ وہ انہیں کسی قیمت پر بھی مغربیت پر نثار کرنے کو تیار نہ تھا۔ قدیم ہندوستانی شائستگی کے محاسن کا وہ معترف تھا۔ اور اس نظام معاشرت میں وہ کم سے کم تبدیلی دیکھنے کا روادار نہ تھا۔

اردو شاعری میں اکبر کا مرتبہ ایک ہجوگو اور طنز نگار کی حیثیت سے بہت بلند ہے۔ اور غالباً اس میدان میں اس کا کوئی حریف نہیں۔ وہ اپنے اردگرد کی سوسائٹی کو مضحکہ خیز حالت میں دیکھتا۔ اس کی برائیاں اس پر گہرا اثر کرتیں۔ اور اس کے دل و دماغ سے اسکے طنزیہ اشعار کی صورت میں اس اثر کا ردِ عمل پیدا ہوتا۔ وہ ایک مجبور اور بے بس انسان کی حیثیت میں قوم کی بے راہ روی پر آوازے کستا، جہاں کہیں اُسے کوئی قباحت نظر آتی۔ وہ ایک زہر آلود ہنسی کے ذریعہ اس کا خاکہ اُڑاتا۔ وہ رفتارِ زمانہ سے قطعاً مطمئن نہیں تھا اس کی حقیقت بین نگاہیں دیکھ رہی تھیں۔ کہ افراد قوم کی غلط روی انہیں عزت کی بلندیوں سے کھینچ کر ذلت کی پستیوں کی طرف لے

جاری رہے۔ وہ زمانے کی سرد مہری، محبت اور اخلاص کے فقدان اور پرانی تہذیب و رسوم کی تخریب پر آٹھ آٹھ آنسو روتا۔ جو کچھ وہ کہتا، بظاہر اس میں شگفتگی اور شوخی پائی جاتی۔ مگر دراصل یہ ایک مایوس اور بے قرار دل سے نکلنے والا نوحہ تھا جس نے مزاح اور ظرافت کا لباس پہن رکھا تھا۔

اکبر کی ہجو کا مقصد جیسا کہ اکثر ہوا کرتا ہے۔ اصلاح تھا۔ اردو میں ہجو گو شاعر بہت کم ہوئے ہیں۔ سودا اور میر کی ہجو ذاتی اور انفرادی ہوا کرتی تھی۔ یا کہیں کہیں "شہر آشوب" اور "تضحیک روزگار" دیکھنے میں آتی ہے۔ انشا نے بھی اس ضمن میں بہت کچھ لکھا، مگر یہ سب کچھ انفرادی نوعیت کا تھا۔ عام اجتماعی اور معاشرتی ہجو اکبر سے پہلے بہت کم دیکھنے میں آتی ہے۔ اکبر کے ہاں یہ چیز عام ہے۔ یہاں تک کہ اسی چیز نے اکبر کا نام بحیثیت شاعر بلند کر رکھا ہے۔

ہجو گوئی ایک بدیع فن ہے۔ اور کلاسیکل شاعری میں اس کا درجہ بہت بلند ہے۔ قدیم رومن ادب میں جووینل اور ہوریس کا درجہ ہجو گوئی کی وجہ سے بہت اونچا ہے۔ انہوں نے اپنے گرد و پیش کی قباحتوں کا خاکہ اشعار میں اڑایا۔ اور طعن و تشنیع، مزاح اور طنز کے ذریعہ اپنے عہد کی خامیوں کی اصلاح کی کوشش کی۔ اکبر کے بہت سے اشعار ہوریس کے اشعار سے ملتے جلتے ہیں۔ انگریزی نثر میں سوفٹ کا مرتبہ اس سلسلہ میں بہت بلند ہے۔ سوفٹ نے اپنے عہد کی بوالعجبیوں پر دل کھول کر تنقید کی۔ اور ہر نقص اور خامی کے خلاف انتہائی غیظ و غضب کے جذبات کے ساتھ جہاد کیا۔ مگر اکبر اور سوفٹ کی ہجو میں بڑا فرق ہے۔ اکبر کی ہجو عام معاشرت کے خلاف تھی۔ اور وہ بدلتے ہوئے حالات کو سخت تشویش کی نظروں سے دیکھتا تھا۔ سوفٹ کی ہجو ذاتی ہے۔ اس کے غم و غصہ کی بنیاد اس کے ذاتی تجربہ پر ہے۔ اس کی زندگی تلخیوں کا مجموعہ تھی۔ محبت سے اسے نفرت تھی۔ اس کا بہترین دوست بے وفا نکلا۔ اس کا غم و غصہ کا ایک بحر بیکراں تھا۔ محبت کے تلخ تجربوں نے سوفٹ کو حد درجہ غضبناک بنا دیا۔ اور اسے دنیا کی ہر چیز مضحکہ خیز نظر آنے لگی۔ اکبر کو بھی اواخر عمر میں محبت نے داغ دیا۔ اسے اپنے چھوٹے فرزند ہاشم سے حد درجہ محبت تھی، وہ عنفوانِ شباب میں ہی راہیٔ ملکِ بقا ہوا۔ اکبر کی رفیقہ حیات نے بھی جلد ہی اسے داغِ مفارقت دے دیا۔ اور وہ خود قسم قسم کے عوارض میں مبتلا رہنے لگا۔ حیات کی زوال پذیری نے اس کے دل و دماغ پر گہرا اثر کیا۔ وہ ہر ایک چیز پر قنوطیت ہی سے دیکھنے لگا۔ جدید تہذیب و تمدن کا رونا وہ عمر بھر روتا رہا۔ مگر خوش طبعی کے ساتھ۔ اگرچہ اس خوش طبعی میں سوز پنہاں اہلِ نظر کو صاف دکھائی دیتا تھا۔ اب یہ خوش طبعی جاتی رہی۔ اور شاعر مایوسیوں کے گہرے سائے کے نیچے آ گیا۔ شاعر کے ارد گرد نوجوان نغمۂ مسرت گا رہے تھے۔ مگر سالخوردہ مبصر کو یہ نغمے بے معنی نظر آتے تھے۔ اس کی چشمِ حقیقت بیں کو نہ معلوم کیا کچھ نظر آتا تھا۔ کہ اس کی ہر امید یاس میں مدغم ہو کر رہ جاتی تھی ؎

تمہیں کو ناز ہوا ہے۔ نوجوانو اس طریقے پہ   مری امید تو نغمہ خوشی کا گا نہیں سکتی۔

ہم دیکھ چکے ہیں۔ کہ سوفٹ اکبر سے جداگانہ حیثیت رکھتا ہے۔ ذاتی غیظ و غضب نے اس کی تنقیدوں کو مبالغہ آمیز معاندانہ رنگ میں رنگ دیا تھا۔ اکبر کے ہاں ذاتی بغض نہیں تھا۔ اس کا بہترین ہمکار ایڈیسن کو گنا جا سکتا ہے۔ ایڈیسن اکبر کی طرح اپنے عہد کی معاشرت کا بہت بڑا نقاد تھا۔ اکبر کی بذلہ سنجی، برجستگی اور نکتہ آفرینی بالکل ایڈیسن کی تحریر سے ملتی جلتی ہے۔ حاضر دماغی اور مزاح دونوں میں بدرجہ اتم موجود ہے۔ جہاں ذرا مواد فراہم ہوا۔ ان کی ظریفانہ طبیعت کے سانچے میں ڈھل کر نکل گیا۔ جہاں ایڈیسن کے ہاں راجر، سانٹلی، اور کورلی، معاشرت کے نمائندہ کردار تھے۔ وہاں اکبر کے پاس۔ کلو، بدھو اور جمن جیسے خاص خاص نمونوں کے مخاطب تھے۔ ایڈیسن سپیکٹیٹر کے ذریعہ اپنے ظریفانہ انداز کی اشاعت کرتا رہا۔ اور اکبر نے اپنی ہجو، خوش مذاقی اور ظرافت کی اشاعت کے لئے "اودھ پنچ" کے صفحات سے فائدہ اٹھایا۔ دونوں اپنے فن میں کامل تھے۔ انہوں نے طنز کے ذریعہ وہ کام کیا۔ جو وعظ و تقریر کے ذریعہ برسوں

میں نہیں ہو سکتا۔

یہاں پر ہجو کی وضاحت ضروری ہے۔ گرد و پیش کے انسان اور انسانی معاشرت میں جو چیز قبیح اور ناگوارِ خاطر ہو۔ اس کے متعلق ایک حساس روح کا ردِ عمل ہجو کی صورت میں پیدا ہوتا ہے۔ اس اصل ہجو کو پاکیزگی اور حُسن سے پوری پوری محبت ہوتی ہے

ہجو شعری کو اخلاقی اور اصلاحی شاعری کہہ لینا عین مناسب ہے۔ کیونکہ اس کا نصب العین معاشرتی قباحتوں کی اصلاح ہوتا ہے۔ اور اس غرض کے لئے شاعر آزادی اور جرأت سے کام لے کر تمام برائیوں پر زبانِ طعن دراز کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے۔ کہ اکبر کی شاعری کا بیشتر حصہ اخلاقی شاعری کے تحت میں آتا ہے۔ اور شیخ سعدی کی شاعری کا سا اثر رکھتا ہے۔ اکبر کی ظرافت کا مقصد تہذیبِ اخلاق تھا اور اگر ہم اس کی تمام تر شاعری کو اخلاقی شاعری کہہ لیں۔ تو کچھ مضائقہ نہیں۔

نقادوں نے اور خود اکبر مرحوم نے اپنی شاعری کے کئی دور قائم کئے ہیں۔ اور مختلف سنین کے ذریعہ انہیں ایک دوسرے سے علیحدہ کیا ہے۔ مثلاً پہلا دور ابتدا سے لے کر ۱۸۶۶ء تک، دوسرا ۱۸۶۶ء سے ۱۸۸۰ء تک وغیرہ، مگر اس قسم کا تعین ایک فطری شاعر کے کلام کے متعلق محض ایک تکلف کی حیثیت رکھتا ہے۔ ہاں یہ ضرور ہے۔ کہ ابتدا میں اکبر نے جو کچھ کہنا شروع کیا۔ آخر عمر میں بالکل اس سے بدل گئے۔ یہ عین فطرت کے اقتضا کے مطابق ہے۔ جوں جوں عمر اور تجربہ بڑھتا جاتا ہے۔ خیالات پختگی اختیار کرنے لگتے ہیں۔

غزل اردو شاعروں کی قدیم روش ہے۔ اور تمام شاعر شاعری کی بسم اللہ غزل گوئی سے کرتے ہیں۔ دورِ حاضر کا سب سے بڑا شاعر اقبال بھی اس کلیہ سے مستثنےٰ نہیں۔ کسی شاعر کا صحیح قائم مقام کرنے کے لئے اس کے اواخر عمر کا کلام دیکھنا پڑتا ہے۔ جس طرح فلسفی ترجمانِ حقیقت اقبال کو ہم کبھی غزلگو نہیں کہہ سکتے۔ اسی طرح طنز نگار لسان العصر اکبر کو غزلگو کہنا مناسب نہیں۔ اگرچہ اس نے اپنے ابتدائی کلام میں اپنے تمام پیش رو شعرا کا رنگ اختیار کیا۔ اور بہت کامیابی کے ساتھ اسے نبھایا۔ مثال کے طور پر بعض اشعار ملاحظہ ہوں:-

غالب:-

زیر رنگِ طبع ہوتا۔ نہ یہ دل میں جوش ہوتا
یہ جنوں اگر نہ ہوتا۔ تو کہاں یہ ہوش ہوتا!

شائق ہوا ہے بوسۂ دامانِ یار کا
اللہ رے حوصلہ مرے مشتِ غبار کا

غم و ہر سے بچاتا ہے بشر کو مست رہنا
مجھے شاعری نہ آتی تو میں بادہ نوش ہوتا

مری فطرت میں مستی ہے حقیقت میں ہے دل میرا
مجھے ساقی کی کیا حاجت ہے، جامِ جم ہے دل میرا

مری ہستیا بیاں بھی جزو ہیں اک بیری ہستی کا
یہ ظاہر ہے کہ ہم میں خارج از دریا نہیں ہیں

دلِ زیست سے بیزار ہے معلوم نہیں کیوں
سینے پہ نفس بار ہے معلوم نہیں کیوں

جس سے دلِ رنجور کو پہنچی ہے اذیت!
پھر اس کا طلبگار ہے معلوم نہیں کیوں

ذوق:-

آپ کی یاد کو اللہ سلامت رکھے
مجھ پہ احسان ہے اس مونسِ تنہائی کا

دم لبوں پر تھا دلِ زار کے گھبرانے سے
آگئی جان میں جان آپ کے آ جانے سے

اللہ نے دی ہے جو تمہیں چاند سی صورت
روشن بھی کرو جا کے سیہ خانہ کسی کا

صبا بھی اس گل کے پاس آئی تو میرے دل کو ہوا یہ کھٹکا کوئی شگوفہ نہ یہ کھلائے پیام لائی نہ ہو کسی کا

داغ:-

سوالِ وصل کروں یا طلب ہو بوسے کی وہ کہتے ہیں مری ہر بات پہ یہ خوب کہی۔

نہ مہر و ماہ پر مری نظر ہے۔ نہ لالہ و گل کی کچھ خبر ہے فروغِ دل کیلئے ہے کافی تصور اس روئے آتشیں کا

یہ عمر یہ حسن اور ناز و ادا، اسیر پہ سنگار اللہ اللہ مستی نگہ اُف اُف کی جگہ سینے کا ابھار اللہ اللہ

یہ گیسوئے پیچاں دام خود، یہ نرگسِ فتاں دشمنِ دیں یہ عارضِ رنگیں غیرتِ گل مستی کی بہار اللہ اللہ

درد:-

خلقت میں جلوۂ حق پاتے ہیں اہلِ عرفاں آنکھیں زمیں پر ہیں دل آسماں پر ہیں

کرتی ہے بیخودی میں سوزِ دروں کو ظاہر اے شمع ہم تو عاشق تیری زباں پر ہیں

میر:-

دن رات کی یہ بے چینی ہے۔ یہ آٹھ پہر کا رونا ہے آثار بُرے ہیں فرقت میں معلوم نہیں کیا ہونا ہے

اللہ بچائے مرضِ عشق سے دل میرے کو سنتے ہیں کہ یہ عارضہ اچھا نہیں ہوتا

کچھ آج علاج دلِ بیمار تو کر لیں! اے جانِ جہاں آؤ ذرا پیار تو کر لیں

سو جان سے ہو جاؤں گا راضی میں سزا پر پہلے وہ مجھے اپنا گنہگار تو کر لیں

مومن:-

آفتِ جان ہے تجلی آتشِ رخسار کی خیر ہو یارب نگاہِ شوق سہل انگار کی

مست کر دیتی ہے مجھ کو فصلِ گل بوئے گل وجد میں لاتی ہے حالت سبزہ و اشجار کی

انشا:-

سامنا اک نگہِ ناز کا ہے۔ جان کی خیر مہرباں اک بت عیار ہے ایمان کی خیر

ٹھن گئی آج یہی دل میں کہ پہنچوں ان تک یا مری خیر نہیں یا نہیں دربان کی خیر

اے بتو بہرِ خدا درپئے آزار نہ ہو! خیر راحت نہ سہی زیست تو دشوار نہ ہو

سودا:-

حیا سے سر جھکا دینا۔ ادا سے مسکرا دینا حسینوں کو بھی کتنا سہل ہے بجلی گرا دینا

بلائیں لیتے ہیں ان کی ہم ان پر جان دیتے ہیں یہ سودا دید کے قابل ہے کیا لینا ہے کیا دینا

سرو سے بھی ہوں آزاد تر اس گلشن میں نخلِ ہستی پہ مرے برگ کا بھی بار نہ ہو

آتش:-

جنبشِ ابروئے قاتل کا اشارہ ہے یہی کام چلتا ہے جو دنیا میں تو شمشیر کے ساتھ

عمر زنداں میں کٹی شوقِ رہائی رخصت ہو گیا اُنس مرے پاؤں کو زنجیر کے ساتھ

ولی دکنی:-

رکتے ہیں دستِ دعا اٹھتے ہوئے ہے جو ہونا کیوں رہے گا بے ہوئے

ظفر:-

ہیں وطن سے حزیں وطول بچھڑنے وہ بزم ملی نہ وہ یار گل و لالہ و سرو کا ذکر کیا وہ چمن ہی تھا وہ ہوا ہی تھا

ہوئی طبع جو مائل دامِ بلا ہیں تمہاری ہی زلف سیہ میں پھنسا مرے دامنِ دل کو جو کھینچ سکے کوئی اور تو ایسی بلا ہی تھی

حالی:-

اگر تم چاہتے ہو محرمِ اسرار ہو جانا۔ سکھاؤ اپنے دل کو حرص سے بیزار ہو جانا

ہزاروں کو کرو ایک آج تو اس کی ضرورت ہے، بُرا ہے ایک کا دو اور دو کا چار ہو جانا

ہر ذرہ چمکتا ہے۔ انوارِ الٰہی سے ہر سانس یہ کہتی ہے ہم ہیں تو خدا بھی ہے

ناتجربہ کاری سے واعظ کی ہیں یہ باتیں اس رنگ کو کیا جانے پوچھو تو کبھی پی ہے

کلیاتِ اکبر کا مطالعہ کئے بغیر کون کہہ سکتا ہے۔ کہ یہ تمام اشعار اکبر الٰہ آبادی کے ہیں۔ یا ان مختلف شعرا کے جن کے ساتھ انہیں اوپر فرضی طور پر منسوب کیا گیا ہے۔

یہ تو ابتدا تھی اور عروج وہاں تھا۔ جہاں وہ کمال بے باکی سے اپنے وقت کا ایک ایک عجیب گن گن کر سنا رہا تھا۔ اپنے زمانے کی برائیوں اور مضحکہ خیزیوں پر زہر آلود قہقہے لگا رہا تھا۔ راہ گم کردگان کو جھنجوڑ جھنجوڑ کر ترکستان کی بجائے کعبہ کا رستہ دکھا رہا تھا۔ اور ان کی موجودہ ہئیت کذائی پر انہیں کوس رہا تھا۔ انتہا وہاں تھی۔ جب اسے کھٹکا بلکہ یقین ہو گیا۔ کہ قدیم تہذیب و تمدن کی بچی کھچی نشانیاں بھی عنقریب مٹ جائیں گی

یہ موجودہ طریقے راہیٔ ملکِ عدم ہونگے
نئی تہذیب ہوگی اور نئے سامان بہم ہونگے

اِس تغیر کو وہ لازمی طور پر تخریبی اور انحطاطی تغیر قرار دیتا ہے ؎

گذشتہ عظمتوں کے تذکرے بھی رہ جائینگے
کتابوں میں ہی دفن افسانۂ جاہ و حشم ہونگے
کِسی کو اِس تغیر کا نہ حِس ہوگا نہ غم ہوگا
ہوئے جس ساز سے پیدا اسی کے زیر و بم ہونگے

ایک شاعر کا دل ہے۔ جو اس انقلاب کو برداشت نہیں کر سکتا۔ اور اب اسکے لئے مشرقی شاعروں کی مخصوص تسکین باقی رہ گئی ہے

تمہیں اس انقلابِ دہر کا کیا غم ہے اے اکبر
بہت نزدیک ہیں وہ دن کہ تم ہوگے نہ ہم ہونگے

ڈرامہ
اور
منظوم مکالمہ
نریندر ناتھ سیٹھ
روش صدیقی
سید امتیاز علی تاج

نریندر ناتھ

خاموش محبّت

(ایک ایکٹ کا ڈرامہ)

کردار

(ڈرامے کے کردار فرضی ہیں)

ڈاکٹر ونود ——— ایک ڈاکٹر
مسٹر جگدیش ——— ڈاکٹر ونود کا ایک وکیل دوست
ڈاکٹر پرمیلا ——— ڈاکٹر ونود کی ہم جماعت اور لیڈی ولنگڈن ہسپتال کی ہوس سرجن
مس سہراب جی ——— ڈاکٹر پرمیلا کی ایک سہیلی
ڈاکٹر من موہن ——— سر رام چند ... آئی سی ایس کا لڑکا اور ڈاکٹر ونود و ڈاکٹر پرمیلا کا ہم جماعت
نوکر

(سب کی عمر ۲۵ یا ۲۶ سال کے لگ بھگ ہے)

پہلا سین

وقت .... شام کا دھندلکا

منظر۔ لاہور کے مضافات میں ایک بازار کے کونے میں ڈاکٹر ونود کی دوکان۔ دوکان ایک عام معمولی ڈاکٹر کی دوکان ہونی چاہیئے دوکان میں میز کے ساتھ والی کرسی پر بازار کی طرف منہ کئے ڈاکٹر ونود بیٹھا ہے۔ اور میز کی دوسری طرف اُس کا دوست مسٹر جگدیش دونو بیٹھے باتیں کر رہے ہیں۔

ونود۔ کہو جگدیش آج کتنے مؤکل پھنسے؟

جگدیش۔ مؤکل! (طنزاً ہنستے ہوئے) یہ تو ویسے ہی ہے۔ جیسے میں تم سے پوچھوں۔ کہ آج کتنے مریض دیکھے!

(دونو ہنستے ہیں)

ونود:۔ اس طرح کب تک گزر ہوگا۔

جگدیش:۔ جب تک ماں باپ کا اثر ختم نہیں ہو جاتا۔

ونود:۔—— اس عمر میں آخر ماں باپ سے مانگنا بھی تو کوئی اچھی بات نہیں۔

جگدیش:۔ لیکن مجبوری ہے۔

ونود۔ مجھے تو اکثر دوکان پر بیٹھے بیٹھے ایسا احساس ہوتا ہے۔ جیسے میں دنیا کو اور اپنے آپ کو دھوکا دے رہا ہوں۔ میرے لئے تو یہ پیشہ بیکاری کو چھپانے کے لئے محض ایک ڈھونگ بن کر رہ گیا ہے۔

جگدیش:۔ تمہارے لئے شاید ایسا ہی ہو۔ کیونکہ تمہیں یہاں سے معقول آمدنی نہیں ہوتی۔ لیکن اس پیشہ کے متعلق تم یہ بات نہیں کر سکتے۔ آخر یہ ایک فن تو ہے۔ اس کا کوئی مقصد تو ہے اور اگر کوئی چاہے۔ تو یہ خدمتِ خلق کا بہترین ذریعہ بن سکتا ہے

ونود:۔ میں نے کئی بار یہ ارادہ کیا ہے۔ کہ ہندوستان کے دیہات میں جگہ جگہ دکھیوں کا اور بیماروں کا علاج کرتا پھروں

کھانے کو تو کہیں نہ کہیں سے کچھ مل ہی جائیگا۔ لیکن پھر خیال آتا ہے۔ کہ علاج کے لئے دوائیاں کہاں سے آئیں گی۔ اور پھر گاؤں میں سوشل زندگی بھی تو ختم ہو جاتی ہے۔

جگدیش :- یہی تو میں کہتا ہوں۔ تمہارے دل کو تسکین دینے کے لئے ایک سہارا تو ہے۔ یہاں تو یہ بھی نہیں۔ وکالت ایک ایسا پیشہ ہے۔ جس کا کوئی مصرف نہیں۔ جس کا کوئی مقصد نہیں۔ اور جسکے نہ ہونے سے بھی دنیا قائم رہ سکتی ہے

ونود :- مقصد کیوں نہیں؟ میرے خیال میں تو انفرادی طور پر لوگوں کے جھگڑے مٹانے کا یہ ایک آئینی طریقہ ہے۔ اگر عدالتیں اور وکیل نہ ہوں۔ تو لوگ آپس میں لڑ لڑ کر مر ہی جائیں۔ وکیل ہی تو انصاف کے نگہبان ہیں۔ تبھی تو اسے نہایت باعزت پیشہ (Most Honourable Profession) کہا گیا ہے۔

جگدیش :- (Honourable Indeed) میں نے تو اپنے تین سال کے تجربے میں اسے اسکے بالکل برعکس پایا۔ جتنا جھوٹ اور جتنی دغابازی اور مکاری اس پیشہ میں ہے۔ اور شاید ہی کسی جگہ ہو۔ جھگڑے نپٹانے کے بجائے لوگوں کو آپس میں لڑانے کا ایک آئینی طریقہ تم اسے ضرور کہہ سکتے ہو۔ اور یہ تمہیں کس نے بتایا۔ کہ وکیل انصاف کے نگہبان ہیں۔ انصاف تو اس مہاجنی دور میں اور چیزوں کی طرح بازار میں مول بکتا ہے۔ ہم وکیل انصاف کی منڈی کے دلال ہیں۔ ہماری کمیشن اور انصاف کی جنس پر جو شخص مقابلتاً زیادہ قیمت ادا کرتا ہے وہی انصاف خرید سکتا ہے۔ کیا تمہیں مہنت دھیان چند کے مقدمے کا علم نہیں۔ وہ کس طرح قتل کر کے صاف نکل گیا

ونود :- اگر تمہارا ایسا ہی تجربہ ہے۔ تو تم اس پیشے کو چھوڑ کیوں نہیں دیتے؟

جگدیش :- یہ بھی مجبوری ہے۔ اور اسکے علاوہ . . . . .

(ڈاکیہ "ونود" باہر سے چٹھی۔ مسٹر ڈاکٹر ونود کے نام چٹھی پھینکتا ہے۔ جو جگدیش کے پاس ایک کرسی پر آ کر گرتی ہے۔ نیلگوں رنگ کا خوبصورت کراؤن بانڈ کا لفافہ۔ ونود جلدی سے اٹھ کر چٹھی اٹھا لیتا ہے اور پھر اُسے کھولتے ہوئے آہستہ آہستہ اپنی کرسی پر جا بیٹھتا ہے۔ وہ چٹھی پڑھتا ہے اور پڑھتے ہوئے اُس کا چہرہ خوشی سے سُرخ ہوا جاتا ہے — وہ کبھی کبھی مسکرا بھی دیتا ہے۔

چٹھی پڑھکر اسے کوٹ کے اندرونی جیب میں رکھ لیتا ہے

جگدیش :- کس کی چٹھی ہے۔ جس نے آتے ہی جادو کا کام کیا۔ دم بھر میں تمہارے چہرے کی رنگت بدل ڈالی۔ جیسے تن مردہ میں جان ڈال دی ہو۔

ونود :- ویسے ہی! ایک دوست کی ہے۔

جگدیش :- ہم بھی تو جانیں۔ آخر کس دوست کی ہے؟ مجھ سے تمہارا کون دوست چھپا ہے؟

ونود :- نہیں تم اُسے نہیں جانتے۔

جگدیش :- (مُنہ پھُلا کر) ویسے کہو بتانا نہیں چاہتے۔

ونود :- (مسکراہٹ کو دبانے کی کوشش کرتے ہوئے) لو تم تو ناراض ہو گئے۔

جگدیش :- ناراضگی کی کونسی بات ہے۔ تمہاری چیز ہے۔ دکھاؤ گے تو دیکھ لیں گے۔ ورنہ نہ سہی

ونود :- اچھا ایک شرط پر بتاؤنگا۔

جگدیش :- ہوں!

ونود :- اسے اپنے تک ہی محدود رکھنا۔

جگدیش :- آگے بھی تم نے کبھی کوئی شکایت سُنی۔ وہ ڈاکٹر پرمیلا والی بات کوہی لو۔

ونود :- (آہستہ سے) اُسی کی تو چٹھی ہے

جگدیش :- تبھی چھپا رہے تھے۔ کیا لکھا ہے اُس نے؟ شکر ہے۔ تمہاری بھی خدا نے سُنی۔

ونود :- وہ لاہور آ رہی ہے۔

جگدیش :- کب؟

ونود :- کل شام کی گاڑی سے۔ اُسے یہاں لیڈی ولنگڈن ہسپتال میں ہوس سرجن کی جگہ مل گئی ہے۔

جگدیش :- کیا اُس نے تمہیں سٹیشن پر ملنے کے لئے لکھا ہے؟

ونود :- صاف الفاظ میں تو نہیں۔ لیکن چٹھی لکھنے کا آخر اور کیا

مقصد ہو سکتا ہے۔ وہ مِس سہراب جی کے ساتھ آ رہی ہے اور مجھے مِس سہراب جی کی کوٹھی اپنی نگرانی میں صاف کروانے کے لئے بھیجا ہے۔

جگدیش:۔ یہ مِس سہراب جی کون ہیں ؟

ونود:۔ مِس سہراب جی پرمیلا کی ایک گہری سہیلی ہے۔ کالج کے ایام میں بھی وہ اسکے ساتھ ہی رہتی تھی ہیمنگٹن روڈ پہ اسکا اپنا بنگلہ ہے

جگدیش:۔ کیا وہ بھی کالج میں تمہارے ساتھ ہی پڑھتی تھی؟

ونود:۔ نہیں تو، وہ اُن دنوں ایم۔ اے میں پڑھتی تھی۔ اور اپنے بھائی کے ساتھ ہیمنگٹن روڈ پر رہتی تھی۔ آجکل اُس کا بھائی شاید بمبئی گیا ہوا ہے۔ اسلئے کوٹھی میں نوکروں کے سوا کوئی بھی نہیں۔

جگدیش:۔ کیا اُسی کوٹھی کو صاف کروانے کا کام تمہارے سپرد کیا گیا ہے؟

ونود:۔ (مسکراتے ہوئے) جی ہاں!

جگدیش:۔ بڑے خوش قسمت ہو دار وغہ جی۔

ونود:۔ تمہیں تو بس مذاق ہی کی سوجھتی ہے۔

جگدیش:۔ اور تمہیں اس وقت کوٹھی صاف کروانے کی۔ بہر حال اسکا مطلب یہ ہوا۔ کہ تم کل سارا دن مصروف رہو گے۔

ونود:۔ یقیناً۔ اوّل تو میں ابھی کوٹھی جاؤنگا۔ اور کل تو صبح بھر صفائی ہوگی۔ اور شام کو سٹیشن جانا ہوگا۔ اگر کہیں سے کل شام کے لئے کسی کی موٹر مل جائے تو خوب رہے ورنہ ٹیکسی پر ہی اکتفا کرنی پڑے گی۔ لیکن ارے (گھبراہٹ سے) میرے پاس تو آجکل کوئی پیسہ بھی نہیں۔

جگدیش:۔ (قہقہہ لگاتے ہوئے) واہ رے میاں عاشق۔ جیب میں پیسہ نہیں۔ اور چلے عشق کرنے۔ ڈاکٹر پرمیلا کے ساتھ۔ خوب!

ونود:۔ (غصے سے) مجھے تم سے ہرگز ایسی امید نہ تھی بجائے مدد کے تم الٹا میرا مذاق اڑا رہے ہو۔

جگدیش۔ مذاق نہیں اڑا رہا ونود۔ تمہاری مدد کے لئے تو میری جان تک حاضر ہے۔ ٹیکسی کا بھی تم کوئی فکر نہ کرو۔ میرے پاس پانچ روپے ہیں۔ جو تم لے سکتے ہو۔ لیکن میں پوچھتا ہوں آخر یہ ناز برداری کب تک نبھے گی۔ مجھے تو تمہارے اس نرالے عشق کی سمجھ نہیں آتی۔

ونود۔ میں تمہارا کس منہ سے شکریہ ادا کروں جگدیش۔ تم کتنے اچھے ہو۔ لیکن یہ سمجھ نہ آنے والی بات تمہارے بس کی نہیں۔ جس تن لاگے سو ہی تن جانے۔ پریت کا روگ ہر کوئی کیسے جانے۔

جگدیش۔ (طنزاً) پریت کا روگ! میں تو آجتک اسے سمجھنے سے قاصر ہوں۔ میرے خیال میں تو یہ کسی دماغی بیماری کا نام ہے۔ اور اگر سچ پوچھو۔ تو میں تو اسے جنسی بھوک کی ایک علامت سمجھتا ہوں۔ اسکا صرف ایک ہی علاج ہے۔ کسی عورت کے پاس جا کر اپنی جنسی بھوک مٹا ڈالو۔ تو یہ روگ دور ہو جاتا ہے۔ اور دماغ صاف ہو جاتا ہے۔

ونود۔ تم تو اپنی عادت کے موافق ہذیان بک رہے ہو۔ تمہارے جیسا مادہ پرست بھی میں نے کہیں نہیں دیکھا۔ تم محبت جیسے لطیف جذبے کی تحقیر کر رہے ہو۔ تم اس احساس کو کیا جانو۔ اسکے تاثرات تو اُس شخص سے پوچھو۔ جو اس جذبے سے متاثر ہوا ہو۔ یہ ایک روحانی جذبہ ہے۔ اور ایک لافانی رشتہ جو دو روحوں کو ایک دوسرے میں منسلک کر دیتا ہے۔ ایک لطیف احساس جو روح کو علّیین تک پہنچا دیتا ہے۔ اس سے متاثر ہو کر انسان انسان نہیں رہتا۔ وہ خدا کا ایک حصہ بن جاتا ہے۔ آتما پرماتما میں مل جاتی ہے۔

جگدیش۔ چھی۔ چھی۔ عورت اور مرد کے رشتے میں تم خدا۔ روحانیت علّیین۔ اور نہ جانے کیا کیا لے آئے۔ سیدھی سی بات ہے کہ ہر نوجوان مرد اور ہر جوان عورت کو ایک دوسرے کی خواہش ہوتی ہے۔ اسی خواہش کو لوگوں نے محبت کا نام دے دیا ہے۔ اب اگر ایک خاص مرد کو ایک خاص عورت سے "محبت" ہو جائے۔ اور وہ عورت اُسے کسی نہ کسی وجہ سے نہ ملے تو۔ اُس کی محبت نہایت شدید ہو جاتی ہے۔ اور بعض حالتوں میں تو پاگل پن کے درجے تک پہنچ جاتی ہے

کیونکہ یہ ایک نفسیاتی اصول ہے۔ کہ انسان کو جس کام سے منع کیا جائے۔ اُسے اُس سے خوُ ہو جاتی ہے اور بعض اوقات اُسے حاصل کرنے کے لئے تو وہ اپنی جان بھی کھو دیتا ہے۔ تم ہی بتاؤ۔ کہ اگر ایسا نہیں۔ تو تمہیں کسی مرد سے محبت کیوں نہیں۔ تم ایک عورت کے پیچھے کیوں بھاگتے پھرتے ہو

ونود ۔ میں یہ کب کہتا ہوں۔ کہ مرد کو مرد سے محبت نہیں ہو سکتی یہ تو محض ایک اتفاق ہے۔ کہ مجھے ایک عورت سے محبت ہے

جگدیش ۔ یہ اتفاق نہیں۔ بلکہ ایک قدرتی اصول ہے۔ تم اسے روحانیت کہہ کر اپنے آپ کو دھوکا دے رہے ہو۔ مجھے تو حیرانی اس بات کی ہے۔ کہ تم ایک ڈاکٹر ہو کر اس طرح کی مہمل باتیں کر رہے ہو۔ تمہیں تو ہر ایک چیز سائنٹیفک نکتہ نگاہ سے دیکھنی چاہیئے

ونود ۔ میں ڈاکٹر ہوں۔ انسان کے جسم کی بیماریوں کو سمجھتا ہوں روح کی بلندیوں تک نہیں پہنچ سکتا۔ سائنس کا جذبات میں کیا دخل؟

جگدیش ۔ تمہارے دماغ میں ضرور کچھ فتور ہے۔ اچھا یہ تو بتاؤ۔ کہ کبھی اُسکے سامنے بھی اپنی محبت کا اظہار کیا۔

ونود ۔ وہ عشق ہی کیا جس کا اظہار زبان سے ہو۔

جگدیش ۔ میں پوچھتا ہوں کہ کیا اُسے اپنے مجنوں کے عشق کا علم بھی ہے یا نہیں۔

ونود ۔ میں کیا جانوں۔

جگدیش ۔ عجب انسان ہو یار تم۔ تین سال سے اُس کی محبت میں سرگرداں پھر رہے ہو۔ ان تین سالوں میں تم دو سال کالج میں اسکے ساتھ رہے۔ لیبارٹری میں ہمیشہ اُسکے پاس اور جماعت میں بھی ہمیشہ اکٹھے۔ لیکن ابھی تک یہ معلوم نہیں ہو سکا۔ کہ اُسے تمہاری محبت کا علم بھی ہے۔ یا نہیں یہ بھی محبت کی کوئی نئی ہی قسم ہے۔ جو میں نے آج تک نہیں سُنی کیا کہا تھا تم نے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ روحانی ۔ ۔ ۔ ہاں ۔ ہاں! ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ روحانی محبت ۔ ۔ ۔ ۔

ونود ۔ بے شک روحانی محبت ۔ اس میں ہنسنے کی کونسی بات ہے۔ دراصل سچی محبت ہمیشہ روحانی ہوا کرتی ہے۔ مجھے بھی اُس سے پاک محبت ہے۔ تمام آلائشوں سے پاک۔ میرا مقصد یہ نہیں۔ کہ میں ہر وقت سینے پہ ہاتھ رکھ کر پکارتا پھروں "مجھے تم سے محبت ہے" "میں تم پہ مرتا ہوں" "تمہارے بغیر میں ایک پل بھی نہیں کاٹ سکتا۔" میرا کام صرف محبت کرنا ہے بےلوث محبت۔ میں اُس شمع کی طرح ہوں۔ جو خاموش جلتی ہے۔ اور جل کر راکھ ہو جاتی ہے۔ لیکن شکایت کا ایک لفظ بھی زبان پہ نہیں لاتی۔

جگدیش ۔ لیکن اسکے باوجود تم اُسے حاصل کرنا چاہتے ہو۔ کیا تمہاری محبت کی تکمیل شادی نہیں۔

ونود ۔ یہ ٹھیک ہے۔ کہ میں اُسے حاصل کرنا چاہتا ہوں۔ لیکن میری محبت مشروط نہیں۔ میں حاصل کئے بغیر بھی اُس سے محبت کر سکتا ہوں۔ اور نہ ہی شادی میری محبت کی تکمیل ہے۔ میری محبت شادی کے بعد بھی اُسی طرح زندہ رہے گی

جگدیش ۔ لیکن اگر تم اُسے حاصل کرنا چاہتے ہو۔ تو بغیر اظہار کے یہ کیسے ہو سکیگا۔ اگر میں تمہاری جگہ ہوتا۔ تو اظہار کئے بغیر کبھی نہ رہتا۔ اگر مان جاتی تو اچھا۔ ورنہ ہم کسی اور کی تلاش کرتے۔

ونود ۔ تم محبت نہیں کر سکتے جگدیش۔ اصلی محبت میں اظہار کی ضرورت نہیں ہوا کرتی۔ اگر میری محبت سچی ہے۔ تو اُسے متاثر کئے بغیر کبھی نہیں رہ سکتی۔ اور اگر اسپر کچھ اثر نہیں ہوتا۔ تو ضرور میری محبت میں کچھ نقص ہے۔ مجھ میں اتنی شکتی نہیں۔ کہ محبت کر سکوں۔ محبت ایک مہا شکتی ہے۔ ایک مقناطیسی کشش مقناطیس نے کبھی لوہے سے یہ نہیں کہا۔ کہ تم میری طرف آؤ اگر مقناطیس میں مناسب طاقت ہو تو لوہا خود بخود اُس کی طرف کھچا آتا ہے۔

جگدیش ۔ یہ بھی خوب کہا۔ معشوق نہ ہوا۔ لوہے کا ایک ٹکڑا ہو گیا۔ بہرحال یہ تجربہ بھی دیکھنے کے قابل ہوگا۔ لیکن مجھے تو ابھی تک اُن کی طرف سے کچھ اچھے آثار دکھائی نہیں دیتے۔

ونود ۔ اگر اسپر کوئی اثر نہ ہوتا۔ تو وہ مجھ کو یہ چِٹھی ہی کیوں لکھتی۔

اور بھی تو اُسکے کئی ایک ہم جماعت تھے۔ کسی اور کو لکھ دیا ہوتا۔ اور پھر ذرا غور سے دیکھو۔

(چِٹھی نکال کر دکھاتا ہے)

اُس نے مجھے لکھا ہے۔ "ڈیر ڈاکٹر ونود" اور چِٹھی کو بند کرتے ہوئے لکھتی ہے "یورز (yours) پرمیلا" اور پھر یہ فقرہ پڑھ پڑھ کر سناتا ہے)

مِس سہراب جی نہیں چاہتی تھیں۔ کہ یہ تکلیف تمہیں دی جائے۔ لیکن میں نے اُسے بتایا۔ کہ ونود میری خاطر سب کچھ کر سکتا ہے ـ سب کچھ!"

دیکھا تم نے۔ ہندوستانی ماحول میں ایک لڑکی ہر ایک کو ایسے تھوڑا لکھتی ہے۔ گو یہ چھوٹی سی بات ہے۔ لیکن مجھے تو ایسا محسوس ہوتا ہے۔ جیسے اس میں میری زندگی کا راز پوشیدہ ہو۔

جگدیش۔ (زور سے قہقہہ لگاتے ہوئے) تم کتنے سادہ لوح ہو میرے دوست۔ مجھے تو وہ لڑکی بہت چالاک معلوم ہوتی ہے۔ اور میری رائے میں وہ تمہیں اُلو بنا رہی ہے۔ وہ یہ جانتی ہے۔ کہ تم اُسکے چاہنے والوں میں سے ہو۔ اس بات کا فائدہ اٹھا کر وہ تمہیں اس طرح کے ذلیل کام کرنے کو کہتی ہے۔ کوٹھی صاف کروا دو۔ جیسے تم کمیٹی کے داروغہ ہو۔

ونود۔ وہ تو کیا میرا اُلو بنائے گی۔ تم ضرور مجھے بنانے کی کوشش کر رہے ہو۔ اچھا اب بند کرو۔ اس بحث کو مجھے تو ابھی کوٹھی بھی جانا ہے۔

جگدیش۔ (ہنستے ہوئے) ہاں بھائی ڈاکٹر پرمیلا کے لئے کوٹھی صاف کروانا تو ضروری ہے نا۔

ونود۔ (کرسی پر سے اٹھتے ہوئے) شٹ اپ ناؤ۔ اور لاؤ وہ پانچ روپے۔

جگدیش۔ او ہو! میں تو بھول ہی گیا تھا۔ ہمارے عاشق صاحب کو تو ٹیکسی کی ضرورت ہے (جیب میں سے بٹوا نکال کر پانچ روپے کا نوٹ ونود کو دیتا ہے) لیجئے صاحب پانچ روپے

ونود۔ (نوٹ جیب میں رکھتے ہوئے) تھینک یُو۔

جگدیش۔ اچھا بھائی۔ اب چلیں۔ دو تین دن بعد ملیں گے۔ اور تب ہی تمہاری کامیابی کی داستان بھی سن لینگے۔ لیکن میری ایک بات ضرور یاد رکھنا۔ کہ پریت کا روگ امیروں کا روگ ہے۔ بیکار امیروں کا۔ بیکار ڈاکٹروں کا نہیں۔ اچھا گڈ بائی۔

ونود۔ گڈ بائی۔

جگدیش جاتا ہے۔

(پردہ)

دوسرا سین

وقت۔ تقریباً پانچ بجے شام۔

منظر۔ لیمنگٹن روڈ پر مِس سہراب جی کی کوٹھی۔ اگر ممکن ہو تو کوٹھی کی چار دیواری۔ لان اور اُس کا اندرونی حصّہ سب سٹیج پر نظر آ جائے۔

شام کے وقت کوٹھی کے باہر ایک موٹر ٹیکسی آ کر ٹھہرتی ہے (اگر ہو سکے تو کوٹھی کے اندرونی حصے کے باہر) ٹیکسی میں سے ڈاکٹر پرمیلا مِس سہراب جی اور ڈاکٹر ونود باہر نکلتے ہیں۔ ڈاکٹر ونود ڈرائیور کو کرایہ ادا کرتا ہے۔ اور پھر تینوں کوٹھی میں داخل ہوتے ہیں۔

ڈرائنگ روم جدید طریقے سے سجا ہوا ہونا چاہیئے۔ قالین۔ صوفے۔ مینٹل پیس پر مِس سہراب جی کی فیملی تصویریں۔ اور ایک خوبصورت چوکور گھڑی۔ کھڑکیوں اور دروازوں پر خوبصورت پردے۔ کمرے کے وسط میں اخروٹ کی لکڑی کی کشمیری کام والی ایک خوبصورت میز۔ وغیرہ وغیرہ۔

ڈرائنگ روم میں داخل ہو کر مِس سہراب جی اور ڈاکٹر پرمیلا ایک صوفے پر بیٹھ جاتی ہیں۔ ڈاکٹر ونود کھڑا رہتا ہے۔

ڈاکٹر پرمیلا۔ بیٹھیئے مسٹر ونود۔ میں آپکا کن الفاظ میں شکریہ ادا کروں۔ آپ اتنے مہربان ہیں۔

ڈاکٹر ونود۔ (کرسی پر بیٹھتے ہوئے) آپ تو مجھے شرمندہ کر رہی ہیں شکریہ کس بات کا؟

مِس سہراب جی۔ آپ کو ہماری خاطر بہت تکلیف ہوئی۔ مگر

صرف نوکروں کے بس میں ہوتا۔ تو تین دن تک کوٹھی رہائش کے قابل نہ ہوتی۔

ڈاکٹر وِنود۔ اب بھی تو سارا کام نوکروں ہی نے کیا میں تو محض کھڑا دیکھا کیا

مس سہراب جی۔ یہ کام بھی تھوڑا نہ تھا۔ میں واقعی آپ کی احسان مند ہوں۔

ڈاکٹر پرمیلا۔ او گاڈ نیس! میں بھی کتنی لاپرواہ ہوں۔ ہسپتال میں کل میری ڈیوٹی ہے۔ اور مجھے ابھی تک ڈیوٹی کے اوقات کا بھی علم نہیں۔

مس سہراب جی۔ لاپرواہ تو تم ہو ہی۔ اب تھوڑی دیر آرام کر لو تو پھر سیر کو ادھر ہی چلی چلیں گی۔ اور یہ کام بھی ہو جائیگا۔

ڈاکٹر وِنود۔ آپ کہاں جائینگی اتنی دور۔ اور پھر اتنے لمبے سفر کے بعد میں تھوڑی ہی دیر تک اس امر کی اطلاع آپ کو دے جاؤنگا۔

ڈاکٹر پرمیلا۔ نو ڈاکٹر۔ تھینک یو۔ آپ اتنی تکلیف کہاں کریں گے ہم خود ہی چلی جائینگی۔ اور پھر آپ کے مریض بھی تو مطب میں آپ کا انتظار کر رہے ہونگے۔

ڈاکٹر وِنود۔ مریض تو روز ہی دیکھتے ہیں آج اتنی مدت کے بعد آپ ملی ہیں۔ کیا آپکا اتنا سا کام بھی نہ کر سکونگا۔

ڈاکٹر پرمیلا۔ آپ کتنے اچھے ہیں۔ مجھ پر احسان پہ احسان چڑھائے جا رہے ہیں۔

ڈاکٹر وِنود۔ اچھا تو مجھے اجازت دیجئے۔ میں تقریباً آدھ گھنٹے تک آپ کو اطلاع دونگا۔

ڈاکٹر پرمیلا۔ تکلیف تو آپ کو بہت ہوگی۔ لیکن آپ کسی نوکر کے ہاتھ اطلاع بھیجدیں۔ اور پھر اتنی جلدی کی کیا ضرورت ہے

ڈاکٹر وِنود۔ بہرحال آپ کو اطلاع مل جائے گی۔ اچھا نمستے۔

ڈاکٹر پرمیلا۔ نمستے

مس سہراب جی۔ نمستے۔

ڈاکٹر وِنود جاتا ہے۔

مس سہراب جی۔ تمہیں کام نکالنے کا ڈھنگ خوب آتا ہے۔ پرمیلا

ڈاکٹر پرمیلا۔ ہنستی ہے

مس سہراب جی۔ آدمی بھلا ہے۔ تمہارا ڈاکٹر وِنود۔ خوش خلق اور بامروت۔

ڈاکٹر پرمیلا۔ بڈھو ہے۔ نِرا بُڈھو۔

مس سہراب جی۔ بڑی ناشکر گزار ہو تم۔ ایک تو بیچارے نے مفت میں تمہارے لئے زحمت سہیڑی اور دوسرے بُڈھو بنا

ڈاکٹر پرمیلا۔ مفت میں نہیں۔ تمہیں شاید علم نہیں۔ کہ آپ بھی میرے چاہنے والوں میں سے ہیں۔ گو الفاظ میں اُس نے اس بات کا کبھی اظہار نہیں کیا۔ لیکن کہیں عشق بھی چھپانے سے چھپتا ہے۔

مس سہراب جی۔ اور تم یہ جانتے ہوئے بھی اُس کی محبت کا امتحان کر رہی ہو۔ تمہیں کسی کی محبت کا ناجائز فائدہ اٹھاتے ہوئے شرم آنی چاہیئے۔

ڈاکٹر پرمیلا۔ اچھا تم ہی بتاؤ۔ کہ اگر وہ میرا کوئی کام کرنے پر بضد ہو۔ تو میں کیا کروں۔ مجھے اپنا کام نکالنے میں کیا نقصان ہے۔

مس سہراب جی۔ اگر تم اُس کو نہیں چاہتی۔ تو موقعہ پا کر اُسے بتا دو۔ کہ تمہیں اُس سے محبت نہیں۔

ڈاکٹر پرمیلا۔ کیسے کہوں۔ وہ موقعہ بھی تو دے۔ اُس نے تو کبھی مجھ سے محبت کا ذکر ہی نہیں کیا۔ اور پھر ویسے بھی تو اگر بھنوروں کی طرح دو تین آدمی میرے ارد گرد منڈلاتے رہیں۔ تو اس سے مجھے کچھ لطف سا محسوس ہوتا ہے۔ اپنی خوبصورتی کا احساس ہونے لگتا ہے۔ اور اپنے آپ میں عورت کی طاقت کا غرور بھی محسوس کرتی ہوں۔

مس سہراب جی۔ (طنزاً) صورت کا غرور۔ جیسے زلیخا تم ہی ہو۔ مجھے تو تمہارے یہ طریقے پسند نہیں۔

ڈاکٹر پرمیلا۔ پسند چاہے نہ ہوں۔ لیکن فطرت تو تمہاری بھی یہی ہے۔ بلکہ ہر عورت کی۔

مس سہراب جی۔ غلط بات۔

ڈاکٹر پرمیلا۔ اور اگر میں تمہارے چاہنے والوں کی فہرست ابھی

سے سنا دوں تو۔

مس سہراب جی۔ لیکن میں نے تو کبھی کسی کو دھوکا نہیں دیا کسی کی محبت کا ناجائز فائدہ تو نہیں اٹھایا۔ اور پھر میری تو اب سگائی بھی ہو چکی ہے۔

ڈاکٹر پرمیلا۔ تو تمہارا کیا مطلب ہے۔ کہ میں بھی ڈاکٹر ونود سے شادی کر لوں۔

مس سہراب جی۔ کیا حرج ہے۔

ڈاکٹر پرمیلا۔ لیکن فائدہ بھی کیا ہے؟

مس سہراب جی۔ محبت بھی کوئی جنس ہے۔ جس سے تم فائدہ ڈھونڈتی ہو۔ ڈاکٹر ونود تمہیں دل سے محبت کرتا ہے۔ کیا تمہارے لئے یہ کافی نہیں۔

ڈاکٹر پرمیلا۔ ہرگز نہیں۔ معلوم نہیں تم لوگوں نے محبت کو کیا سمجھ رکھا ہے۔ کیا محبت کسی کی کوئی بھوک مٹا سکتی ہے۔ اگر جذبات کو برانگیختہ کر کے پاگل پن کی حد تک پہنچنے کو ہی محبت کہتے ہیں تو میں ایسی محبت سے باز آئی۔ مجھے شادی سے جذبات نہیں چاہئیں۔ مجھے تو شادی سے صرف دو چیزیں درکار ہیں۔ دو ٹھوس چیزیں ایک سیکس اور دوسرے سماج میں اونچا درجہ۔ زندگی کے تمام لوازمات اور جاہ و حشمت۔ ونود کے پاس صرف جذبات ہیں۔ ایک نیا ڈاکٹر۔ ایک کلرک کا بیٹا مجھے جذبات کے سوا اور کیا دے سکتا ہے۔

مس سہراب جی۔ لیکن یہ چیزیں بھی تو تمہیں صرف وہی دے سکتا ہے۔ جو تمہیں چاہتا ہو۔ جسے تم سے انس ہو۔ تم نے ڈاکٹر منموہن کو بھی تو اپنے آنے کی اطلاع دی تھی۔ اس نے تو سٹیشن تک آنے کی تکلیف بھی گوارا نہ کی۔

ڈاکٹر پرمیلا۔ وہ کیوں آتا۔ اسے میری جیسی اور کئی لڑکیاں مل سکتی ہیں۔ ہے تو وہ بھی ایک نیا ڈاکٹر ہی لیکن وہ سر رامچندر آئی سی۔ ایس کا اکلوتا لڑکا ہے۔ سماج میں اسکا سب سے اونچا درجہ ہے۔ منموہن میری سب ضروریات مہیا کر سکتا ہے۔ اسی لئے تو میں اس سے شادی کرنا چاہتی ہوں۔

اگر تم چاہو۔ تو کہہ سکتی ہے۔ کہ مجھے اس سے محبت ہے۔ اور بھی کئی لڑکیاں اسے پھانسنے کی فکر میں ہیں۔ لیکن اسے صرف ایک عورت کی ضرورت ہے۔ یہ تو مقابلہ ہے۔ اگر میں اپنے داؤ پیچ سے کامیاب ہو گئی تو اچھا۔ ورنہ میں کب اس پر جان دیتی ہوں۔ وہ نہ سہی۔ اس جیسا کوئی اور سہی۔

مس سہراب جی۔ (خشمگیں سے) یہ تم کیا کہہ رہی ہو پرمیلا۔ تمہارے اخلاق کو کیا ہو گیا۔

ڈاکٹر پرمیلا۔ (غصے سے) سچ کہنے پر تم نے مجھے اخلاق کا برا کہہ دیا حالانکہ میں وہی کہہ رہی ہوں۔ جو تم نے کر کے دکھایا۔ فرق صرف اتنا ہے۔ کہ تم اپنے آپ کو دھوکا دے رہی ہو۔ اور میں صاف لفظوں میں اپنے دل کی بات کہہ رہی ہوں۔ بھلا تم نے سیٹھ نادر جی کو کیوں پسند کیا۔ اور غریب رستم جی کو کیوں دھتکار دیا۔ بتاؤ گی مجھے۔ آخر اسے بھی تو تم سے محبت تھی۔

مس سہراب جی۔ (کرسی پر سے اٹھتے ہوئے) اچھا تم جانو۔ تمہارا کام۔ میں جاتی ہوں۔ آج رات کے کھانے کا بھی تو انتظام کرنا ہے (مس سہراب جی اٹھ کر دوسرے کمرے میں جاتی ہے)

ڈاکٹر پرمیلا اٹھ کر کمرے میں ٹہلنے لگتی ہے۔ پھر خود ہی گنگنانے لگتی ہے۔

ڈاکٹر پرمیلا۔ کیا ڈاکٹر سچ مچ نہیں آئے گا؟ میں نے تو اسے کوٹھی کا پتہ بھی لکھ دیا تھا۔ شاید کوئی ضروری کام ہو۔ شاید ابھی آ ہی جائے۔ لیکن میری کیا حالت ہو رہی ہے۔ چہرے پر سے سفر کی دھول اڑ رہی ہے (ہینڈ بیگ سے شیشہ نکال کر دیکھتے ہوئے) آف کیا شکل ہے۔ اسی بل بوتے پر جیتو گی اسے واہ ری پرمیلا (ہینڈ بیگ سے کنگھی نکال کر بالوں کو ٹھیک کرتی ہے۔ پھر پاؤڈر۔ لپ سٹک وغیرہ سے ڈریسنگ کرتی ہے)۔

(ڈریسنگ کرتے ہوئے)

مجھے کہتی تھی بداخلاق۔ میں نے بھی منہ توڑ جواب دیا۔ لو جی ونود سے شادی کر لو (ہنستے ہوئے) اور اس کی باعصمت بیوی بن جاؤ۔ برتن مانجھو روٹی بناؤ۔ گھر کی صفائی کرو۔ بچے

پارو یہی تو محبت کی نشانی ہے۔ محبت۔ محبت۔

(کھلکھلا کر ہنستی ہے)

اتنے میں باہر سے نوکر آتا ہے۔ اور ایک وزیٹنگ کارڈ پیش کرتا ہے۔

نوکر۔ بی بی جی۔ ایک آدمی آپ سے ملنے آئے ہیں۔

ڈاکٹر پرمیلا۔ (کارڈ دیکھتے ہوئے) کون؟ ڈاکٹر منوہن۔ ہاں! ہاں! آنے دو۔ آنے دو۔ اور دیکھنا نہایت عزت سے پیش آنا (دبی زبان سے) آخر آ ہی گئے۔ . . . .

نوکر واپس جاتا ہے۔ اور ڈاکٹر پرمیلا جلدی سے ڈریسنگ ختم کرتے ہوئے صوفے پر جا بیٹھتی ہے۔

(ڈاکٹر منوہن کمرے میں داخل ہوتا ہے)

ڈاکٹر منوہن۔ نمستے پرمیلا۔ مجھے معاف کرنا۔ سٹیشن پر نہیں پہنچ سکا ——میں سخت شرمندہ ہوں۔

ڈاکٹر پرمیلا۔ آپ بیٹھئے تو۔ میں نے بھی یہی اندازہ لگایا تھا۔ کہ کوئی ضروری کام ہی ہوگا۔ ورنہ رکنے والے تو آپ بھی نہ تھے

ڈاکٹر منوہن۔ (صوفے کی ساتھ والی اور ڈاکٹر پرمیلا کی طرف کی کرسی پر بیٹھتے ہوئے) میں پرانی پنجابی کے ساتھ کسی کو ملنے چلا گیا تھا۔ اور وہاں دیر ہو گئی۔

ڈاکٹر پرمیلا۔ معمولی بات ہے۔ اور ویسے سٹیشن پر جانا بھی تو ایک رسمی سی بات ہے۔

ڈاکٹر منوہن۔ ہاں ہے تو محض تکلف ہی۔ اچھا سفر کی کہئے۔ کوئی تکلیف تو نہیں ہوئی۔

ڈاکٹر پرمیلا۔ یہ سفر تو بڑے آرام سے کٹا۔ مس سہراب جی بھی میرے ساتھ ہی آئی ہیں۔

ڈاکٹر منوہن۔ (کمرے میں ادھر اُدھر دیکھتے ہوئے) مس سہراب جی!

ڈاکٹر پرمیلا۔ ہاں! وہ ابھی آرام کرنے کیلئے ساتھ کے کمرے میں گئی ہیں۔

ڈاکٹر منوہن۔ اور آپ آرام نہیں کر رہیں۔

ڈاکٹر پرمیلا۔ مجھے آپ کا انتظار جو تھا۔

ڈاکٹر منوہن۔ اوہو! اور ہاں میں آپ کو مبارک باد دینی تو بھول ہی گیا تھا۔

ڈاکٹر پرمیلا۔ مبارک باد! کس بات کی؟

ڈاکٹر منوہن۔ لیڈی ولنگڈن ہسپتال میں ہوس مین بننے کی اور کس کی

ڈاکٹر پرمیلا۔ واہ! یہ بھی کوئی بات ہے۔

ڈاکٹر منوہن۔ تو اور کیا کم ہے۔ آخر ہم کیوں نہ بنگئے ہوس سرجن۔

ڈاکٹر پرمیلا۔ تم نے پرواہ ہی نہ کی ہوگی۔ ورنہ یہ کونسی مشکل بات تھی

ڈاکٹر منوہن۔ ہمارے گروپ کی لڑکیوں میں سے اور کون کون بنی ہوس مین

ڈاکٹر پرمیلا۔ (ذرا شرماتے ہوئے لیکن فخریہ لہجے میں) لڑکیوں میں سے تو شاید میں ہی ہوں۔

ڈاکٹر منوہن۔ میں پہلے ہی کہا کرتا تھا۔ کہ تم اُن سب سے قابل ہو۔ (آہستہ سے) اور خوبصورت بھی۔

ڈاکٹر پرمیلا۔ (آخری الفاظ کو نظرانداز کرتے ہوئے) بھئی مجھے تو وہ کالج کے دن کبھی نہیں بھولتے۔

ڈاکٹر منوہن۔ خوب تھے وہ دن۔ میرا تو کالج سے باہر نکلنے کو دل ہی نہ چاہتا تھا۔

ڈاکٹر پرمیلا۔ آخر یہ کیوں؟ کالج تھا۔ کہ اندر کا اکھاڑہ

ڈاکٹر منوہن۔ اندر کا اکھاڑہ تو نہ تھا۔ لیکن ایک پری نے کالج میں ضرور بسیرا کر لیا تھا۔

ڈاکٹر پرمیلا۔ کون تھی وہ پری۔

ڈاکٹر منوہن۔ اب اُس پری نے لیڈی ولنگڈن ہسپتال میں بسیرا کر لیا ہے۔

(دونوں ہنستے ہیں)

ڈاکٹر پرمیلا۔ تمہیں یاد ہے۔ جب ہم نے امتحان کے بعد ایک رات الوداعی مون لائٹ پارٹی کی تھی۔ شالامار باغ میں۔

ڈاکٹر منوہن۔ وہ پارٹی کیسے بھول سکتی ہے۔ اس دن شاید تم مس سہراب جی کو بھی ساتھ لائی تھیں۔

ڈاکٹر پرمیلا۔ ہاں۔ لیکن وہ تو تمہارے دوست منوہر پر ایسی تو بھی کہ اور کسی سے بات تک نہ کی۔

ڈاکٹر منوہن۔ (ٹھنڈا سانس بھرتے ہوتے ہوئے) وہ چاندنی

رات تمہیں کبھی نہ بھولے گی۔ اُس رات چاند کی چاندنی میں جب تم میرے ساتھ شالامار باغ کی ایک روش میں ٹہل رہی تھیں۔ تو مجھے ایسا معلوم ہو رہا تھا۔ جیسے چاند زمین پر اتر آیا ہو۔

ڈاکٹر پرمیلا۔ چاند زمین پر اتر آیا تھا کیا۔ پکڑ کیوں نہ لیا تم نے؟

ڈاکٹر منوہن۔ پکڑتا کیسے؟ وہ تو ایک چھلاوے کی طرح تھوڑی دیر بعد کہیں غائب ہو گیا۔

ڈاکٹر پرمیلا۔ تمہاری آنکھوں نے کہیں سراب تو نہیں دیکھا۔

ڈاکٹر منوہن۔ ہوں ہوں۔ میں نے خود اُس چاند کو ان ہاتھوں سے چھوا۔

ڈاکٹر پرمیلا۔ اُسے پھر ڈھونڈنے کی ہی کوشش کی ہوتی۔

ڈاکٹر منوہن۔ بڑی کوشش کی۔ آخر آج کامیاب ہوا۔ چاند پھر زمین پر آ رہا

ڈاکٹر پرمیلا۔ (ہنستے ہوئے) بڑے شیطان ہو تم۔

دونوں ہنستے ہیں۔

ڈاکٹر منوہن۔ پرمیلا۔ تمہارے ہاتھوں کی مخروطی انگلیوں سے تو یہ ظاہر ہوتا ہے۔ کہ تم آرٹسٹ ہو۔ تم ڈاکٹر کیسے بن گئیں۔

ڈاکٹر پرمیلا۔ (اپنا ہاتھ اُسکے ہاتھ میں دیتے ہوئے) اچھا بھلا دیکھو تو میرے ہاتھ سے اور کیا ظاہر ہوتا ہے۔

ڈاکٹر منوہن۔ (ہاتھ کو دباتے ہوئے) کتنا خوبصورت ہاتھ ہے۔ کتنا سڈول اور نرم لیکن میں نے سنا ہے۔ کہ جس عورت کے ہاتھ نرم ہوں اُسکا دل بڑا سخت ہوتا ہے

ڈاکٹر پرمیلا۔ (خفیف سی ہنسی ہنستے ہوئے) ہوں! ہوں!

اتنے میں دروازے پر ڈاکٹر ونود آ جاتا ہے۔ اُسے منوہن کے آخری الفاظ سنائی دیتے ہیں۔ اور پرمیلا کا ہاتھ منوہن کے ہاتھوں میں دیکھ کر اُسکے چہرے پر زردی چھا جاتی ہے۔ تذبذب کی حالت میں وہ یہ سوچنے لگتا ہے کہ وہ پرمیلا کو اُسکے ڈیوٹی کے اوقات کی اطلاع دے۔ یا بغیر اطلاع دیئے ہی واپس لوٹ جائے۔ اسی حالت میں ڈاکٹر منوہن کی آواز پھر اُسکے کانوں میں آتی ہے،

ڈاکٹر منوہن۔ تم کتنی سندر ہو۔

ڈاکٹر ونود آخری فیصلہ کر کے واپس مڑتا ہے۔ لیکن دروازے کے سامنے اُس کا پاؤں اٹک جاتا ہے۔ اس آواز سے منوہن اور پرمیلا دونوں چونک پڑتے ہیں۔ منوہن جلدی سے پرمیلا کا ہاتھ چھوڑ دیتا ہے جو ایک بے جان شاخ کی طرح صوفے پر جا گرتا ہے۔

ڈاکٹر منوہن۔ ہو ڈو یو ڈو مسٹر ونود۔

ڈاکٹر پرمیلا۔ (ڈاکٹر ونود کی طرف خشم آلود آنکھوں سے دیکھتے ہوئے) کیوں ڈاکٹر ونود کیا بات ہے تم سنتے کی طرح میرے پیچھے کیوں پڑ گئے ہو

ڈاکٹر ونود۔ (گھبرا کر) لیکن ۔ میں ... تو آپکو صرف یہ اطلاع دینے آیا تھا۔ کہ آپ کی ڈیوٹی صبح آٹھ بجے سے شروع ہوتی ہے۔ آپ نے ہی تو دریافت کرنے کے لئے کہا تھا۔

ڈاکٹر پرمیلا۔ لیکن یہ آپ مجھے صبح بھی بتا سکتے تھے۔ کیا آج آپ کو اپنا کوئی کام نہیں۔

ڈاکٹر ونود۔ (آہستہ سے) میں جا ہی رہا تھا۔

ڈاکٹر پرمیلا۔ اچھا تو پھر؟ ....

(ڈاکٹر ونود جاتا ہے)

ڈاکٹر منوہن۔ (دبی زبان میں پرمیلا سے) میں نے یہی تو کہا تھا بڑی پتھر دل ہو تم۔

ڈاکٹر ونود کوٹھی کے اندرونی حصے سے باہر نکل کر آہستہ آہستہ باہر جاتا ہے۔ اور منہ میں گنگناتا جاتا ہے۔

ڈاکٹر ونود۔ کیا جگدیش سچ کہتا تھا۔ کہ پرمیلا میرا الوینا رہی ہے۔ لیکن یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ دل نہیں مانتا۔ نہیں نہیں اس میں اُسکا کوئی قصور نہیں۔ میرے ہی پریم میں ابھی اتنی شکتی پیدا نہیں ہوئی کہ میں اسکے قابل بن سکوں۔ مگر اُس نے تو آج میرا اپمان کیا ہے۔ اور ڈاکٹر منوہن کے سامنے۔ اپمان ... کیا اپمان میں یہ کیا کہہ رہا ہوں۔ میری محبت کا بھلا کون اپمان کر سکتا ہے۔ میری محبت اٹل ہے۔ اور کبھی نہ ختم ہونے والی میرا فرض ہے نشکام بھاؤ سے محبت کرنا۔ اور بس ...

لیکن ... لیکن۔

(اس دوران میں ڈاکٹر ونود کوٹھی کی سڑک سے گذر کر باہر سڑک پر آ جاتا ہے۔ اور سٹیج پر حاضرین کی نظروں سے اوجھل ہو جاتا ہے

پردہ

روش صدیقی

کارواں

ایک مکالمہ

فلسفی

ہم نفس! یک تک طلسم اعتبارِ این و آں
آخرش کیا ہے مآلِ زندگیٔ رائیگاں

☆

آہ یہ پژمردہ امیدیں، فسردہ خواہشات
چل رہی ہے جن کے خونِ سرد سے نبضِ حیات
بجھ نہیں جاتا ہے آخر کیوں چراغِ کائنات
دیکھتا ہوں ہر طرف غمناک آہوں کا دھواں

☆

شاعر

میں بھی اکثر سوچتا رہتا ہوں اے دانائے راز
کیا متاعِ زندگی ہے حسرت و درد و گداز
جادہ پیما ہے ابھی تک فکرِ شبہائے دراز
پر کسی منزل پہ رکتا ہی نہیں یہ کارواں

☆

پھر بھی میرا ہر نفس ہے ہم خرامِ زندگی
جھومتا ہوں وجد کرتا ہوں بنامِ زندگی
بے نیاز اس سے کہ کب ہو جائے نیامِ زندگی
روز و شب سنتا ہوں نغماتِ حیاتِ جاوداں

یہ امیدیں، یہ تمنائیں، یہ سوز و اضطراب
شوقِ وارِ لطف کے نظارے، یاس و حسرت کے حجاب
کہکشاں کی سرد آہیں، خوابہائے ماہتاب
کہہ رہے ہیں زندگیٔ جاوداں کی داستاں

☆

فلسفی

زندگیٔ جاوداں، اِک خوابِ نادیدہ ہنوز
ہے یہ نغمہ کشتۂ مضرابِ نادیدہ ہنوز
ہر نفس ہے سجدۂ محرابِ نادیدہ ہنوز
ایک خوابیدہ تصور پر حقیقت کا گماں؟

☆

ختم بھی آخر یہ قیدِ نا سزا ہوگی کبھی!
کیا نہ اِس درد و الم کی انتہا ہوگی کبھی!
کیا نہ اک تعمیرِ نو کی ابتدا ہوگی کبھی!
کیا کہیں رُکنے نہ پائے گا غبارِ کارواں

☆

بے کسی، بے آگہی، افسردگی، آشفتگی
اِک مسلسل ناامیدی، اِک مسلسل تشنگی
کیا یہی ہے زندگی، تعبیرِ خوابِ زندگی
کیا یہی ہے زندگیٔ جاوداں کی داستاں؟

☆

ہر خیابانِ عمل سیلابِ حسرت کا شکار
دستِ عفریتِ خزاں سے چاک دامانِ بہار
زندگی ہے اِک طلسمِ عشرتِ ناپائیدار
کیوں رہے انساں اسیرِ کاکُلِ سود و زیاں

شاعر

سچ کہا معمورۂ سود و زیاں ہے زندگی
پھر بھی اے ذی ہوش! کیفِ جاوداں ہے زندگی
جادہ پیما کارواں، در کارزاں ہے زندگی
زندگی موجِ رواں، جوئے رواں، بحرِ رواں

☆

زندگی! اے دیدہ ور تسکینِ خوابیدہ نہیں
گوش شنوا کیلئے یہ نغمہ نشنیدہ نہیں
خلوتِ دل منزلِ انوارنادیدہ نہیں
زندگی خود ہے دلیلِ زندگی جاوداں

☆

سیل بے پروا، جو بہتا ہے گلستاں کا لہو
خود بھی ہوتا ہے گلستاں میں گہر ریز نمو
اک نفس چاکِ گریباں، اک نفس فکرِ رفو
آہ! نازک کس قدر ہے رشتۂ سود و زیاں

☆

اشک بن بنکر برستا ہے کبھی ابرِ نشاط
درد کے محمل میں آتی ہے عروسِ انبساط
ہو دلِ آگاہ سینے میں تو کیا غم کی بساط
غم، خمارِ یک نفس ہے دل سرورِ جاوداں

☆

ہر نفس جب تک تغیر آشنا ہوتا نہیں
عالمِ فانی سرافرازِ بقا ہوتا نہیں
رائیگاں مٹ کر بھی نقشِ مدعا ہوتا نہیں
موت کیا ہے، نشۂ جامِ شرابِ جاوداں

یہ حوادث، یہ مصائب، یہ حجاباتِ محن
فتنۂ اورنگ و افسر، عشوۂ دار و رسن
کب انہیں خاطر میں لاتا ہے دلِ باطل شکن
بادلوں سے بھی کہیں رکتا ہے خورشید رواں

☆

فلسفی

یہ جہانِ خواجگی و بندگی یہ زندگی!
ابنِ آدم کے لئے اک مستقل شرمندگی!
ہے یہاں معدوم شمعِ فکر کی تابندگی!
یہ جہاں ظلمت نشاں ظلمت نشاں ظلمت بجاں

☆

خدمتِ خلقِ خدا کے نام پر خود پروری
دعوئ منزل نمائی شیوۂ غارت گری
داغدارِ خونِ انساں ہے قبائے سروری
دیکھ کر رنگِ زمیں شرما رہا ہے آسماں

☆

دیکھتا ہوں چشمِ گیتی میں فسونِ بیش و کم
رنگِ میخانہ دگرگوں ہو رہا ہے دمبدم
لڑکھڑاتے ہیں غرورِ ہوش و مستی کے قدم
میکشِ کم ظرف کے ہاتھوں میں ہے رطلِ گراں

☆

خونِ خودداری کہیں عذر پذیرائی کہیں
داغِ محکومی کہیں شانِ خود آرائی کہیں
دم نہیں لیتا سمندِ نازِ دارائی کہیں
مشرق و مغرب ہیں برباد فسونِ قہرماں

عزمِ خائف جوشِ ساکت شوقِ محرومِ نوید
عصرِ حاضر ہے کہ اِک طوفانِ اندوہِ شدید
روح مایوسِ یقیں ہے دل ہے ویرانِ امید
زندگی بھی رائیگاں اور مرگ بھی ہے رائیگاں

☆

شاعر

عصرِ حاضر پر گمانِ منزلِ ہستی نہ کر
فکرِ رفعت آشنا کو عازمِ پستی نہ کر
دستگیرِ عزم! اظہارِ تہی دستی نہ کر
وقت ہے پھر نغمہ خوانِ جرأتِ روشن دلاں

☆

بازوؤں پر جس کے زلفِ مرگ لہرائی نہ ہو
زندگی نے جس کے قدموں کی قسم کھائی نہ ہو
چشمِ انجم جس کی خودداری سے شرمائی نہ ہو
دیکھ سکتا ہے وہ کیا خوابِ حیاتِ جاوداں

☆

امتیازِ بندگی و خواجگی سودائے خام
اور ہی کچھ ہے جہاں میں ابنِ آدم کا مقام
دل نہ ہو آزاد سینے میں تو انساں ہے غلام
وہ گدائے بینوا ہو یا کوئی کشور ستاں

☆

کیا ہوا؟ گر ہیں پئے کم ظرف پیمانے ہزار
مٹ چکے ہیں خواب بنکر ایسے افسانے ہزار
پیشِ مستاں خود ہی جھک جاتے ہیں میخانے ہزار
مشربِ ہستی نہیں شرمندۂ رطلِ گراں

فقر درویشی نہیں، تمکین سلطانی نہیں!
شہریاری، کشور آرائی، جہاں بانی نہیں!
کوئی منزل منتہائے اوجِ انسانی نہیں!
کوکبِ تقدیرِ آدم ہے فروغِ لامکاں

☆

فلسفی

اے کہ تیرا سوزِ دل ہے محرمِ سوزِ حیات
کر دیئے بے پردہ تو نے رازہائے کائنات
ہاں ابھی تک دل میں رہ رہ کر کھٹکتی ہے یہ بات
آسمانِ کوکبِ تقدیرِ آدم ہے کہاں؟

☆

شاعر

آسمانِ کوکبِ تقدیرِ آدم عشق ہے
پاسبانِ عظمتِ تعمیرِ آدم عشق ہے
خوابِ آدم عشق ہے تعبیرِ آدم عشق ہے
عشق ہے معراجِ دیدارِ خدائے دوجہاں

☆

زندگی زنگار، آئینہ ہے آئینہ عشق
سنگ ہے معمورۂ کونین اور شعلہ ہے عشق
علم بربط ہے، عمل مضراب ہے، نغمہ ہے عشق
ذرہ ذرہ کارواں ہے، عشق خضرِ کارواں

سید امتیاز علی تاج

بنتِ عم کے ہاں

ایک ننھا سا کھیل

کردار:- لڑکا اور لڑکی

منظر

[لڑکی کا نشست کا کمرہ۔ درمیان میں ایک صوفا۔ صوفے کے قریب ایک اونچا لیمپ۔ سامنے ایک میز جس پر سگرٹ کا ڈبا۔ دیاسلائی کی ایک ڈبیا۔ ایش ٹرے وغیرہ۔ کمرے کا ایک دروازہ باہر کو کھلتا ہے۔ ایک گھر کے دوسرے کمروں کو جاتا ہے۔ لڑکا اور لڑکی صوفے پر اکٹھے بیٹھے ہیں۔ لڑکی کا سر لڑکے کے کندھے سے لگا ہے]

لڑکی۔ سچ کہو۔ کیا سوچ رہے ہو۔؟

لڑکا۔ کیا؟ — غالباً یہ سوچ رہا ہوں کہ تم کیا سوچ رہی ہو۔

لڑکی۔ میں؟ — سوچتی تھی۔ کہ جب ہماری شادی ہوجائیگی تو کیسے لطف اور راحت میں بسر ہوا کریگی۔

لڑکا۔ (خوشی سے بے خود ہوکر) پھر ہمیں راتوں کو خدا حافظ کہنے کی ضرورت نہ رہے گی۔

لڑکی۔ نہ تمہیں گھر سے ٹھنڈی راتیں باہر آنا پڑے گا۔

لڑکا۔ آہ وہ مبارک وقت کتنی سست رفتار سے آرہا ہے۔

(گھڑیال بارہ بجاتا ہے)

بارہ! بڑا وقت ہوگیا (اٹھ کر) اب مجھے چلنا چاہئے۔

لڑکی۔ نہیں ابھی نہیں۔ (پھر بٹھا لیتی ہے)

لڑکا۔ جب تک میں نہ جاؤں گا۔ چچا جان ساتھ کے کمرے میں بیٹھے جاگتے رہیں گے۔

لڑکی۔ ابا جان تو رات کے دو دو بجے تک بیٹھے پڑھتے رہتے ہیں

لڑکا۔ پھر بھی۔ میرا اتنی رات گئے تک بیٹھا رہنا کچھ مناسب معلوم نہیں ہوتا۔

لڑکی۔ جانے سے پہلے کچھ پیوگے نہیں؟ چائے۔ کافی؟

لڑکا۔ نہیں نوازش۔

لڑکی۔ اچھا سگرٹ۔

لڑکا۔ ہاں سگرٹ لے لوں گا۔

لڑکی۔ لیجئے۔ (ڈبا پیش کرتی ہے) سلگاؤں گی میں۔ (سگرٹ سلگاتی ہے)

لڑکا۔ شکریہ۔ اب مجھے سچ مچ رخصت ہوجانا چاہئے۔

لڑکی۔ اچھی بات۔ (لڑکا کھڑا ہوجاتا ہے) خدا حافظ۔

لڑکا۔ خدا حافظ۔

لڑکی۔ (اٹھتے ہوئے) یاد ہے صبح سب سے پہلا کام کیا کرنا ہے۔؟

لڑکا۔ ٹیلیفون۔

لڑکی۔ (خوش ہوکر) ہاں۔

لڑکا۔ مگر کس وقت؟

لڑکی۔ آنکھ کھلتے ہی۔

لڑکا۔ صبح صبح بے آرام ہوگی تم۔

لڑکی۔ بے آرام ہونے کی بھی ایک ہی کہی۔ صبح کو مجھے سب سے پہلے یہ معلوم کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ کہ میرے لئے تمہاری محبت میں کمی تو نہیں آئی۔

لڑکا۔ (ہنسکر) تو پھر یوں کیوں نہ کروں۔ کہ کمی آگئی ہو تو فون کرکے تمہیں بے آرام کروں

لڑکی۔ ایسی باتوں کا مذاق نہ اڑاؤ ـــــ تو خدا حافظ۔

لڑکا۔ خدا حافظ۔

لڑکی۔ (جلدی سے بڑھکر) ٹھہرو دروازہ میں کھولوں گی۔

(دروازہ کھولتی ہے۔ باہر مینہ برس رہا ہے اور تیز ہوا چل رہی ہے)

لے لو! باہر موسلا دھار بارش ہو رہی ہے اور ہمیں خبر بھی نہیں

لڑکا۔ موسلا دھار کہاں۔ یوں ہی پھوہار ہے۔

لڑکی۔ مگر تمہارے پاس تو برساتی چھتری بھی نہیں۔ ایسا اچھا سوٹ غارت ہو جائے گا۔

لڑکا۔ گھر کونسا دور ہے۔ چند قدم کے فاصلے پر تو ہے ہی۔ بھاگ کر پل بھر میں پہنچ جاؤں گا۔

لڑکی۔ (سر ہلاکر) نہ نہ۔ میں ایسی بارش میں تمہیں ہرگز باہر نہ جانے دونگی۔ اب سے دور دشمنوں کو نمونیہ۔ پلاریسی۔ گٹھیا ہوگیا تو؟

لڑکا۔ (ہنس کر) سب مرض ایک دم۔!

لڑکی (ہنسکر) شادی سے پہلے ہی مجھے بیوہ کرنے کی ٹھان لی؟

لڑکا تم تو پگلی ہو۔

لڑکی۔ (متانت سے) دیکھو۔ یوں کرو۔ بھائی جان آج رات دہلی گئے ہیں۔ ان کا کمرہ خالی ہے۔ میں ابا جان سے پوچھ لوں تو تم ان کے پلنگ پر سو رہو۔

لڑکا۔ نہیں نہیں۔ اس وقت چچا جان کو تکلیف نہ دو۔ کیا کہیں گے اپنے دل میں۔ اور پھر اسکی ضرورت بھی؟ بیکار کی تکلیف۔

لڑکی۔ واہ۔ بیکار کیوں۔ تمہاری زندگی کا سوال بیکار ہے؟ میرے دل سے پوچھو نا۔ تم اتنے سگرٹ ختم کرو۔ میں ابا جان سے جاکر پوچھ آتی ہوں۔ ابھی آئی۔

(لڑکا بڑھکر اسے روکنا چاہتا ہے لیکن لڑکی اندر بھاگ جاتی ہے وہ اسے تکتا رہ جاتا ہے۔ ذرا دیر تساہل سے کھڑا رہتا ہے پھر سگرٹ پھینک۔ کوٹ کا کالر الٹ لیتا ہے۔ باہر کے رخ کا دروازہ کھولتا ہے۔ اور ذرا سے پس و پیش کے بعد باہر نکل جاتا ہے۔ کمرہ ذرا دیر خالی رہتا ہے۔ پھر اندر سے لڑکی کی آواز آتی ہے)

لڑکی۔ میں نے پوچھ لیا۔ آجاؤ۔ کمرہ ٹھیک ہے (لڑکی اندر آتی ہے) ہیں! کہاں گئے؟ (ادھر ادھر دیکھتی ہے، کہاں ہو؟ ـــ چھپ گئے کیا؟ پردے کے پیچھے اور فرنیچر کے نیچے دیکھتی ہے) آؤ بھی۔ دیکھو پھر میں روٹھ جاؤں گی (روٹھے ہوئے انداز میں) توبہ اللہ۔ یہ کیا مذاق ہے۔

(دروازہ کھلتا ہے۔ بارش کی آواز اور ہوا کا شور۔ لڑکا اندر داخل ہوتا ہے۔ لباس بھیگ چکا ہوا ہے۔ پانی کی بوندیں ٹپک رہی ہیں۔ لڑکی ہکا بکا ہوکر اسے تکتی ہے)

ہیں! تم تو شرابور ہو رہے ہو! باہر کیوں گئے تھے۔؟

لڑکا۔ (ٹھنڈ کے مارے سسکی لیکر) ذرا گھر تک گیا تھا۔

لڑکی۔ کیوں۔!

لڑکا۔ میں نے سوچا۔ رات کو یہاں سونے کے لئے اپنا پاجامہ کوٹ لے آؤں۔

(اسٹیج کی روشنی فی الفور گل کردی جائے)

اخترؔ شیرانی

غزل

یہ غزل ایک عجائب المخلوق دوشیزہ نے لکھوائی ہے۔ پچھلی رات "دورِ جنوں" کے عالم میں کعبے کی مخالف سمت سے آواز آئی۔ کہ غزل کہو اور میں گاتی ہوں میں نے کہا تم گاؤ اور مجھے لکھاتی جاؤ۔ چنانچہ جو کچھ اس نے لکھوایا میں لکھتا گیا۔ اور وہ بغیر اصلاح و نظرِ ثانی نذرِ قارئین ہے۔ — اخترؔ

گھنگھور گھٹا گر صبح کو ہو، کیا وقت سہانے ملتے ہیں
اس طرح کہ جیسے بچھڑے ہوئے، دوست دوانے ملتے ہیں

ہے آج فضا بھی غمگیں سی، ہے آج صبا بھی محزوں سی
کیا بات ہے یہ کیوں درد بھرے غمناک فسانے ملتے ہیں

کس نے یہ کہا؟ کس سے یہ سنا، یوں کہنے کو ہر اک کہتا ہے
انصاف تو ہو سکتی سے کہیں لیلےٰ کے فسانے ملتے ہیں؟

ہم کو تو جوانی میں بھی کوئی اک منظر سادہ تک نہ ملا
سنتے تھے کہ اس دنیا میں کئی نظارے سہانے ملتے ہیں

یہ بات الگ ہے آئے کوئی! آئے تو پھر اپنا ہو کے رہے
یوں ورنہ کسی کو شام وسحر! ہر روز بہانے ملتے ہیں

بدبختیٔ الفت یہ بھی ہے، اچھا تو زمانہ مل نہ سکا
کہتے ہیں کہ شوقِ الفت میں اچھے بھی زمانے ملتے ہیں

بلبل کے ترانے کیوں نہ پسند آئیں ہمیں دردِ فرقت میں
غمگین دلوں کو غم ہو اگر غمگین ترانے ملتے ہیں

اخترؔ جسے دنیا کہتی ہے، افسردہ سا ہے بیمار سا ہے
کیا ایسی مکدّر دنیا میں، ایسے بھی دوانے ملتے ہیں

شعرستان
اختر شیرانی
احمد ندیم قاسمی
اختر ہوشیارپوری
علی سردار جعفری
بہزاد لکھنوی
امین حزیں
خیبر بھوروی
قیوم نظر
فراق گورکھپوری
سلام مچھلی شہری
اعجاز صدیقی
اثر لکھنوی
احسان دانش
عبدالمجید بھٹی
طالب انصاری
راج بلدیو راج

احمد ندیم قاسمی

شمعِ احساس

خرد کی جنگ میں احساس چوٹ کھائیگا
تو تیرے دل کا دھڑکنا نہ کام آئے گا

یہ بھاری بھاری کتابیں — ضخیم تفسیریں
یہ تیز و تند صدا۔ شعلہ بار تقریریں

یہ فلسفہ — یہ حقیقت کی آڑی ترچھی لکیر
خرد کا ٹوٹا ہوا ایک ٹیڑھا بنیگا تیر

یہ معرفت — یہ کمانے کا اِک نرالا ڈھنگ
دلوں پہ پھیلا ہوا عقل و آگہی کا زنگ

یہ مدرسوں میں نیا رنگ علم و عرفاں کا
نقابِ دُرس تمدن میں خون انساں کا

حیاتیات اِدھر، اقتصادیات اُدھر
اندھیری شام اِدھر اور کالی رات اُدھر

شکم پرستی کا بہانہ — سیاسیات کا نام
ہوس خدائی کی — اور اشتراکیات کا نام

نئے نئے یہ مذاہب، نئے نئے احکام
یہ منحنی سے عقاید۔ یہ بے محل پیغام

بلند بانگ ارادے، فسردہ جذبِ دروں
زباں سے شعلہ فشانی، دلوں پہ مہرِ سکوں

یہ مسجدوں کی پناہوں میں جبّہ و دستار
یہ لمبے لمبے عمامے، یہ روحِ زار و نزار

یہ مقبروں پہ چڑھاوے، غلاف قوّالی
دماغ پیر کا فکرِ مرید سے خالی

ڈھکوسلہ ہے خرد کا یہ ہاؤ ہو ساری
کدھر ہے دلِ شاعر واہ تیری جبّاری

یہ عقل و فکر کے ہنگامے پھونک ڈال کبھی
رگوں سے شعلۂ احساس بھپر نکال کبھی

جہانِ کہنہ میں اِک ایسا انقلاب آئے
کہ تیرے نعروں کا افلاک سے جواب آئے

یہ فلسفے، یہ سیاست، یہ معرفت کے جال
انہیں کے دم سے قلندر کی زندگی ہے وبال

توہمات کے بادل ہیں گھر کے آئے ہوئے
اُٹھے افق سے دھندلکے پرے جمائے ہوئے

جلا وہ شمعِ حقیقت ہو ضو فگن جس میں
خلوص و درد و محبت ہو ضو فگن جس میں

توہمات کی پرچھائیاں سمٹ جائیں
دھندلکے بھاگ اٹھیں اور گھٹائیں چھٹ جائیں

اختر ہوشیارپوری

غزل

فغاں کے چند ٹکڑوں میں الم کی داستاں رکھدی ۔ اکٹھی کر کے تفسیرِ مکان لامکاں رکھدی

الٰہی خیر ہو اب میں ہوں اور رازِ محبت ہے ۔ یہ میں نے خاک پر بنیادِ کاخِ آسماں رکھدی

وفا کا ذوقِ عشقِ ناتواں کے قلب میں رکھا ۔ کہاں رکھنی تھی بنیادِ محبت اور کہاں رکھدی

ترے قرباں اے غمازۂ فطرت کی پُرکاری ۔ دلِ محزوں میں تُو نے وُسعتِ کون و مکاں رکھدی

حصولِ زندگی معدومیٔ ہستی کو کہتے ہیں ۔ خدا نے موت میں پنہاں حیاتِ جاوداں رکھدی

کسی نے اس طرح بھر کر پلائی چشمِ میگوں سے ۔ شکستہ کر کے ہم نے بیعتِ پیرِ مغاں رکھدی

جو مجھ کو عمر بھر مجبورِ ضبطِ شوق رکھنا تھا ۔ تو تُو نے کس لئے آخر مرے منہ میں زباں رکھدی

خدا کا نام لیں یا بے خودی میں اُن کو پہچانیں ۔ نصابِ عشق میں کیا چیز بہرِ امتحاں رکھدی

زمانے بھر کا ہر ذرہ ہے مجھ کو معبدِ اُلفت ۔ وگرنہ آستاں وہ ہے جبیں میں نے جہاں رکھدی

مجسم روح کو اب تک نہ پایا ہے نہ پائیں گے ۔ یہی اک شے تھی جو تُو نے نگاہوں سے نہاں رکھدی

اِدھر عشق و وفا پرور اُدھر حُسنِ وفا دشمن ۔ دلِ معصوم نے لاکر محبت درمیاں رکھدی

بتائیں کیا نشاں اُس رہ نوردِ دشتِ غربت کا ۔ نظر آئی جہاں بھی شاخ طرحِ آشیاں رکھدی

چمن کے رنگ و بُو نے اس قدر دھوکا دیا مجھ کو ۔ کہ میں نے شوقِ گل بوسی میں کانٹوں پر زباں رکھدی

مجھے صیاد و گلچیں کا نہیں ہے خوف کچھ اختر
کہ شاخِ برق پر میں نے بنائے آشیاں رکھدی

علی سردار جعفری

سالِ نو

یہ کس نے فون پر دی سالِ نو کی تہنیت مجھکو — تمنا رقص کرتی ہے تخیل گنگناتا ہے

تصور اک نئے احساس کی دنیا میں لے آیا — نگاہوں میں کوئی رنگین چہرہ مسکراتا ہے

جبیں کی چھوٹ پڑتی ہے فلک کے ماہ پاروں پہ — ضیا پھیلی ہوئی ہے سارا عالم جگمگاتا ہے

شفق کے نور سے روشن ہیں محرابیں فضاؤں کی — ثریا کی جبیں زہرہ کا عارض تمتماتا ہے

پرانے سال کی ٹھٹھری ہوئی پرچھائیاں سمٹیں — نئے دن کا نیا سورج افق پر اٹھتا آتا ہے

زمیں نے پھر نئے سر سے نیا رختِ سفر باندھا — خوشی میں ہر قدم پر آفتاب آنکھیں بچھاتا ہے

ہزاروں خواہشیں انگڑائیاں لیتی ہیں پہلو میں — جہانِ آرزو کا ذرہ ذرہ گیت گاتا ہے

امیدیں ڈال کر آنکھوں میں آنکھیں مسکراتی ہیں — زمانہ جنبشِ مژگاں سے افسانہ سناتا ہے

مسرت کے جواں ملاح کشتی لیکے نکلے ہیں — غموں کے ناخداؤں کا سفینہ ڈگمگاتا ہے

خوشی مجھ کو بھی ہے لیکن میں یہ محسوس کرتا ہوں — مسرت کے اس آئینہ میں غم بھی جھلملاتا ہے

ہمارے دورِ محکومی کی مدت گھٹتی جاتی ہے — غلامی کے زمانے میں اضافہ ہوتا جاتا ہے

یہی انداز گر باقی ہیں اپنی سست گامی کے

نہ جانے اور کتنے سال آئیں گے غلامی کے

بہزاد لکھنوی

غزل

اک بیوفا سے چاہ کئے جا رہا ہوں میں
یوں زندگی تباہ کئے جا رہا ہوں میں

ہر لحظہ آہ آہ کئے جا رہا ہوں میں
تیرے لئے گناہ کئے جا رہا ہوں میں

آنکھیں بھی خشک ہیں مری اور لب بھی ہیں خموش
ہر طرح سے نباہ کئے جا رہا ہوں میں

یہ جانتا ہوں سجدہ نہیں ہے انہیں روا
پھر بھی عجب گناہ کئے جا رہا ہوں میں

وہ ہیں کہ اپنے منہ کو چھپاتے ہیں بار بار
اُن کی طرف نگاہ کئے جا رہا ہوں میں

دنیا تو کہہ چکی ہے محبّت کو جرم ہے
دانستہ یہ گناہ کئے جا رہا ہوں میں

الزامِ کفر کو بھی میں سر اپنے لے چکا
ہر بات سے پناہ کئے جا رہا ہوں میں

تارے بھی مضمحل ہیں فلک بھی ہے کچھ اداس
اتنی بلند آہ کئے جا رہا ہوں میں

ہر لحظہ اُن کی یاد ہے ہر لمحہ اُن کا ذکر
دل کا سکوں تباہ کئے جا رہا ہوں میں

بہزاد اس میں اُن کا نہیں ہے کوئی قصور
خود ترکِ رسم و راہ کئے جا رہا ہوں میں

امینِ حسنزیں

سانیٹ

محبت کیا ہے؟ آ تجھ کو بتاؤں

محبت کارِ شیطانی نہیں ہے نہیں ہے یہ ہوس رانی نہیں ہے
محبت زندگی کی زندگی ہے محبت جوہرِ تابندگی ہے
محبت اِمنِ ہستی کی ہے برق اسی کے نور میں دونوں جہاں غرق
محبت بادۂ شوقِ پرستار دل وجاں سے عبودیت کا اقرار
نگاہِ پاک کی پروردۂ ناز محبت بات ہے واللہ خداساز
محبت حسن کا نیرنگِ جانسوز محبت کا نہ فردا ہے نہ دیروز
محبت بے نیازِ چشمِ ادراک محبت ہے سراپا جذبۂ پاک
جمالاتی یہی اِک سرزمیں ہے محبت خاک کا عرشِ بریں ہے

محبت کیا ہے؟ آ تجھ دکھاؤں

خیبر ہجویری

بارگاہِ قدّس میں فرشتوں کا وفد

فرشتوں نے خدا سے ایک دن یہ ری شکایت کی   کہ اک بندہ ترا تبلیغ کرتا ہے بغاوت کی
"نئی دنیا" رماتا ہے، "نیا مذہب" بناتا ہے   ترے بندوں کو "آدابِ خداوندی" سکھاتا ہے
نہ کوئی اس کا "مذہب" ہے، نہ کوئی اکی "ملت" ہے   نہ پابندِ "شریعت" ہے، نہ پابندِ "طریقت" ہے
وہ کہتا ہے "عمل" ہی دونوں عالم کی حقیقت ہے   نہ کوئی چیز "دوزخ" ہے، نہ کوئی چیز "جنت" ہے
وہ کہتا ہے "خدا" کا کوئی "مذہب" ہے، نہ "ملت" ہو   اُسے "کافر" سے "نفرت" ہے، نہ "مومن" سے "محبت" ہے
خدا آزاد ہے "قیدِ مذاہب" اور "ملت" سے   محبت ہے اُسے "حسنِ عمل" سے "حسنِ فطرت" سے
وہ کہتا ہے "خدا" "ہندو" ہے، "مسلم" ہے، نہ "عیسائی"   نہ "شیعہ" ہے، نہ "سنی" ہے، نہ "مرزائی" "نہ موسائی"
وہ کہتا ہے خدا کا گھر نہ "مندر" ہے، نہ "کعبہ" ہے   "پگوڈا" ہے، نہ "بت خانہ"، نہ "شیوالہ" نہ "گرجا" ہے
کبھی "مندر" میں جاتا ہے کبھی "مسجد" میں جاتا ہے   کبھی "گنگا" نہاتا ہے، کبھی "چندن" لگاتا ہے
کبھی "توریت" اور "انجیل" کی باتیں بتاتا ہے   کبھی "قرآن" پڑھتا ہے، کبھی "گیتا" سناتا ہے
کبھی "حوروں" پہ ہنستا ہے کبھی "جنت" پہ ہنستا ہے   "حرم" کے پاسبانوں کو "مقدس چور" کہتا ہے
کبھی "پیروں" کی "مجلس" میں کبھی "واعظ" پہ تعریضیں   کبھی "ملا" کا شاکی ہے، کبھی "رندوں" کی تعریفیں
"مقدس خانقاہوں" کو وہ کہتا ہے "پری خانہ"   کبھی "شداد" کی "جنت"، کبھی "بزمِ شرابانہ"
"عذابِ زندگی" کہتا ہے "انساں کی غلامی" کو   کسی کے سامنے جھکتا نہیں ہے وہ "سلامی" کو
وہ کہتا ہے "وطن" پر "جان" "دینا" "عین ایماں" ہے   اسی کا نام "جنت" ہے، یہی "معراجِ انساں" ہے
وہ کہتا ہے کوئی "آقا" ہے، "مالک" ہے، نہ "خادم" ہے   اگر تفریق کرتا ہے خدا اس میں تو ظالم ہے
یہ ہیں "الفاظ کے جادو"، یہ ہیں انساں کی تخلیقیں   ہوئی ہیں جن سے "کعبے" اور "بتخانے" میں تفریقیں
وہ کہتا ہے کہ انساں باعثِ تخلیقِ فطرت ہے   وہ کہتا ہے کہ انساں "رازدارِ سترِ وحدت" ہے
وہ کہتا ہے خدا کو سب سے پہلے ہم نے پہچانا   "فنا" سمجھا، "بقا" سمجھا، "نیاز" و "ناز" کو جانا
وہ کہتا ہے خدا کی آبرو ہم نے بڑھائی ہے   حقیقت اُسکی کیا ہے، ہم نے دنیا کو بتائی ہے
عجب آزاد مسلک ہے عجب آزاد فطرت ہے   نہ اسکو "خوفِ دوزخ" ہے، نہ کچھ پروائے "جنت" ہے

تری "قدرت" کا قائل ہے تری حکمت کا قائل ہے
مگر پھر بھی "بغاوت" پر طبیعت اس کی مائل ہے

ضرورت ہے کہ اس آزاد فطرت "شوخ انساں" کو
تری قدرت سزا دے ایسے "گستاخ" اور "ناداں" کو

وگرنہ خوف ہے دنیا کہیں باغی نہ ہو جائے
فرشتوں میں بھی وہ "تخم فساد" آ کر نہ بو جائے

"خزاں" کی گود کا پالا کرے "چشمک" بہاروں سے
"ہوا" کی شوخیاں بڑھنے لگی ہیں اب "شراروں" سے

"زمیں" کا بسنے والا "آسماں" والوں سے بڑھ جائے
بڑھے اتنا کہ رفتہ رفتہ اک دن سر پہ چڑھ جائے

فرشتے اس کے گستاخانہ اندازِ "تکلم" سے
بہت بیزار ہیں تیری عنایت اور ترحم سے

خدا نے سن کے فرمایا "بہ اندازِ رحیمانہ"
شکایت ہے بجا لیکن شکایت ہے یہ طفلانہ

حقیقت میں وہ "کافر" ہے نہ "مشرک" ہے نہ "دیوانہ"
مگر جو بات کہتا ہے "بطرزِ خاص رندانہ"

شریر و شوخ ہے لیکن ریاکاروں سے اچھا ہے
"وطن" کے آسماں پر بے ضیا تاروں سے اچھا ہے

خواہش

نگاہ کیف زا ہے اور میں ہوں!
دل رنگیں نوا ہے اور میں ہوں!
مری ہر سانس نغمہ بن رہی ہے
تری آوازِ پا ہے اور میں ہوں!

کلیم سینائی

فلسفۂ التجا

مرے سینے میں طوفاں کیوں نہیں ہے؟
زِ غم شعلہ ساماں کیوں نہیں ہے؟
جبین شوق ہے مصروفِ سجدہ
دل کونین لرزاں کیوں نہیں ہے؟

کلیم سینائی

قیوم نظر

غزل

مٹ مٹ کے محبت میں تیری یوں تجھ کو پکارے جاتے ہیں
کٹ کٹ کر دریا کی تہ میں جس طرح کنارے جاتے ہیں

کیا خوب ہے تیری محفل بھی محفل ہے کہ چکر دنیا کا
کچھ نیند کے ماتے آتے ہیں کچھ درد کے مارے جاتے ہیں

کیوں عشق کو مٹنا حسن کو بننا لازم تھا معلوم ہوا
کچھ کام بگاڑے جاتے ہیں کچھ کام سنوارے جاتے ہیں

رہ مل تو گئی ہے منزل کی لیکن یہ ہوئی حالت اپنی
ارمان بڑھائے جاتے ہیں اور حوصلہ ہارے جاتے ہیں

یادورِ محبت تھا وہ بھی آنکھوں میں ہیں نقشے پل پل کے
یا وقت یہ آیا ہے کہ یونہی اب عمر گزارے جاتے ہیں

امیدوں کی بستی اجڑی، دل مٹ گیا، لیکن پھر بھی وہاں
اشکوں کی ٹھنڈی چھاؤں میں آہوں کے شرارے جاتے ہیں

شام آئی تھی، آنا تھا، نہیں، کیا رات پہاڑسی کٹ بھی گئی
تنگ آکے فریبِ وعدہ سے یا چاند ستارے جاتے ہیں

ہم پر بھی نظر وہ ہو ہی گئی آخر مشکل آسان ہوئی
اک بوجھ تھا سر پر جینا بھی اس کو بھی اتارے جاتے ہیں

فراق گورکھپوری

نکات

بھیک مانگ کے بھاگے بُت ٹُٹ — ورنہ تھی وہ سرکار تو لُکھ لُٹ

دردِ دل کیا ہے کھلا آج ترے لڑنے پر — تجھسے اتنی تھی محبت مجھے معلوم نہ تھا

بھینچکر اُس کو جو ملئے بدنِ نازک وزم — جسم اور جان میں تمیز نہیں ہو سکتی

یہ کیا ہار جیت اور یہ سود و زیاں کیا — محبت تو اونچا جوا کھیلتی ہے

ملاحت اسکے بدن کی نہ پوچھ حال یہ ہے — چھُوا ہے جب سے وہ مجھ میں سمایا جاتا ہے

وہ جسم بادہ نہ افسوں نہ سحر ہے لیکن — رہے نہ ہوش بدن سے بدن اگر چھو جائے

جسم اُس کا نہ پوچھئے کیا ہے — لوچ ایسی تو روح میں بھی نہیں

بے چین زندگی کی آسودگی پنہاں — جبدم ہوئی نمایاں کہلائی حسنِ جاناں

دُکھ میں بھی حسن یوں نہیں بیتاب — سُکھ میں جس طرح بے قرار ہے عشق

حسن خود قرب، عشق خود دوری — پھر کسے ہجر یا وصال کہیں!

جب کہیں اُن کو چین مل نہ سکا — بجلیاں سوگئیں اُن آنکھوں میں

ایک عالم کو حُسن کا ہے پیام — چھوڑ رنج و نشاط، سیکھ سکون

ایک عالم سے وہ لبِ اعجاز — کہتے ہیں داستاں خموشی کی

جیسے رگ رگ میں جان دوڑ گئی — موت نے زندگی کو چھیڑ دیا

موت جب روٹھ کر گئی جانے — زندگی کیوں لگی ہے شرمانے

دکھ ہو یا سُکھ کس قدر معصوم تھا اسکا سکون — حسن کو تنہائیوں میں چھپ کے دیکھا بارہا

فراق پوچھ رہے ہو کہ حسن کیا شے ہے — سکونِ غیر شعوری ز فرق تا بہ قدم

ترے جمال میں بے چینیاں کہاں میری — میں دردِ عشق ہوں مجھ میں ترا سکون کہاں

حُسن ہستی کے نشہ کا ہے خمار — وہی اترے تو عشق کہتے ہیں

حُسن کیا، ایک خواب ہے جس کے — چونک پڑنے کو عشق کہتے ہیں

مجھ کو تو مرے حال سے کیا کام ہے لیکن — شاید یہ مرا درد زمانے کے لئے ہے

مجھ کو حالت پر اپنی فرقت ہیں — تو نہ آئے تو رحم ہی آجائے

خو رجذب نہاں پہ کر کے کھلا
تجھ سے کچھ احتراز سا ہے مجھے

مدت سے ترا درد بھی خاموش ہے لیکن
رہ رہ کے کچھ اپنے دوست میں گھبرا سا اٹھا ہوں

گو جواب اسکا نہیں ہے مگر پھر بھی فراق
حسن سے وجہ جفا پوچھ کے شرمندہ ہوں

یاد کرتا ہوں تجھ کو سو سو طرح
یعنی سو سو طرح بھلاتا ہوں

دکھ میں بھی حسن کو سکون وہ ہے
عشق کو سکھ میں جو نصیب نہیں

حسن کو درد میں بھی دیکھا ہے
اس پہ سو جان سے سکون نثار

بہت دلوں میں محبت کو ہو سکا معلوم
جفا فریب جفا تھی وفا فریب وفا

خفا ہوں جور و جفا پر خبر نہیں تجھ سے
بچھڑ کے دے نہ سکونگا تجھے کوئی الزام

میں رو رو کر ترے جور و ستم کی
شکایت کرتے کرتے ہنس پڑا ہوں

بجا ہے ضبط بھی لیکن محبت میں کبھی رولے
دبانے کے لئے ہر درد او نادان نہیں ہوتا

نفس پرستی پاک محبت بنجاتی ہے جب کوئی
وصل کی جسمانی لذت سے روحانی کیفیت لے

کوئی جب وصل میں دے جسم کو پینگ
حقیقت کا سمندر موج مارے

یہ خواہش نفسانی معیوب نہیں اسکو
جو کھول کے پورا کر پر ساتھ محبت کے

رسیلے ہونٹ ہیں میٹھی چھیڑ کی نگاہیں ہیں
بدن میں لوچ ملاحت کی جان ہیں کولے[1]

دیکھتا ہوں کہ سن رہا ہوں تجھے
یعنی تو ہے کہ ایک گیت کی لے

مذہب کا فرشتہ تھا ادراک کا آئینہ
جب عکس پڑا صورت شیطاں کی نظر آئی

نیک اعمال کے او سر میں اگا کب خلاق
نخل ساحل ہے یہ دریا معاصی کا فراق

تا کمر جسم کچھ رہیں جو جیسے
اور پیڑ و سے یوں بھیجے پیڑو

سر سے سر کو ملا کے دو ارنے
جس طرح زور آزماتے ہوں

مل کے جسموں کا پھر وہ لہرانا
کرشن کا رقص ناگ کے پھن پر[2]

[1] کولے (Hips) جسے سنسکرت میں نتیمبھ کہتے ہیں سنسکرت ادب میں حسن کا اہم خاص رکن مانا گیا ہے اور سنسکرت ادب میں بھرے بھرے کولوں کے حسن کا ذکر شدید جذبات کے ساتھ کیا گیا ہے۔ اردو اور فارسی ادب کمر کے نیچے نہیں اترسکے۔

[2] کرشن بچپن میں اپنے ساتھیوں کے ساتھ جمنا کے کنارے گیند کھیل رہے تھے گیند جمنا میں جا پڑا کرشن اسے نکالنے کے لئے جمنا میں کود پڑے اور جمنا کی تہ میں ڈوبتے ہوئے پاتال تک چلے گئے جہاں شیش ناگ یعنی سانپوں کا شہنشاہ حکومت کرتا ہے۔ وہ بیخوف اسکے پھن پر چڑھ گئے اور اسے ناتھ کر اس کے وسیع پھن پر رقص کرنے لگے ناگ کے پھنکار سے کرشن کا جسم سیاہ ہوگیا۔

فراق گورکھپوری

سلام مچھلی شہری

"ہاجرہ سے"

یہ کیا کہ میں غریب ہوں، بڑی ہی مردہ دل ہو تم
مری بہن تو ہو مگر بہت فسردہ دل ہو تم
مجھے بھی فکر ہے کہ زرد پڑ گئی ہو بھوک سے
تمہیں بھی چڑھ سی ہو گئی ہے کوٹھوں کی کوک سے
مجھے بھی فکر ہے یہ چاند مضمحل ہے، زرد ہے
تمہیں بھی سوچ، رخ پہ کیوں تمہارے اتنی گرد ہے
مجھے بھی فکر تم میں کیوں لطیف شوخیاں نہیں
تمہیں بھی غم تمہارے پاس کیوں سہیلیاں نہیں
مجھے بھی غم فسردہ ہو، بجا کہ تم جمیل ہو
تمہیں بھی فکر، پھر بھی کیوں سماج میں ذلیل ہو

― ذلیل ہو ― غریب ہو، مگر یہ کیا ضرور ہے
خوشی تو میرے بھائی جان! اب بھی دور ہے
خوشی ― یہی کہ قیمتی لباس زیب تن کروں
حسین زیورات سے نگارش بدن کروں
خوشی ― یہی کہ پارٹی سے ہال کو سجاؤں گی
ہر ایک کام کو کسان عورتیں بلاؤں گی
خوشی ― یہی کہ دلفریب ناولوں میں کھو رہوں
وگرنہ فلم کے حسین گیت گا کے سو رہوں

― جہاں سبھی غریب ہوں وہاں تمہیں ملال کیوں
خود اپنے اضطراب میں سکون کا خیال کیوں
جو دل میں دکھ کی ٹیس ہے تو راحتوں کا شوق کیوں
ہجوم اشک دیکھ کر تبسموں کا ذوق کیوں
بدلنے دو جہان کے الم فزا نظام کو
ابھی نہ غم زدہ کرو مری بہن سلام کو!

اعجاز صدیقی اکبرآبادی

التجا

یہ بجا، ہے مصلحت تیری دخیلِ کائنات — لیکن اس پر بحث کی اعجازؔ کو جراَت نہ دے
چشم پوشی ظالموں سے دیدۂ دانستہ ہے — تُو اگر چاہے تو ان کو ظلم کی ہمت نہ دے
اک اشارے پر ترے رُک جائے نبضِ زندگی — تُو اگر چاہے تو دم لینے کی بھی مہلت نہ دے

شورشیں دنیا پرستوں کی ہوں تیرے علم میں!
پھر بھی تو جبروت کو اپنے ذرا حرکت نہ دے؟

ہیں اندھیرے جور و استبداد کے چھائے ہوئے — دہر کو اس سے زیادہ موقعِ ظلمت نہ دے
انتہا سے بڑھ گئی ہے کجلاہی کی ہوس — زر پرستوں کو مجالِ عظمت و سطوت نہ دے
مال و دولت کو ہیں یہ اپنا خدا سمجھے ہوئے — خود پسندانِ جہاں کو اس قدر نخوت نہ دے
تیری ہی مخلوق کہلاتے ہیں بیوہ اور یتیم — جو نہ تاباں ہو کبھی، ایسی انہیں قسمت نہ دے
مفلسوں کی ہڈیاں ہیں اور دندانِ ہوس — رحم فرما، ان درندوں کو تو یہ طاقت نہ دے
تیری دنیا ہو رہی ہے آج فاقوں سے نڈھال — چار دن کی زندگی میں اس قدر زحمت نہ دے
ہر نفس تازہ مصیبت، ہر گھڑی آلامِ نَو — زیست کہ اِک لمحہ راحت ہیں یہ کلفت نہ دے
سانس بھی تو لے نہیں سکتے ترے وحدت پرست — فطرتِ کثرت کو اتنا غلبۂ کثرت نہ دے
بن گئی ہے بزمِ ہستی رزم گاہِ خونچکاں — خون کے پیاسوں کو خونخواری کی یوں ہمت نہ دے
بھیڑیوں میں پھنس گئی ہیں بے زباں بھیڑیں تری — بے محابا پھاڑ کھانے کی انہیں جراَت نہ دے
بے بسوں پر آزمائی جا رہی ہیں قوتیں — جن کی قسمت میں نہیں ہے رحم انہیں قوت نہ دے
قتل و غارت کر چکے بے حد یہ قزاقانِ دہر — اور خوں آشامیوں کی اب انہیں ہمت نہ دے
وسعتِ عالم میں اس کو کون دے گا پھر پناہ — دستِ سختِ ظلم میں مظلوم کا رعایت نہ دے
بے کسی میں لُٹ رہا ہے کاروانِ زندگی — رہزنوں کو رہزنی کی اس طرح ہمت نہ دے

ۓ حرکت کی ’ر‘ کو دانستہ بالجزم استعمال کر رہا ہوں۔ اعجازؔ

ٹھوکروں کی زد میں سر ہیں آج بندوں کے نئے — ملک گیرانِ جہاں کو یہ انانیت نہ دے

شورشوں کی آگ ہے پھیلی ہوئی چاروں طرف — دشمنِ امن و سکوں کو مژدۂ نصرت نہ دے

خود پسندی، خود سری اور خود روی میں چور ہیں — شر پسندوں کو زمامِ شوکت و عظمت نہ دے

فرطِ شورش سے زمین و آسماں لرزش میں ہیں — مادیت کے پرستاروں کو یہ قدرت نہ دے

موت کے سانچوں میں ڈھالی جا رہی ہے زندگی — شاہکارِ زندگی کو اتنی کم قیمت نہ دے

بحر و بر میں آگ سی پھیلی ہوئی ہے ظلم کی — بربریت کے ذلیل احساس کو وسعت نہ دے

دے سہے ہیں جو یہاں اولادِ آدم کو فریب — اُن دغا بازوں کو اپنا سایۂ رحمت نہ دے

کیوں نہیں فرمانِ نو مخلوق پر صادر ہنوز؟

دے ثبوت اس کا کہ تو ہے دہر پر قادر ہنوز!!

احتشام حسین

گریز پا جوانی

منجمد کر دوں آفتاب کو میں — ٹوٹنے بھی نہ دوں حباب کو میں

جلد آنے کا گر کرو وعدہ — روکوں جاتے ہوئے شباب کو میں

رنگین ستارا

کسی مایوس تمنا کا سہارا جیسے — شکلِ مانوس کا دھندلا سا نظارا جیسے

فلک میں غرق اکیلے وہ ترا نازِ خرام — چرخ پر شام کا رنگین ستارا جیسے

سر پھری جوانی

اُس شوخ نگہ کی بے عنانی سے پوچھ — ہاں پوچھ ادائے دلستانی سے پوچھ

کیوں حسن کی ہر نظر پہ مٹ جاتی ہے — یہ بات نہ سر پھری جوانی سے پوچھ

اثر لکھنوی

غزل

کہیں نہ دیکھ لے کوئی، ارے سنبھل سنبھل کے دیکھ
نگاہِ شوق تو انھیں نہ یوں مچل مچل کے دیکھ

یہ دل ہے اور یہ جگر، ترے نثار، متّصل
نظر ملا ملا کے دیکھ، رُخ بدل بدل کے دیکھ

یہی جو اضطراب ہے، دل خراب خون ہو
اور اپنا رنگ آنکھوں سے مری اُبل اُبل کے دیکھ

فراق کی یہ رات ہے، قرار دل کو آچکا
تڑپ تڑپ کے خواہ کروٹیں بدل بدل کے دیکھ

غرض پڑی ہے کیا انہیں، وہ آئے ہیں نہ آئینگے
ہزار بار گھر سے تو اثرؔ نکل نکل کے دیکھ

احسان دانش

نظم پارہ

یہ میری ایک طویل نظم "گورستان" کا ٹکڑا ہے۔ جو میں نے اپنی والدہ کی وفات سے متاثر ہو کر کہی ہے۔ اور کتابی صورت اختیار کر گئی ہے۔ مکمل نظم "گورستان" کے نام سے جلد از جلد کتابی صورت میں شائع ہونے والی ہے:۔ احسان

پاؤں ننگے، سر برہنہ، خشک لب، سوکھی زباں، والدہ کے مرقدِ اقدس کی جانب ہوں رواں
جا رہا ہوں دل میں ارمانِ قضا کو پالتا گرم ذرّوں کی کھلی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتا
اس زمیں پر پاؤں رکھنا بے شعوری ہے ضرور کیا کرے لیکن جسے حاصل نہ ہو کشف القبور

میرے سینے میں دھڑکتا ہے دلِ بے انکشاف
اے مزاروں کی مقدس خاک گستاخی معاف

شہر کی دُوری سے جتنا ہو رہا ہوں ہمکنار پاس آتا جا رہا ہے میری دُنیا کا مزار
آہ ان ویرانیوں میں میری جنّت دفن ہے میری عظمت دفن ہے میری محبّت دفن ہے
ٹوٹا ہے مجھ ناتواں پر آسماں اس راہ میں لٹ گئی میری متاعِ دوجہاں اس راہ میں
ہے اسی مٹی میں میری شادمانی محوِ خواب میری قسمت کا یہیں ڈوبا ہے آکر آفتاب
کیوں نہ کھو جاؤں امیرِ کارواں گُم ہو گیا کیوں نہ گُم ہوں حاصلِ کون و مکاں گُم ہو گیا
عمر بھر یہ داغ اب سینے سے جا سکتا نہیں زندگی میں زندگی کا رنگ آ سکتا نہیں
گُل ہوئی شمعِ سکوں سوزِ تمنّا بجھ گیا راہِ غربت میں چراغِ دین و دُنیا بجھ گیا
جاگتے سنسار جنسِ بے بہا جاتی رہی رتبہ جس ہستی کا تھا بعد از خدا جاتی رہی
قافلے میں دن دہاڑے اِک مسافر لُٹ گیا لٹ گیا پردیس میں مزدور شاعر لُٹ گیا

لیکن اے شہرِ عدم آباد کی مجلس نشیں!
ان میں کوئی بات بھی آزردہ ہونے کی نہیں

تربیت نے تیری بخشا ہے مجھے ذوقِ سلیم! — میرے مشرب میں ہے بیجا مدح اک جرمِ عظیم
اپنے ذوقِ التجا سے دشمنی رکھتا ہوں میں — گو فقیرِ بے نوا ہوں دل غنی رکھتا ہوں میں
تو نے جو تعلیم دی ہے اس زمانے میں کہاں — ایسی دولت بادشاہوں کے خزانے میں کہاں
ناز ہے مجھ کو نہیں میں فطرتاً مطلب پرست! — میری خودداری نے دولت سے نہیں کھائی شکست
زرد پڑ سکتا نہیں میرے چمن زاروں کا رنگ — کھا نہیں سکتا میرے ایمان کے سونے کو زنگ
میرا دل روشن ہے میرے فیصلے ضوناک ہیں — میرے منصوبے مقدس ہیں ارادے پاک ہیں
میں ادب کے سبز پرچم کو جھکا سکتا نہیں — میں قصیدے لیکے درباروں میں جا سکتا نہیں
تو نے جس ماتھے کو چوما ہے بصد لطف و کرم — وہ قیامت تک نہ ہوگا اب کسی چوکھٹ پہ خم

پھر بھی اے روحِ مقدس ساکنِ خلدِ بریں
صبر کرنا چاہتا تو ہوں مگر ہوتا نہیں

اب تخیل میرا اندھا ہے میرے بازو ہیں شل — لے گئی تو ساتھ میری قوتِ فکر و عمل
ضبط و جرأت کے سفینے غرق ہو کر رہ گئے — آنسوؤں سے کٹ کے امیدوں کے ساحل بہ گئے
زندگانی کے وہ تعمیری مشاغل اب کہاں — گرچہ جیتا ہوں مگر جینے کے قابل اب کہاں

دِل بس اب زندانِ یاس و غم کا قیدی ہو گیا
دُودھ تیرا میرے بالوں کی سفیدی ہو گیا

ناتمام

عبد المجید بھٹی

راجا — اور — پرجا

راجا ——— !
راجا ——— !
اک بات مجھے بتلا دے
تو پرجا پتی کہلا ئے
بن پرجا تو ہے پت کس کی ؟
کس کی پت کہلائے ؟
راجا ——— !
کیوں تو نے مان بڑھایا ؟
راجا ——— !
راجا ——— !
اک بات مجھے بتلا دے
تو اَن داتا کہلائے
پرجا دان نہ دے گر تجھ کو
بول کہاں سے کھائے ؟
راجا ——— !
کیوں تو نے مان بڑھایا ؟
راجا ——— !
راجا ——— !
اک بات مجھے بتلا دے
تو مہا بلی کہلائے
پرجا ساتھ نہ دے گر تیرا
پھر بل کیسے آئے
راجا ——— !
پرجا تیری پت کہلائے ؟

طالب انصاری

عروسِ سحر

شفق کی رنگین چلمنوں میں سحر کھڑی جھلملا رہی ہے
سنہری رتھ میں سوار ہو کر عروسِ نوخیز آ رہی ہے

فضائیں مدہوشیوں میں گم ہیں درخت مستی میں جھومتے ہیں
برس رہا ہے شفق سے بادہ نسیم بے خود بنا رہی ہے

ہر ایک ذرے کی وسعتوں میں تڑپ رہے ہیں ہزار جلوے
ہر ایک جلوے کی روشنی میں ہر ایک شے جگمگا رہی ہے

چمن کی بھیگی ہوئی فضائیں بہار افزا ہے حسنِ سنبل
عروسِ فطرت نہا کے گویا ہوائیں گیسو سکھا رہی ہے

روش روش میں نشاط افزا، چمن چمن ہے بہار ساماں
ہر ایک غنچہ مہک رہا ہے، ہر اک کلی مسکرا رہی ہے

ہوائیں بدلیں، حجاب اُٹھے، درخت چونکے، شباب جاگے
تمام نور آفریں مناظر پہ زندگانی سی چھا رہی ہے

چمن کے غنچے کھلا رہی ہے روش روش پہ ہوا چمن کی
گلوں کی خوشبو ہوائیں مل کر دلوں کے غنچے کھلا رہی ہے

گلوں میں رنگت بڑھا رہی ہے، سنہری کرنوں کی نقش کاری
زمرّدی پتیوں پہ شبنم دمکتی چاندی چڑھا رہی ہے

دماغ پرور ہے نکہتِ گل، بہار ساماں ہے شاخ گلگیں
یہ مشک و عنبر بکھیرتی ہے وہ لعل و گوہر لٹا رہی ہے

سحر سرور نظر بڑھاتی، جہاں کی رنگینیاں جگاتی
افق کے دامن سے مسکراتی یہ آ رہی ہے وہ آ رہی ہے

پپیہے کی "پی کہاں" کے نالے فضا کے سینے میں تیرتے ہیں
پرندِ فانی کو اُس کی آواز غیر فانی بنا رہی ہے

بہت سے مخمور پھول ہیں جن کو نیند کے آ رہے ہیں جھونکے
صبا گلستاں میں اُن کا دامن پکڑ پکڑ کر جگا رہی ہے

ہزاروں غنچے چٹک چٹک کر گلوں کے قالب میں ڈھل چکے ہیں
جو کوئی غنچہ ہے ناشگفتہ صبا اُسے گدگدا رہی ہے

ہزاروں نیرنگیاں افق سے لئے ہوئے آفتاب اُٹھا
اُٹھایا فطرت نے شب کا پردہ رخِ سحر سے نقاب اُٹھا

راج بلدیو راج

وطن کے تعلیم یافتہ نوجوانوں سے

اے وطن کے نوجوانو! باغ ہستی کے گلو
اے مہکتی بند کلیو! اے چہکتے بلبلو

درسگاہوں سے سند لے کے تم آئے تو ہو
دل میں لاکھوں جگمگاتی حسرتیں لائے تو ہو

علم کہتے ہی نہیں الفاظ کی پہچان کو
- علم وہ ہے جو بتائے زلیست کے عرفان کو

ایٹلس سیاح کی عظمت کو کھو سکتی نہیں
کاغذوں سے ماہیت معلوم ہو سکتی نہیں

علم انسانوں کی خدمت کے سوا کچھ بھی نہیں -
عقل کا جوہر اخوّت کے سوا کچھ بھی نہیں

روزمرّہ زندگی میں ہم کو آتا ہے نظر
جس کو کہتے ہیں شرِ کبیر ہے محتاج بشر

فاقہ کش جھکتے ہیں جا کر منعموں کے رُوبرو
منعموں کی حاکموں کے ہاتھ میں ہے آبرو

اور حکومت جنگ کے شعلوں سے گھبرائی ہوئی
شمعِ نخوت آندھیوں کی زد پہ تھرائی ہوئی

صاف بازارِ جہاں کا راستہ ملتا نہیں
بھیڑ انسانوں کی اتنی ہے خدا ملتا نہیں

وہ خدا دونوں جہاں میں جس کا برتر ہے وجود
حکم سے اُس کے نہیں ہوتا بلاؤں کا وُرود

باپ کوئی اپنے بیٹوں کو ستا سکتا نہیں
یہ شواہد کیا تصوّر میں بھی آ سکتا نہیں

یہ جہالت کے سبب سے ملک پر ادبار ہے
آدمی ہی آدمی کے درپئے آزار ہے

زینتِ عالم ہے انسانوں کی محنت کا ظہور
یہ حرم، یہ دیر۔ یہ آتشکدہ۔ یہ بامِ طور

یہ چمن یہ کھیت یہ ایوان یہ سڑکیں یہ پل
یہ مشینوں کی گمج۔ یہ مضطرب لوہے کا غل

یہ ہوائی گاڑیاں یہ مسکراتے باد باز
یہ سمندر کے جگر پر تیرنے والے جہاز

واہ رے معصوم انسانوں کی عقلِ کارگر
اڑتی پھرتی ہیں زمینیں ہی زمینیں چرخ پر

ہے ہوس انسان کی مضطرِ حکومت کے لئے
آدمی جیسے نہیں آیا محبت کے لئے

وقت ہے اب اس طرح روشن کرو بزمِ خیال
جس سے دیکھو اپنی آنکھوں آدمیت کا کمال

علم تعمیرِ غلامی کے لئے ہرگز نہیں
علم تحقیرِ دوامی کے لئے ہرگز نہیں

علم سے کھلتا ہے دل میں عشق و آزادی کا باب
عشق و آزادی کے بل پر زندگی ہے کامیاب

آج کا جو کام ہے چھوڑو نہ کل کے واسطے
یاد رکھو علم ہوتا ہے عمل کے واسطے

شمس العلماء مولینا تاجور

عالم موجودات کے دو سربستہ راز

خدا اور عورت

(۱)

خدا۔ خدا کیا ہے؟ کون ہے؟ کیوں ہے؟ کیسا ہے؟ کب سے ہے؟ کیا کام کرتا ہے؟ کیا نہیں کرتا؟ کہاں ہے کہاں نہیں؟ ہے بھی یا نہیں؟

یہ اور اسی قسم کے سوالات انسان کے دماغ میں اُس وقت سے خطور کر رہے ہیں۔ جب سے انسان عقل و ہوش پا کر اشرف المخلوقات کہلانے کا مستحق بنا ہے۔

وہ خدا کے متعلق سوچتا ہے۔ برابر سوچتا رہتا ہے۔ سوچتے سوچتے تھک جاتا ہے۔ اور پھر کچھ سوچنے لگتا ہے۔ یہاں تک کہ سوچنے سمجھنے کے لایق نہیں رہتا۔ مگر ہزاروں سال کے سوچ بچار کا نتیجہ یہ ہے کہ خدا کل بھی ایک راز تھا آج بھی راز ہے۔ اور آنے والا کل بھی ہمارے آج اور گذشتہ کل کی طرح اس راز سے بے خبر خرام نظر آتا ہے۔

عقل کے دیوانوں نے جنہیں دنیا فلاسفر کا نام دیتی ہے۔ اٹکل کے تیر بہت چلائے، مگر سب تیر خطا گئے، ایک تیر بھی نشانے پر نہ بیٹھا۔ اب مناسب تو یہ تھا کہ جو چیز سمجھ میں نہیں آتی یا سمجھ کی پہنچ سے باہر ہے۔ اُس کی چھان بین سے باز آجاتے اور اپنے فہم کی نارسائی کا اعتراف کر لیتے۔ مگر نہیں ایسا نہیں ہوا۔ عقل بدستور اس راہ تلاش میں گم ہے۔ اور رہ نورد فلسفہ منزل کے تمام راستوں کو طے کر کے بھی محروم منزل ہی نظر آتا ہے۔

دہریئے۔ عقل زدہ جماعت میں سے کچھ ہمت ہار تو یہ کہہ کر زحمت تلاش سے دست بردار ہو گئے۔ کہ

"خدا وُدا کچھ نہیں، کہیں نہیں، کوئی نہیں، کوئی ہوتا تو نہیں ملتا۔ ملتا تو اُسے سمجھتے اور آپ سمجھ کر دوسروں کو سمجھاتے۔ مگر جب وہ سرے سے موجود ہی نہیں تو ملے کیسے؟ اور کیونکر ملے؟ اور نہ ملے اُسے سمجھنے سمجھانے کی ضرورت ہی کیا ہے؟"

سیاسی فلاسفر۔ ہوش باختہ سوشلسٹوں نے خدا کے نام پر سیاسی کھیل کھیلنے شروع کر دیئے کہ

"خدا اور مذہب' دوزخ اور جنت' یہ سب سرمایہ داری نظام کے ڈھکوسلے ہیں۔ جاہل اور بے مایہ عوام کو ڈرانے دھمکانے کے لئے یہ ہوّے تراشے گئے تھے، خدا کی رضا اور جنت کے سبز باغ دکھا دکھا کر ننگے بھوکوں کو دنیوی مصائب پر صبر و شکر کرنے کی تلقین کی گئی۔ اور اس کامیاب عیاری کے طفیل عیش پرست سرمایہ داروں نے دنیا کے فاقہ مست طبقات کی گاڑھی کمائی سے ہاتھ رنگنے کی راہیں پیدا کیں۔ بس یہی ہے خدا کی حقیقت"

اس کھیل میں بازی خدا کے ہاتھ رہی۔ سوشلسٹ ہارے اور بری طرح ہارے۔ آپ جانئے خدا سب کچھ برداشت کر سکتا ہے

مضامین

مگر اپنے حریف کھلاڑیوں کو کسی صورت برداشت نہیں کرتا۔ چنانچہ اس سیاسی کھیل کا نتیجہ آپ دیکھ رہے ہیں۔ خدا ایسے ہر شکست کے لنگوٹی بندھا رکھی ہے۔ سوویٹ روس کے قیام سے آپ دھوکا نہ کھائیے۔ وہاں سے سرمایہ دار اجڑے۔ یہ صحیح مگر لنگوٹ بندھوں کے بھی ہاتھ پلے کچھ نہ لگا پہلے سرمایہ داروں کے غلام تھے۔ سرمایہ در مایہ نہ سہی پیٹ کو روٹی اور تن ڈھانکنے کو کپڑا تو میسر تھا۔ اور اب خدا کو ہاتھ سے کھو کر جا بجا سیاستوں کی خدائی میں مویشیوں کی سی زندگی بسر کر رہے ہیں۔

اشراقی فلاسفر ۔ افلاطون الہی اور اُس کے لگے بندھوں نے اشراقیات کے اندھیرے میں بہت کچھ ہاتھ ٹوئیے مارے مگر ان کے ہاتھ بھی کچھ نہ آیا۔ نادان روشنی کو تاریکی میں ڈھونڈھنے نکلے تھے۔ آتا سمجھ سکتے کہ روشنی وہاں ہوتی تو اندھیرا ہی کیوں ہوتا۔ خفغ آگے بڑھے خدا کی منزل عقبی جانب کو زقند بھرتی رہی۔ مگر ڈھٹائی ملاحظہ ہو کہ خود تو دامن جھاڑ کر خالی ہاتھ ہلاتے لوٹے۔ لیکن دوسروں کو خدا کے ٹھہراو رہنے کا پتہ اس انداز میں بتاتے ہیں جیسے ابھی ابھی اُس سے ملکر چلے آرہے ہیں۔

لا ادریہ ۔ اس سلسلے میں لا ادریہ فلاسفروں کی دیانتداری قابل صد تحسین و آفرین ہے کہ یہ نیک لوگ اپنی تگ و دو میں ناکام ہوئے تو دوسروں کی طرح چڑ نہیں گئے۔ بلکہ نہایت معصومانہ طریقے پر اپنی نارسی کا یہ کہہ کر اعتراف کر لیا کہ "لا ادری" ہم کچھ بھی نہیں جانتے۔

وحدۃ الوجودی ۔ وحدۃ الوجود کے نظر بازوں پر جو وجدانی قسم کے دورے پڑے لگے بہکی بہکی باتیں کرنے۔ ان کے گیت ذوق سماعت کو تو ساز گار رہیں۔ مگر ادراک و ہوش کے لئے گراں بار ہوش ثابت ہوئے۔ آپ کچھ مذاق شعری اور ذوق سخن فہمی رکھتے ہوں تو اس بلیغ درس کو سمجھ کر ہمیں بھی سمجھایئے۔ :

ارشاد ہوتا ہے کہ :۔

"اس بلے چوڑے عالم موجودات میں ایک واجب الوجود کی ذات کے سوا کوئی نہیں۔ کچھ نہیں۔ وہی سب کچھ ہے۔ کائنات کے ذرّے ذرّے میں حسین ازل جلوہ کار ہے۔"

"پھولوں کی ہنسی، کلیوں کی مسکراہٹ، آبشاروں کا ترنم اور دریاں کی مست خرامی۔ ان آئینوں میں حسن آئینہ ساز ہی جلوہ نما ہے۔ کوئل کی "کوکو"، فاختہ کی "حق سرّہٗ"، طوطے کی "نبی جی بھیجو" چڑیوں کی چوں چوں اور کبوتروں کی غٹرغوں۔ ان سب پردوں سے اُسی موسیقار ازل کے نغمے بلند ہیں۔"

"توپوں کی دمادم، عمارتوں کی دھم دھڑام۔ طیاروں کے زناٹے اور بم باروں کے فراٹے۔ سب اُسی کے جلال عظمت کے گیت گاتے ہیں۔"

وحدۃ الوجودیوں کی شاعرانہ موشگافیاں عقل اور فلسفے دونوں کو پیچھے چھوڑ گئیں۔ اب اُن کے تخلیقی مشاہدات کو جو آنکھیں نہیں دیکھتیں تو روحانی موتیا بند میں مبتلا ہیں۔ فلسفہ ان کی تصدیق نہیں کرتا تو پاگل خانے کی ہوا کھائے۔

ان نیم شاعر نیم فلاسفر بزرگوں نے تو خدا کا اتا پتہ سب کچھ بتا دیا ہے۔ عقل کے پرستار اُسے نہیں پاتے تو اُن کی سمجھ بوجھ کی بے مائیگی اس نارسائی کی ذمہ دار ہے۔ وحدۃ الوجودی فلاسفر دوسروں کو نشانِ منزل بتا کر خود محروم منزل ہو گئے ؎

دادیم ترا از گنج مقصود نشاں — گر ما نرسیدیم تو شاید برسی

ویدانتی ۔ ویدانتی مہاتماؤں نے سوچا کہ ہمارے حریف وحدۃ الوجودی کہنے کی باتیں تو سب کچھ کہہ گئے۔ ہمارے لئے کچھ کہنے کو چھوڑا ہی نہیں۔ اب چپ سادھ لینا تو کوئی بہادری نہیں، کچھ نہ کچھ کہنا ضروری ہے۔ لاؤ پھر ایک ان کہنی کہہ کر فلاسفی کے پانچوں سواروں میں اپنا نام ہم بھی درج کرا دیں۔ چنانچہ یہ بھی دُور کی کوڑی لائے۔ ارشاد ہوتا ہے کہ :۔

"ہمارے سوا سب فلاسفر پاگل ہیں۔ بے عقل کہیں کے خدا کی تلاش میں نکلے تھے۔ خدا تو کیا ملتا۔ اپنے آپ کو بھی کھو بیٹھے۔ دیوانے اتنا بھی نہ سمجھ سکے کہ چہرے کے چراغ اس تاریکی پر کچھ روشنی نہیں ڈال سکتے۔

بھیے مانسو! پہلے آنکھوں کے پٹ بند کرو۔ پھر من کے پٹ کھلیں گے۔ من کے پٹ کھلے تو سب کچھ کھل جائیگا۔

خدا کی تلاش میں سرگردانی تمہیں خدا تک تو کیا پہنچائے گی۔ ہاں پاگل خانے تک ضرور پہنچا دے گی۔

"خدا کی تلاش!! پناہ بخدا کیسی غلامانہ ذہنیت ہے!! بندگی کے طلبگارو! بندگی اختیار کرنا کوئی سمجھ کا کام نہیں۔ اسے بندہ تو وہ ہے جو خدا بننے کی اہلیت نہ رکھتا ہو۔ وحدۃ الوجودیوں کے بے سُرے گیت نہ سنو۔ انہوں نے اپنے آپ کو خدا سے بندہ بنا دیا۔ اس ہستی کا کچھ ٹھکانا ہے کہ تمام عالمِ موجودات کو اصنامِ خیالی بتلاتے ہیں۔ اپنے وجود کو عارضی اور اپنی ہستی کو فانی تصور کرتے ہیں۔ بھلا جو خود شناس نہ بن سکے وہ خدا شناس کیونکر بن سکتے ہیں۔ خدا کی تلاش کرنیوالو پہلے اپنی تلاش تو کرو تم کہاں ہو۔ کیسا ہو؟ کون بتائے کہ جہانِ ہستی میں خدا ہی خدا ہے۔ خدا کے ماسوا کچھ نہیں۔ خدا ہم سے جدا نہیں۔ ہم بھی خدا تم بھی خدا، خدا بھی خدا نا خدا بھی خدا۔ جو اُسے مانتا ہے وہ بھی خدا جو نہیں مانتا وہ بھی خدا۔ مختصر یہ کہ خدا کے سوا کچھ نہیں۔ اور اگر کچھ ہے تو وہ بھی خدا ہے۔"

ان بڑبولوں کی مجذوبانہ بڑ نے ساری کائنات کو خدا بنا کر قصہ ہی ختم کر دیا۔ اب یہ فلاسفی ہے یا دیوانگی؟ اس کا فیصلہ آپ کیجئے! عجیب معجزہ ہے کہ خدا اپنے متعلق فلسفہ بگھارنے والوں کو سمجھ بوجھ کے بوجھ سے پہلے ہلکا کر دیتا ہے۔ پاگل خانے جا کر اس معجزے کی فراوانی کا اندازہ کیجئے۔ آپ کو پہلی ہی نظر میں معلوم ہو جائیگا کہ ہر صوبے کا پاگل خانہ اس خدا برادری کا سب سے بڑا گڑھ ہے۔ آپ دن رات دیکھتے ہیں کہ سوسائٹی میں جب کبھی پر خدا بننے کا دورہ پڑتا ہے تو پولیس کے فلاسفر حفظِ امن کا بہانہ کر کے اُس کی بارگاہ میں سب سے پہلے حاضر ہو جاتے ہیں۔ اور پہلی فرصت میں سول سرجن سے اس کی خدائی کا سرٹیفکیٹ لیکر اُسے پا بہ دستِ دگرے خدا برادری میں پہنچا دیتے ہیں۔

فلسفی شعراء۔ شاعر جب تک اپنے حدود میں رہتا ہے شاعر اور انسان دونوں حیثیتوں کا مالک بنا رہتا ہے۔ لیکن جہاں اُس نے فلسفہ الٰہیات میں قدم رکھا شاعر رہتا ہے نہ انسان کچھ اور ہی بن جاتا ہے۔ کسی شاعر پر فلسفہ طاری ہونے لگے تو سمجھ لیجئے اُس کے بُرے دن آگئے۔ یوں تو یہ فلسفہ الٰہیات سبھی کو چرخ پر چڑھا دیتا ہے۔ لیکن شاعر اس بیماری میں مبتلا ہو جائے تو اس حادثے کا اثر سب سے زیادہ اُس کے دماغ پر پڑتا ہے۔

خدا نگاری کے سلسلے میں بھی شعراء کی فلسفیانہ موشگافیوں کو ان کے نتائجِ افکار نہیں بلکہ عواقبِ جنوں کہہ سکتے ہیں۔ ملاحظہ ہو۔

ذہن میں جو گھر گیا لاانتہا کیونکر ہوا
جو سمجھ میں آگیا پھر وہ خدا کیونکر ہوا

کون کہہ سکتا ہے کہ یہ فلسفہ دماغ سے کچھ دور کا بھی تعلق رکھتا ہے۔ شعر کا مطلب یہ ہے۔ کہ خدا چونکہ سمجھ میں نہیں آتا اسلئے وہ خدا ہے۔ ان بزرگوار سے کوئی پوچھتا کہ خدا سمجھ میں آسکتا ہے یا نہیں۔ یہ تو فرمائیے خود آپ بھی اپنی سمجھ میں آگئے ہیں؟ اور اگر آپ ہی اب تک اپنی سمجھ سے باہر زندگی بسر کر رہے ہیں تو آپ کی فلسفیانہ دلیل تو خدا سے پہلے آپ کی خدائی کا اعلان کر رہی ہے۔ کیا معقول دلیل ہے کہ جو کچھ سمجھ میں نہ آئے سمجھ لو کہ وہ خدا ہے۔

فلسفیانہ شاعری کی دوسری مثال

نہ تھا کچھ تو خدا تھا، کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا   ڈبویا مجھ کو ہونے نے نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا

ایک ہی شعر میں دو دُم بُریدہ دعوے اور ایک اور دو جملے شرطیہ ہو تشبیہ۔ دُم بریدہ اس لئے کہ تینوں دعوے بلا دلیل ہیں یا شاید اپنے قاری کو یہ جتانا مقصود ہے کہ ہم فلاسفری کے اُس رتبۂ بلند پر پہنچ گئے ہیں۔ جہاں پہنچکر ہر دعوے الہام اور اسلئے بے نیاز دلیل بن جایا کرتا ہے۔

پہلا دعوے "نہ تھا کچھ تو خدا تھا"

دو نہائی یونانی فلاسفہ کا ابناز تو اس ماضی سے باصرار منکر ہے جب خدا تھا اور کچھ نہ تھا۔ مگر شاعر کی بلا سے وہ تو اس انداز سے کہہ رہا ہے جیسے یہ اُس وقت خدا کی تنہائی دیکتائی کا تماشا کھڑا دیکھ رہا تھا۔ اب کس کی ہمت ہے کہ اس کے ازلی مشاہدات پر حرف گیری یا اس دعوے پر دلیل کا مطالبہ کرے؟

"کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا"

یہ دوسرا دعوے بھی اسی انداز کا ہے کہ

" وہ کہیں اور سنا کرے کوئی "

ایک غلط شرط پر جزاء کو معلق کر دیا گیا ہے۔ کوئی پوچھے کہ اس "کچھ" میں خدا کی صفات بھی داخل ہیں؟ یا نہیں؟ اگر داخل ہیں تو خدائے بے صفات کو خدا کہنا ہی صحیح نہ ہوگا۔ اور اگر اس "کچھ" سے خدا اور اُس کے صفات خارج ہیں۔ تو خدا کا صفاتی فیضان اس شرط کو مہمل بنا دیتا ہے۔

"ڈبویا مجھ کو ہونے نے" کیا ڈبویا کہاں ڈبویا؟ جمنا تو کانو پر ہاتھ رکھتی ہے۔ وہی مثل کہ "بے مارے کی توبہ" عمر بھر میاں نے گلچھرے اڑائے۔ جب تک جیے رام رنگی کے جلووں میں سرشار رہے، "شامی کباب اور شیرمال" مرتے دم تک وقتِ ناشتہ بنے رہے۔ پھر کہتے ہیں ہمیں ہونے نے ڈبویا۔ سارے فلاسفر تو عدم پر وجود کو ترجیح دیتے چلے آئے ہیں یہ نئے فلسفی فیضان وجود کو سزائے زندگی تصور کر رہے ہیں"۔

"نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا" کچھ بھی نہ ہوتا۔ نئی دلّی اسی شان سے آباد ہوتی، چاندنی چوک کی چہل پہل میں شمہ بھر کمی نہ آتی۔ ہاں اتنا ضرور ہوتا کہ ہندوستان کو آزادی حاصل کئے ہوئے آج اس دسمبر کے خاتمے پر ۸۲ برس گذر گئے ہوتے۔ اور دلّی آج برطانوی وائسرائے کی بجائے صدر جمہوریہ ہند کی راجدھانی کہلاتی۔

"نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا" پہلے فرما چکے ہیں کہ جب کچھ نہ تھا تو خدا تھا۔ اور اگر کچھ بھی نہ ہوتا تو خدا ہی خدا ہوتا۔ "کیا ہوتا" سے یہ فرمانا چاہتے ہیں کہ غالبؔ انسان نہ بنا ہوتا تو خدائی منصب پر سرفرازی حاصل کرتا۔ سمجھو خیریت ہی گذری کہ یہ بزرگ انسان کی جون میں گرفتار ہو گئے ورنہ کہیں یہ مبارک حادثہ وقوع پذیر نہ ہوا ہوتا۔ تو آپ کے خدائی کارناموں سے خدا جانے کیا کیا حشر برپا ہو جاتا۔ سب سے پہلے تو مرزا قتیلؔ کی قبر پر ہل چلوا دیا ہوتا۔ پھر قتیلؔ کے نام لینے والوں کا بچہ بچہ کولہو میں پلوا دیتے۔ دلّی اور دو ایک ریاستوں کو چھوڑ کر سارے آباد ملک کو زیرِ زمین اتار دیتے۔

یہ ہیں ہمارے فلسفی شاعروں کے الہیاتی نظریات، یہ بزرگ اپنے دل کی سراسیمگی کو دماغی زبان میں بیان کر کے الہامی نظریہ بنا ڈالتے ہیں پھر دوسروں سے مطالبہ کرتے ہیں۔ کہ اس بےچون و چرا ایمان لے آؤ! بھلا جن خود ناشناسوں کو اپنے ہی حدود اربعہ کا پتہ نہ ہو۔ وہ خدا کی کنہ حقیقت کیا بتا سکتے ہیں۔؟

مختصر یہ کہ فلسفہ اور شاعری ویدانت اور وحدۃ الوجود کے تمام راستے منزلِ حیرت پر ختم ہو جاتے ہیں۔ یہاں پہنچکر راہِ خدا کا مسافر حواس ظاہری و باطنی کے بوجھ کو سر سے اتار کر پھینک دیتا ہے۔ جن مدہم چراغوں کی روشنی میں وہ اس راہ بے منزل کو طے کرتا ہے۔ وہ راستے

کے جھٹکے جھولوں میں ایک ایک کرکے گل ہو جاتے ہیں۔

حیرت کے اس دوراہے پر اُس کی دستگیری کے لئے مذہب آگے بڑھتا ہے۔

مذہب ہی اُس کے سوال کا صحیح جواب دیکر اُسے منزل رساں رستے پر ڈال دیتا ہے۔

مذہب کہتا ہے کہ

مذہب - خدا موجود ہے اور یہ ساری کائنات اُس کے لفظ "کُن" کا کارنامہ ہے۔ وہ ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا۔ ہم نے اسے دیکھا ہے۔ اور زندہ رہ گئے تو قیامت میں تمہیں دکھا دیں گے۔ قیامت کچھ ایسی دور نہیں آج نہیں تو کل آئیگی۔ کل نہ آئی تو کل کے بعد آئیگی۔ اسکی آمد گزشتہ کل کی رفت و گزشت کی طرح یقینی ہے۔ دُنیا بامید قائم۔ امروزِ زندگی سے فردائے قیامت کچھ دور نہیں۔ شبِ زندگی تاریک سہی مگر دراز نہیں یہ گزری اور اُس فردا کی صبح نمودار ہوئی۔

ہم تو اس تاریکی میں بھی اُس روشنی کی تجلیاں دکھا دیتے مگر حضرت موسےٰ کے حادثۂ دیدار سے ہمیں کان ہو گئے۔ بس اُس کا نام رٹتے رہو اور اُس صبحِ سعادت کے منتظر بیٹھے رہو۔ مبٹھنا کیا معنی خدا سے لو لگائے ہوئے منزل لامکاں کی طرف ناک کی سیدھ بڑھے چلو مگر واضح رہے کہ راہِ منزل کے مہیب نشیب و فراز ہمت آزما ہیں۔

"اُس میں دو چار بہت سخت مقام آتے ہیں"

راہِ خدا کی پہلی ہی منزل جس پر راہِ زندگی ختم ہو جاتی ہے۔ محصول راہداری میں نقدِ جاں کی طلبگار ہوتی ہے یعنی مسافر کو وہاں پہنچکر زمین پہ چلنے کی بجائے زمین میں چلنا پڑتا ہے۔ یہ دفعۂ زندگی "کٹھن" ضرور ہے مگر بہرحال پیش آمدنی اور گزاشتنی ہے۔ مگر یہ بھی کیا ہے۔ کچھ نہیں۔ مرنے سے ڈرنا کیا؟

"بر سرِ فرزندِ آدم ہرچہ آید بگزرد"

جس زمین نے تمہیں زندگی بھر اپنے سر پر بٹھایا وہ اگر جوشِ محبت میں کبھی کلیجے سے بھی لگا لے تو جھجک کیسی اور مضائقہ کیا ہے۔؟ آخر تمہارے باوا آدم مٹی ہی سے بنے تھے اور ماما حوا کا خمیر بھی کوئی سونے چاندی کا نہ تھا۔ پھر جب تمہارے ددھیال اور ننھیال دونوں ہی خاک نژاد ہیں تو رات بھر کے لئے مٹی کو اوڑھنا بچھونا بنا لینا کونسا مشکل کام ہے؟ مختصر یہ کہ یہ منزل کچھ کٹھن ہے مگر دشوار نہیں۔ پھر یہ بھی تو ہے کہ کوئی راہِ خدا اختیار کرے یا راہِ شیطان یا دونوں راہوں سے منہ موڑ کر کسی تیسرے رستے پر پڑ جائے۔ یہ منزل سب کیلئے نوشتۂ تقدیر ہے۔ کوئی اس سے ڈر کر بھاگے تو یہ اُسکے پیچھے دوڑتی ہے۔ کیسا ہی بھگوڑا ہو آخر کہاں تک بھاگے گا۔ کب تک بھاگ سکے گا۔ جہاں دم پھولا وہیں یہ منزل موجود جب اس سے گریز نہیں کسی صورت مفر نہیں تو بس شرافت اسی میں ہے کہ جی کڑا کرکے "رضینا بالقضا" کہکر آرام سے لیٰسین شریف سننا گوارا کرلے۔ حاصل یہ کہ اِس زندگی کا ہر راستہ ہر سفر اور ہر دوڑ اسی منزل پر ختم ہو جاتی ہے۔ "مرگِ انبوہ جشنے دارد" تم مُردوں اور قبروں سے ڈرا کرتے ہو۔ اس لئے شائد تمہیں تمہارے تصورات ڈرائیں۔ مگر ڈرنے کی مطلق ضرورت نہیں۔ موٹی سی بات ہے کہ مُردوں سے زندے ڈرا کرتے ہیں۔ بھلا مُردوں کو قبریں اور مردے کیا ڈرائیں گے؟ وہی کہاوت کہ "ایک بلا دوسری کو کرے باؤ"

ہاں تو ہر رستے کی طرح خدا کے راستے کی پہلی منزل شبِ زندگی کا قرینہ کہلاتی ہے۔ مگر یہ منزل اتنی کٹھن نہیں جتنی انوکھی ہے۔ انوکھی اس لئے کہ بظاہر منزل نظر آتی ہے۔ لیکن در اصل منزل راہ نہیں، بلکہ راہ منزل ہے بات یہ ہے کہ راہِ زندگی کے نشیب و فراز طے کرتے کرتے راہروی جسم آگے بڑھنے سے انکار کر دیتا ہے تو روح اس بوجھ کو منزل پر پھینک کے بنا سفر دم لئے بغیر جاری رکھتی ہے۔ چونکہ جسم کا کھلونا مٹی ہی سے بنا تھا ٹوٹ پھوٹ کر مٹی ہی میں مل جاتا ہے۔ نادان یہ سمجھتے ہیں کہ مردہ قبر سے غائب ہو گیا۔ مگر یہ غلط ہے۔ مردہ غائب وائب کچھ نہیں ہوتا بھلا

مرنے قبروں سے غائب ہونے لگیں تو قیامت ہی نہ آجائے۔ دوسری منزل ہے "پُل صراط" البتہ کٹھن بھی ہے اور دشوار بھی جن عاقبت اندیش مسافروں نے آغازِ سفر میں نہ سہی دورانِ سفر میں پاسپورٹ لیتے ہوئے دبائی گناہوں کے ٹیکے لگوا لئے ہیں وہ تو اس جاں فرسا مرحلے کو بھی پلک مارتے عبور کر لیتے ہیں لیکن جوان گھرڈاکٹری کرلئے بغیر یہ سفر اختیار کر لیتے ہیں ان کے لئے البتہ یہ سفر نمونہ سقر بن جاتا ہے اول تو پہلے ہی قرنطینہ میں پرانے بیٹوں کے ہاتھوں ان کی اور ہالنگ شروع ہو جاتی ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ زیرِ تجویز قیدی اگر اے کلاس کے لیڈر یا سیاسی شطرنج کے ہارے ہوئے نہ ہوں تو پولیس کے رحمدل سپاہی انہیں جیل پہنچانے سے پہلے ہی جیل کی مصیبتیں جھیلنے کے قابل بنا دیتے ہیں۔ یہی کچھ وہاں بھی ہوتا ہے۔ پہلی منزل میں قدم رکھتے ہی منکر نکیر نامی دو افسرانِ تفتیش آدھمکتے ہیں اور سلام دعا کے بغیر ہی۔

کون ہو۔ ؟

کیا کرتے ہو ؟

کیا کچھ کر آئے ہو ؟

کی قسم کے سوالات کئے اور دھمک دھوا شروع کر دی۔ پٹنے والا ہزار چیخے چلائے روئے گڑگڑائے وہ خدا کے بندے کانوں سے بہرے ہیں کسی کی چیخ پکار کیا سنیں ؛ دیدوں کے پٹ کچھ دکھیں تو سمجھیں کہ ہم زبان کے گونگے کیا کچھ کر رہے ہیں ؛ پٹنے والے جان ہار کو تسلی دلاسا بھی نہیں دے سکتے۔ سو تدبیر نہ تقدیر دونوں میں سے کوئی بھی اس ستم ظریفی کا ذمہ دار نہیں۔ پٹنے والا دوسری منزل تک اسی طرح شان سے پٹتا رہے گا۔ اور پیٹنے والے اشرول کے بغیر اسی طرح اپنی ڈیوٹی بجا لاتے رہیں گے۔

"کردنی خویش آمدنی پیش" کا معاملہ ہے۔ جو کریگا وہ بھریگا۔ مولوی ملانے آئے دن اسی دن سے تو ڈرایا کرتے تھے۔ جو اُس وقت نہیں ڈرا وہ اب بھرے۔ چیختا چلاتا بیکار ہے۔ یہ روحانی ویکسینیٹر تو ڈھکی چھپی ہوئی ان ہونی ساری ہی بیماریوں کے ٹیکے لگائیں گے۔ سر سے پاؤں تک سارے جسم کو چھپک (وہ چہرہ بنائیں گے پھر بھی کچھ کچا اندر رہ گیا تو اگلی منزل ہے پل صراط، پل صراط کے نیچے جو دریا بہ رہا ہے اُس میں غسلِ صحت کرنے سے جسم کے ساتھ روح کی کثافتیں بھی دور ہو جائیں گی پل صراط سے بخیریت گزر گئے تو تیسری منزل ہے منزلِ مراد۔ اسی منزل کا دوسرا نام ہے بہشت۔ اور جو اس منزل پر پہنچ جائے وہ بہشتی کہلاتا ہے۔ بہشت میں دودھ شہد کی نہریں بہتی ہیں مشکیں بھر دیا پیٹ میں، کوئی روک ٹوک نہیں۔ کھانے کو رنگ برنگ میوے رہنے کو موتی محل، اور بات چیت کو حوروں کی ڈاریں۔ اور غلمانوں کی قطاریں۔ ایک کو بلاؤ تو ستر دوڑے آئیں ان حسین ورنگین تماشوں کے ساتھ کبھی کبھی جلوہ کارِ کائنات یعنی مبدا حسن و نور کی کوئی کرن حیرت تمام۔ نظارہ بنکر تمہیں اس سوال کا بھی صحیح اور ناطق جواب دیدے گی کہ

"خدا کیا ہے، کون ہے، کیسا ہے، کہاں ہے ؟"

مذہب کا دونوں جہان بھلا ہو۔ دیکھئے کہنے کی باتیں سب کہہ گیا۔ خدا رسی کی مشکلات اور خدا رسانی کی تدبیریں بھی ایک ایک کر کے گنوا گیا۔ اب جس میں حوصلہ ہو

"توکلت علی اللہ تعالیٰ"

کہہ کر اس خار زارِ عشق میں قدم رکھے۔ "ہمتِ مرداں مددِ خدا" ایک نہ ایک دن منزل پر پہنچ ہی جائیگا۔

کیا فرض ہے کہ سب کو ملے ایک سا جواب
آؤ نہ ہم بھی سیر کریں کوہِ طور کی

مرزا ابو محمد طالب عظیم آبادی

مغرب و مشرق کی مُلاقات

نواب آسمان قدر بہادر، اودھ کے شاہی خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کو پانچ سو پنشن اور چودہ سو روپیہ ماہوار وثیقہ بہو بیگم صاحبہ سے ملا کرتا تھا۔ آدمی خوام رس تھے۔ آج سے پچاس سال قبل حکام جو صوبہ اودھ میں آیا کرتے تھے۔ وہ اردو زبان اچھی طرح بول لیتے تھے اُس وقت کے حکام اُنسے مل کر بہت خوش ہوا کرتے تھے۔ جس کی وجہ زیادہ یہ تھی۔ کہ اودھ کی قدیم تاریخ اُنکے نوک زبان تھی۔ اور اس سے قبل زمانے کے جو حکام آیا کرتے تھے۔ باپ دادا سے سُنے ہوئے اُن کے قصے بھی اُنہوں نے خوب یاد کر لئے تھے۔ اُس زمانے میں انگریزوں کے تسلط کو ابھی تھوڑا ہی زمانہ گزرا تھا۔ اور رئیسوں کو اپنانے کے لئے وہ اکثر دعوتیں کرتے رہتے تھے۔

ایک دن کمشنر صاحب کے یہاں نواب صاحب کی دعوت تھی اور ان کے صاحب زادے انجم قدر کے نام بھی دعوتی کارڈ آیا ہوا تھا۔ انجم قدر انگریزی سیکھنے کے شوق میں انگلستان جا کر تین سال رہ آئے تھے۔ اور سینئر کیمبرج کا امتحان بھی اُنہوں نے پاس کر لیا تھا۔ انجم قدر حسب معمول صبح کو اپنے والد کو سلام کرنے آیا کرتے۔ اور دس منٹ اُن کے پاس بیٹھ کر چلے جایا کرتے تھے۔

نواب آسمان قدر :۔ بیٹے! دیکھو آج شب کو کمشنر صاحب نے رات کے کھانے پر بُلایا ہے۔ اور تمہارے نام بھی کارڈ آیا ہے اس لئے میں تمہارا انتظار ہی کر رہا تھا تم سے کہنا یہ ہے۔ کہ چار سال قبل مجھے یاد آتا ہے۔ تمہاری دو اچکنیں تو لوان بنارسی زر بفت کی میں نے بنوائی تھیں۔ ایک اچکن بارہ سو کی جامہ وار کٹوا کر اور ایک اچکن اک قیمتی خلیل خوانی کی سلوائی تھی۔ میری رائے ہے۔ کہ زربفت کی ایک اچکن نکلوا لو۔ اور طلائی مشروع کا چوڑی دار پاجامہ۔ سر پر میری جوانی کے پہننے کا عالم پسند۔ اور پیر میں زردوزی کی اوڑگی ۔ ۔ یہ شہزادوں کا لباس ہے۔ اور تم پر بہت اچھا سجیگا۔ ساری محفل میں تم ہی تم ہوگے۔ اور اگر چاہو جامہ وار کی اچکن پہن لو۔ یا خلیل خوانی والی اچکن —— جو تم پسند کرو۔

انجم قدر :۔ ابا جان حضور کا فرمانا بجا اور درست ہے۔ لیکن انگلستان کی واپسی کے بعد میں زربفت اور جامہ وار وغیرہ کی اچکن پہننا پسند نہیں کرتا!

نواب جانی (نواب صاحب کے مصاحب خاص) نواب صاحب ٹھیک تو کہتے ہیں۔ کہ شہزادوں کا لباس زری۔ زربفت جامہ وار وغیرہ ہی ہے!

حیدر نواب :۔ (نواب صاحب کے داروغہ توشہ خانہ) شہزادے صاحب ایک سے ایک بڑھ کر کمخواب اور زربفت کی اچکنیں اور چوغے توشہ خانے میں موجود ہیں۔ سرکار کی تجویز بالکل صحیح و درست ہے۔ کہ آپ کو ایسی مؤقر محفل میں شہزادوں کا لباس پہن کر جانا چاہیئے!

انجم قدر :۔ آپ لوگ اپنے اپنے خیال کے مطابق تجویزیں پیش کر رہے ہیں۔ لیکن میرے خیال میں انگریزی لباس میں شریک دعوت ہونا بدرجہا بہتر ہے!

نواب آسمان قدر :۔ اگرچہ تم انگلستان سے ہو آئے ہو۔ اور انگریزی بھی خوب بول لیتے ہو۔ لیکن بحیثیت ایک شہزادہ ہونے کے میری جان، میری رائے پر عمل کرنا ہی مناسب ہوگا۔ انجم قدر! تم میرا کہنا مانو اور اپنے آباو اجداد کے روش پر چلو۔ ورنہ تمہاری اُس محفل میں کوئی عزت نہ ہوگی۔ یہ دُم کٹا لباس نہ تمہارے باپ نے پہنا۔ نہ تمہارے دادا نے اور نہ آجتک تمہارے خاندان کے

کسی بزرگ نے ــــ انسان کو اپنی وضع نہیں چھوڑنا چاہیئے؟

انجم قدر:- آپ جو کچھ فرما رہے ہیں۔ اور جو آپکا نکتہ نظر ہے۔ بالکل اُس اعتبار سے صحیح ارشاد ہو رہا ہے۔ مگر میں آپ کی رائے سے ہرگز اتفاق نہیں کر سکتا۔ اس لئے کہ وہاں تمام انگریز اور لیڈیاں ہونگی۔ وہ مجھ پر ہنسینگے۔ اور مجھے اُن میں اکثر نہایت ہونگے۔ وہ کیا کہیں گے۔ کہ باوجود انگریزی تعلیم پانے کے یہ شخص زری زربفت میں لپٹا ہوا ہم انگریزی تہذیب والوں میں آیا ہوا ہے۔ یہ لباس ابا جان آپ کے لئے زیبا ہیں۔ اب مجھے معاف رکھئے۔ اب میں ان لباس اور اس وضع کو ترک کر چکا ہوں۔ ہاں اگر کہیں پھر شہزادوں کی محفل ہوئی۔ وہاں آپکے حکم کی تعمیل کر دونگا۔

نواب صاحب:- دیکھو انجم قدر! تم سراسر غلطی کر رہے ہو۔ جو ہم رسے اپنے لباس میں عزت ہے۔ وہ انگریزی لباس میں ہرگز نہیں ہے ضد نہ کرو۔ اور میرا کہا مانو!

انجم قدر:- ابا جان۔ میں معاف ہی کیا جاؤں۔ تو بہتر ہے۔ انگریز اور لیڈیاں انگریزی زبان میں میرا مذاق اڑائینگے۔ آپ تو سمجھئے گا نہیں۔ اور میری مٹی پلید ہو جائے گی۔

نواب صاحب:- مجال ہے کسی کی۔ کہ میرے ہوتے ہوئے تمہیں کوئی ذلت کی نگاہ سے دیکھے۔ کیا ہوا سلطنت چلی گئی ہے۔ لیکن انگریزوں کے دلوں پر ہمارا رعب و وقار باقی ہے تم اپنی بالکل ہٹ سے باز آؤ۔ سخن شنیدن۔ دولت بیخ۔ کہا مانو۔ شاباش جاؤ۔ جو میں کہتا ہوں وہ کرو۔

انجم قدر! ابا جان میں دست بستہ عرض کرتا ہوں کہ میں زری کے لباس پہننے کے لئے مجبور نہ کیا جاؤں۔ ورنہ میں دعوت میں جانے سے دست بردار ہو جاؤنگا۔

نواب صاحب:- اچھا صاحبزادے کرو جو تمہارا جی چاہے۔ آپ ذلیل ہونگے۔ میرا کیا جائیگا؟ مجھے کوئی پوچھے گا۔ کہ آپ کا لڑکا انگریز ہو گیا ہے۔ تو میں کہدونگا نا خلف ہے۔ اچھا یہ تو کرو۔ کہ چاہے تم لباس انگریزی ہی پہنو مگر اوپر سے فقط ایک دریائی بنارسی زری کا ایک چوغا ہی پہن لو۔ تاکہ کچھ تو شناخت اس بات کی ہے۔ کہ تم شاہی خاندان سے تعلق رکھتے ہو!

انجم قدر:- آپ کے ہمراہ جانا ہی اس بات کی دلیل ہے۔ کہ میں نواب زادہ، شہزادہ، شاہی خاندان کا فرد ہوں۔

نواب صاحب:- اچھا بھائی جہنم میں جاؤ ــــ جاؤ جو چاہے وہ کرو پر یہ کہے دیتا ہوں۔ کہ ٹھیک سات بجے تیار ہو کر میرے پاس آجانا۔ تاکہ تھوڑا پہلے ہی تم کو لے کر چلا جاؤں۔ اسلئے کہ جگہ دعوت میں اچھی ملجائے۔ اور کمشنر صاحب کو بھی خیال ہوگا۔ کہ یہ اپنا گھر سمجھے۔ جب ہی تو سویرے سے آگئے اور اک بات یہ بھی ہے۔ کہ موقع آیا۔ تو اُن کی طرف سے ذرا مہمانوں کی دیکھ بھال بھی کر دونگا۔ تھوڑا اُن کا ہاتھ ہی بٹا کر اُن کو اپنا ممنونِ احسان بنا دونگا۔

انجم قدر:- ابا جان! انگریزی دعوتوں میں ایک گھنٹہ قبل جانے کا دستور نہیں۔ مہمان ٹھیک وقت پر یعنی آٹھ بجتے ہی سب ایک وقت پہنچ جائینگے۔ جگہ اچھی ملجانے کی آپ فکر نہ کریں۔ عین وقت پہنچیں آپ کو جگہ اچھی ہی ملجائے گی۔ اس لئے کہ مہمانوں کی تعداد معین اور کرسیاں اُسی تعداد کے موافق ہی ہوتی ہیں آپ کی جگہ شہزادوں ہی کے محل پر رکھی گئی ہوگی۔ اور اس پر کوئی اور بغیر آپ کے نہیں بیٹھ سکتا۔ یہ انگریزی دعوتوں کا دستور ہے۔ اب رہا انتظام۔ منتظم دعوت کے خانساماں اور خانساماں کے ماتحت نیچے کام کرنے والے ہی کافی تعداد میں موجود ہونگے مکان پہلے ہی سے زیادہ سجا سجایا ہوگا۔ دعوت کی میزیں پہلے ہی سے آراستہ ہونگی۔ اسلئے ہم کو آپ کو کام میں ہاتھ بٹانے کی ضرورت نہ ہوگی۔ بلکہ وہاں کے کاموں میں ہمارا دخل در معقولات خلافِ تہذیب سمجھا جائیگا۔

نواب صاحب:- انجم قدر! یہ تو تم سراسر غلط کہہ رہے ہو۔ میں جب اور جہاں بھی ایسی دعوتوں میں گیا ہوں۔ آراستگی کے متعلق جو بھی میں نے اپنے مذاق کے موافق رائے دی ہے۔ فوراً میزبان نے اسی کے مطابق عمل کیا۔ ابھی چھ مہینہ بھی نہ گذرے ہونگے۔ کہ میز پر چار مزدنگ رکھنے کی تجویز میں نے کی تھی۔

اور جو ڈپٹی کمشنر جو اُس دعوت کے میزبان تھے۔ اُنہوں نے
قبول کی۔ اُن کے یہاں مزوگیں نہ تھیں۔ میں نے چار عدد
آسمانی رنگ کی مزوگیں اُسی دم منگوا دیں۔ اور وہ میزوں
پر ایسی سجیں۔ کہ جوائنٹ سول صاحب کی میم نے بڑے ہی زور میں
میری تجویز کی تعریف کی۔ اسکو ما نے وہ۔ ڈپٹی کمشنر صاحب
کی دعوت میں میری تجویز پسند کی گئی! وہ یہ کہ میز پر پتے بچھانے
کے بدلے پلیٹوں کے چاروں طرف گیندوں کے پھول لگائے
جائیں۔ اور یہ کہ میٹھی چیزوں میں بالائی کی تہ کا مزعفر ہو۔ اور
وہ بھی میرے باورچی کے ہاتھ کا پکایا ہوا چنانچہ میرے باورچی
کے ہاتھ کا مزعفر سب انگریز مہمانوں نے بڑے شوق سے کھایا
اور بہت تعریفیں کیں۔ تم اب مجھے بالکل پاگل ہی سمجھنے لگے ہو
انجم قدر۔ ابا جان! بجا ارشاد ہوا! انگریزوں کا قاعدہ ہے۔ کہ
اگر ذرا سا شہر میں سے کوئی اُن کے گھریلو کام میں کوئی رائے
دے۔ تو خاطرانہ وہ منظور کر لیتے ہیں۔ اگرچہ وہ دل سے پسند
نہیں کرتے۔ باقی مزعفر کا کھانا اور آپ کا پکوا کے بھیجنا۔
جس انگریز نے کھایا ہوگا۔ اُس کو یقینی دوسرے روز تنقیہ
کی ضرورت ہوئی ہوگی۔ اسلئے کہ ایسی مرغن غذاؤں کے
کھانے کے وہ عادی نہیں۔ اُن کے معدے ہضم نہیں کر سکتے
نواب صاحب:۔ صاحب زادے یہ بھی تم بالکل اور قطعی جھوٹ بول
رہے ہو۔ آج مشکل سے پندرہ روز ہوئے ہونگے۔ کہ میں نے
رکاب دار سے گنگا جمنی تنجن پکوا کر کمشنر صاحب کی میم کو بھجوایا
تھا۔ ہاتھ چاٹ چاٹ کے کھایا ہوگا۔ اِن لوگوں کو یہ نعمتیں نصیب
ہی کہاں۔ شکریہ کا خط ابھی تک میرے پاس رکھا ہوا ہے!
انجم قدر:۔ زیادہ سے زیادہ اُن لوگوں نے ذرا سا چکھ لیا ہوگا۔ باقی
سب خانساماں اور باورچی وغیرہ نے کھا لیا ہوگا۔ آپ کو
حسب قاعدہ معمول شکریہ کا خط لکھ دیا۔
نواب صاحب:۔ جاؤ اپنی ماں سے پوچھو۔ کہ سول سرجن کی میم صاحب
کو اُنہوں نے پان کی گلوری تک کھلا دی۔ اور وہ بہت ہی
خوش خوش مزے مزے سے کھاتی رہی۔ اس کے ہونٹوں میں چاندی
کے ورق جو جا بجا چپک گئے تھے۔ وہ اس نے فقط اس لئے
نہ صاف کئے۔ کہ میں ان اپنے ہونٹوں کو اپنے صاحب کو لے
جا کر دکھاؤں گی۔ شہزادی صاحبہ نے چار گلوریاں سول
سرجن کے لئے بھی بنوا کر بھجوائیں۔ سُنا اُنہوں نے بڑے شوق
سے کھایا۔ اور نہایت ہی اُن کو لطف آیا۔
انجم قدر:۔ وہ سول سرجن ہندوستان کا پیدا ہوا ایک اینگلو انڈین تھا
اور اُس کی میم بھی۔ اُنہوں نے بھی مذاقاً کھا لیا ہوگا۔
نواب صاحب:۔ بھئی ہوگا۔ میں سات بجے ہی جاؤنگا۔ اور تم کو میرے
ساتھ چلنا ہوگا۔ اب میں تمہاری ایک نہ مانونگا۔ جو بات کہتا ہوں
یہ لڑکا اُس کی تردید کرتا ہے۔ دیکھو! انجم قدر تم کو میرا حکم ماننا
پڑیگا۔ ٹھیک سات بجے تیار ہو کر حاضر ہو جاؤ!
انجم قدر:۔ ابا جان بہت خوب حکم کی تعمیل کرونگا۔ پر میں باہر گاڑی
ہی پر بیٹھا رہونگا۔ عین وقت پر جب سب مہمان آ جائینگے۔ میں
بھی حاضر ہو جاؤنگا!
نواب صاحب:۔ اچھا جو چاہے۔ تم جھک مارنا۔ میں آج سے اب
تمہیں کچھ نہ کہونگا۔ پر سات بجے تم حاضر ہو جانا۔
انجم قدر:۔ بہت اچھا کہتے ہوئے چلے گئے!
نواب صاحب نے اِدھر توشک خانہ میں سے ویلر گھوڑوں کی
جوڑی کے چاندی سونے کے ملمع کئے ہوئے ساز و یراق نکلوا کر
صاف کرنے کا حکم دیا۔ اور فرمایا کہ کوچبان کا لباس زردوزی
کا کام کیا ہوا نکلوا کر معائنہ کے لئے حاضر کرو۔ نواب صاحب کے
پاس ایک بلیر وش گاڑی تھی جس پر کھار وے کا غلاف چڑھا
رہتا تھا۔ اور جس میں تمام کاشانی مخمل کے گدیلے اور نشست
کے سامنے ایک جلبی آئینہ سونے کے چوکھٹے میں لگا ہوا جڑا
تھا۔ ایسی بڑی دعوتوں میں جاتے وقت جس پر نواب صاحب
سوار ہوتے نکالی جاتی تھی۔ اُس کو نکلوائے جانے کا حکم دیا گیا
الغرض نواب صاحب ٹھیک ساڑھے چھ لباس پہنکر برآمد
ہوئے۔ پیش خدمت کی طرف دیکھا۔ اُس نے خاصدان سے
دو گلوریاں نواب صاحب کی خدمت میں پیش کیں۔ جسکو اُنہوں

نے دونوں کانوں میں دبا لیا۔ حیدر نواب سے مخاطب ہو کر پوچھا۔ کیوں حیدر نواب سچ سچ بتانا میرا لباس کیسا رہا۔

حیدر نواب:۔ سرکار کیا کہنا ہے۔ اس لباس کا۔ شاہی لباس ہے اور سرکار آپ کا گاڑی گھوڑا تو ایسا ہے۔ کہ اس وقت کے بادشاہوں کو بھی نصیب نہ ہوگا۔ کوچبان ہی کا لباس دو ڈھائی ہزار روپے تیاری کا ہے!

منجھو صاحب:۔ ہائیں اور جوڑی کا ساز و یراق بھول ہی گئے۔ نو ہزار کی تیاری کا ہے۔ نواب صاحب مجھے تو ان دیلا گھوڑوں کی ٹاپوں کی آواز کے ساتھ جب جھانجنوں کی جھنکار ملی جلی نکلتی ہیں۔ تو ایسا معلوم ہوتا۔ کہ گھونگھٹ کے ساتھ ساتھ پری جیدن رقص کناں جارہی ہیں۔ ماشاءاللہ سے یہی تو دس ہزار کی جوڑی۔ سالے کیوں حضور لاٹ صاحب نے آسٹریلیا سے آپ کو منگا دی تھی نا!

نواب صاحب:۔ بھئی منجھو کو خوب بات یاد رہتی ہے میرے مصاحب بھی اس وقت یگانۂ روزگار ہیں۔

منجھو صاحب:۔ سرکار۔ اگر اجازت ہو تو اک بات پوچھوں۔ خفا نہ ہوجیئے گا۔

نواب صاحب:۔ نہیں نہیں پوچھو۔

منجھو صاحب:۔ میں نے کہا۔ سرکار کو میمیں دیکھ کر تو لوٹ پوٹ ہو جایا کرتی ہونگی۔ بھلا انگریزوں میں آپ ایسا سجیلا جوان کہاں ماشاءاللہ میری آنکھ میں خاک۔ سرکار کے یہ گھونگر والے بال اور یہ رسیلی انکھیاں۔

نواب صاحب:۔ اماں کتیاں یوں سے وہ یوں ہو گئیں۔ مگر مجھے تو یہ کرنجیاں پھیکا شلغم۔ بھورے بال والیاں بھوتی آنکھوں نہیں بھاتیں! ارے لو سات بجے کو پانچ منٹ رہ گئے منجھو ذرا بڑھ کے انجم قدر کو آواز دینا۔ ابھی تک وہ آئے نہیں۔ میں نے جھک مارا۔ گرو کھایا۔ جو اس کو انگلستان بھیجا۔ فرنگی ہو گیا ہے فرنگی۔ اب آگے دیکھیئے۔ کیا کیا یہ رنگ لاتے ہیں۔

منجھو صاحب:۔ سرکار آرہے ہیں۔ شہزادہ صاحب

اتنے میں ڈنر سوٹ پہنکر انجم قدر آجاتے ہیں۔ نواب صاحب دیکھتے ہی فرمانے لگے۔ دیکھیئے صاحبان۔ یہ دم کٹا۔ نئے ورلا فیشن۔ اچھا صاحبزادے مجھے بھی دیکھنا ہے۔ کہ تمہاری اس لباس میں کیا عزت ہوتی ہے۔ جلد سوار ہو۔ بہت دیر ہوگئی۔ پہنچتے پہنچتے ساڑھے سات ہو جائینگے۔

نواب صاحب اور انجم قدر سوار ہو کر روانہ ہوتے ہیں۔ پندرہ منٹ میں کمشنر صاحب کے بنگلہ پر پہنچ جاتے ہیں انجم قدر گاڑی ہی پر بیٹھے رہتے ہیں۔ اور نواب صاحب گاڑی سے اتر کر سیدھے کوٹھی کے اندر جا پہنچتے ہیں۔ گیسٹی والی چاندی کی بدری ٹپکے کاری کی ہوئی چھڑی ہلاتے ہلاتے ڈرائنگ روم کے بیچ میں پہنچکر ایک کنٹس لائٹ کے نہ شاخے پر نظر پڑتی ہے۔ چھڑی سے جھاڑ کو گھمانے کے لئے ذرا حرکت دیتے ہیں۔ اتفاقاً تینوں کے تین بلب مع شیڈوں کے زمین پر گرتے ہیں۔ چھنا نا نا چھن جو آواز گونجتی ہے۔ تو بغل والے کمرے سے کمشنر کی میم صاحب یہ آواز سنکر دوڑی۔ ڈرائنگ روم میں آکر دیکھتی کیا ہیں کہ اک مرغ زریں کھڑا ہے۔ اور جھاڑ زمین پر گر کر چکنا چور ہوگیا ہے غصہ میں ڈپٹ کہتی ہوئی تیز قدم اٹھاتے کمشنر صاحب کو جا کر واقعہ سناتی ہیں۔ اور کہتی ہیں اس بیوقوف آدمی کو جلد پولیس کے حوالے کرو۔ کمشنر صاحب اٹھ کر فوراً آتے ہیں۔ تو دیکھتے ہیں۔ نواب آسمان قدر بہادر کھڑے چھڑی ہلا رہے ہیں۔

کمشنر صاحب:۔ ول نواب صاحب آداب تسلیم۔ اسی قدر کہنے پائے تھے۔ کہ

نواب صاحب:۔ میں نے آدمی دوڑایا ہے۔ کہ اک بارہ بتی والا بلوری جھاڑ آسٹریا کی صنعت کی یادگار جو میں نے پانچ ہزار کو منگوایا تھا۔ ابھی لا کر یہاں پہ لگا دیا جائیگا جس کو آپ اور میم صاحب دیکھ کر دونوں دیکھ کر خوش ہو جائینگے۔ میں معافی چاہتا ہوں۔ اور خصوصاً آپ کی میم صاحبہ سے کہ

اُن کا نیا جھاڑ مجھ سے لُٹ گیا۔

کمشنر:- (ہل نواب صاحب کوئی ہرج کی بات نہیں (میم صاحبہ کی طرف مخاطب ہو کر) یہ شاہی خاندان کے ایک فرد ہیں (ذرا آہستہ سے) شہزادے صاحب نے پانچ ہزار قیمتی جھاڑ اس کے عوض میں منگوایا ہے۔ تم تعیرہ کرنا۔ اس لئے کہ یہ ہمارے معزز دوست ہیں۔

میم صاحب:- (اپنے شوہر سے) تم ایسے شخص کی سفارش کر رہے ہو۔ جو مجھے بیوقوفوں کا سردار معلوم ہوتا ہے۔

اسی درمیان میں فراش دوڑتے۔ ہانپتے کانپتے جھاڑ لئے آ پہنچتے ہیں۔ اور نواب صاحب سے حکم پاتے ہی دس منٹ کے اندر اندر جھاڑ لٹکا کر اس کی شمعیں بھی روشن کر دیتے ہیں۔ جھاڑ کے کنولوں کی طلائی تحریروں اور گلکاریوں کی بیلیں دیواروں پر جھاڑ کی نوری گردش سے دوڑنے لگتی ہیں۔ میم صاحبہ کا غصہ اس نایاب جھاڑ کو دیکھ کر فرو ہو جاتا ہے۔ اور بات رفت و گذشت ہو جاتی ہے ساتھ ہی آٹھ بجتے ہیں۔ اور مہمان بیک وقت سب ایک ایک کر کے آ پہنچتے ہیں۔ منجملہ اُن کے انجم قدر بھی آتے ہیں۔ نوابصاحب سے عرض کرتے ہیں دیکھا حضور ایک گھنٹہ پہلے آنے کا نتیجہ۔ پانچ ہزار کا کیسا نفیس جھاڑ آپ کو تاوان میں دینا پڑا۔

نواب صاحب:- اب تم مجکو شماتت کرنے لگے۔ خدا کی شان۔ بے شرط کہ اس بھری محفل میں تم کو دو طمانچوں سے اس گستاخی کا جواب دوں۔ یہ سنتے ہی شہزادے انجم قدر نواب صاحب کے سامنے سے ٹل گئے۔ ساڑھے آٹھ بجتے ہی سب مہمان جو فقط چالیس شمار میں تھے۔ کھانے کی میز پر جا بیٹھے۔ نواب آسمان قدر کمشنر سے چوتھی کرسی پر جا کر متمکن ہوئے۔ اور انجم قدر عمداً دُور آخر میز پر جا کر بیٹھے۔

کھانا آنے لگا۔ پہلے شوربہ کی پلیٹیں آئیں۔ جونہی ایک پلیٹ نواب صاحب کے سامنے رکھی گئی۔

نواب صاحب:- بھئی میں کوئی بیمار تو ہوں نہیں۔ کہ شوربے (شوربے)

پر گزارا کروں۔

کمشنر صاحب اور بعض انگریز جو تھوڑی بہت اردو سمجھتے تھے۔ بے اختیار ہنس پڑے۔ تھوڑے دیر کے بعد اُن کے چاپ لائے گئے۔ سبھوں نے دو دو اپنی اپنی پلیٹ پر ڈش سے لے لئے۔ نوابصاحب کی باری آئی۔ تو آپ نے بھی دو دو لوگوں کی دیکھا دیکھی اٹھا لئے۔ ذرا مزے کے جو معلوم ہوئے۔ تو ذرا اونچی آواز میں خانساماں کو پکار کر فرمانے لگے اماں ذرا یہ دو آلو قیمے کے کباب ادھر لانا۔ اس پر لیڈیوں نے اک ہلکا قہقہہ لگایا اور سارے مہمان بھی کھلکھلا کے ہنس پڑے۔

اب کے چکن روسٹس آئے۔ آپ نے بھی ایک ٹانگ مع ران کے اٹھالی۔ گوشت کی بوٹی ہاتھ سے نہ ٹوٹی۔ تو فقط آپ نے داہنے ہاتھ میں چھری اٹھا کر زور زور سے گوشت کے ٹکڑے پر پھیرنی شروع کی۔ چونکہ کانٹے سے دبا کر کاٹنا بھول گئے ایک مرتبہ جو چھری ہڈی والے حصہ پر پڑی کے بوٹی اڑی تو بغل کی کرسی والی مہمان سٹی مجسٹریٹ کی میم کے گال پر پھٹ سے جا کر پڑی۔ وہ اک چیخ مار کر اٹھی۔ تو ساری محفل انگریز اور میمیں ہنستے ہنستے لوٹ گئے۔ نواب صاحب بول اٹھے باورچی نے گوشت میں گلاوٹ ڈالی نہیں۔ بوٹی اگر پڑی تو اس میں میرا کیا قصور ہے۔ آخر نوابصاحب سے کمشنر صاحب نے کہا۔ نوابصاحب کچھ فکر کی بات نہیں۔ خیر سب مہمان بیٹھ گئے

چوتھا کورس مچھلی کا آیا سبھوں نے ایک ایک ٹکڑا مچھلی کا اٹھایا آپ نے اول تو تین ٹکڑے اٹھائے۔ خیر اتنے پر اکتفا نہ کی۔ فرمایا بھئی مچھلی بھی کہیں کانٹے چھری سے کھائی جا سکتی ہے۔ حاضرین مجلس مجھے معاف فرمایئے گا۔ یہ کہہ کر آپ نے ہاتھ سے مچھلی کے کانٹے نکال نکال کر پھینکنا شروع کیا۔ اور خانساماں کو کہا۔ کیوں میاں کوئی روٹی ووٹی نہیں۔ خانساماں نے ہاتھ کے اشارہ سے ٹوسٹ کی سلائسیں جو اسٹینڈ میں لگی تھیں۔ اُن کی طرف نواب صاحب کی توجہ مبذول کرائی۔ تو آپ نے فرمایا کیا خوب! یہ کھڑے کھڑے روٹیاں خوب سجائی گئی ہیں! اچھا گندم اگر بہم نرسد بھس غنیمت است! اس پر بھی سارے مہمان ہنس پڑے۔

خیر آخر کی ڈش پڈنگ کی آئی۔ آپ نے بھی تھوڑی سی پڈنگ اپنی

پلیٹ میں لی۔ خانساماں نے پڈنگ میں جو کلیٹس مٹھاس ڈالی تھی نواب صاحب نے اُس پڈنگ کا چمچہ منہ میں ڈالتے فرمایا۔ اُرق ہے ہے! اس میں مچھندر کی بو آتی ہے۔ اب تو مہمانوں کی یہ حالت ہوئی۔ کہ ہنستے ہنستے پیٹ میں بل پڑ گئے۔ اور اس پر طرہ یہ کہ ہاتھ دھونے کو گرم پانی کے بلوری پیالے جو لائے گئے۔ تو آپ نے خانساماں کے ہاتھ سے لے کر غٹ غٹ دو چار گھونٹ لگائے۔ اور فرمانے لگے۔ اماں یہ گرم پانی ہے گرم۔ اس پر تو مہمانوں نے فرمائشی قہقہے لگانے شروع کئے۔ اب نواب صاحب نے پکارنا شروع کیا۔ بھئے آفتابہ لگن لانا۔ ورنہ اب مجھے گرم پانی پی کر تے ہوا چاہتی ہے۔ یہ سنتے میمیں تو ڈرائنگ روم میں ہنستی ہوئی بھاگ گئیں۔ انجم قدر منہ چھپائے گاڑی پر آ کر بیٹھ گئے۔ اور کمشنر صاحب نے قریب آ کر ان کا ہاتھ پکڑا۔ اور غسل خانے میں لے جا کر منہ ہاتھ دھونے کا لوٹا دکھا دیا۔ اور کہا یہاں آپ ہاتھ دھو سکتے ہیں۔ غسل خانے سے جو نکلے۔ تو کمشنر صاحب اور ان کی میم سے ہاتھ ملایا اور کہنے لگے اب ہم رخصت ہوتے ہیں۔ میم صاحب نے کہا۔ آپ کے جھاڑ کا شکریہ میں کس زبان سے ادا کروں۔ ول! گوڈ ہائی! گوڈ نائیٹ!!

عربی ادب اور جنگ

میں جنگ کے لئے پیدا کیا گیا ہوں۔ جب وہ فرد ہو جاتی ہے تو میں اسے روشن کرتا ہوں اور میں اس کے شعلوں کو چیرتا ہوا اس میں گھس جاتا ہوں۔

موت جس وقت لوگوں کی جانیں قبض کر رہی ہو اگر مجھ سے مقابلہ کرے تو مجھ سے ضرور شکست کھا جائیگی

میں نے اپنے گھوڑے کو میدان جنگ کے گرد و غبار میں ڈالدیا وہاں حالانکہ نیزوں سے شعلے نکل رہے تھے۔ میرا گھوڑا جس وقت میدان جنگ میں گھسا تھا "مجل" تھا لیکن جنگ کے بعد واپس آیا تو پیروں کی سپیدی رخصت ہو چکی تھی۔

اور میں جس وقت نیزے چلتے ہیں۔ اپنے نیزے سے زخم پر زخم لگاتا رہتا ہوں۔

ذلت کی زندگی سے موت اچھی ہے۔ اند بعض عار مٹائے نہیں مٹتے۔

مشکیزہ شراب اور مغنیہ کو تم مجد نہ سمجھو۔ تلوار کا اچھوتا وار بادشاہوں کی گردنیں مارنا' فوج کا مالک ہونا حقیقی مجد ہے

شرف و مجد ضرر سے محفوظ نہیں رہ سکتا جبتک اسکے ہر طرف خون نہ بہایا جائے۔

سلامتی کی خواہش انسان کی توجہ اچھے اور بلند کاموں سے پھیر دیتی ہے اور کسل پر آمادہ کرتی ہے۔

وہ حضرات ایسے ہیں کہ ان کے علاوہ لوگ گدوں پر سوتے ہیں اور دبلے پتلے گھوڑوں کی پیٹھ پر رات بسر کرتے ہیں۔ ان کے خیمے خون میں تیرنے لگتے ہیں اور سمندر میں کشتیاں معلوم ہوتے ہیں۔

زمانہ نیزے کی لکڑیاں پیدا کرتا ہے۔ آدمی نوک لگا کر ان میں نیزہ تیار کرتا رہتا ہے

انسان کی مرادیں اتنی حقیر ہیں کہ انکے لئے ہمیں آپس میں لڑنا کٹنا نہیں چاہئے۔

پروفیسر کنہیالال کپور

رہیئے اب ایسی جگہ چل کر...

کسی شخص کی بدقسمتی کا اندازہ اُس کے ہمسایوں کی تعداد سے کیا جا سکتا ہے۔ مثلاً جس شخص کا کوئی ہمسایہ نہیں۔ اُس کو ہم دنیا کے اُن چند ایک خوش قسمت انسانوں میں شمار کر سکتے ہیں۔ جن میں نظام حیدرآباد۔ راک فیلر اور ہنری فورڈ شامل ہیں۔ بصورت دیگر اگر کسی شخص کے چار سے زیادہ ہمسائے ہیں۔ تو اُس شخص کی بدقسمتی کی نہ کوئی انتہا ہے اور نہ کوئی علاج۔ اور ہمیں کچھ تعجب نہ ہوگا۔ اگر وہ شخص شکسپیئر کے مشہور کردار ہیملٹ کی طرح دن رات یہی سوچتا رہتا ہو "زندگی اچھی یا خودکشی۔ خودکشی اچھی یا زندگی"

قیاس اغلب ہے۔ کہ ان اشخاص میں اردو کے جلیل القدر شاعر مرزا غالب بھی شامل تھے۔ کیونکہ ایک جگہ اپنے ہمسایوں سے تنگ آکر فرماتے ہیں ؎

رہیئے اب ایسی جگہ چل کر جہاں کوئی نہ ہو

ذرا خیال فرمایئے۔ مرزا علے الصبح اٹھتے ہیں۔ اور اپنے ہمسائے سے کہتے ہیں "سنئے گا۔ مطلع عرض کیا ہے" اور کور ذوق ہمسایہ کہتا ہے۔ "ہاں مرزا! مطلع کے متعلق آپ کیا کہہ رہے تھے۔ مطلع تو بالکل صاف ہے" یا مرزا فرماتے۔ "دیکھیئے کل رات کیا اچھا شعر موزوں ہوا ؎

غم اگرچہ جاں گسل ہے پہ کہاں بچیں کہ دل ہے
غمِ عشق گر نہ ہوتا۔ غمِ روزگار ہوتا!

اور شعر و شاعری سے بے بہرہ ہمسایہ فرماتا۔ "ہاں مرزا! روزگار کا بہت برا حال ہے۔ تین دن سے دکان پر ایک گاہک تک نہیں پھٹکا"

اب بتایئے مرزا سر پیٹ کر کیوں نہ فرمائیں۔ کہ "رہیئے اب ایسی جگہ چل کر جہاں کوئی نہ ہو"

مگر اسی پر بس نہیں۔ مرزا ہمسایوں سے اتنے تنگ ہیں۔ کہ فرماتے ہیں ؎

بے در و دیوار سا اک گھر بنایا چاہیئے

بہت خوب! کیونکہ اگر گھر کے در و دیوار ہوتے۔ تو ہمسایہ بھی ضرور ہوگا۔ اسلئے بے در و دیوار کے گھر بنانے سے ہی اس کم بخت سے نجات حاصل ہو سکتی ہے . . . . .

اب مرزا تو ٹھہرے شاعر جن کے لئے جیسی بستی ویسا ویرانہ بلکہ بستی سے ویرانہ بہتر۔ مگر ہم اس مصیبت سے کسطرح چھٹکارا حاصل کریں کہ جنکو ساری عمر بستی میں گزرنا ہے۔ اور جن کے ایک چھوڑ پانچ ہمسائے ہیں . . . .

آپ ہمارے پہلے ہمسائے سے متعارف ہو جیئے۔ یہ صاحب کسی نام نہاد بیمہ کمپنی میں کلرک ہیں۔ مگر آپ کے اقوال اور افعال سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ کلرکی تو صرف اُن کا شغل ہے۔ ورنہ پیشے کے لحاظ وہ طبیب واقع ہوئے ہیں۔ آں جناب کی حالت یہ ہے۔ کہ امیر مینائی کی طرح "سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے" فرق اتنا ہے۔ کہ امیر مینائی تو کسی کو کانٹا چبھنے پر تڑپتے تھے۔ یہ صاحب بغیر کسی ایسی خلش کے تڑپا کرتے ہیں۔ اور وقت بے وقت ہر تندرست اور بیمار شخص کے لئے نسخے تجویز کرتے رہتے ہیں۔ مثلاً "آپ کو کھانسی ہے ذرا خیال رکھئے۔ کہیں وجع الصدر نہ ہو جائے۔ آج ہی شربت بنفشہ خرید لیجئے۔ اور کم از کم دو ہفتے پیجیئے" . . . . "آپ کی آنکھیں ظاہر کرتی ہیں۔ کہ آپ کو قبض ہے۔ علے الصبح ٹھنڈے پانی کا ایک گلاس پیا کریں" "آپ روز بروز دُبلے ہو رہے ہیں۔ کہیں رات کو پسینہ تو نہیں آتا؟"

ان کا مقولہ ہے کہ تندرستی کا انحصار تین باتوں پر ہے۔

(۱) صبح جانبکے اٹھ کر سیر کرنا۔

(۲) سرسوں کے تیل سے مالش کرنا۔

(۳) انگریزی برش کی بجائے مسواک کرنا۔

سیر کے متعلق ان کا اعتقاد ہے۔ کہ یہ کم از کم دس امراض کا واحد علاج ہے۔ چنانچہ آپ نے ایک چارٹ (نقشہ) تیار کیا ہے جس کی ایک کاپی اپنے ہر ایک ہمسائے کو مفت مہیا کرتے ہیں۔ اس چارٹ میں لکھتے ہیں:-

بدہضمی کی دوا . . . . . لارنس باغ کے پانچ چکر
سر درد کی دوا . . . . لارنس باغ کے چار چکر
پیٹ درد کی دوا . . . . لارنس باغ کے دو چکر

آپ سیر کے اتنے شوقین ہیں۔ کہ ان کا یہ شوق مرض کی انتہا تک جا پہنچا ہے۔ سردی ہو یا برسات۔ آندھی ہو یا طوفان، جون ہو یا دسمبر، یہ سیر کرنے ضرور جائینگے۔ اور کم از کم دو تین ہمسایوں کو اپنے ساتھ لیجانے پر ضرور مصر ہونگے۔ اور پھر جو شخص کسی بیوقوفی کے لمحے میں ان کا شریک حال ہو جائے۔ تو اُس کا ڈاکٹر یا خدا ہی حافظ ہے۔ کیونکہ ان کے نزدیک سیر اور سفر میں بہت کم فرق ہے۔ دس میل کی روزانہ مسافت کو حضرت سیر کے نام سے پکارتے ہیں۔ جب لارنس باغ جو آپ کے گھر سے چار میل پر ہے۔ پہنچتے ہیں۔ تو کہتے ہیں۔ کہ بس اب دو میل اور۔ اور پھر فضا کچھ ٹھیک ہو جائے گی۔ اور ہماری سیر تفریح شروع ہو گی۔ ایک دو دفعہ مجھے بھی سیر پر گھسیٹ کر لے گئے۔ واپسی پھیرا یہ حال تھا۔ کہ قدم ڈگمگا رہے تھے۔ سانس پھولا ہوا تھا اور جسم پسینہ میں تر بتر۔

سرسوں کے تیل کی مالش ان کا دوسرا مجرب نسخہ ہے۔ اور جو شخص اس تیل کی مالش نہیں کرتا۔ وہ ان کے نزدیک قابل گردن زدنی اور گشتنی ہے۔ یہی بات مسواک کے متعلق ہے۔ جو شخص انگریزی برش استعمال کرتا ہے۔ وہ اپنے ہاتھوں پر کلہاڑی مارتا ہے بیماری کو دعوت بھیجتا ہے۔ وہ اپنی قبر کی طرف بے تحاشا دوڑ رہا ہے۔

الغرض ہمارے یہ ہمسائے جو ہر درد کا درماں جانتے ہیں اور بلا فیس بتاتے ہیں۔ خود بلائے بے درماں ہیں۔ جن سے سوائے نقل مکان اور موت کے رہائی حاصل کرنا اتنا ہی ناممکن ہے۔ جتنا کہ قفس یا جیل خانے سے بچ کر نکلنا . . .

ہمارے دوسرے ہمسائے شکل اور لباس کے اعتبار سے انسان ہیں لیکن اگر ان کو انسان نما ریڈیو کہا جائے۔ تو زیادہ موزوں ہوگا کیونکہ ریڈیو کی طرح یہ بزرگ صبح ۵ بجے سے لے کر رات کے گیارہ بجے تک کچھ نہ کچھ فرماتے رہتے ہیں۔ سیاست، فلمیں، مسلم لیگ، کانگرس، ہوائی حملے، بھونچال، قحط، بھوک، بیکاری مردم شماری ان کے پسندیدہ موضوع ہیں۔ سیاست میں یہ اکثر ہندوستانی اور انگریزی سیاستدانوں کی غلطیاں اور گناہوں کی فہرست تیار کرتے رہتے ہیں مثلاً "یہ وائسرائے کی غلطی ہے۔ اور سچ پوچھو تو یہ کانگرس کی بھی غلطی ہے۔ اور مسلم لیگ کی بھی۔ قصور مسٹر جناح کا ہے۔ مگر مہاتما گاندھی کو بھی معاف نہیں کیا جا سکتا۔ دراصل یہ سب کی غلطی ہے۔ آپ کہیں نہ۔ یہ غلطی نہیں۔ تو اور کیا ہے۔ نہیں مگر یہ غلطی نہیں۔ اس کو غلطی کہنا ہی غلطی ہے۔ یہ جرم ہے نہیں یہ جرم بھی نہیں یہ گناہ ہے"

سیاست کے بعد ان کی دوسری دلچسپی کی چیز فلم ہے۔ فلموں کے متعلق کچھ اس قسم کی باتیں کیا کرتے ہیں "فلاں ایکٹر فلاں کمپنی کو چھوڑ کر فلاں کمپنی میں شامل ہو گیا ہے۔ اب اس ایکٹر کا کیا بنے گا! اب اس کمپنی کا کیا بنے گا! فلاں ایکٹرس فلاں ایکٹر کے ساتھ بھاگ گئی ہے۔ خدا جانے کہاں بھاگ گئے ہیں؟ آپ اس ایکٹر کو جانتے ہیں۔ کیوں نہیں جانتے؟ آپ کا اس فلم کے متعلق کیا خیال ہے؟ آپ نے یہ فلم کیوں نہیں دیکھی؟ آپ ہر ایک فلم کیوں نہیں دیکھتے؟" . . . . .

ہمارے تیسرے کرم فرما کسی سکول میں مدرس ہیں۔ آپ کا تکیہ کلام ہے۔ "میں پوچھتا ہوں۔ آپ کے پاس یہ چیز ہے؟" چنانچہ آپ بجائے بازار۔ ڈاکخانہ یا ہسپتال جانے کے وقتاً فوقتاً ہمارے پاس تشریف لے آتے ہیں۔ اور میں کہتا ہوں آپ کے پاس ایک گرل کوئین کی ہے ایک آنے کا ٹکٹ ہے؟ پرسوں کا اخبار ہے؟ پچھلے سال کا کیلنڈر ہے اس سال کی جنتری ہے؟ پریم چند کی کہانیوں کا مجموعہ ہے؟ اقبال کے اشعار کا انتخاب ہے؟ وغیرہ وغیرہ سوالوں سے ہمارا ناک میں دم کیا کرتے ہیں۔ ایک دن نہایت گھبرائی ہوئی آواز میں پوچھنے لگے۔ "آپ کے پاس "ادبِ لطیف" کا سالنامہ ہے؟" میں نے کہا "کیوں؟

اس کی کیا ضرورت پیش آئی" کہنے لگے "یونہی، کچھ نہیں، اس میں سے مارکس کا اشتہار پڑھنا تھا"

ہمارے چوتھے ہمسائے اُن اشخاص میں سے ہیں جن کو لیڈر کے لقب سے پکارا جاتا ہے۔ ان کو ہر وقت قوم کا غم کھائے جاتا ہے اور اس غم میں وہ اس طرح رہتے ہیں۔ گویا اس شاعر کے مصرع کی ترجمانی کر رہے ہیں جس نے کہا تھا: "ہم رونے پہ آجائیں تو دریا ہی بہا دیں"

وہ جس وقت ہمارے پاس آتے ہیں۔ قوم کی لاش پر آنسو بہانے لگتے ہیں۔ "اس قوم کا اب کچھ نہیں بن سکتا۔ ہندوستانی دنیا میں سب سے زیادہ پسماندہ ہیں۔ چینی ہندوستانیوں سے بھی پست حالت میں ہیں۔ مگر سست الوجودی میں ہم چینیوں سے بھی پست ہیں۔ انگریزی مزدور کی روزانہ آمدنی تین روپے ہے۔ امریکن مزدور کی ساڑھے چار روپے، آسٹریلین کی پانچ روپے، اور ہندوستانی مزدور کی آمدنی صرف چھ پیسے یومیہ ہے۔ یا اس طرح "اس سال ہندوستان میں دو لاکھ کی کھانڈ باہر سے آئی۔ ۲ لاکھ کے سگرٹ آئے۔ دس لاکھ کے کھلونے آئے۔ افسوس اس ملک کا کیا بنے گا" ہر وقت مجھ سے پوچھتے رہتے ہیں کہ میں چرخہ کب خریدونگا اور سوت کب کاتنا شروع کرونگا۔ سودیشی تحریک کے یہ دلدادہ ہیں۔ مگر گھڑی سوئٹزرلینڈ کی اور سیگرٹ انگلینڈ کا خریدتے ہیں۔ لکھنے کا قلم امریکہ کا۔ تیل اور کریم فرانس کے اور کھانڈ جاوا کی استعمال کرتے ہیں۔

ہمارے پانچویں ہمسائے سوشلسٹ واقع ہوئے ہیں۔ آپ ہر وقت مہیب اور خطرناک الفاظ استعمال کرنے کے عادی ہیں۔ مثلاً زلزلہ آئیگا۔ ایک زبردست طوفان اُٹھے گا۔ بجلیاں کڑکیں گی۔ خون کی ندیاں بہہ نکلیں گی۔ آپ کو ناز ہے۔ آپ نے سوشلزم کا بہت گہرا مطالعہ کیا ہے حقیقت یہ ہے۔ کہ آپ نے آجتک صرف لینن کی سوانحعمری پڑھی ہے۔ وہ سوانحعمری جسکا کہ روسی زبان سے فرانسیسی۔ فرانسیسی سے انگریزی اور انگریزی سے اردو میں ترجمہ ہوا ہے۔ اپنی ہر تقریر کا آغاز "ماسکو" سے کرتے ہیں۔

ماسکو میں ایسا ہرگز نہیں ہوتا۔ ماسکو میں اگر کوئی یہ بات کرے تو اُسے فوراً گولی کا نشانہ بنادیا جائے۔ ماسکو میں اگر کوئی شخص بازار میں کیلے کا چھلکا پھینک دے۔ تو اُسے دو سال قید بامشقت کی سزا ہوجائے" آپ ہر وقت دنیا کے نظام کو بدلنے کی تجویزیں سوچتے رہتے ہیں۔ ہر وقت ملک کی خاطر سختیاں جھیلنے کے لئے تیار ہیں۔ جرأت کا یہ حال ہے۔ کہ جس دن شہر میں گرفتاریاں یا خانہ تلاشیاں شروع ہو جائیں۔ آپ خوف زدہ کبوتر کی طرح سہمے سہمے پھرتے ہیں۔ رک رک کر بات کرتے ہیں۔ اور اپنے پُرانے اخبارات کا پلندہ جو کہ آپ کا واحد اثاث البیت ہے۔ میرے گھر پھینک جاتے ہیں۔ کہ مبادا ان اخبارات میں سے کوئی خلاف قانون چیز برآمد نہ ہو جائے۔ لمبا ترچھا قد ہے۔ اور منہ پر ہر وقت کسی نامعلوم خطرے کے زیر اثر ہوائیاں اڑتی رہتی ہیں۔ چہرے پر فاقہ مستی اس طرح لکھی ہوئی ہے۔ کہ پہلی ملاقات میں سب سے پہلے یہی چیز نظر آتی ہے۔ اکثر جوش ملیح آبادی کی نظمیں پڑھ کر دل کو تسلی دیا کرتے ہیں۔ اور اگرچہ آپ میں شباب کے آثار تک غائب ہیں اور آپ تغیر کے معنی سے قطعاً ناواقف ہیں۔ لیکن ہر صبح نہایت جوش سے اپنی بھاری آواز میں گایا کرتے ہیں۔

؎ کام ہے میرا تغیر۔ نام ہے میرا شباب

آپ کا نیک ارادہ دنیا بھر کے خاکروبوں کو منظم کرنا ہے۔ اس کے بعد دھوبیوں کی انجمن، نائیوں کی انجمن، بے کاروں کی انجمن، بہشتیوں کی انجمن، بیکاروں کی انجمن، شامت کے ماروں کی انجمن، وغیرہ قائم کرینگے۔ آپ کا خیال ہے۔ کہ آپ غلطی سے ہندوستان میں پیدا ہوئے ہیں۔ جہاں آپ کی لیاقت کی بہت کم قدر کی گئی ہے۔ اس لئے بارہا مجھ سے کہہ چکے ہیں کہ اگر میں ماسکو میں پیدا ہوتا تو . . . .

. . . . "

پروفیسر غلام جیلانی برق

ایرانی ادب میں طنز، ظرافت اور بذلہ سنجی

ایرانی ادب میں ظرافت کا عنصر ابتدا سے موجود ہے۔ کلیلہ دمنہ جیسی قدیم کتاب میں بھی۔ جو نوشیرواں کے زمانے میں ہندوستان سے ایران میں پہنچی تھی۔ کہیں کہیں رنگِ ظرافت پایا جاتا ہے۔ حافظ شیرازی جیسا مجذوب شاعر واعظوں و زاہدوں پر نہایت دلچسپ پھبتیاں کستا ہے۔ ایک مقام پر کہتا ہے۔

واعظ بطنز گفت حرام است مے مخور!
گفتم کہ چشم و گوش بہر خر نمے کنم!!

عمر خیام، امیر خسرو، عنصری، انوری، سلمان ساوجی، مولینا رومی اور دیگر شعرا کے کلام میں ظرافت کا عنصر کافی ملتا ہے۔ چنانچہ یہاں چند مثالیں پیش کی جاتی ہیں۔

(۱) سلطان محمود غزنوی پولو کھیلتے کھیلتے گھوڑے پر سے گر پڑا عنصری وہاں موجود تھا۔ فوراً بول اٹھا۔

شاہا ادبے کن فلک بد خو را! کافت رسانید رخ نیکو را
گر گرسنے غلط رفت بگو کانش زن ور اسپ خطا کرد ببخش او را

چند روز کے بعد اسی حادثے کا ذکر چل پڑا۔ اور بادشاہ نے اُس گھوڑے کو برا بھلا کہنا شروع کیا۔ تو عنصری نے گھوڑے کی طرف سے یوں معذرت کی۔

رفتم بر اسپ نا بکرم آتش بکشم گفتا بشنو نخست ایں عذر خوشم
نے گاو زمینم کہ جہاں برگیرم نے چرخ چہارم کہ خورشید کشم

(۲) ایک دفعہ جہانگیر نے نورجہاں کے سامنے یہ مصرع پڑھا۔

چراغم گشتہ ای گرد ند پیرانِ جہاں دیدہ

تو نورجہاں نے فوراً کہا۔

بزیر خاک مے جویند ایام جوانی را

(۳) عمر خیام بغل میں شراب کی بوتل دبائے جا رہے تھے۔ کہ ٹھوکر لگی۔ خود گر گئے۔ اور بوتل ٹوٹ گئی۔ اس پر برافروختہ ہو کر کہنے لگے۔

ابریقِ مئے مرا شکستی ربی بر من درِ عیش را ببستی ربی
بر خاک بریختی مئے لعل مرا خاکم بدہن مگر تو مستی ربی

(۴) امیر خسرو کے ہاں ضیافت تھی۔ ضیافت کے بعد باقی لوگ تو چلے گئے لیکن ایک صاحب دیر تک امیر خسرو کا دماغ چاٹتے رہے۔ یہاں تک کہ قلعہ میں ۱۲ کا گھنٹہ بجا۔ مہمان نے پوچھا "خسرو صاحب! یہ گھنٹہ کیا کہہ رہا ہے"۔ خسرو نے کہا۔ "گھنٹہ کہہ رہا ہے"

نان کہ خوردی خانہ برو، خانہ برو، خانہ برو،
نہ بدستِ تو کردم خانہ گرو، خانہ گرو، خانہ گرو،

مہمان صاحب پر گھڑوں پانی پڑ گیا۔ اور وہ اٹھ کر چل دیئے

(۵) ایک دفعہ امیر خسرو ایک دھنیئے کی دکان کے پاس سے گزرے دھنیا نہایت انہماک سے روئی دھن رہا تھا۔ خسرو کچھ دیر کے لئے رک گئے۔ ساتھی نے پوچھا۔ کیوں صاحب۔ اس دھن دھن کی آواز پر مست ہو گئے؟

خسرو۔ "میں کیا کروں لے ہی ایسی ہے۔" اور فوراً دھنیئے کی دھن دھن کے ساتھ یہ شعر پڑھنے شروع کر دیئے

درپئے جاناں جاں ہم رفت۔ جاں ہم رفت رفت رفت جاں ہم رفت
ایں ہم رفت۔ آں ہم رفت۔ اینہم آنہم۔ اینہم آنہم۔ آنہم رفت
رفتن دہ رفتن دہ۔ دہ۔ دہ رفتن دہ۔ رف۔ رف۔ رف رف

درپئے جاناں جاں ہم رفت۔
اینہم رفت۔ آں ہم رفت!

(۶) امیر خسرو ایک حجام بچے کو دیکھ کر کہتے ہیں۔

حجام پسر بخوبی در رعنائی دے آئینہ بمزد بداں رعنائی

گفتم غمنا و ربت آیم نایم ۔ فریاد برآورد کہ نائی نائی

(۷) اسی طرح ایک تیلی بچے کے متعلق فرماتے ہیں۔

تیلی پسرے کہ می فروشد تیلے ۔ از دست و زبانِ جیبِ او وایلے

خامے برخش بدیم و گفتم کہ تل است ۔ گفتا کہ برمیت شیت میں تل تیلے

(۸) ابو اسحاق حلوہ کے متعلق کہتے ہیں۔

آں من نیم کہ ز حلوا عناں بگردانم ۔ کہ ترکِ صحبتِ شیریں نہ کارِ فرہاد است

(۹) ایک اور صاحب فرماتے ہیں۔

پلاؤ و حلوہ چو بینی شہید کن خود را

کہ مرگ ہمسے چنیں گاہ گاہ می باشد

(۱۰) جعفر زٹلی اپنی شان میں کہتے ہیں۔

منم آں رستمِ وقت روئیں تنم ۔ کہ دہ پا پڑا ز مشتِ خود بشکنم،

بہ پشم اگر جوششِ جنگ را ۔ بریت و ہم پشۂ لنگ را۔

بیک حملہ بالِ مگس بر کنم! ۔ قطار و دو صد مور برہم زنم

دریں دورِ حاضر کہ رستم منم، ۔ بپاشہ بگرز گراں بشکنم!

چناں بگسلم رشتۂ خام را ۔ کہ سازم خجل رستم و سام را

اگر برکشم تیغِ تدبیر را ۔ ببرم سرِ شیرِ تصویر را!

من آنم اگر اسپ جولاں کنم ۔ چہل خانۂ موش برہم زنم

بنام و نشانِ جعفر درد مند

چو بانگِ خر آوازۂ من بلند

(۱۱) قاسم کاہلی کا تخیل ملاحظہ فرمایئے۔

روزِ ہجر مرا دیدہ بس گہر بار است

شبے کہ ماہ نباشد ستارہ بسیار است

(۱۲) وصالِ شیرازی اس شعر میں ایک نیا مضمون باندھتے ہیں

اشکم ز سر گزشت و ہماں سوزشم بجاست

در حیرتم کہ سوختنِ من در آب چیست،

(۱۳) کسائی سفید بالوں کے متعلق کہتے ہیں۔

دشمن زندگیست موئے سفید

بہرِ دشمن سیاہ باید کرد

(۱۴) امیر خسرو کا خیال ملاحظہ ہو۔

می روی و گریہ مے آید مرا

ساعتے بنشیں کہ باراں بگذرد

(۱۵) ایک صاحب اپنے معشوق اور چاند میں یوں موازنہ کرتے ہیں

بمیزانِ نظر حسنِ ترا با ماہ سنجیدم

میاں ایں و آں فرقِ زمین و آسماں دیدم

(۱۶) نظامِ تنفس پر حمید الدین ہندی کا انوکھا خیال ملاحظہ فرمایئے

از بہرِ قطع کردنِ نخلِ حیاتِ من۔

چوں ارّہ دو دمِ نفس اندر کشاکش است

(۱۷) ملا مراد کو مولویوں سے بڑی چڑ تھی۔ شہر کے ایک بڑے مولوی صاحب ملا مراد کے سلام کا جواب عموماً نہیں دیا کرتے تھے ایک دن ملا صاحب نے مسجد میں سلام دیا۔ اور مولوی صاحب نے سر کو ذرا سا ہلا دیا۔ اس پر ملا صاحب نے یہ رباعی فوراً لکھ کر مولوی صاحب کی خدمت میں پیش کر دی۔

اے مولوی از کبر و رعونت گندہ ۔ گاہے کہ کند بر تو سلام ایں بندہ

چنداں حرکت نما کہ از روئے قیاس ۔ معلوم شود کہ مردۂ یا زندہ

(۱۸) خواجہ نصیر پر ملا جلال نے کفر کا فتویٰ لگا دیا۔ تو جواباً خواجہ صاحب نے یہ قطعہ کہا۔

مرا ملا جلال از گفت کافر ۔ چراغِ کذب را نبود فروغے

مسلماں گفتمش بہرِ مکافات ۔ کہ نبود جز دروغے را دروغے

(۱۹) شہاب ترشیزی نے ایک مولوی صاحب کو گدھا کہہ دیا۔ اس پر مولوی صاحب سخت برافروختہ ہوئے۔ اور پیغام بھیجا۔ کہ شہاب معافی مانگے۔ جس پر شہاب نے مندرجہ ذیل شعر میں معافی طلب کی

ترا خر خواندم و گشتم پشیماں ۔ کہ آں بیچارہ را بدنام کردم

(۲۰) ایران میں اصفہان ایک نہایت پر رونق اور آباد شہر ہے لیکن اہلِ اصفہان اپنی عیاریوں۔ دروغ بافیوں اور شرارتوں کی وجہ سے ہمیشہ بدنام رہے ہیں۔ شاہ طہماسپ صفوی اصفہان کے متعلق کہتے ہیں۔

اصفہاں جنتے است پر نعمت ۔ ہرچہ در وے گماں بری شاید

ہر چیزش خوش است الّا آنکہ ۔ اصفہانی در و نمے باید

(۲۱) ایران میں ایک حکیم تمام آبادی کے لئے خطرہ جان بنے ہوئے تھے۔ ایک ظریف نے آپ کے متعلق یہ قطعہ کہا۔

ملک الموت رفت پیش خدا — گفت سبحان ربی الاعلیٰ
یک طبیب است احمق الحکماء — من یکے می کشم وا و صد را
یا بفرما کہ روح او گیرم — یا مرا کار دیگرے فرما

(۲۲) وحشی بافقی نے ایک شراب نوش سے قدرے شراب طلب کی۔ اسنے بیچ میں پانی ملا دیا۔ تو کہا۔

بر در خانہ قدح نوشے — رفتم و کردم التماس شراب
شیشۂ لطف کرد ما بود — چوں حرف شراب نیمے آب

(۲۳) انوری زندگی کے مصائب سے تنگ آ کر کہتا ہے۔

ہر بلائے کز آسمان آید — گرچہ بر دیگرے قضا باشد
بزمین نارسیدہ می پرسد — خانۂ انوری کجا باشد

(۲۴) سلمان ساوجی ہر روز شراب سے توبہ کرتا ہے۔ اور بار بار اس توبہ کو توڑتا ہے۔

از بس کہ شکستم و ببستم توبہ — فریاد ہمی کند ز دستم توبہ
دیروز بتوبہ شکستم ساغر — امروز بساغرے شکستم توبہ

(۲۵) بعض علمائے اسلام کا خیال یہ ہے۔ کہ یزید پر لعنت بھیجنا درست نہیں۔ اس پر جناب قاآنی کا خیال ملاحظہ ہو۔

اے کہ گفتی بر یزید و آل او لعنت مکن
زانکہ شاید حق تعالیٰ کردہ باشد رحمتش
آنچہ با آل نبی او کردہ گر بخشد خدا۔
ہم ببخشاید ترا گر کردہ باشی لعنتش۔

(۲۶) منصور شیرازی کا دل گم ہو گیا ہے۔ چور کا سراغ یوں لگاتے ہیں

در سینہ دلم گم شدہ است بکہ نہم — غیر از تو کسے راہ درین سینہ ندارد

(۲۷) ایک صاحب محبوب کی خدمت میں ایک گلدستہ پیش کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

بگو اے عاشق صادق چرا گلدستہ آوردی — دل بلبل شکستی غنچہ را دلخستہ آوردی
زہجر رویت بہ دست ما من گلدستہ آوردم — بہ خوبی گلعذاری من گل نیت بستہ ام

(۲۸) مولینا رومی مثنوی میں ایک عورت کا قصہ درج کرتے ہیں کہ وہ ہر روز ہانڈی کو بھونتے وقت گوشت خود کھا جاتی۔ اور خالی شوربا خاوند کے آگے لا رکھتی۔ نیز کہتی۔ کہ گوشت بلی کھا گئی تھی۔ ایک دن ایک سیر گوشت آیا۔ خاوند نے بلی کو پہلے ہی پکڑ کر پنجرے میں بند کر رکھا تھا۔ حسب دستور جب رات کو رکابی میں پھر شوربا سامنے آیا۔ اور بیوی نے وہی عذر پیش کیا۔ تو خاوند نے بلی کو پکڑ کر تولا۔ وہ وزن میں صرف ایک سیر نکلی۔ گوشت بھی ایک سیر تھا۔ وہ کہنے لگا۔

اگر ایں گربہ است گوشت کجا ست — وگر ایں گوشت است گربہ چہ جا ست

ایرانی شاعری نے نویں صدی سے انیسویں صدی تک ایک ہزار سال کے عرصہ میں قصیدہ، غزل، رباعی، قصیدہ، مدح، ہجا وغیرہ وہم دنیائے ادب میں پیش کر دئے تھے۔ صرف قومی، ملکی اور اصلاحی نظموں کا باب رہ گیا تھا۔ اسے بیسویں صدی کے ابتدا میں دور انقلاب و مشروطیت نے پورا کر دیا۔ اور اب ایرانی شاعری بہمہ وجوہ مکمل ہو گئی ہے۔ ایران میں ہمیشہ سے استبداد اور شخصی حکومت کا دور دورہ رہا تھا۔ لیکن انیسویں صدی کے آخری نصف میں سید جمال الدین۔ کی اسلامی انقلابی تحریک کے زیر اثر بیداری کے آثار پیدا ہوتے جا رہے تھے . . . ایران نو کی تکمیل میں جن کتابوں کا بہت بڑا حصہ ہے۔ اس کا آغاز شہزادہ ملکم خاں کی تصنیفات کو حاصل ہے۔ دارالفنون طہران کی کتابوں نے اس انقلاب میں نمایاں حصہ لیا۔ اس زمانے میں ایران کے اخباروں نے ایران میں نئی روح پھونک دی تھی۔ کسی ملک کو خواب غفلت سے بیدار کرنے کے لئے قومی نظموں کا وجود بہت زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔ چنانچہ ایران نو میں بہار، اشرف رشتی، عارف، وحید، شوریدہ، ادیب، پوردواؤد اور ملک ساسانی نے اس کمی کو پورا کر دیا۔ (ادبیات ایران نو)

پروفیسر عبداللطیف تپش

آغا حشر کاشمیری

کیا پوچھتے ہو۔ کہ میں آغا صاحب کو جانتا ہوں؟ آغا محمد شاہ حشر کو کوئی نہ جانے، اور پھر مجھ جیسا ادبی ماحول کا پیاسا!

ایرانی بانکپن محمد شاہ رنگینیوں کے ساتھ حشر کا سامان آج تک یاد ہے۔ اللہ اللہ آدمی زعفرانِ زارِ کشمیر تھے۔ خدا ان کی روح کو بہشت میں وسائے بسائے۔ عجیب انسان تھے، سر سے پاؤں تک ادب رنگین کا مجسمہ، دل و دماغ دونوں جنت کے پھولوں کے گلدستے، فطرت ایسے اچھوتے مذاق کے آدمی اور ایسی نادرِ روزگار ہستیاں روز کہاں پیدا کرتی ہے۔

آج سے پچیس برس ادھر کی بات ہے۔ کہ مرحوم حکیم فقیر محمد شفاء الملک کے بہارستان میں جو لاہور کے زندہ دلوں کی سدا بہار محفل تھی، ان حضرات سے پہلی بار ملنے کا اتفاق ہوا۔ وہاں تکلف کا کیا کام تھا، زبان تھی کہ پھلجھڑی، فقرے ایسے چست، باتوں میں لوچ، لب و لہجہ میں ایسی لچک کہ تو وہ کہیں اور سنا کرے کوئی" محو ہو کر رہ گیا، یہ دلچسپ صحبت ایسی بھائی۔ کہ فرصت کے اکثر لمحے وہیں گزرنے لگے،

حکیم صاحب اور آغا صاحب کب کے آشنا تھے، یہ تو معلوم نہیں۔ مگر رشتہ مؤانست نہایت پکا۔ جب کبھی لاہور میں براجمان ہوتے۔ تقریب کوئی سہی۔ انہی کے مطب کو اپنا نشیمن بناتے، جتنے دن رہتے۔ حریفانِ ادب کا جمگھٹا رہتا، مجھ پر خاص عنایت تھی جس دن حاضر نہ ہوتا۔ گرفتاری کے احکام جاری ہوتے، رفتہ رفتہ پیر اور مرید۔ عاشق و معشوق کی سی کیفیت ہو گئی، پیر تو خیر وہی رہے۔ لیکن عاشق کا درجہ نہیں کھلا، مجھے بھی شبہ ہی رہا کہ وہ میرے عاشق تھے۔ یا میں اُن کا، ہاں یہ کہہ سکتا ہوں، کہ لاہور میں نہ انہیں میرے بغیر چین تھا۔ نہ مجھے ان کے بغیر، ورنہ یوں مہینوں بلکہ برسوں اُن کے ساتھ نہ رہتا، اور اُن کی زبان دانی کے چمن میں گل چینیاں کیں،

آغا حشر اپنے ادبی متوالوں کی نگاہوں میں جس قدر خوش رو اور جامہ زیب ہوں گے، اس کا تو ذکر ہی کیا، جس نے آپ کو جوانی میں دیکھا ہے۔ وہ بلا رو و رعایت کہہ سکتا ہے، کہ آپ ہر دیکھنے والے کے لئے عام طور پر جاذب نظر تھے، رنگ کھلتا ہوا، چمپئی رنگ، دس بیس میں نکلتا ہوا قد۔ چوڑے چکلے ہاڑ، بھرا بھرا اور ورزشی بدن، کہتے ہیں۔ لڑکپن میں ورزش کا بھی شوق تھا، کسی قسم کی لکڑی بھی سیکھی تھی، گنگا مائی کی گود میں ہاتھ پاؤں مارتے ہم نے بھی دیکھا ہے، آنکھوں کا حُسن کسی قدر تبسم ریز تھا۔ پھر بھی نگاہیں آفت تھیں،

باپ دادا کا اصلی وطن کشمیر تھا، خدا جانے کس تقریب سے پنجاب کو لانگتے پھلانگتے بنارس پہنچے۔ والد آغا غنی شاہ شال کی سوداگری کے سلسلے میں کچھ عرصے کے لئے امرتسر آ گئے تھے۔ اسی زمین کو حشر نے پسند کیا، یہ فتنہ یہیں سے اُٹھا، مگر صبحِ بنارس کی کشش کا اثر تھا، کہ پھر کنارِ گنگ جا پہنچے، اگرچہ خاندان میں علمی چرچے نہ تھے۔ تاہم وقت کی مناسبت سے والدین نے تربیت کا پورا خیال رکھا،

ابتدائی تعلیم ان دنوں گھر سے باہر کچھ اچھی نہیں سمجھی جاتی تھی، اس لئے دس بارہ برس کی عمر تک گھر ہی پر مختلف استادوں سے پڑھتے رہے۔ اس کے بعد مدرسہ میں داخل ہوئے، ذہین تھے۔ وہ جلد ہی انٹرنس تک جا پہنچے۔ لیکن مزاج شوقین اور طبیعت سریع واقع ہوئی تھی۔ خشک اور بے لطف مضامین کو کون رٹتا، جی اچاٹ ہو گیا، ناٹک ہندوستان میں رواج پا رہے تھے بمبئی اور کلکتہ کی تھیٹریکل کمپنیاں طلسم معلوم ہوتی تھیں، رقص و سرود اور بول ٹھٹولی کا نیا دور تھا۔ یکایک یہ حضرت بھی اس طرف جھک پڑے، تماشے دیکھتے دیکھتے۔ تماشہ سازی کا شوق ہوا، اردو ڈرامہ نویسی کی ابھی تخلیق بھی نہیں ہوئی تھی۔ گل بکاؤلی اندرسبھا اور فسانہ عجائب کے منظوم ناٹک۔ پبلک

میں گشت کر رہے تھے، کہ آغا صاحب نے "آفتابِ محبت" ایک ڈرامہ لکھا، اُردو ڈرامہ کی تاریخ میں یہ پہلی کوشش اور کامیاب کوشش تھی بنارس کے طلبہ میں خوب چلی،

سَو بوتلوں کا نشہ ہے۔ اک واہ واہ میں، پروازِ شوق میں تعریف کے پر اور لگ گئے، سمندِ ناز کو اک اور تازیانہ ہوا، بنارس سے جاڑے ترسیدے بمبئی پہنچے، بمبئی ویسے ہی پرستان کا نمونہ ہے، جدھر دیکھو پریاں ہی پریاں نظر آتی ہیں، اور ناٹکوں کے حق میں تو اسے منڈی سمجھنا چاہیئے، مگر زمانہ اور تھا منشی احسن، منشی سنہا، منشی شائق وغیرہ کی طوطی بول رہی تھی، جتنے ناٹک تھے منظوم، گویوں کا بول بالا، صرف شاعری ہی شاعری، کردار نویسی اور ڈرامہ کی اصلیت سے سب ناواقف، آغا حشر کو کون پوچھتا، اول اول ان کی دال نہ گلی، بہت ہاتھ پاؤں مارے، کچھ پلے نہ پڑا،

محفل کا رنگ بدلنا آسان نہ تھا، برسوں خونِ جگر پینا پڑا، پرانی روش میں نئے چراغ جلانے شروع کئے، ڈراموں کی کایا پلٹ کی مکالموں میں نثر داخل کی، شہیدِ ناز، مریدِ شک، کے بعد اسیرِ حرص لکھا، ناٹک کی دنیا میں انقلاب ہو گیا، آغا صاحب پر انگلیاں اٹھنے لگیں، بیس کیس برس کے نوجوان نے پرانے منشیوں کو پرے بٹھا دیا، اب کیا تھا ع ؎ - دنیا کے لوگ دیکھنے والے ہوا کے ہیں، ساری بمبئی میں آغا حشر ہی آغا حشر تھے،

شہرت نے قدم کیا چومے کہ بے پروں کے فضا پر قبضہ ہو گیا، ہر کمپنی کا مالک انہیں اپنی طرف کھینچنے لگا، تقدیر کی یاوری نے حوصلے بڑھا دیئے قدر و قیمت دن دونی رات چوگنی ہوتی جاتی تھی، یہاں تک کہ ہندوستان کے شکسپیئر مشہور ہوئے۔ اور بقائے دوام کا تاج ملا، اُردو ڈرامے کی تاریخ گویا حشر کی سوانحعمری ہے، حشر کو اردو ڈرامے کا خالق کہنا چاہیئے۔ آغاز سے لے کر آج دم تک اردو ڈرامہ جن منازل سے گزرا ہے۔ اور جو ترقیاں اُس نے کی ہیں، سچ پوچھو تو وہ سب حشر ہی کی قلم کاری ہے،

ہندوستان کے اس مایہ ناز فرزند کو کون نہیں جانتا، ناٹک تھیٹروں سے نکل کر سینما کے پردوں پر آگئے ہیں، تاہم حشر کو کوئی نہیں بھولا ان کا سکہ اب تک جاری ہے۔ اردو ڈراموں کے بعد ہندی زبان میں بھی کھیل تیار کئے۔ جن میں سے ہر ایک شاہکار تھا، جوہر قابل ہو۔ تو قدر دانوں کی کیا کمی، قابلیت اپنی جگہ آپ کر لیتی ہے دوسرے منشیوں کی زیادہ سے زیادہ سَو ڈیڑھ سو روپیہ تنخواہ ہوا کرتی تھی۔ حشر نے ایک ڈرامہ نویس منشی کا معیار اتنا بلند کیا۔ کہ میدانِ تھیٹر میں ایک ہزار ایک روپیہ ماہوار آگیا، اور چھ چھ مہینے میں ایک ڈرامہ لکھ کر دیا۔ صرف اپنی ہی عزت نہیں کرائی، بلکہ کردار نگاری کی عظمت قائم کی،

آغا حشر کے ڈرامے لکھنے کا ڈھنگ بھی نرالا تھا، ایک بڑے کمرے میں چلے جاتے۔ ایک منشی ساتھ ہوتا۔ آمد شروع ہوئی۔ اور یہ ٹہلنے لگے۔ کبھی تیز کبھی آہستہ، بولتے جاتے اور منشی لکھتا جاتا۔ جیسا کردار ہوتا، زبان اور لب و لہجہ بھی اسی قسم کا بن جاتا۔ جذبات کی لفظوں میں تصویریں کھینچتے، ایسا معلوم ہوتا۔ کہ جو کچھ یہ کہہ رہے ہیں۔ انہیں پہ گزر رہی ہے، حرکات سکنات آواز کا اتار چڑھاؤ۔ چہرے کی کیفیت برابر بدلتی رہتی، عیش و نشاط کا سماں باندھتے، تو سر سے پاؤں تک شاخِ گل نظر آتے، غم و اندوہ کی باتیں ہوتیں؛ تو ایسی شکل بناتے کہ دیکھنے والے ترس کھانے لگتے۔ غیظ و غضب کے جذبات کا اظہار کرتے۔ تو لوگ ڈر جاتے۔ کئی موقعوں پر تو غصے میں کپڑے پھاڑ ڈالے، خوش قسمتی سے مجھے بھی اُن کے منشی بننے کا فخر نصیب ہوا ہے، آہ اس لئے کوئی میرے دل سے پوچھے۔ کہ وہ ڈرامہ نویسی کی اسٹیج پر کس درجے کے ایکٹر تھے

عام گمان ہے۔ کہ حشر کا حسنِ تخیل بادۂ سرجوش کا رہینِ منت ہے۔ حاشا و کلا، وہ پیتے تھے اور خوب پیتے تھے، اُن کا مشرب تکبیرِ نماز تھا۔ لیکن آپ کو یہ سنکر تعجب ہوگا۔ کہ لکھتے یا لکھواتے وقت انہوں نے کبھی نشہ سے مدد نہیں لی۔ نہ ایک منٹ کے لئے مصنوعی جوش پیدا کیا، قدرت نے انہیں ملکہ ہی ایسا دیا تھا۔ کہ جس کردار میں چاہتے۔ اپنے آپ کو تبدیل کر لیتے، اور جتنی دیر کے لئے جس حالت کی ضرورت

ہوتی۔ اپنے اوپر طاری رکھتے، یہ باتیں ایک شرابی کی بے خودی میں کہاں۔ مکالمہ اردو یا ہندی، نثر میں ہو یا نظم میں، اپنے اثرات کے لحاظ سے اس قدر پیا تُلا اور جوش سے بھرا ہوا ہوتا تھا، کہ حشر کے بعد دیکھنے میں نہیں آیا۔ ابھی منہ سے پھول جھڑ رہے ہیں، ابھی تیر و نشتر برسنے لگے اور پھر بے تکلف بوسے چلے جاتے تھے۔ اسی طرح اردو اور ہندی گانے بنانے میں بھی کمال تھا، ادھر ہارمونیم کے سُر نکلے طبلے پر تھاپ پڑی، ادھر بیٹھے بیٹھے بول رسیلی دھنیں بندھنے لگیں۔ منٹوں میں پڑے سے پڑا گانا تیار ہے، دراصل آغا حشر مرتے ڈرامہ نویس ہی نہ تھے، وہ انسانی رنگین فطرت کا ایک خاص نمونہ تھے، وہ ڈرامہ نگار ہونے کے علاوہ ادب جمیل کے ماہر، شاعر، موسیقی میں باکمال تھے، بلکہ اپنے وقت کا سب سے بڑا ڈائرکٹر بھی کہنا چاہیئے، اس لئے کہ اتنی خوبیاں ہندوستان کے کسی ایک ڈائرکٹر میں جمع نہیں ہوتیں۔ نفسیات کو سمجھتے ہیں۔ مگر جھوٹے جذبات کو الفاظ سے موثر بنانے کو وہ کیا جانیں، ان پر وہ کیفیت ہی نہیں طاری ہوتی۔ جو بناوٹ اور حقیقت میں فرق کرنے والی ہے۔

ناٹک کی زندگی کے زمانے میں آغا صاحب پر ایک دور مذہب پرستی کا بھی گزرا ہے، کوئی یہ نہ سمجھ لے کہ وہ کافر ادب عبا در بر اور رحمٰن مہ بر سر مولوی یا مولوی نما بنگیا تھا، توبہ توبہ! زبان مانجھی تھی، فقرے چست کرتے تھے، پادریوں اور آریوں سے برسوں مڈبھیڑ رہی۔ بمبئی کی انجمن ضیاء الاسلام میں ان کے دم سے رونق تھی۔ کوئی جلسہ ایسا نہ ہوتا، کہ یہ ناٹک کے ایکٹروں کا استاد قومی لیکچرار کے بھیس میں دھواں دھار تقریر نہ کرتا۔ لاہور میں آریہ مندر ان کی گھنٹوں سے گونجا کرتے تھے۔ اور دہلی کے بازاروں میں تو ان کے ہمراہ تماشائیوں کے غول رہتے تھے۔ اکثر یہ اپنے حریفوں پر فتح پاتے، اگرچہ محض زبان آوری، پھبتیوں، ذومعنی فقروں اور حاضر جوابی کی بنا پر [دہلی میں مرکی وآلان کے گرجا میں بحث ہو رہی تھی پادری صاحب نے کہیں یہ کہہ دیا: "کہ تم تو ناٹک کے لونڈے نچانے والے ہو" حشر کو کہاں تاب؟ فوراً منہ بنا کر جواب دیا۔ کہ جی ہاں، اسی لئے تو مذہبی اسٹیج پر تم جیسے ریشائل نچا رہا ہوں" اور حد قہقہہ پڑا۔ دھر پادری صاحب اپنا سا منہ لے کر رہ گئے، اسی گرجا میں ایک مرتبہ کا ذکر ہے، احمد مسیح سے مقابلہ تھا، اعجاز قرآن پر بحث تھی۔ احمد کی زبان سے نکلا کہ تم قرآن کی فصاحت و بلاغت کو لئے پھرتے ہو۔ کہ اس کا جواب کسی سے نہیں لکھا گیا، فیضی نے جو بے نقط تفسیر لکھی ہے۔ اس کا جواب کسی نے دیا؟ آغا صاحب نے بے ساختہ کہا، "لائیے۔ ابھی آپ جتنی کہیں میں بے نقط سنا دوں"]

حشر کی علمی قابلیت معمولی تھی، لیکن ذہن اور حافظہ اس قیامت کا تھا۔ کہ اچھے اچھے صاحب علم لوہا مانتے تھے، سینکڑوں اردو فارسی عربی انگریزی اور بھاشا کے فقرے یاد تھے، ہزاروں ہر مضمون اور ہر مطلب کے اشعار کا ذخیرہ سینے میں تھا، جو کچھ کسی کتاب میں دیکھتے۔ جو بات کہیں سنتے، عمر بھر یاد رہتی۔

ڈرامہ نگار کے ساتھ شاعر کی حیثیت میں بھی حشر میں مستقل تھی، ان نظموں غزلوں اور متفرق اشعار کے سوا جو ان کے ناٹکوں میں پائی جاتی ہیں۔ اگر کوئی جمع کرتا۔ تو ان کا منظوم کلام بھی نوادرات میں شمار ہوتا، "شکریہ یورپ"، ادبی حلقے میں خاص شہرت رکھتی ہے، "موجِ زمزم" نعت میں پر مانہ رامدی حبنت سمجھنی چاہیئے، وقت میں گنجائش ہو نہ ہو، جی نہیں مانتا، کہ بغیر دو چار شعر سنائے آگے بڑھوں۔

امنگیں جن سے اک نشہ سا تھا اب مٹتی جاتی ہیں — اُڑی جاتی ہے ساغر سے شراب مشکبو میری
بہا جاتا ہے تن گھل گھل کے اشکوں کی روانی میں — گرے کٹ کٹ کے دریا کا کنارا جیسے پانی میں
دل چھیدتی ہے شرم سے سمٹی ہوئی نظر — خنجر بنی ہے آپ کی تلوار ٹوٹ کے!
امیدیں مر کے جی اٹھیں تری جھوٹی تسلی سے — ارے بے درد کیوں جینا مرا دشوار کرتا ہے
ایک دھندلا سا قصہ ہے۔ کہ دل بھی تھا یہاں — اب تو سینے میں فقط اک ٹیس سی پاتا ہوں میں
یہ تجھ کو مانگتی ہے۔ بتا میں کہاں سے دوں۔ — شرمندہ ہو رہا ہوں تری آرزو سے میں۔

وہ ملی ملی موج تبسم کی رزشیں ۔۔۔ جنبش ہو جیسے چشمۂ آبِ حیات میں
جنت میں بھی بقائے طرب کی امید کیا ۔۔۔ اک خندۂ خیال ہے ۔ تصویر یار کی
ازل سے چاند کی کرنوں نے جن کو سینچا ہے ۔۔۔ انہیں ستاروں کے پھولوں کا عطر کھینچا ہے
عجیب چیز پلائے سرور پیتے ہیں ! ۔۔۔ ہم آج گھول کے پانی میں زہر پیتے ہیں

کیا کیجئے، حشر کی کہانی اٹھائیس منٹ ۔ ریڈیو والے بھی عجیب ستم ظریف ہیں ۔ خیر العرض، یہ پہلوانِ سخن جس اکھاڑے میں اُترا سُرخرو نکلا اردو تو گھر کی زبان تھی ۔ جتنا اُس میں دودھ اور شہد کی نہریں بہاتے کم تھا، بھاشا میں قلم اٹھائی، تو ہندی لکھنے والوں کو مات کر دیا، اور پنڈت حشر کہلانے لگے ۔

جس طرح آغا حشر مرحوم اپنی ذہنیت میں انوکھے تھے، اسی طرح ان کی معاشرت کا انداز بھی اچھوتا تھا، اور وہ نوحیثیتیں نہایت شاندار، اپنی عظمت کا احساس تھا، مگر بڑائی اور غرور سے متنفر، خلوص و محبت کے بندے، سخن ناشناس سے ہمیشہ ناراض رہتے ان کے غصے میں عداوت نہ تھی، اور عداوت بالکل بے ضرر مہمان نواز اور رحم مجسّم تھے ۔ خوش پوشی ان کی زندگی کا لازمہ تھا، کوٹ پتلون بھی پہنتے ۔ اور لکھنوی ٹھاٹھ بھی رکھتے ۔ جاڑوں میں عموماً سیاہ سرج کا سوٹ ہوتا جو گو ۔ رنگ کی جرابیں، گرمیوں میں چکن کا انگرکھا اور آڑا پاجامہ ۔ شوز بوٹ سے سلیم شاہی کا مدار جوتی بھی بدلتی رہتی، ترکی ٹوپی اتار کر کبھی کبھی دو پلڑی ٹوپی بھی پہننے لگے، پان سے منہ لال تھا حقے کے بہت شوقین تھے وہ باتیں اور چارکش، سنہری کمانی کی عینک بھی چہرے کی زینت میں داخل تھی ۔

کمانے پینے میں حشر بڑے کھلے دل کے آدمی تھے، یاروں کے یار اور کنبہ پرور، ہزاروں روپیہ کمایا ۔ اور جس طرح کمایا ۔ اسی طرح اُڑایا اور روز امیر تو دو روز فقیر، پنجاب اور اہلِ پنجاب سے خاص لگاؤ تھا، کہا کرتے کہ پنجاب مجھے اپنی طرف کھینچتا ہے ۔ اور میں کھنچتا ہوں، آخر پنجاب کی کشش زبردست رہی، لاہور کی خاک نے انہیں کھینچا، اور ایسا کہ قیامت تک اب نہیں نکل سکتے، کلکتہ سے دل برداشتہ ہو کر آخری زمانے میں لاہور آ گئے تھے ۔ سنیما کا تھیٹر پر غلبہ ہو چکا تھا، اُنہوں نے بھی ادھر توجہ کی، ایک فلم کمپنی کی بنیاد ڈالی، کام جاری ہوا، ساتھی کچے پیندے کے نکلے، سرمایہ بکھر گیا، ساتھ ہی حضرت کی صحت نے جواب دے دیا ۔ فکر نے پکڑ لیا ۔ ذیابیطس کے حملوں سے زندگی تلخ ہو گئی، اگر یہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو جاتے، تو خدا جانے ان کے طیار کئے ہوئے فلم کیسی قیامت برپا کرتے، لیکن خدا کو یہ منظور نہ تھا ۔ چھ سات مہینے بیماری سے لڑتے رہے، تابہ کے، انجام کار جس دن سے ڈرتے تھے، آ گیا، تین سال ہوئے اپریل کا مہینہ تھا، کہ ہمارے تھیٹر کا چراغ بجھ گیا، پنجاب کی مٹی بھی لاہور کی خاک میں جا ملی، ؎ عمر بھر روؤ عمر بھر پیٹو ―― ایسے بچھڑے کہیں ملے بھی ہیں،

ایک شاعر سے دل کی تسکین کے لئے اور کیا ممکن ہے، مرثیہ لکھے یا تاریخ نکالے، یہی اُس کی آہیں ہیں ۔ اور یہی اُس کے آنسو ۔ میں نے مرثیہ بھی لکھا تھا ۔ اور تاریخ بھی کہی تھی، تاریخ سن لیجئے ۔ اور اسی پر مضمون کا خاتمہ ہے ؎

ہوئی ختم تمثیل ہستیٔ فانی ۔۔۔ گرا پردۂ مرگ بے رو و کد اب
تپش کس قیامت کا بدلا ہے منظر ۔۔۔ تماشہ گہِ حشر ہے یہ لحد اب ۔

۱۳۵۴ھ

مجھے زندگی کی دُعا دینے والے ۔۔۔ ہنسی آ رہی ہے تری سادگی پہ

(گوپال متل)

ابراہیم شمیم - ایم۔ اے

صنعتی نفسیات

نفسیات دنیا کی تمام سائینسوں سے کمتر سائنس ہے۔ بیسویں صدی کے ابتداء سے لے کر آج تک جو اس نے حیرت انگیز ترقی کی ہے اُسے تمام پرانی سائنسیں رشک کی نگاہ سے دیکھتی ہیں۔ کوئی سائنس پبلک کی توجہ کو کھینچ نہیں سکتی۔ جبکے اصول عوام کو فائدہ نہ پہنچا سکیں۔ جونہی نفسیات نے اپنے آپ کو فلسفہ کے چنگل سے چھڑایا، تو اسکے اصول زندگی کے مختلف شعبوں میں استعمال ہونے لگے۔ نفسیاتی تجربہ گاہوں میں ذہنی امراض کا علاج نہایت کامیابی سے ہو رہا ہے تعلیمی اداروں میں اُس کی بدولت جو اطمینان بخش تبدیلی اور ترقی ہوئی ہے۔ اس کا عملی ثبوت جدید انداز کے سکول ہیں۔

صنعتی نفسیات کا سب سے پہلا کام صنعت سے متعلقہ تمام حالات کا گہرا مطالعہ کرنا ہے۔ صنعتی ماحول میں بہت سی باتیں شامل ہیں۔ مثلاً اگر کوئی شخص کسی صنعت میں جانا چاہتا ہے۔ تو اس کا نفسیاتی امتحان کرکے بتانا کہ وہ کس قسم کی صنعت کا اہل ہے ہندوستان میں صنعت یا پیشے کا انتخاب حالات اور ماں باپ پر ہوتا ہے لیکن ترقی یافتہ ملکوں میں ہر شخص کو ہر بات کا اہل نہیں سمجھا جاتا۔ مختلف نفسیاتی امتحانوں سے اُسکی فطری صلاحیتوں کا جائزہ لے کر اسے بتایا جاتا ہے۔ کہ وہ فلاں قسم کے کاموں کے لئے موزوں ہے۔ اسلئے وہ زندگی کے قیمتی وقت کے ساتھ تجربے کرنے سے بچ جاتا ہے۔

اگر کارخانہ میں کوئی جگہ خالی ہو، جسکے بہت سے امیدوار ہوں تو اُن امیدواروں کا نفسیاتی امتحان لے کر فیصلہ کرنا کہ کون امیدوار اس خاص جگہ کے لئے موزوں ہوگا۔

ایسی مؤثر تدابیر کا اختیار کرنا جس سے مزدوروں کی تھکاوٹ دور ہو سکے۔ ایسی تدابیر کا دریافت کرنا جس سے مزدوروں کو بیش از بیش کام کرنے کی اندرونی تحریک اور تشویق ہو سکے مزدوروں کی ناخوشی، عدم اطمینان اور چڑچڑاپن کے اسباب اور علاج دریافت کرنا۔ فضول بدنی اور اعصابی حرکات کو کم کرنا: تاکہ مزدور جلد تھک نہ جائیں۔ روشنی۔ ہوا۔ اور درجۂ حرارت کا جائزہ لینا۔ کہ ضرورت سے کم یا زیادہ تو نہیں۔

اس طرح بہت سی ایسی باتیں جو بظاہر معمولی معلوم ہوتی ہیں لیکن انکے نتائج بالآخر بہت گہرے ہوتے ہیں۔ انکا بغور مطالعہ کیا جاتا ہے۔ صنعتی نفسیات کا سب سے بڑا مقصد زیادہ سے زیادہ پختہ مال تیار کروانا نہیں۔ بلکہ مزدور کو اسکے کام پر زیادہ سے زیادہ سہولیت بہم پہنچانا ہے۔ آرام محض بدنی ہی نہیں بلکہ ذہنی بھی۔

آج سے قریباً پچاس سال پہلے کلدار مشین اور جاندار مزدور میں چنداں فرق نہیں سمجھا جاتا تھا۔ مزدور سے کام لیتے وقت اُسکے جذبات احساسات اور فطری محرکات کو نظر انداز کر دیا جاتا تھا۔ آج حقیقی نفسیات کی بدولت ان تمام باتوں کو پوری اہمیت دی جاتی ہے۔ مزدور کا ذہنی ماحول جس میں مزدور کا تعلق مشین سے اور مزدور کا مزدور سے اور اُس کا مادی ماحول جس میں اسکے کام کرنے کی جگہ۔ اُسکے اوزار، تنخواہ اور دیگر اشیا مشاغل ہیں۔ اگر یہ دونوں طرح کے ماحول یا ان میں سے کوئی ایک مزدور کو سازگار نہ ہو ممکن ہے۔ مزدور بظاہر خاموشی سے کام کرتا چلا جائے۔ لیکن پختہ مال کے تیار ہونے کی رفتار اور مقدار پر یقیناً اُس کا بُرا اثر پڑتا ہے بعض مزدور ایک خاص مشین پر کام کرتے کرتے اُسے اپنا لیتے ہیں۔ انہیں اس مشین سے ہٹا لینا بسا اوقات نقصان دہ ثابت ہوتا ہے۔

پہلے یہ خیال ذہن نشین تھا۔ کہ ایک مزدور جتنے گھنٹے کام کرتا رہیگا۔ اُسی مقدار سے وہ مال زیادہ تیار کریگا۔ مثلاً ایک شخص اگر ۱۰ گھنٹے کام کرے۔ تو وہ دس گھنٹے کام کرنے والے مزدور سے

زیادہ مال تیار کریگا۔ لیکن صنعتی نفسیات نے اب عملی طور پر ثابت کردیا ہے۔ کہ اس میکانکی اصول کا اطلاق انسان پر نہیں ہو سکتا۔ ایک مشین جب اُسکے پیچ و پرزے سلامت ہیں۔ جتنی دیر زیادہ کام کرتی چلی جائے گی۔ اسی نسبت سے مال زیادہ تیار ہوتا جائیگا۔ لیکن انسانی جسم ایک خاص وقت تک کام کرنے کے بعد ستانے اور آرام لینے کی ضرورت محسوس کرتا ہے۔ اگر اُسے یہ میسر نہ آئے۔ تو کام کی صلاحیت اور مقدار دونوں میں قابلِ محسوس کمی واقع ہو جاتی ہے۔ یہ صنعتی نفسیات کی بدولت ہے۔ کہ آج کارخانوں میں مزدور آٹھ گھنٹوں سے زیادہ کام نہیں کرتے۔ اور اس میں بھی تفریح کا وقفہ لازمی ہوتا ہے۔

صنعتی نفسیات کے ماہر کے پیش نظر ایک اور مسئلہ بھی ہوتا ہے وہ کارخانہ دار اور مزدور کے تعلقات کو خوشگوار بنانا ہوتا ہے آئے دن کی ہڑتالیں ظاہر کرتی ہیں۔ کہ کارخانہ دار اور مزدور میں کچھ غلط فہمیاں ہیں۔ ان غلط فہمیوں کے اسباب کا مطالعہ اور اُن کا ازالہ ضروری ہوتا ہے۔ عدمِ اطمینان کے اسباب تو بہت سے ہو سکتے ہیں۔ لیکن اس کا نتیجہ صرف ایک ہوتا ہے "ناخوش مزدور اور بُرا کام"۔

صنعتی نفسیات کا کام کارخانہ کی چار دیواری تک ہی محدود نہیں ہوتا۔ لوگوں کے مذاق کا مطالعہ۔ پروپیگنڈا، اشتہار بازی، اور پختہ مال کی کھپت کے ذرائع سوچنا بھی اس کے فرائض میں شامل ہیں۔ مغرب نے نفسیات کے ان جدید اصولوں سے بہت فائدہ اٹھایا ہے۔ لیکن ہندوستان میں ابھی اس کی ضرورت محسوس نہیں کی جا رہی

گالزوردی

گالزوردی کیلئے تاجر یا سیاسی ہو جانے کے پورے امکانات تھے۔ وہ سب کچھ ہو سکتا تھا۔ لیکن ادیب ۲۸ سال کی عمر تک اسے اشاعت کیلئے لکھنے کا خیال پیدا نہ ہوا۔ اس نے صرف اپنی ہونیوالی بیوی کی خاطر لکھنا شروع کیا۔ اس نے چھنگٹیا قسم کے افسانے لکھے۔ دو ایک ناول بھی گھسیٹ ڈالے۔ لیکن آخر کار اسے ایک افسانے کا معاوضہ پندرہ پونڈ کی صورت میں مل ہی گیا۔ سنہ ۱۹۰۲ء تک وہ اپنے ادبی ذوق کی تسکین پر بہت کچھ خرچ کرتا رہا۔ سنہ ۱۹۰۴ء میں اس نے اپنے نام سے پہلی کتاب شائع کی۔ آئندہ تین سال کی شبانہ روز محنت کے بعد اس نے دوسری کتاب "صاحب اثاثہ" لکھی۔ اس کتاب کی نو ہزار جلدیں بہت تھوڑے وقت میں فروخت ہو گئیں۔ اس کتاب میں گالزوردی نے وکٹوریہ کے عہد کے ادب اور تمدن کے خلاف بغاوت کی ہے۔ یہ ناول ایک طنزیہ تضحیک ہے۔ اس زمانہ کے دولت مندانہ تمدن کی۔ مخالفت ہے اس زمانے کے اس خیال کی۔ کہ ہر چیز کو دولت کی میزان میں تولنا چاہیئے۔ اسے اپنے الفاظ میں یہ کتاب "قومی اخلاقیات" کے خلاف اعلان جہاد ہے

اس کتاب کے لئے موزوں موقعہ پیدا ہو چکا تھا انیسویں صدی کے خاتمہ کے ساتھ ہی وکٹوریہ کے عہد کی روایات مٹ رہی تھیں ویلز اس دور کو علمی ہیجان کا دور بتاتا ہے "ملکہ وکٹوریہ ایک بہت بڑے پیپر ویٹ کی طرح انسانوں کے ذہن کو دبائے ہوئے تھی۔ اس کی موت کے بعد لوگوں کے خیالات نے اڑنا شروع کر دیا،، ویلز اور برنارڈ شاہ بھی اس آندھی میں اڑنے لگے۔ گالزوردی بھی انہی لوگوں میں سے تھا۔ ان تینوں نے پردے اٹھا دیئے گھروں کے دروازے کھول دیئے۔ اشرافیہ کی جگہ ناولوں میں عام لوگ پیش کئے جانے لگے ہیرو کی تلاش میں فلک بوس ویرانوں کی جگہ ان محرروں کو کارخانوں، بازاروں اور کوچوں میں جانا پڑا۔ عہدِ وکٹوریہ کے ادب سے یہ کھلم کھلا علیحدگی تھی۔ انہوں نے عوام کو حقائق سے آشنا کیا۔ بلکہ امراء کو اس کی مصنوعی زندگی سے آگاہ کیا۔

پروفیسر عبدالبصیر پال

نظریۂ اضافیت

نظریۂ اضافیت مشہور جرمن سائینسدان البرٹ آئن شٹائن کی جدت اور بلند خیالی کا ایک پرتو اور بیسویں صدی کا سب سے بڑا علمی کارنامہ سمجھا جاتا ہے۔ اس نظریہ نے دنیائے سائنس میں ایک انقلاب پیدا کر دیا ہے۔ انیسویں صدی کی سائنس کے بنیادی قیاسات کو انسانی غلط فہمیوں کا ایک بے معنی انبار ثابت کیا ہے۔

آئن شٹائن کے خیالات کو سمجھنے کے لئے ضروری ہے۔ کہ پہلے ہم سائنس کی تاریخ پر ایک نظر ڈالیں۔ سائنس کی صحیح ابتدا یونانی فلسفیوں نے کی۔ اسکولوں میں جو اقلیدس پڑھائی جاتی ہے۔ وہ یونانی علوم کی ایک شاخ ہے۔ اقلیدس میں جو چیز ہمارے نزدیک قابلِ غور ہے۔ وہ خطِ مستقیم کا قیاس ہے۔ اسکول کے طالب علم یہ سمجھتے ہیں۔ کہ خطِ مستقیم کو ہم جتنا چاہیں۔ لمبا کر سکتے ہیں۔ یعنی اگر اس خط کو بڑھاتے چلے جائیں۔ تو فضا میں کوئی ایسا مقام نہیں آئے گا۔ جہاں پہنچ کر اس خط کی لمبائی ختم ہو جائیگی۔

یونانی فلسفیوں نے اشیاء کی حرکت کا مطالعہ تو کیا۔ لیکن مکینکس یعنی اشیاء کی حرکت کے علم میں کوئی خاص بات معلوم نہ کی۔ مکینکس کی صحیح ابتدا گلیلیو اور نیوٹن کے زمانے سے شروع ہوئی نیوٹن نے بتایا۔ کہ جو چیز مادے میں حرکت پیدا کرتی ہے۔ وہ قوت ہے۔ مثلاً جب آپ ایک فٹ بال کو کِک لگاتے ہیں۔ تو آپ کی قوت سے فٹ بال میں حرکت پیدا ہو جاتی ہے۔ نیوٹن نے جب مادی چیزوں کو زمین پر گرتے دیکھا۔ تو خیال کیا۔ کہ زمین مادی اشیا کو اپنی طرف قوت یا زور لگا کر کھینچتی ہے۔ اسکے بعد نیوٹن نے اپنا مشہور "قانونِ تجاذب" پیش کیا۔ اور بتایا کہ یہ قوت عالمگیر ہے۔ یعنی فضا میں ہر ایک مادی جسم دوسرے مادی اجسام پہ زور لگا کر انہیں اپنی طرف کھینچنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ نیوٹن کے قیاس کو سب سائنسدان صحیح خیال کرتے تھے۔ کیونکہ اس قیاس سے سیاروں کی حرکت کی توجیہہ ہو سکتی ہے۔ نیوٹن نے فضا کو "مطلق" تصور کیا یعنی فضا بذاتِ خود ایک علیحدہ چیز ہے۔ اور اس میں مادے کا ہونا یا نہ ہونا کوئی تبدیلی پیدا نہیں کرتا۔ نیز فضا ہر طرف پھیلی ہوئی ہے اور اس کی وسعت کی کوئی انتہا نہیں۔ نیوٹن نے وقت کو بھی مطلق تصور کیا۔ یعنی وقت کی رفتار ہر جگہ ایک ہی ہے۔ اور اس میں مادے کی حرکت سے کوئی تبدیلی نہیں ہوتی۔ نیوٹن نے مکینکس کی ساری عمارت انہیں بنیادی قیاسات پر قائم کی۔ اور نیوٹن کے بعد مکینکس کا علم بڑی کامیابی اور سرعت کے ساتھ ترقی کرنے لگا۔

انیسویں صدی میں سائنسدانوں کو ایک نئے قیاس کی ضرورت محسوس ہوئی۔ تجربوں سے معلوم ہوا۔ کہ گرمی اور روشنی ایک قسم کی لہریں ہیں جو فضا میں ۱۸۶۰۰۰ میل فی سیکنڈ کی رفتار سے چلتی ہیں۔ آپ جانتے ہیں۔ روشنی اور گرمی دُور دُور کے ستاروں سے چل کر ہماری زمین تک آتی ہیں۔ اب سوال پیدا ہوتا ہے۔ کہ گرمی اور روشنی کی لہریں کس چیز سے گزر کر آتی ہیں؟ خیال کیا جاتا ہے کہ یہ لہریں ایتھر میں سے گزر کر آتی ہیں۔ جو ایک غیر مادی چیز ہے اور سارے عالم میں ہر جگہ موجود ہے۔ ایتھر بالکل ساکن ہے۔ اس میں ہماری زمین، چاند، سورج اور ستارے ایسے حرکت کر رہے ہیں۔ جیسے ایک وسیع سمندر میں ننھی ننھی مچھلیاں، ریڈیو کی لہریں بھی ایتھر میں پیدا ہوتی ہیں۔ اور اس میں روشنی کی رفتار سے چلتی ہیں۔ یعنی ایک سیکنڈ میں ریڈیو کی لہریں ۱۸۶۰۰۰ میل طے کر لیتی ہیں۔

۱۸۵۱ء میں فزو نے ایک تجربہ کیا۔ جس سے یہ ظاہر ہوا۔ کہ بہتے ہوئے پانی میں روشنی کی رفتار تیز ہو جاتی ہے۔ اس سے یہ نتیجہ نکالا گیا۔ کہ بہتا ہوا پانی ایتھر کو اپنے ساتھ گھسیٹتا ہے۔ یعنی ایتھر کو

اپنے ساتھ زور سے بہا کر لے جاتا ہے۔ روشنی کی لہریں بھی ایتھر کے ساتھ گھسٹتی جاتی ہیں۔ اس لئے اُن کی رفتار تیز ہو جاتی ہے۔ اس تجربے کے بعد یہ خیال پیدا ہوا کہ ہماری زمین ایتھر میں حرکت کرتی ہوئی ایتھر کو اپنے ساتھ ضرور گھسیٹتی ہوگی۔ اس لئے زمین کی حرکت کی سمت میں روشنی کی رفتار تیز ہونا چاہیئے۔ اگر روشنی کی رفتار میں یہ تبدیلی تجربے سے معلوم کی جائے۔ تو پھر زمین کی اصلی حرکت کا پتہ لگ جائے گا۔ یعنی ہمیں یہ معلوم ہوگا۔ کہ ہم زمین پر سوار ہو کر فضا میں کس طرف اور کتنی رفتار سے حرکت کر رہے ہیں۔ چنانچہ یہ تجربہ پہلے ۱۸۸۱ء میں کیا گیا۔ لیکن تمام سائنسدانوں کی توقع کے خلاف زمین کی حرکت سے روشنی کی رفتار میں کوئی تبدیلی معلوم نہ ہوئی۔ ۱۸۸۷ء میں مائیکلسن اور مارلے نے یہ تجربہ زیادہ احتیاط سے دوبارہ کیا۔ لیکن تجربہ پھر ناکام رہا۔ یعنی روشنی کی رفتار میں کوئی تبدیلی معلوم نہ ہوئی یہی تجربہ بعد میں کئی مقامات پر بار بار دہرایا گیا۔ لیکن قدرت نے ہر بار یہی جواب دیا۔ کہ زمین کی حرکت سے روشنی کی رفتار بالکل نہیں بدلتی۔ چنانچہ مائیکلسن اور مارلے کے تجربے نے سائنسدانوں کو سخت پریشان کیا۔ اور اس تجربے کی ناکامی کا راز کسی کی سمجھ میں نہ آسکا۔

۱۹۰۵ء میں آئن سٹائن نے اس مشہور تجربے کی ناکامی کی وجہ بیان کی۔ سب سائنس دان اس غلط فہمی میں مبتلا تھے۔ کہ وقت مطلق ہے۔ یعنی وہ یہ خیال کرتے تھے۔ کہ وقت کی رفتار ساکن ایتھر اور متحرک زمین دونوں کے لئے ایک ہی ہے۔ اگر وقت واقعی ایسا ہوتا۔ تو زمین کی حرکت سے روشنی کی رفتار ضرور بدلتی۔ لیکن تجربے سے روشنی کی رفتار میں کوئی تبدیلی ثابت نہیں ہوتی۔ اس لئے نیوٹن کا یہ قیاس کہ وقت مطلق ہے بالکل غلط ہے۔ وقت دراصل اضافی ہے یعنی وقت کا اندازہ ساکن چیزوں کے لئے اور ہے۔ اور متحرک چیزوں کے لئے اور۔ آئن سٹائن نے ریاضیات سے دریافت کیا۔ کہ رفتار کی تیزی سے وقت کا اندازہ کیسے بدلتا ہے فرض کیجئے آپ ایک پلیٹ فارم پر سیر کر رہے ہیں۔ اور آپ کے سامنے سے ایک گاڑی گزر رہی ہے۔ جس کی رفتار ۱۸۶۰۰۰ میل فی سیکنڈ ہے۔ آپ دیکھیں گے کہ پلیٹ فارم کی گھڑی اور چلتی گاڑی کی گھڑی ایک ہی رفتار سے نہیں چلتی جتنے وقت میں پلیٹ فارم کی گھڑی ۱۰ منٹ ظاہر کرے گی۔ اتنے ہی وقت میں چلتی گاڑی کی گھڑی ۲۰ منٹ ظاہر کرے گی۔ اس سے ظاہر ہے کہ وقت کا اندازہ پلیٹ فارم کے مسافر کے لئے اور ہے۔ اور چلتی گاڑی کے مسافر کے لئے اور۔ کیونکہ جو وقت پلیٹ فارم کے مسافر کو ۱۰ منٹ معلوم ہوگا۔ وہی وقت چلتی گاڑی کے مسافر کو ۲۰ منٹ معلوم ہوگا۔ وقت کے ساتھ اشیا کے طول کا اندازہ بھی بدل جائیگا۔ جو چیز چلتی گاڑی کے مسافر کو گاڑی کے اندر دو فٹ لمبی نظر آئے گی۔ وہی چیز پلیٹ فارم کے مسافر کو صرف ایک فٹ لمبی نظر آئے گی۔

وقت اور اشیا کے طول کے اندازوں کا اختلاف چلتی گاڑی کی رفتار پر منحصر ہے۔ رفتار جتنی تیز ہوگی۔ اُتنا ہی یہ اختلاف زیادہ نظر آئے گا۔ جو گاڑیاں ہم روزانہ زندگی میں دیکھتے ہیں۔ اُن کی رفتار بہت کم ہوتی ہے۔ اس لئے ہمیں پلیٹ فارم اور چلتی گاڑی کے وقت اور لمبائی کے اندازوں میں کبھی فرق محسوس نہیں ہوتا۔ تاہم یہ فرق ضرور ہوتا ہے۔ اگرچہ اتنا تھوڑا ہوتا ہے۔ کہ ہمیں اس کی خبر تک نہیں ہوتی۔

ہماری زمین کی حرکت سے وقت اور فاصلے کی قدریں بدل تو جاتی ہیں۔ لیکن ایک ایسے انداز سے بدلتی ہیں۔ کہ ہمیں روشنی کی رفتار میں کوئی تبدیلی نظر نہیں آتی۔ روشنی کے علاوہ دیگر قدرتی مظاہر کا بھی یہی حال ہے۔ یعنی زمین کی یکساں رفتار سے اُن میں کوئی تبدیلی نظر نہیں آتی۔ بس قدرتی مظاہر ایسے واقع ہوئے ہیں۔ کہ جس طرح یہ ایک ساکن نظام میں نظر آتے ہیں۔ بالکل اُسی طرح یہ اُس نظام میں نظر آئینگے۔ جو ایک یکساں رفتار کے ساتھ حرکت کر رہا ہو۔ یہ بات نظریۂ اضافیت کا ایک بنیادی اصول ہے۔ جسے آئن سٹائن نے ۱۹۰۵ء میں اپنے خاص نظریۂ اضافیت میں بیان کیا۔

نیوٹن کے قیاس کے مطابق چیزیں زمین پر اس لئے گرتی

ہیں۔ کہ زمین انھیں اپنی طرف قوت یا زور لگا کر کھینچتی ہے۔
لیکن آئن شٹائن کو ایسی قوت کی موجودگی میں شک پیدا ہوا چنانچہ آئن شٹائن نے ۱۹۱۵ء میں اپنا "عام نظریۂ اضافیت" پیش کیا۔ جس میں اشیاء کے زمین پر گرنے کی ایک نئی وجہ بیان کی۔ اس نظریے کے مطابق زمین پر قوت یا زور نہیں لگاتی۔ بلکہ چیزیں خود بخود گرنے پر آمادہ ہو جاتی ہیں۔ جب فضا خالی ہوتی ہے۔ تو چیزیں سیدھی حرکت کرتی ہیں۔ جیسے ایک سیدھی ریلوے لائن پر گاڑی سیدھی چلتی ہے۔ لیکن جب فضا میں کوئی مادی جسم موجود ہوتا ہے۔ تو یہ جسم فضا کو ٹیڑھا کر کے بنا دیتا ہے اور چیزیں اس ٹیڑھی فضا میں ٹیڑھی حرکت اختیار کر لیتی ہیں۔ جیسے ایک ٹیڑھی لائن پر گاڑی کی حرکت بھی خود بخود ٹیڑھی ہو جاتی ہے۔

چونکہ زمین مادے کا ایک تودہ ہے۔ اسلئے زمین کے اردگرد کی فضا ٹیڑھی ہے۔ جب ہم ایک پتھر زور سے پھینکتے ہیں۔ تو پتھر زمین کے اردگرد کی ٹیڑھی فضا میں سیدھا نہیں گھوم سکتا بلکہ اس کی حرکت ٹیڑھی ہو جاتی ہے۔ اور ہمیں پتھر زمین پر گرتا معلوم ہوتا ہے۔ مادے سے فضا میں جو ٹیڑھا پن نمودار ہوتا ہے اُس کا ہمارے خیال میں صحیح نقشہ نہیں بن سکتا۔ اس تبدیلی کو صرف ریاضی کے پیچیدہ مسائل ہی بیان کر سکتے ہیں۔

لیکن فضا کی یہ تبدیلی ایک فرضی قیاس نہیں۔ تجربہ اس کی تصدیق کرتا ہے۔ سورج کی مثال لیجئے۔ سورج مادے کا ایک بہت بڑا تودہ ہے۔ اس لئے اس کے اردگرد کی فضا کافی ٹیڑھی ہونا چاہیئے۔ ظاہر ہے۔ اگر اس ٹیڑھی فضا میں روشنی کی شعاعیں گزریں۔ تو اُن کی حرکت کا رخ بدل جائے گا۔ چنانچہ آئن شٹائن نے نظریۂ اضافیت سے یہ نتیجہ نکالا۔ کہ سورج کے قریب سے گزرنے والی شعاعیں سیدھی نہیں چلتیں۔ بلکہ اُن کے رخ میں کچھ تبدیلی پیدا ہو جاتی ہے۔ ۱۹۱۹ء میں اس عجیب خیال کی تصدیق کے لئے تجربے کئے گئے۔ اور تجربوں سے صاف ظاہر ہوا۔ کہ روشنی کی شعاعیں سورج کے قریب سے گزرتی ہوئی واقعی اپنا رخ بدل لیتی ہیں۔ اور رخ کی تبدیلی عین آئن شٹائن کے حساب کے مطابق ہوتی ہے۔ اس تجربی تصدیق سے نظریۂ اضافیت بہت مشہور ہو گیا۔ اور ۱۹۲۱ء میں آئن شٹائن کو نوبل پرائز ملا۔

نیوٹن کے قیاس کے مطابق سیاروں کی گردش کی وضاحت کامیابی کے ساتھ کی گئی تھی۔ لیکن ایک سیارے کی حرکت میں ایک ایسی بے قاعدگی معلوم ہوئی۔ جسے نیوٹن کا قیاس دریافت کرنے میں ناکام رہا۔ لیکن آئن شٹائن نے اپنے نئے قیاس کے مطابق اس غیر معمولی بے قاعدگی کی وضاحت نہایت کامیابی کے ساتھ کی۔ اس لحاظ سے آئن شٹائن کا قیاس نیوٹن کے قیاس سے زیادہ کامیاب ثابت ہوا ہے۔

سائنس والوں کا مدت سے خیال تھا۔ کہ مادہ ایک غیر فانی چیز ہے۔ لیکن نظریۂ اضافیت نے اس خیال کو غلط ثابت کیا ہے۔ اس نظریے کے مطابق مادہ فنا ہو کر روشنی اور گرمی میں تبدیل ہو سکتا ہے۔ چنانچہ قیاس کیا جاتا ہے۔ کہ یہ عمل سورج میں جاری ہے یعنی سورج کا مادہ آہستہ آہستہ فنا ہو کر روشنی اور گرمی پیدا کر رہا ہے۔ یہی وجہ ہے۔ کہ سورج کروڑوں سال سے برابر چمک رہا ہے۔ اور ابھی تک ٹھنڈا نہیں ہوا۔ مادے کی اس تبدیلی سے سورج کا وزن ایک سیکنڈ میں چالیس لاکھ ٹن گھٹ جاتا ہے! اگر سورج کے وزن کے گھٹنے کی رفتار یہی رہی۔ تو پھر بھی سورج کروڑہا سال تک ٹھنڈا نہیں ہو گا۔ کیونکہ سورج کا موجودہ وزن ۲۰۰۰۰ لاکھ سنکھ ٹن ہے!

چونکہ فضا میں ستارے بکھرے ہوئے ہیں۔ اس لئے ساری فضا ہر جگہ تھوڑی بہت ٹیڑھی ہے۔ ایسی ٹیڑھی فضا میں سیدھا خط کھینچنا ناممکن ہے۔ جس طرح ٹیڑھی لائن پر گاڑی کا سیدھا چلنا ناممکن ہے۔ پس خطِ مستقیم کا جو قیاس اسکولوں کی جومیٹری میں بیان کیا جاتا ہے۔ ایک غلط اور ناممکن بات ہے۔

اگرچہ فضا کی وسعت بہت زیادہ ہے۔ لیکن یہ لاانتہا نہیں۔ اگر ایک جسم فضا میں حرکت کرتا ہے۔ تو آخرکار وہ

ساری فضا کی سیر کرتا ہوا اپنے پہلے مقام پر واپس آ جائے گا۔ اگر ہم ساری فضا کا مقابلہ زمین سے کریں۔ تو فضا کی وسعت کا اندازہ لگ جائے گا۔ روشنی کی رفتار اس قدر تیز ہے۔ کہ روشنی ہماری زمین کے گرد ایک سیکنڈ میں تقریباً آٹھ چکر لگا سکتی ہے۔ لیکن زمین کے مقابلے میں فضا اتنی وسیع ہے۔ کہ اس میں صرف ایک چکر لگانے کے لئے روشنی تقریباً ۱۰ کروڑ سال تک چلتی رہے گی!

۱۹۱۵ء کے نظریۂ اضافیت میں ایک خامی بھی ہے۔ یہ نظریہ برقی مقناطیسی مظاہر کی وضاحت نہیں کرسکتا۔ اسی خامی کو مدِ نظر رکھتے ہوئے آئن شٹائن اور اُن کے ساتھی ۱۹۲۹ء سے ایک ایسے نئی قسم کے نظریۂ اضافیت کی تلاش میں مصروف ہیں۔ جو تمام قدرتی مظاہر کی توجیہہ کر سکے۔ ابھی تک ایسا کامیاب اور عالمگیر نظریہ پیش نہیں کیا گیا۔ ناکامی کی ایک وجہ یہ ہے۔ کہ ہمارا برقی مقناطیسی مظاہر کا علم ابھی ابتدائی مرحلے طے کر رہا ہے۔ اور ایسی صورت میں ایک صحیح اور مستقل رائے کا قائم کرنا بہت دشوار ہے۔

آئن شٹائن

۱۸۷۹ء میں پیدا ہوا۔ اسے اس جرم پر کہ وہ یہودی والدین کے ہاں پیدا ہوا۔ اسے نازیوں نے جرمنی سے نکال دیا ہے ۱۹۰۹ء میں اس نے زیورچ یونیورسٹی سے پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری لی۔ اسی سال نے اسنے اپنے تجربات کو کتابی صورت میں شائع کیا۔ یہ کتاب اتنی مقبول ہوئی۔ کہ اسے زیورچ یونیورسٹی میں پروفیسر بنا دیا گیا۔ "پراگ کی انجمن ماہرانِ طبیعت"، کی اسے صدارت پیش کی گئی۔ ۱۹۱۲ء میں جرمن حکومت کی طرف سے اس کا وظیفہ مقرر ہوا۔ ۱۹۲۱ء میں اسے نوبل انعام ملا۔ آئن شٹائن صرف ماہر طبیعات اور ریاضی دان ہی نہیں۔ بلکہ اعلیٰ درجہ کا مغنی اور مصور بھی ہے۔ اس کا خیال ہے۔ کہ اگر وہ ریاضی دان نہ ہوتا تو مغنی ہوتا۔ اس کے چہرے کی ساخت اور اسکے تاثرات بھی اس حقیقت کے غماز ہیں کہ وہ بہت بڑا مغنی ہے۔ عملی زندگی میں بھی اس کی یہ حالت ہے۔ کہ جب اسے کام سے فرصت ملتی ہے تو فوراً بیدسے کر بیٹھ جاتا ہے۔ اور خوب بجاتا۔ اسے کشتی چلانے سے بھی بہت زیادہ دلچسپی ہے۔

اس کا ایک دوست لکھتا ہے۔

"جب آئن شٹائن اپنے سر کے گرد نہایت بے ترتیبی سے تولیہ باندھ کر سیر کے لئے نکلتا ہے۔ کہ وہ ایک یونیورسٹی پروفیسر معلوم ہونے کی بجائے ایک لکڑی ڈاکو سے زیادہ مشابہ ہوتا ہے" (معلوماتِ سائنس)

ظہور الحسن ڈار

ابنِ آدم عالمِ تنہائی میں

آج رات میں مکان کی چھت پر کھڑا قدرت کی بکھرتی ہوئی رنگینیوں کا تماشا کر رہا تھا۔ کہ قریب کے مکان پر میں نے ایک حسین جوانسال لڑکی کو چھت پر کچھ بے خودی کے عالم میں کھڑے دیکھا۔ گویا وہ زندگی کی تمام دکھوں سے نجات پانے کے لئے چھت سے کودا چاہتی ہے۔ یکایک اُس نے آسمان کی طرف سر اٹھایا۔ اور اپنی ننھی سی گلابی زبان نکال کر چاند کا منہ چڑانا شروع کر دیا۔ چاند آہستہ آہستہ دودھیا سپید بادلوں میں سے گزر رہا تھا ہوا غیر معمولی طور پر معطر تھی۔ اور اس عالم رنگ و بو میں ایک پیکر جمال آسمانی حسن کا مضحکہ اڑا رہا تھا۔ عجیب اتفاق ہے مگر جب کبھی میں کسی کو تنہائی میں دیکھتا ہوں۔ تو وہ اس قسم کی حرکات میں مشغول ہوتا ہے۔ کہ خواہ مخواہ غیر ارادی طور پر میں یہ خیال کرنے لگتا ہوں۔ کہ کہیں یہ شخص مخبوط الحواس تو نہیں مجھے یاد ہے۔ کہ بچپن میں میں نے ایک بڑے آدمی کو دیکھا تھا۔ جو آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر اپنی ٹوپی کو ہاتھ میں لئے سنجیدگی کے ساتھ اپنے عکس کے سامنے بار بار جھک رہا تھا۔ اس کے بعد میں نے ایک اور معزز آدمی کو دیکھا۔ جو باغ میں بیٹھا تھا۔ اُن کے سامنے گلاب کے حسین پھولوں پر سورج کی زرنگار شعاعیں کھیل رہی تھیں۔ اور یہ حضرت اس کوشش میں لگے ہوئے تھے۔ کہ جس طرح بھی ہو۔ ان شعاعوں کو اپنی ٹوپی میں مقید کر کے سر پر رکھ لیں۔ یہ ناکام کوشش اُن کے ذہن میں غصے اور اضطراب کا عالم پیدا کر رہی ہے۔ اُن کے چہرے کی سُرخی۔ حرکات کی نامعقولیت۔ اور ایک اضطراری حرکت کے ساتھ اُن کا ٹہلنا۔ سب اِس حقیقت کی مظہر تھیں۔ یہی حضرت تھے۔ جن کو ایک دن میں نے ایک موٹی پنل کو ایک کچے شیشے کی چھوٹی سی بوتل میں داخل کرنے کی کوشش میں معروف پایا۔ نتیجہ ظاہر ہے۔ کہ آپ سائنس کے اصول کو توڑنے میں کامیاب نہ ہو سکے۔ اور بوتل ٹوٹ گئی۔ ایک مرتبہ میں نے ایک مشہور راویب کو دیکھا۔ جو پاس ہی دھوپ میں لیٹے ہوئے۔ ایک کتے پر انداز شفقت میں جھکے ہوئے زیر لب کہہ رہے تھے "کیوں دوست خوش تو ہو میں تو ہرگز خوش نہیں ہوں"۔ میرے ایک معزز دوست میرے ہاں مہمان ٹھیرے۔ باتیں کرتے کرتے یکایک آپ کی نگاہ سامنے آئینے کی طرف پڑی۔ اور آپ یکایک خاموش ہو گئے۔ لیکن جب اُنہوں نے اپنے آپ کو تنہا خیال کیا۔ تو بڑے ڈرامائی انداز سے آئینہ میں عکس دیکھ کر بولے "میرے یار کہو۔ تو زمانے نے تم سے کیا سلوک کیا؟" ایک سال پہلے کی بات ہے۔ میں ایک ہوٹل میں مقیم تھا۔ میرے اور میرے ساتھ والے کمرے دونوں کی ظاہری بناوٹ بالکل ایک سی معلوم ہوتی تھی۔ اور ایک انسان کے لئے دھوکا کھا جانا ناممکن نہ تھا۔ ایک رات جب میں تنہا لیٹا ہوا گناہ کی اضافی حیثیت کے متعلق سوچ رہا تھا۔ دفعتاً میرے کمرے کا دروازہ کھلا۔ اور میرے ساتھ والے کمرے میں ٹھیرے ہوئے صاحب اندر داخل ہوئے۔ انہیں مغالطہ تھا۔ کمرے میں کوئی لیمپ وغیرہ تھا نہیں۔ چاندنی موجود تھی۔ اور میں چپ چاپ لیٹا ہوا اُن کی حرکات کا مطالعہ کر رہا تھا۔ اُنہوں نے پہلے تو اِدھر اُدھر دیکھا۔ اور پھر اپنے آپ سے یوں باتیں شروع کیں۔ "تم کون ہو"۔ خود ہی جواب دیا۔ "میں ہوں"۔ "یہ تمہارا کمرہ نہیں ہے"۔ "میں معافی کا خواستگار ہوں"۔ یہ کہہ کر حضرت خاموش ہو گئے۔ اور میز سے ایک رسالہ اٹھایا اور رکھ دیا۔ پھر کھڑکی میں سے بازار کی طرف جھانکا اور فرمایا۔ اس وقت تو روشنی ہے۔ لیکن آج دن کے وقت کتنی تاریکی تھی۔ معاذ اللہ یہ کہہ کر پنجوں کے بل بلی کی طرح دروازے کی طرف بڑھے۔ اور کمرے سے باہر نکل گئے۔

آپ تنہائی میں کیا کرتے ہیں؟ کیا آپ نے کبھی اس پر غور کیا ہے؟

دیوندر ستیارتھی

لاچی

"اے حسینہ! اپنی اصلیت پیار میں کھوج، آئینہ کی چاپلوسی میں نہیں!——" شاعر ٹیگور نے کہیں لکھا ہے۔ مگر یہ کوئی نئی آواز نہیں سینہ بہ سینہ، ان گنت صدیوں سے، سینکڑوں نسلوں سے یہ آواز عورت تک پہنچتی رہی ہے۔ خود اپنے خاوند کی آواز میں بھی اُس نے اکثر آئینہ کی چاپلوسی پائی ہے۔ عورت کو سطحی انداز سے دیکھنا کتنا آسان ہے۔ بہت کم ہیں۔ جو اُس کا چہرہ نہیں دیکھتے، دل دیکھتے ہیں۔

الاؤ کے سُرخ اور سنہری شعلے اوپر آسمان کی طرف منہ کئے ہوئے ہیں۔ اور جاڑے کی رات آنکھیں کھولے پڑی ہے۔ سب کے سب چمار، جن کی رگیں اور پٹھے دن بھر کی محنت مزدوری کے بعد الاؤ کی گرمی میں نئی زندگی محسوس کر رہے ہیں۔ مدھ بھرے سنگیت کی باٹ جوہ رہے ہیں۔

یو۔پی کے دیہات میں جنہوں نے کبھی چماروں کی محفلیں دیکھی ہیں وہ جانتے ہیں کہ کس طرح اُن کے گیتوں کے اثر تلے انگڑائی لے رہی رات بھی کچھ گھنٹوں کے لئے نیند کو دور ہی سے سلام کہہ دیتی ہے۔ جب ڈھولک بجنے لگتی ہے ساری فضا اس کی دھڑکن پر ناچ اُٹھتی ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ نہ وہاں کوئی غربت باقی رہی ہے نہ کوئی غلاظت سماج کے یہ اچھوت جن کی آنکھوں میں بے بسی اپنی دردبھری کہانی لکھتی رہتی ہے۔ الاؤ پر بھی اس محفل میں جیسے دھرتی ماتا کا آشیرواد پا لیتے ہیں —— وہ آشیرواد جنہیں شادیوں کے وقت جبکہ اونچی ذاتوں کے لوگ دیکھ رہے ہوتے ہیں۔ وہ نہ دے سکے!

"گیت کو چلنے دو۔"

"کونسا گیت؟"

"وہی لاچی والا۔"

یہ لاچی کیا بلا ہے۔ میں سوچ رہا ہوں۔ گیت شروع ہونے شاید ابھی کچھ دیر ہے۔ نارنجی لپٹیں اوپر اُٹھ رہی ہیں۔ شاید وہ بھی لاچی سے واقف ہونا چاہتی ہیں۔ کیا لاچی کوئی شہزادی تھی؟ کیا اُس کا مکھڑا الاؤ کے سنہری شعلوں سے بازی لے سکتا تھا؟

"مہوا تو آج ہے نہیں۔"

"مہوا کے بغیر سنگیت کا کیا رس؟"

"تو لاچی کا گیت کیا صرف مہوا ہی جانتا ہے؟"

ساری محفل میں شور پڑ گیا۔ ڈھولک پھر بجنے لگی۔ الاؤ کی سنہری روشنی میں کالے کلوٹے آدمی بھی کتنے بھلے دکھائی دیتے ہیں گورے چٹے آدمی اِس محفل میں کچھ جنازی قلفی ہوگی۔ مگر میرے کہنے کا یہ مطلب نہیں ہے۔ کہ حسن کی دیوی اِن دھرتی کے بیٹوں کو اپنے رتن نہیں بخشتی۔

کتنے خوش ہیں یہ لوگ جیسے ماضی، حال اور مستقبل کے سب کے سب سپنے سچ ہوگئے ہوں۔ کتنا مذاق، کتنی چٹکیاں، کتنے قہقہے، کتنے لطیفے —— یہ سب اس الاؤ کے شعلے ہیں۔ جو اُن کی دلی کیفیت کا آئینہ دار ہے۔ ہماری کہانی کے ساتوں کے ساتوں شہزادے ان چماروں کی بے فکری پر رشک کر سکتے ہیں۔

"لاچی کا گیت تو لچھمن کی بھابی جانتی ہے۔"

"تو لچھمن کی بھابی ہی گا دے۔" میں نے کہا۔

ساری محفل کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ اور شاید لچھمن کی بھابی بھی ہنس رہی ہے۔ سر پر پورنماشی کا چاند چمک رہا ہے۔ ستارے بھی دھرتی والوں کی اس محفل کی طرف رشک بھری آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں۔

لچھمن کی بھابی کوئل کی طرح کوک رہی ہے۔

"برسے برسوا اک لپیا سُنری آرے نا

پچیا گھر لیں بیٹھی لیتی بیتری آرے نا!"

— حسینہ لاچی بارہ سال کی ہے'

کھڑکی میں بیٹھ کر لاچی ہوا کھا رہی ہے!'

"گھوڑ واچڑ بل آ ہیں ایک راجپوت وارے نا

راما پڑی گئی لیں لاچی پے نجری آرے نا"

— 'گھوڑے پر چڑھ کر ایک راجپوت آنکلا۔

لاچی پر اس کی نظر پڑ گئی!'

"گھوڑا ت باندھے راجہ کدمے کی ڈری آرے نا

راجہ چلی گئی لیں کٹنی محلی آرے نا!"

— راجہ نے اپنا گھوڑا کدمب کی شاخ سے باندھ دیا۔

اور راجہ کٹنی کے محل کو چلا گیا!

"دے دیوں تیں کٹنی رے پانچ مہری آرے نا۔

کٹنی پچیا بھورلی لیی آ وؤ رے نا!"

— اے کٹنی! میں تجھے پانچ اشرفیاں دوں گا۔

اری او کٹنی! لاچی کو بہکا کر لے آؤ!'

"کیسے ک پچیا ک بھورروں رجپوتوا رے نا

راجہ پچیا سووے سوامی کو روارے نا!"

— 'او راجپوت! لاچی کو کیسے بہکاؤں؟

او راجہ! لاچی تو اپنے خاوند کی گود میں سوتی ہے!'

"ہتھوا ک لیو کٹنی جیپری گول اٹھیا رے نا

کٹنی اگیا اوڈہر پچیا بھوررو اورے نا"

— 'ہاتھ میں کوئلے لے لو، او کٹنی!

او کٹنی! آگ لینے کے بہانے لاچی کو بہکا لاؤ!'

"بھیتر باڈوکی باہر پچیا رے نا!

پچیا سب سکھی جا تھیں نہونے رے نا!"

— 'لاچی! اندر ہو یا باہر؟

اری او لاچی! سب سکھیاں نہانے جا رہی ہیں!'

"اتنی بچن سنی پچیا لونگیا رے نا'

ساسو جاتی باٹی سگرے نہونے رے نا!"

— 'اتنی بات سنکر وہ لونگ سی لاچی (بولی)،

سب باہر نہانے جا رہی ہیں۔

"سگرے ک پنیاں بہواری لاگے پت رینگوا رے نا۔

ہجواری گھر ہیں کرہ واسنن وارے نا!"

— 'تالاب کا پانی تو چبھ جاتا ہے' اری پتلے جسم والی!

اری او دلہن! گھر پر ہی نہالو!

"گڈی کھیلت موری لہوری نندیا رے نا!

نندی جات باٹی سگرے نہونے رے نا!"

— 'اری او گڑیا کھیلتی میری چھوٹی نند!

او نند! ہم سب نہانے جا رہی ہیں!'

"بھوجی بابا مور سگرا کھودے ہیں رے نا

بھوجی بھیا مورا گھٹ دا بندہے ہیں رے نا!"

— 'اری او بھابی! میرا باپ نیا تالاب کھدوائے گا

او بھابی! میرا بھائی (اس تالاب کا) گھاٹ تیار کروائے گا!

"تب موری بھوجی لوں سگرے نہاتے اورے نا۔

بھوجی گھر ہیں کرو اسننوا رے نا!"

— 'تب اے میری بھابی! تم اس تالاب میں نہانا۔

او بھابی! آج تو گھر میں ہی نہالو۔

"کے ٹھک کہتا لاچی من ہی نہ آدے رے نا!

لاچی کھولی لی ہیں رتولی پیٹریا رے نا!"

— کسی کی بھی بات لاچی کے من نہ لگی۔

لاچی نے اپنی لال رنگ کی پٹاری کھول لی!

"اوڑہی پہری پچیا آئی اوسر وارے نا۔

ساسو جاتی باٹیوں سگرے نہنوا رے نا!"

— 'پہن اوڑھ کر لاچی برامدے میں آئی۔

او ساس جی! ہم سب نہانے جا رہی ہیں!

"جہاں جہاں پچیا کرنے بیٹھک وارے نا'

تہاں تہاں راجہ گھوڑ ٹھکا دیں رے نا!"

— (راستہ میں) جہاں جہاں لاچی سستانے لگتی ہے۔

وہاں وہاں راجہ اپنا گھوڑا ٹھہرا لیتا ہے !'

"ایکنو بڈ ڈکیا پچیا مرئی اُڑ رے نا۔
راجا اتنے ایں چنری اُٹھا دیں رے نا"

— لاچی نے ابھی ایک بھی ڈبکی نہیں ماری،
راجہ اُس کی چنری اُٹھانے لگا !

"مسے اُو نہ راجا کاہیں ہمری چنریا رے نا !
راجہ مورمانسو کھائیں مچھریا رے نا"

— 'اور راجہ ! تم میری چُنری کیوں نہیں دیتا ؟
راجہ ! مچھلیاں میرا ماس نوچ رہی ہیں !'

"جو ہم دیئی پچیا تو ہمری چُنری آرے نا۔
پچیا ہمرے گوہن واں چلی چالئو رے نا !"

— 'لاچی ! اگر میں تمہاری چُنری دے دُوں۔
تو ازی رو لاچی ! میرے گھر میں چلی چلو نا !'

"جو ہم چلی راجہ تو ہمرے گوہن واں رے نا۔
راجہ تو ہیں سے سُندر مور بیہوا رے نا !"

— راجہ ! تمہارے ساتھ میں کیوں چلوں گی ؟
تم سے کہیں زیادہ حسین ہے میرا خاوند !

"جے کے مرمر کرے جتوا رے نا۔
جے کے ایڑیا برن پر دیا رے نا"

— 'چلتے وقت، جس کی جوتی مرمر کرتی ہے۔
اور جس کی ایڑی کی طرح لال منارے دار ہوتی ہے ؛

"پتنا سُنت راجہ مُنہ بچو کاتے نی رے نا،
پچیا تو ہنے سے سُندری موری بیہیا رے نا !"

— 'اتنی بات سُنکر راجہ کا چہرا اتر گیا۔
اری او لاچی ! تم سے کہیں حسین تو میری بیوی ہے ؛

"جے کے جھبر جھبر کرئی بروا رے نا۔
جے کے مُنری بدن کری بنیاں رے نا۔

— 'جس کے بال چمکتے ہیں :۔
جس کی کمر انگوٹھی کی طرح گول ہے۔

گیت ختم ہوا تو ساری محفل نے شاباش کی صدا بلند کی۔

لاچی کی وفاشعاری کی یہ تصویر جو مجھے اس میں دیکھنے کو مل گئی، مجھ پر وجدانی کیفیت پیدا کرنے کے لئے کافی ہے۔ مگر یہ لاچی تھی کون ؟ کیا وہ ایک چمار عورت تھی ؟ مچھن کی بھابی سی جس نے یہ گیت بڑی مزیدار لے میں گا سنایا ہے ؟ لاچی نے راجہ کی جنسی خواہش سُنکر اُسے جلی کٹی باتیں سنانے کی کوئی ضرورت نہ سمجھی۔ بلکہ اس نے اُسے یہ بتلاکر کہ اسکا خاوند اُس سے کہیں حسین ہے، اپنا جذبہ اُس پر ظاہر کر دیا۔ کٹنی نے ٹھیک ہی تو بتلایا تھا، کہ لاچی اپنے خاوند کی گود میں سوتی ہے یعنی اُس پر وہ کسی غیر مرد کو ترجیح نہ دے گی۔ لاچی گاؤں کی میٹی ہجر اور خاوند کے جوتے کی مرمر آواز پر اور لال کنار دار دھوتی پر سو جان سے قربان ہو رہی ہے۔ اتنی دور اُسکا پیچھا کرنے کے بعد راجہ بھی بہت مایوس ہوا۔ وہ بہت شرمندہ بھی ہوا، من ہی من میں۔ اس شرمندگی کی حالت میں اُسے اپنی رانی کی یاد آئی جو لاچی سے کہیں زیادہ حسین تھی۔

"دونوں کا دھرم بچ گیا۔
"ہاں ہاں' لاچی اور راجہ دونوں کا دھرم بچ گیا :
"مہوا کی بیوی کو لاچی کا ایک دوسرا گیت یاد ہے "
"چلنے دو وہ گیت بھی۔"
"ہاں' چلنے دو"
ڈھولک پھر بجنے لگی ہے۔
"مہوا کی بیوی ! گاؤ نا پھر"

ساری محفل ہنس پڑی ہے۔ ڈھولک اور بھی تیز ہو گئی ہے الاؤ کے شعلے اور بھی اونچے اُٹھنے لگے ہیں، جیسے کہہ رہی ہوں —
مہوا کی بیوی ! گاؤ نہ پھر !

اور مہوا کی بیوی نے اپنے پھیپھڑوں کی پوری طاقت سے گیت شروع کیا ہے۔ وہ اتنے زور سے گا رہی ہے۔ کہ آدمی تو آدمی آسمان کے ستارے بھی اُس کی آواز سن سکیں۔

"اپنی کھڑکیا پچیا جھارے لاگیں کیسا ہونا۔
پچیا پڑی گیسط بے سنگھ بجریا ہونا۔

— اپنی کھڑکی پر بیٹھ کر لاچی اپنے بال جھاڑ رہی ہے۔
لاچی پر جے سنگھ کی نظر پڑ گئی:
"اپنی کھڑکیا پیا کہسے دتوا بیٹھا ہونا۔
پیا پڑی گیلے جے سنگھ جھٹکوا ہونا"

— لاچی اپنی کھڑکی میں بیٹھ کر داتن کر رہی ہے۔
لاچی (کی داتن کے) چھینٹے جے سنگھ پر پڑ گئے:
"اسنے چلو، اد تے چلے جے سنگھ رجوا ہونا۔
جے سنگھ پڑی ہیں دتون جھٹکوا ہونا"

— پرے ہٹ جاؤ! پرے ہٹ جاؤ، راجہ جے سنگھ!
او جے سنگھ! داتن کے چھینٹے پڑ جائیں گے!
"او تو نہ موری لاچی ہمری سیجریا ہونا۔
لاچی رانی ہوتی کے سب سکھ پل سو ہونا"

— لاچی! میری سیج پر آجاؤ نا۔
اری او لاچی! رانی ہو کر سب مزے لوٹو!
"ائی سن بول جنی بول ہتو رجوا جے سنگھ ہونا۔
راجہ ہم تو دھرم کی بٹیا ہونا"

— راجہ جے سنگھ ایسی بات مت بولو!
او راجہ! میں تو تمہاری دھرم کی بیٹی ہوں!
"ادہواں سے گئے کے جے سنگھ کٹنی محلیا ہونا۔
بڑھیا لاچی کے بھورتی موہی آنہو ہونا"

— وہاں سے چلکر جے سنگھ کٹنی کے محل میں پہنچا (اور بولا)
اری بڑھیا لاچی کو بہکا کر لے آؤ۔!
"پیا تو ستلے رجوا سوامی جی کے کوراں ہونا۔
رجوا چھوڑ سے بہینہ کے الونیا ہونا"

— لاچی تو اپنے خاوند کی گود میں سوتی ہے۔
او راجہ! وہ تو چھ ماہ کی گربھ وتی ہے۔
"لیہو ہن کٹنی رے ڈال بھری سونوا ہونا۔
کٹنی لاچی کے بھورائی سرہیں آن ہونا"

— اری کٹنی! ڈلیا بھر کر سونا لے لے۔
او کٹنی! لاچی کو بہکا کر لے آؤ۔
"سیتوا کے لے لیں بڑھیا گوئیٹھا چپریا ہونا۔
بڑھیا ائیا بہانے لاچی کہاں ائی لی ہونا"

— بڑھیا نے ہاتھ میں گوبر کی ٹھیکی لے لی۔
آگ لینے کے بہانے بڑھیا لاچی کے گھر آئی:
"باہر باڑو کی بھیتر پیا الونتیا ہونا۔
پیا سب سکھی جائیں گنگا نہنوا ہونا"

— باہر ہو یا اندر، او گربھ وتی لاچی؟
لاچی! سب سکھیاں گنگا اشنان کیلئے جا رہی ہیں:
"برہا برس پر لگلی تربھتوا ہونا۔
لاچی تہوں چلبو گنگا اسنوا ہونا"

— بارہ سال کے بعد یہ تیرتھ کا دور آیا ہے۔
لاچی! تو بھی گنگا اشنان کے لئے چل:
"چپیا بیٹھلی تہوں ساسو بڑے تن ہونا۔
ساسو ہم جیبو گنگا اسنوا ہونا"

— اسے چپیا پر بیٹھی ساس! میری بزرگ!!
ساس! میں گنگا اشنان کے لئے جاؤں گی:
"اتنی بولی جنی بولہو بہو آہو نا،
بہوا چھوڑ سے بہینہ کے الونیا ہونا"

— بہو! تو اتنی بات مت کر۔
بہو! تو تو چھ ماہ کی گربھ وتی ہے:
"ایک کوسے گئی لی لاچی دئی کوسے گئی لی ہونا،
راما پڑی گئی سے جے سنگھ نجریا ہونا"

— ایک کوس گئی، لاچی دو کوس گئی۔
او رام! اس پر جے سنگھ کی نظر پڑ گئی!
"اوہواں سے بیجے جے سنگھ ہرکروا ہونا۔
راما تاہی جیجے گھوڑا آڑدے ہونا"

— وہاں سے جے سنگھ نے ہرکارا بھیجا (لاچی کو روکنے کیلئے)
او رام! اس کے بعد اپنا گھوڑا دوڑایا!

گھوڑا سے اتری جے سنگھ لاچی کہاں ائی سے ہونا۔
جے سنگھ پلکی دھنی لے واہن بھنیاں ہونا۔"

— گھوڑا سے اتر کر جے سنگھ لاچی کے پاس آیا۔
لپک کر جے سنگھ نے اُس کی بانہہ پکڑ لی؛
"چھوڑ دو چھوڑ دو جے سنگھ ہمرو انچر وا ہونا۔
جے سنگھ تو ہمرا سے سندر مور رجوا ہونا۔"

— "چھوڑ دو، چھوڑ دو جے سنگھ میرا آنچل چھوڑ دو۔
جے سنگھ! میرا راجہ تم سے کہیں حسین ہے!"

"ائی سن بولی جنی بولو رانی لچھا ہونا۔
لاچی چلی چلو ہمری سیجریا ہونا۔"

— "او لاچی رانی! ایسی بولی مت بولو۔
لاچی! میری سیج پر چلی چلو نا؛"

"اتنا بچن لاچی سن ہی نہ پوَلی ہونا۔
لاچی کاڈھی کرٹیا جسوا لہلی ہونا۔"

— اتنی بات ابھی لاچی نہ سن پائی تھی۔
لاچی نے کٹار نکال لی اور اُس نے (جے سنگھ) کو مار ڈالا!

اُدہواں سے چل لی لاچی گھر کے پہنچلی ہونا۔
رام ساسو گری آدسے۔ بابا تو آنی ہونا!

— وہاں سے چلکر لاچی گھر پہنچی۔
اور رام ساس کہتی ہے۔ تیرا بابا مر جائے د تو
اب تک کہاں تھی؟)

"جنی ساسس بابا کھا ہو جنی ساسو بھیا کھا ہو ہونا
ساسو بٹیا روکیا بٹ پر وا ہونا۔"

— نہ، اے ساس میرے بابا کو کھاؤ۔ نہ اے ساس
میرے بھائی کو کھاؤ۔
"او ساس راہ میں ڈاکو نے روک لیا تھا۔"

گیت ختم ہوا تو الاؤ کی سنہری لپٹوں کی روشنی
میں میں نے مہوا کی بیوی کی طرف نگاہ اٹھائی۔ وہ اپنی
سہیلیوں کے بیچ میں بڑی شان سے بیٹھی تھی۔ جیسے وہ خود
ہی گیت کی لاچی تھی اور جے سنگھ کو ابھی ابھی موت کے
گھاٹ اتار کر اس گیتوں کی محفل میں آگئی تھی۔

ڈھولک کی تھرکن بند ہو گئی۔ آگ سو گئی۔ سب اپنے اپنے
گھروں کو چل دیئے۔ لچھمن چمار اب بھی میرے پاس بیٹھا ہے
رات — جاڑے کی انگڑائی لے رہی ہے۔

"لاچی نام بھی خوب ہے" — میرا دل کہہ رہا ہے
لاچی یا الائچی؟

تم سب کچھ جانتے ہو۔ لیکن میرے نزدیک زمین شور ہو چکی ہے
آنسو یا بارش اسے روئیدگی نہیں دے سکتے۔
تم سب کچھ جانتے ہو لیکن میں اندھا ہوں۔
منتظر ہوں پردہ اُٹھنے کا۔
تم سب کچھ جانتے ہو، میں دیکھ نہیں سکتا، لیکن
مجھے یقین ہے کہ میری زندگی بیکار نہیں ہوگی۔

(آسکر وائلڈ)

حجاب امتیاز علی

چچا کا خط

میرے نورِ چشم بھتیجے۔ بعد دعائے فراواں کے۔

عزیزی ——— کی زبانی تمہاری شکایت اپنے متعلق پہنچی کہ میں تمہیں کبھی بھولے سے خط نہیں لکھتا۔ اور تمہاری خبر نہیں لیتا۔ اسکے بعد کل تمہارا پوسٹ کارڈ بھی پہنچا۔ جسے دیکھ کر مجھے دلی خوشی ہوئی۔ آج اتوار کی فرصت میں خیال آیا تمہیں خط لکھ ہی دوں۔

مگر اب جبکہ خط لکھنے بیٹھ گیا ہوں تو سوچنے لگا ہوں کیا لکھوں؛ مدتیں گذر گئیں نہ تمہیں دیکھا اور نہ تمہارے بیوی بچوں کو۔ ایسی حالت میں جبکہ تمہارے حالات سے یکسر ناواقفیت ہے تو کیا لکھوں؛ حیران ہوں مجھے امید ہے کہ تم مع متعلقین کے بفضلِ خدا خوش و خرم ہو گے۔

زیادہ دعا ———!

ہاں خوب یاد آیا۔ لگے ہاتھوں اک ذرا سا کام تمہیں لکھ دوں۔ تم شاید نہیں جانتے۔ تمہارے شہر کے پاگل خانے میں تمہارے اک رشتہ کے چچا برسوں سے زیرِ علاج ہیں۔ یہ تمہارے دادا کے جگری دوست کے پوتے اور تمہارے والد مرحوم کے قلبی دوستوں میں سے ہیں۔ اتوار کے اتوار انہیں دیکھ آیا کرو۔ تو دادا مرحوم کی روح تمہیں دعائیں دے گی۔ پاگل خانے میں معمولی آدمی کا جانا ہر چند آسان نہیں۔ مگر اپنے کسی ڈاکٹر دوست کے ذریعہ پاگل خانے کے انچارج ڈاکٹر سے اجازت منگوا لینا۔ اور اپنے چچا کو دیکھنے ہر اتوار جایا کرنا۔ اور واپس آکر اک کارڈ مجھے لکھ دیا کرنا: تاکید ہے۔ یہ سنکر یقیناً تمہارا دل دکھے گا کہ اس بدنصیب پاگل کا واحد بیٹا جو اس کی ماہانہ فیس ادا کیا کرتا تھا اس ہفتہ چل کر مر گیا۔ اک مہینے کی فیس ادا نہیں ہوگی۔ اب کون اس کا کفیل ہو؟ تم زکوٰۃ کے طور پر کچھ روپیہ نکالتے ہی ہو گے تو مہینے کے مہینے وہ روپیہ تم پاگل خانے کی نذر کر دیا کرو۔ اس سے بھی تمہارے دادا کی روح تم سے خوش ہوگی۔

تم نے اپنے خط میں خواہش ظاہر کی تھی۔ کہ میں تمہارے شہر کی کسی چیز کی فرمائش کروں۔ بہت سوچا۔ دماغ پر خوب زور دیا تو ذہن میں آیا کہ کیوں نہ تم سے ہر مہینے سیبوں اور انگوروں اور قندھاری اناروں کی اک ٹوکری منگوا لیا کروں۔ تمہاری چچی کو اختلاج کے دورے پڑتے ہیں۔ اگر اک بڑی ٹوکری ہر مہینہ بھجوا دیا کرو تو مہربانی ہوگی۔ (ٹوکری میں آملے کا مربہ مع چاندی کے ورق کے رکھنا بھول نہ جانا) اگر کسی حکیم یا ڈاکٹر سے تمہارے تعلقات ہوں تو مجھے لکھنا۔ میں تمہاری چچی کی بیماری کی تفصیل لکھ بھیجوں گا۔ انہیں پچھلے بیس سال سے گٹھیا کا مرض ہے۔ پندرہ سال سے اختلاج کے دورے پڑتے ہیں۔ خون کی قے کی شکایت بھی تھی۔ پر اب کچھ کمی ہے۔ تم گھبراؤ مت خدا شفا دے گا۔ فی الحال اک نسخہ ملفوف کرتا ہوں کسی ڈاکٹر سے ملکر پہلے اسے پڑھوا لو۔ پھر عطار سے نسخہ بنوا کر بذریعہ رجسٹری بھجوا دو زیادہ سے زیادہ سات روپے کا نسخہ ہوگا۔ اور مجھے معلوم ہے تم قیمت مجھ سے لوگے نہیں حالانکہ اگر پھلوں کی ٹوکری اور دوا کی قیمت تم لے لیتے تو مجھے اطمینان سا ہو جاتا۔ مگر تم تو اپنے دادا کے پوتے ہو!

میں نے سنا ہے کہ تم شام کو چہل قدمی کے عادی ہو۔ بڑی خوشی ہوئی کہ تمہیں صحت کا اتنا خیال ہے۔ مگر بیٹا اگر شام کی بجائے اپنی چہل قدمی کا وقت دوپہر مقرر کر لو تو اک کام دو کاج ہو جائے۔ بات اصل یوں ہے کہ تمہارے دادا مرحوم کے ایک دوست کے بھتیجے حکیم نفسی نفسی صاحب ایک عمارت تمہارے شہر میں بنوا رہے ہیں وہ تو بیچارے اتنے عدم فرصت ہیں کہ یہاں سے ایک

دن کے لئے باہر نہیں جا سکتے۔ تو تم جانو مالک کی عدم موجودگی میں نوکر انہیں کس قدر لوٹ رہے ہونگے۔ اس لئے دوپہر کے وقت چہل قدمی کے دوران میں اگر تم روزانہ ان کی عمارت کی طرف چلے جایا کرو، اور گھنٹہ، دو گھنٹے، وہاں نگرانی کر لو تو بیچارے کا کام بھی بن جائے ہمارا مقصد بھی پورا ہو جائے۔

آج کل سردی کا موسم ہے۔ زکام کی شکایت عام ہے۔ اگر خالص مشک اور شیر کی چربی دستیاب ہو سکے تو بھجوا دینا۔ شیر کی چربی کے لئے تم شکاریوں سے فرمائش کر سکتے ہو۔ کیونکہ میں نے سنا ہے تمہیں شکار کا بھی شوق ہے۔ اس لئے آسانی سے مہیا کر سکو گے شکار کا شوق نیک شوق ہے۔ تمہارے دادا مرحوم کو بھی بہت تھا۔ ہرن کے کباب مجھے بہت مرغوب ہیں۔ خیال رکھنا۔

ہاں تھوڑی سی خالص شہد بھجوا دینا تاکہ سردی کی صبح ناشتہ میں کھا سکوں۔ اور تو فی الحال کسی چیز کی ضرورت نہیں ہے۔ ورنہ تم سے تکلف کیا ہوتا۔ ہاں خوب یاد آیا۔ عینک کا نمبر بھیجتا ہوں اس کے برابر عینک خرید کر جلد بھیجو۔ بغیر اس کے تمہیں خط تک نہ لکھ سکوں گا۔ ابھی تو مصنوعی دانت بھی بنوانے اور لگوانے ہیں۔ مگر خیر ابھی تو نہیں۔ اس کے لئے تو مجھے خود تمہارے پاس جانا پڑے گا۔

اچھا اب شکایت نہ کرنا کہ میں تمہیں کبھی خط نہیں لکھتا۔ اور تمہاری خبر نہیں لیتا۔ انشاء اللہ خط جلد جلد لکھا کروں گا۔ عینک کا نہ بھولنا۔

زیادہ دعا

تمہارا چچا

ساحر لدھیانوی

آہنگِ عصر!

بھڑک رہی ہے زمانے میں آتشِ نمرود — خدا کو ہے ترے ایماں کا امتحاں مقصود

اٹھ اور اٹھ کے بدل دے نظامِ عالم کو — کہ ہے یہ نیک گھڑی اور ساعتِ مسعود

وطن میں جی کے وطن کے لئے جو مر نہ سکیں — مری نظر میں ہیں ایسے وجود "ننگِ وجود"

تغیرات پہ بنیاد ہے زمانے کی — جو شہریار تھے کل، اب ہیں بندۂ مطرود

تو اور قوتِ باطل کے آستاں پہ جھکے؟ — لہو رلاتی ہے مجھ کو ایازیٔ محمود

حیات کیا ہے؟ فقط ایک جرأتِ بیباک — خودی کی موت ہے پابندیٔ رسوم و قیود

مری نوا نہ کبھی تجھ پہ کارگر ہوگی — کہ تجھ پہ طولِ غلامی سے چھا چکا ہے جمود

قضا کا خوف ہے جنکو وہ میرا ساتھ نہ دیں

مجھے ہے طاقتِ طوفاں کا امتحاں مقصود

ممتاز مفتی

دامِ خیال

نہ جانے اس روز سیر کرتے کرتے میں اُس طرف آ نکلی۔ بائیں طرف ایک وسیع سرسبز ڈھلوان کے نیچے تلہٹی میں پگڈنڈی کا جھرنا کراہ رہا تھا۔ اور دائیں جانب دیاڑی کی پہاڑی پر چیل کے بلند درختوں میں ہوا سسکیاں بھر رہی تھی۔ دور سامنے پہاڑ کی بلند چوٹی پر سورج کانسی کے تھال کی طرح لٹک رہا تھا۔ کتنی اُداس تھی وہ شام!

موڑ پر ایک ویران سا بنگلہ دیکھ کر میں رک گئی۔ وہ مقام مجھے مانوس سا دکھائی دیتا تھا۔ پہاڑیوں میں پھرتے پھراتے اکثر مقامات مجھے اس قدر مانوس نظر آتے ہیں۔ گویا میں نے اپنا بچپن وہیں گزارا ہو۔ میرے گذشتہ تخیل کا کوئی ٹکڑا حقیقت کے لباس میں میرے روبرو آ کھڑا ہوتا ہے۔ اور میں چونک پڑتی ہوں۔ یہ کوئی نیا احساس نہ تھا۔ وہی پرانا فریبِ تخیل۔

بنگلے کے دروازے پر ایک پرانے سے پتھر میں "کاشانہ" کھدا ہوا دیکھ کر میرے دل میں ایک ٹیس سی لگی۔ دس سال کے بیتے ہوئے واقعات میری آنکھوں تلے پھر گئے۔ ہاں دس سال ہوئے میں اور جمیلی اُسی بنگلے میں ٹھہری تھیں۔ جمیلی میری بہترین سہیلی تھی۔ اس سے مجھے اتنی محبت تھی۔ اور جو سات سال ہوئے۔ ہمیشہ کے لئے مجھ سے جدا ہو چکی تھی۔ وہ اُس کے خالو کا بنگلہ تھا۔ ایک آن میں اس ویران سے بنگلے نے میرے دل میں ایک چھوٹی سی رنگین دنیا آباد کر دی۔ اُسی بنگلے نے جو ایک ساعت پہلے میری نظر میں ایک میلی سی بوسیدہ عمارت تھی۔ اس وقت میں نے یوں محسوس کیا۔ جیسے میری زندگی۔ وہ اداس سا حسین منظر جمیلی اور اُس کی محبت صرف میرے تخیل کی ایک شعوری تھی۔ محض ایک رنگین فریب۔

اُن دنوں میں اور جمیلی دسویں جماعت میں تھیں۔ ویسے تو میری وہ ہم عمر سی تھی۔ یہی کوئی اٹھارہ سال کی ہو گی۔ لیکن اُس کی طبیعت میں بلا کی شوخی تھی۔ جبھی تو سکول کی لڑکیاں اُسے ہانی، کہا کرتی تھیں۔ تمام لڑکیاں چاہتی تھیں۔ کہ جمیلی انہیں اپنی سہیلی بنا لے۔ استانیوں کی بھی یہی آرزو تھی۔ لیکن جمیلی کو اُن سے ملنے ملانے یا عام لڑکیوں کی طرح انہیں آنکھوں پر بٹھانے میں چنداں دلچسپی نہ تھی۔ اگرچہ جب وہ برآمدے یا باغیچے میں ٹہلتی۔ تو ہر کوئی یہی محسوس کرتا۔ گویا وہ اُن کی طرف دیکھ کر مسکرا رہی ہو۔ اکثر استانیاں اُس کی اِس شانِ بےنیازی پر دل ہی دل میں جلتی تھیں۔ شاید وہ چاہتی تھیں۔ کہ مزید لڑکیوں کی طرح وہ بھی انہیں پیار اور تحسین بھری نظروں سے دیکھے۔ اور اُن کے اندازِ گفتگو کی تقلید کرے۔ لیکن جمیلی کی ہر بات میں اک اپنا ہی رنگ ہوتا تھا۔

اُن دنوں ہمارے سکول میں کوئی نا کوئی لڑکی کسی نہ کسی اُستانی کی "ظلیم" یا "تقین" سمجھی جاتی تھی۔ ریسیس میں یہاں، وہاں، روشوں پر برآمدے میں یا گراؤنڈ میں کئی ایک "ظلیم" اور "تقین" ٹکڑے باتوں میں مشغول ہوتے۔ اور لڑکیاں دور سے اُن کی طرف دیکھ دیکھ کر آنکھوں ہی آنکھوں میں مسکراتیں۔ گویا کہہ رہی ہیں۔ ہم جانتی ہیں۔ لیکن اُس وقت اُن کے انداز میں ایک حسرت سی جھلکتی تھی۔ اور کوئی شوخ چپکے سے آ کر کان میں کہتی۔ "اے کاش کہ میں ہوتی" اس بات پر سب کھلکھلا کر ہنس پڑتیں۔ یا کوئی امیدوار ایک تیامتی بےنیازی سے۔ اُن میں سے کسی کے پاس سے یوں ٹھمک کر گزرتی کہ جسم کے خم و پیچ نمایاں ہو جائیں۔ ایک نظر ادھر بھی سکے سے انداز سے لیکن اگر اُس وقت جمیلی آ نکلتی۔ تو ایک ساعت کے لئے ہر "ظلیم" اور "تقین" میں ایک بےکلی سی پیدا ہو جاتی۔ استانیاں چوری چوری اُس کی طرف دیکھتیں۔ اور شاید نہ دیکھنے کی آرزو کرتیں۔ لیکن

افسانہ
ممتاز مفتی
شکیلہ اختر
علی عباس حسینی
شاہد احمد دہلوی
شیر محمد اختر
غلام عباس مولوی

جمیلی اپنی ہی دُھن میں ٹہلتی رہتی۔ یا دیوار کے قریب اکیلی جا بیٹھتی۔ اور کوئی گیت الاپنے لگتی۔ اُسے گانے کا بہت شوق تھا۔

وہ دیوار صرف قدآدم اونچی تھی۔ اور دوسری طرف لڑکوں کا سکول اور بورڈنگ تھا۔ لڑکے اکثر درختوں پر چڑھ جایا کرتے تھے اور ٹہنوں میں چھپ کر لڑکیوں کو تاکتے رہتے۔ جبھی ہماری ہیڈ مسٹرس مس موہنی نے ہمارا اُس طرف آنا جانا بند کر دیا تھا۔ لیکن جمیلی مس موہنی سے ڈرتی تھوڑا ہی تھی۔

ایک روز میں، پاربتی اور شیلا نے پیپل سے جھولا باندھا۔ جب میں مس صاحبہ سے اجازت لینے گئی۔ تو وہ کہنے لگیں "ساحرہ جھولے کو زیادہ نہ چڑھانا۔ ایسا نہ ہو۔ کہ لڑکے کوئی شرارت کریں۔

ہم تینوں باری باری جھول رہی تھیں۔ کہ جمیلی آگئی۔

دیکھوں تو کیسا ہے یہ جھولا تمہارا"، اُس نے کہا۔

اسے بھلا کون انکار کرتا۔ اُس نے جھولتے ہوئے گانا شروع کر دیا۔ اور اس قدر محو ہو گئی۔ کہ جھولے کو بہت چڑھا لیا۔ حتّٰی کہ وہ حتّٰی دیوار سے بھی اونچا جانے لگا۔ ادھر لڑکوں نے دیکھ کر غل مچانا شروع کیا۔ اُس شور و غل کو سنکر میں نے اور شیلا نے اُسے بتیری آوازیں دیں "ہائی جمیلی" لیکن وہ بدستور گاتی رہی۔ اور جھولا چڑھاتی رہی۔ عین اُسی وقت مس موہنی آگئیں۔ اور ہم بےحد ناراض ہوئیں۔ جمیلی پر اُن کے غصّے کا کوئی اثر نہ ہوا۔ اگرچہ وہ جھولے سے اتر آئی۔ اور اپنی طبعی بے نیازی سے گنگناتی ہوئی اپنے کمرے کی طرف چل پڑی۔ گویا کچھ ہوا ہی نہ تھا۔ دیوار کی دوسری طرف لڑکے باآواز بلند مل کر گا رہے تھے۔ "ہائی جمیلی۔ جمیلی جمیلی" مس موہنی اُس روز بڑے غصّے میں تھیں۔ لیکن جانے کیوں جمیلی کے سامنے آکر وہ گھبرا سی جایا کرتی تھیں۔ اُس روز بھی اُنہوں نے مجھے ہی گھورنا شروع کر دیا۔

میرا خیال ہے۔ جمیلی کو لڑکوں کو چھیڑنے میں بہت مزہ آتا تھا۔ وہ چاہتی تھی۔ کہ کسی مرد کے سامنے اکڑ کر اک آن اور ادا سے یوں گزر جائے۔ کہ اُس کا منہ کھلا کا کھلا رہ جائے۔ اُس روز بھی شام کے وقت جب کہ بہت سے لڑکے درختوں پر چڑھ کر ہمیں تاک رہے تھے۔ وہ باغیچے میں آئی۔ اور دیوار کے پاس بیٹھ کر دھیمی آواز میں گانے لگی۔ حالانکہ اُسے اچھی طرح معلوم تھا۔ کہ لڑکے ادھر جھانک رہے ہیں۔ اور ہیڈ مسٹرس آگئی تو ——— اُسی وقت مس موہنی آگئیں۔ جمیلہ نے اپنا گانا جاری رکھا۔ جیسے اُنہیں دیکھا ہی نہ ہو۔ "جمیلی۔ ——— یہ کیا مذاق ہے۔ تم یہاں بیٹھی کیا کر رہی ہو۔" مس موہنی نے غصّے میں کہا۔

جمیلی اٹھ بیٹھی اور لاپرواہی سے ایک جمائی لے کر سرسری طور پر کہنے لگی۔ ویسے ہی بیٹھی تھی

اور وہ لڑکے درختوں پر بیٹھے کیسے تک رہے ہیں۔ مس موہنی نے طنزاً پوچھا

"مجھے کیا معلوم" جمیلی نے سرسری طور پر درخت کی طرف دیکھ کر کہا۔ "تو جائیں یا آپ" اور پھر خراماں خراماں اپنے کمرے کی طرف چل پڑی۔

گرمی کی چھٹیوں میں جمیلی دھرم سالہ اپنے خالو کے ہاں چلنے کو تیار ہوئی۔ اور مجھ سے کہنے لگی۔ "سحری اگر تم بھی ساتھ چلو تو بڑا مزہ رہے۔" میں نے کہا "پگلی مجھے کون جانے دیگا۔ بھلا اماں کب مانتی ہیں"۔ "اماں کو منانا میرا ذمّہ"، اُس نے کہا۔ اور واقعی اُسنے اماں کو منا لیا۔ اور ہم دونوں ایک مہینے کے لئے دھرم سالہ چلی گئیں۔ سہی پہلے سے ویران بنگلے میں۔

جمیلی کے خالو اور خالہ دونوں عمر رسیدہ تھے۔ لے دے کر گھر میں صرف نزہت تھی۔ تقریباً اکیس یا بائیس سال کی ہو گی وہ لیکن چہرے سے یوں دکھائی دیتا تھا۔ گویا تیس برس کی ہو۔ بھاری جسم منجمد سا گرنگا چہرہ۔ اکتائی ہوئی سی۔ چلتے ہوئے تو اتنی بھدی دکھائی دیتی۔ کہ توبہ بھلی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا۔ جیسے اُسے کسی جگہ سے چلے جانے یا کسی جگہ پہنچنے کا شوق تو کیا۔ خیال تک بھی نہ تھا البتہ اُس کی آنکھیں ضرور جاذبِ نظر تھی۔ وہ بڑی بڑی تخیلی آنکھیں اگر آپ اُسے برتن مانجھتے یا ہنڈیا پکاتے دیکھ لیں۔ تو آپ محسوس کرینگے۔ کہ وہ اپنے ارد گرد کی چیزوں کو دیکھ ہی نہیں رہی۔ بلکہ دیوار کے پار کسی ایسی چیز کو دیکھ رہی ہے۔ جو میلوں دور ہے۔ یا جو کہیں بھی موجود نہیں۔ چیز ہمیں دیکھ کر ایک ساعت کے لئے

اس کی خوابیدہ آنکھیں جاگ پڑتیں۔ چمکیں اور پھر اپنی دنیا میں لوٹ گئیں۔ اور وہ اسی بےحسی سے کام کاج میں لگ گئی۔

رات کو جب میں اور جمیلی اکیلی بیٹھی تھیں۔ میں نے کہا "جمیلی یہ تمہاری خالہ زاد بہن کیا ہے۔ نہ سر نہ پاؤں۔ بس دیکھ لو" اُس نے کہا "جو کچھ بھی ہے حاضر ہے۔ سر او۔ پاؤں اور بس"۔

"لیکن اتنی عمر ہوگئی ہے۔ اس کا بیاہ کیوں نہیں ہونے دیتے تمہارے خالو"

"بیاہ کس سے کریں۔ کوئی رشتہ بھی ملے امیر آدمی ہیں چھوٹے موٹے رشتے کو کب خاطر میں لاتے ہیں؟" کئی ایک بار لوگ دیکھنے آئے ہیں۔ اُسے۔ پر۔ دیکھ ہی لیا ہے نا تم نے۔ . . . اب کوئی کیا کرے؟"

"سارا دن یونہی چلتی پھرتی رہتی ہے جیسے نیند میں ہو۔ جانے کس کے خیال میں گم رہتی ہے" میں نے کہا۔

"اونہو" وہ بولی۔ "کسی کا خیال کہاں۔ صرف خیال ہی خیال تو ہے۔ جانے کیا کیا خواب دیکھتی ہے۔

بیچاری۔ خواب بھی نہ دیکھے تو کرے کیا تعبیر تو نصیب نہیں"

شام کو نزہت کے ابا آگئے۔ بڑے تپاک سے ہمیں ملے جمیلی سے گھر والوں کے متعلق پوچھتے رہے۔ پھر مجھ سے بھی کئی ایک باتیں کیں۔ آخر خالہ سے مخاطب ہو کر کہنے لگے "نزہت کی ماں۔ خاں صاحب نے آج کیا پتے کی بات کی بھئی خوب آدمی ہیں۔ وہ کہتے ہیں۔ بالوں کے لئے کوئی تیل رجسٹر کرالو۔ چھ سات ہزار اشتہار پر خرچ کردو بتیس کروڑ ہندوستانیوں میں سے کیا تم ایک لاکھ کو بھی اسقدر بیوقوف نہیں بنا سکتے۔ کہ تمہارے تیل کی ایک ایک شیشی خرید لیں۔ بھئی کیا خیال ہے۔ کیوں نزہت کی ماں۔ ہی ہی ہی ہی —— ہی ہی۔ آہم آہم" اور وہ کھانستے ہوئے باہر چلے گئے

ان کے جانے کے بعد جمیلی میری طرف دیکھ کر مسکرا پڑی۔ "سنا تم نے سحری؟ ابا تو لاکھوں کو بیوقوف بنانے کے فکر میں ہیں اور بیٹی سے اتنا بھی نہیں ہوسکا۔ کہ کسی ایک کو بیوقوف بنالیتی"

"لیکن بیٹی کی خالہ زاد تو کروڑوں کو بیوقوف بنا سکتی ہے نا" میں نے اُسے چھیڑنے کے لئے کہا۔

"بڑی وہ ہو تم" اُس نے بناوٹی غصے میں کہا۔

"میں کہتی ہوں۔ جمیلی تمہیں ہو کیا گیا ہے۔ تم مردوں کو ایسا کیوں سمجھتی ہو" میں نے پوچھا۔

"بیچارے" اُس نے منہ بنا کر کہا "جانے کیوں مجھے اُنہیں بیوقوف بنانے میں مزا آتا ہے۔ اور سحری وہ بنے ہی کس لئے ہیں؟ نہ بناؤ تو بگڑتے ہیں۔ یہی جو اُن کی خواہش ہوئی۔ پھر کوئی کیا کرے"

"کسی روز بناتے بناتے خود نہ بن جانا" میں نے چڑ کر کہا جانے کیوں کہہ دیا۔

"اور بن جاؤنگی۔ تو بن جاؤں گی۔ جب تک تو بنالوں" اور وہ ہنس پڑی۔

اُن دنوں ہم باغیچے میں ٹہلتے ہوئے یا ادھر اُدھر سیر کرنے میں وقت کاٹتی تھیں۔ اُس ویران سی پگڈنڈی پر کوئی آتا جاتا تو تھا نہیں۔ گو کبھی کبھار کوئی گدھی یا گوالا گزر جاتا۔ یا کوئی شکاری شکار کی دُھن میں مست جلدی جلدی قدم اٹھاتا ہوا نکل جاتا۔ اس لئے پردے کے متعلق اہتمام کرنے کی ہمیں چنداں ضرورت نہ تھی۔ ایک روز کمرے میں بیٹھے ہوئے اتفاقاً میری نظر سامنے جا پڑی سامنے چٹان پر ایک نوجوان بیٹھا کتاب پڑھ رہا تھا۔ مجھے تو کالج کا کوئی طالبعلم دکھائی دیتا تھا۔ میں نے جمیلی کو آواز دی۔ "دیکھو تو جمیلی وہ سامنے حضرت نے پڑھنے کے لئے کونسی جگہ چنی ہے۔ اس سے تو بہتر تھا۔ کہ کسی درخت سے لٹک جاتے"

جمیلی کی آنکھ میں ایک چمک لہرا گئی۔ "بیچارہ" اُس نے زیر لب کہا۔ اور ایک انداز سے باواز بلند ہنس پڑی۔ اُس کی آواز سُن کر وہ نوجوان ٹھٹکا اور ہماری طرف دیکھ کر بھونچکا سا رہ گیا۔ جمیلی نے میرا ہاتھ پکڑ لیا اور کہا "چلو سحری باغیچے میں ٹہلیں" اُس سے وہ اور بھی بانکی ہوگئی تھی۔

ٹہلتے ہوئے اُس نے باواز بلند باتیں کرنی شروع کردیں آواز میں ایک لوچ تھی۔ چال میں اک لطافت گویا چاند پہ ہالہ پڑ گیا ہو

اُسکے انداز سے یوں دکھائی دیتا تھا۔ جیسے اُسے پروا ہی نہ رہا تھا۔ کو سامنے چٹان پر بیٹھا ہوا نوجوان منہ کھولے اُس کی طرف دیکھ رہا ہے۔

اُس دن کے بعد وہ نوجوان روز وہیں آ بیٹھتا۔ اور کتاب سامنے رکھ کر پھٹی پھٹی آنکھوں سے ہماری طرف دیکھتا رہتا۔ اور جمیلی ایک شانِ استغنا سے ٹہلتی۔ یا کوئی گیت گنگناتی رہتی۔ کیسے مزے میں گاتی تھی۔ کہ کوئی سُنے اور تڑپ ہی جائے۔ اُسی سمے جمیلی کے انداز میں گھبراہٹ کا نشان بھی نہ ہوتا۔ بلکہ ایسے اطمینان سے ٹہلتی رہتی گویا کوئی مچھلی پانی میں تیر رہی ہو۔

ایک دن جب ہم باغ میں ٹہل رہی تھیں۔ ایک لفافہ اڑتا ہوا آیا۔ اور ہمارے پاؤں میں آگرا۔ جمیلی نے اُسے پاؤں سے ٹھکرا دیا۔ اور ویسے ہی ٹہلتی رہی۔ میرا دل تو اچھل کر حلق میں اٹک گیا۔ میں نے بصد مشکل آہستہ سے کہا۔ "اٹھا لو اسے۔ کوئی دیکھے گا تو کیا کہے گا" جواب میں وہ ہنس پڑی۔ آخر مجھ سے نہ رہا گیا۔ "دیکھو تو سہی کیا لکھا ہے" میں نے گھبرا کر کہا۔

"لکھا کیا ہے" اُس نے میری طرف کنکھیوں سے دیکھ کر جواب دیا۔ "یہی کہ مرتے ہیں" اور پھر بولی۔ "ذرا اور مر لینے دو۔"

میں نے وہ لفافہ اٹھا لیا۔ اور رات کو ہم نے اُسے کھولا حسن و عشق سے بھرے ہوئے چار ورق تھے۔ جابجا شعر لکھے ہوئے تھے۔ اور کاغذ معطر تھا۔

اگلی شام وہ نوجوان بہت دیر سے آیا۔ اس کا چہرہ بے حد اداس تھا۔ چال میں مایوسی تھی۔ وہ منڈیر کے پاس آ کھڑا ہوا "خدا کے لئے مجھے ایک بار مل لو۔ خدا کے لئے۔ مجھے کل یہاں سے چلے جانا ہے صرف ایک بار" اس نے بھدی آواز میں کہا۔

یہ دیکھ کر میں تو گھبرا گئی "چلو جمیلی اندر چلیں۔ اتنی دیر ہو گئی ہے" میں نے اسے ہاتھ سے کھینچتے ہوئے کہا۔ جمیلی نے ایک نگاہِ غلط انداز سے اُس کی طرف دیکھا۔ اور گلاب کے پیڑ سے مخاطب ہو کر بولی۔ "ہمت ہے تو کوئی آ کر مل جائے" میں نے اُسے اور کچھ نہ کہنے دیا۔ اور گھسیٹ کر اندر لے گئی۔ ورنہ نہ جانے وہ کیا کیا کہہ دیتی۔

رات کو ہم کھانے سے فارغ ہو کر کوئی ساڑھے دس بجے کے قریب اپنے کمرے میں پہنچیں۔ تو میری نگاہ کھڑکی میں پڑی۔ سیخوں کے پیچھے وہی نوجوان کھڑا تھا۔ میں وہاں سے بھاگی بمشکل چارپائی تک پہنچی۔ اور دھم سے گر پڑی۔ جمیلی نے میری طرف حیرانی سے دیکھا "کیا ہے" اُس نے پوچھا۔

میں نے کھڑکی کی طرف اشارہ کیا۔ اُسے کھڑکی میں دیکھ کر وہ مسکرا پڑی۔

"میں آ جاؤں" کسی نے مدھم مگر بھاری آواز میں کہا۔

"ذرا مشکل کام ہے" وہ بولی اور بڑھ کر کھڑکی کا دروازہ بند کر دیا۔ جانے میں کتنی دیر ویسے ہی آنکھیں بند کئے پڑی رہی۔ پھر جو آنکھ کھولی۔ تو دیکھتی ہوں۔ کہ وہی نوجوان اندر دروازے میں کھڑا ہے۔ اُسے وہاں دیکھ کر میری تو جان ہوا ہو گئی۔ ہمارے کمرے میں کوئی دروازہ باہر باغیچے میں نہ کھلتا تھا۔ البتہ ملحقہ کمرے میں جہاں اُن دنوں نزہت سویا کرتی تھی۔ ایک دروازہ باغیچے میں کھلتا تھا۔ ایک ہمارے کمرے میں اور ایک اُدھر برآمدے میں۔ میرا خیال ہے وہ نزہت کے کمرے سے گزر کر ہمارے کمرے میں داخل ہو گیا ہو گا اُس وقت پونے گیارہ۔ گیارہ بجے ہونگے۔ باہر صحن میں باورچی خانے سے برتن بجنے کی آواز آ رہی تھی۔ غالباً نزہت برتن دھو یا سنبھال رہی تھی۔ خالہ اور خالو کا کمرہ مکان کے پرلی طرف تھا۔ وہ تو شام سے ہی اپنے کمرے میں چلے جاتے تھے۔ اب میرا خیال ہے۔ کہ اُس نے کسی نوکر کو کچھ دے دلا کر ساتھ ملا لیا ہو گا۔ ورنہ تو یوں پرائے گھر میں گھس آنا ——

جمیلی نے اُسے دیکھا۔ تو ماتھے پر ایک تیوڑی پڑ گئی۔ میرا خیال ہے، وہ اُس کی دلیری پر چڑ گئی ہو گی۔

"آپ کا مطلب" اُسنے غصے سے پوچھا۔ وہ گھبرا کر اندھیرے کونے میں رک گیا۔ "خدا کیلئے" وہ کہنا لگا۔ "خدا کیلئے"

"چپ" جمیلی نے گھور کر کہا" میں کہتی ہوں۔ اس کا مطلب"

"بس دو گھڑی دیکھ لینے دیجئے۔ مجھے یہاں سے کل چلے جانا ہے" وہ بولا"

"اچھا مہربانی کرکے ابھی چلے جائیے۔ ورنہ" جمیلی نے آنکھیں دکھاتے ہوئے کہا۔ وہ خاموش ہوگیا۔ عین اُسی وقت ملحقہ کمرے کا دروازہ کھلا۔ اور نزہت اپنے کمرے میں داخل ہوئی۔ جمیلی نے جھٹ اُٹھ کر بتی بجھا دی۔ جانے ہم تینوں کتنی دیر اُس وسیع کمرے کے اندھیرے میں ایک دوسرے سے دور بیٹھے رہے۔ مجھے تو یوں معلوم ہوتا تھا۔ جیسے صدیاں گزر گئی ہوں۔ صرف اس احساس نے کہ ہمارے قریب ایک اجنبی نوجوان کھڑا ہے۔ اُس اندھیرے کو کس قدر خوفناک بنا دیا تھا۔

دُور صحن سے پاؤں کی چاپ سنائی دی۔ اور خالو کی آواز آئی۔ "جمیلی بیٹی جمیلی۔ آہم آہم"

"وہ خالو آگئے" جمیلی گھبرا کر اُٹھ بیٹھی

"مہربانی کرکے آپ چلے جائیے" اُس نے اُس اندھیرے کونے سے مخاطب ہوکر کہا۔ جہاں وہ کھڑا تھا"۔

"اچھا تو میں جاتا ہوں۔ لیکن خدارا مجھے اپنا نام تو بتا دیجئے"

"میرا نام" جمیلی نے چونک کر کہا۔ "میرا نام نزہت ہے اب آپ جائیے"

"کیا میں آپ کو صرف ایک خط لکھ سکتا ہوں صرف ایک۔ اُس نے دروازے میں پہنچ کر کہا"۔

"ہاں ہاں۔ لیکن اس وقت آپ چلے جائیے۔ وگرنہ" اُس نے ملحقہ دروازہ کھولا۔ اور پیشتر اُس کے کہ ہم اُسے روکتیں۔ نزہت کے کمرے میں داخل ہوگیا۔ ایک آواز آئی۔ جیسے کوئی چیز کسی سے ٹکرا گئی ہو۔ ایک دبی ہوئی چیخ۔ خدا کے لئے۔ کون ہے۔ چُپ پھر کمرے میں خاموشی چھا گئی۔ خوش قسمتی سے عین اُسی وقت خالو نے دروازہ کھڑکھڑانا شروع کیا۔ اور ساتھ کے کمرے کی وہ آوازیں دروازے کی کھڑکھڑاہٹ میں دب گئیں"

"سو گئی بیٹی" خالو نے باآواز بلند پوچھا"

"کیا ہے خالو جی" جمیلی نے بناوٹی خواب آلود آواز میں کہا"

"کچھ نہیں۔ تمہیں ناحق بے آرام کیا میں نے۔ میرا مطلب ہے۔ کہ کل صبح چھ بجے نگوڑی جانا ہے۔ تمام انتظام کرلیا ہے۔ بھول نہ جانا بیٹی۔ دروازہ کھولنے کی ضرورت نہیں۔ ناحق بے آرام کیا۔ میں نے۔ خالو واپس جاتے ہوئے کچھ بڑبڑا رہے تھے۔

ڈر کے مارے رات بھر مجھے قطعی نیند نہ آئی۔ صبح سویرے ہم نگوڑی چلے گئے۔ میں جمیلی اور خالو دس بجے کے قریب لوٹے۔ تو میں اپنے کمرہ میں جا لیٹی۔ اُس روز مجھے نزہت کے سامنے جاتے ہوئے شرم آتی تھی۔ کچھ دیر کے بعد جمیلی دوڑتی ہوئی آئی۔ اور کہنے لگی۔ آؤ سمری تمہیں ایک نئی دلہن دکھاؤں۔ اور مجھے گھسیٹ کر باورچی خانے میں لے گئی۔

"یہ دیکھو" اُس نے نزہت کی طرف اشارہ کرکے کہا۔ واقعی نزہت دُلہن بنی بیٹھی تھی۔ نیلا کریپ کا دوپٹہ۔ جس پر سفید پھول کاڑھے ہوئے تھے۔ اور سفید ساٹن کا سوٹ۔ اُس نے ہماری طرف مڑ کر دیکھا۔ اور جھینپ گئی۔

"آج کیا بات ہے" جمیلی نے اُسے چھیڑ کر کہا"۔

"نہیں بات کیا ہوگی" نزہت نے گھبرا کر جواب دیا۔ اور شدت سے ہنڈیا پکانے میں مصروف ہوگئی۔ جمیلی نے میرے بازو پر چٹکی بھری اور دھیمے سے کہنے لگی۔ "چلو یہ بھی اچھا ہوا۔ ان کی دنیائے خیال میں بھی ایک چاند نکل آیا"

اُس روز کے بعد وہ نوجوان ہمیں نظر نہ آیا۔ اس لئے مجھے تسلی سی ہوگئی۔ چار پانچ دنوں کے بعد خالہ آئی۔ ان کے ہاتھ میں ایک لفافہ تھا۔ کہنے لگیں۔ دیکھو تو بیٹی یہ خط کس کا ہے انگریزی لکھی ہے۔ شاید تمہارے خالو کا ہو۔ پتے پر نزہت کا نشانہ دھرم سالہ دیکھ کر وہ خط جمیلی نے لے لیا۔

"میرا ہی ہے خالہ جی" اُس نے کہا"

رات کو ہم نے اُسے کھولا۔ "بیچارے نے اپنے دل کا دکھڑا رویا ہوا ہے"۔ جمیلی نے خط پڑھتے ہوئے مسکرا کر کہا: "کیا محبت اور غم کی داستان لکھی ہے"۔

اس کے بعد جمیلی نے لفافہ اُسی طرح بند کردیا۔ اور صبح سویرے نزہت کو دکھا کر کہنے لگی۔ "دیکھو تو نزہتی شاید یہ تمہارا خط ہے۔ نوکر نے غلطی سے مجھے دے دیا ہے۔ شاید تمہاری

کسی سہیلی کا ہے۔"

اُس روز نزہت کی چال میں ایک نئے تھی۔ وہ ہر بات بات پر مسکرا پڑتی۔ اور پھر آپ ہی آپ شرما جاتی۔ گویا اُس کی دنیا ہی بدل گئی ہو۔

ہاں یہ وہی بنگلہ ہے۔ جانے اب یہاں کون رہتا ہے۔ نزہت کے ابا اور اماں تو مدت سے مرکھپ گئے ہونگے۔ اور نزہت نے جانے کس کا گھر جا آباد کیا ہوگا۔ میرے دل میں شوق گدگدی سی رہا تھا۔ جی میں آیا۔ کہ چلو دیکھتی چلوں۔ اور میں بے دھڑک اندر چلی گئی۔ کمرے میں ایک بڑھیا بیٹھی تھی۔ میں نے فوراً پہچان لیا۔ کہ وہ جمیلی کی خالہ تھی میں نے سلام عرض کیا۔ اور بیٹھ گئی پہلے تو اُس نے مجھے نہ پہچانا۔ پھر بتانے پر وہ مجھے بڑے تپاک سے ملی۔ اور ہم کچھ دیر تک بیٹھی باتیں کرتی رہیں۔ بچاری اپنا دکھڑا روتی رہی۔ نزہت کے ابا فوت ہو چکے تھے۔ اور اب وہ اکیلی ہی وہاں رہتی تھیں۔ میں نے سہیل تذکرہ پوچھا۔ خالہ جی نزہت کہاں ہے آجکل۔

"نزہت"، اُس نے میری طرف گھور کر دیکھا: "ادھر بڑے کمرے میں بیٹھی ہوگی"

لیکن خالہ جی میں نے حیرانی سے پوچھا۔ اُس کی شادی نہیں کی آپ نے"؟

بڑھیا نے ایک آہ بھری۔ "شادی"!! اُس نے تڑپ کر کہا: "کوئی اچھا رشتہ ملا۔ اور نہ شادی کی۔ رشتے تو کئی آتے تھے۔ مگر ان دنوں ہماری نگاہ میں چھوٹے موٹے رشتے جچتے ہی نہ تھے۔ جب خیال آتا ہے بیٹی۔ کہ یہ میری ہی غلطی تھی۔ تو دل میں ایک ٹھیس سی لگتی ہے۔ بچاری کے نصیب پھوٹ گئے۔ ساری عمر بیٹھی میری جان کو روئے گی۔ اچھا تو میں اُسے بلا آؤں" کہہ کر میں اٹھ بیٹھی۔ اور بڑے کمرے کی طرف گئی۔ نزہت چارپائی پر بیٹھی تھی۔ سامنے دو بوسیدہ اور میلے ورق پڑے تھے۔ وہ اپنے ہی دھیان میں لگی ہوئی تھی۔ اسلئے اُس نے مجھے نہ دیکھا۔ اُس کی آنکھ سے ایک آنسو گرا۔ اور کاغذ پہ پھیل گیا۔ "نزہت" میں نے آواز دی وہ چونک کر اٹھ بیٹھی۔ اور آنسو پونچھ کر مجھ سے لپٹ گئی۔ بڑی دیر تک ہم آپس میں باتیں کرتی رہیں۔ لیکن ہر لفظ جو اُسکے منہ سے نکلتا تھا۔ یوں سنائی دیتا تھا۔ جیسے ایک دبی ہوئی کراہ ہو۔ میں نے کہا: "نزہت"، تمہارے ماں باپ نے یہ کیا ظلم کیا۔ کہ ساری عمر تمہیں کنوارا بٹھا رکھا پہلے وہ جھجک گئی۔ پھر کہنے لگی "تم سے کیا چھپانا ہے سحری بہن۔ اماں کا اس میں کوئی قصور نہیں۔ بیسیوں رشتے آئے تھے۔ اماں نے بھی بہت زور دیا۔ تم جانتی ہو، اُسکے ہونٹ ایک موہوم سی مسکراہٹ سے کھل گئے" لیکن تم نہیں جانتی سحری۔ میں کیسے اُن سے بیوفائی کرسکتی تھی اُنہیں مجھ سے بہت محبت تھی۔ میں بھی اُنہیں چاہتی تھی۔ میں تو اُنہی کی ہو چکی تھی۔ شادی تو ایک دنیاوی رسم ہے نا،" اُس نے ایک آہ بھر کر دہرایا۔ "بھلا اُن سے کیسے بے وفائی کرتی۔ اسلئے میں نے شادی سے انکار کردیا۔ یہ دیکھو" اُس نے دونوں ورق اٹھا کر میرے سامنے رکھ دئے۔ "یہ اُن کا آخری خط ہے۔ بہت سے خط بھیجے تھے اُنہوں نے الماری میں ڈھیر لگ گیا تھا۔ لیکن میں نے سب جلا ڈالے صرف یہی ایک رکھ لیا تھا۔ یہ اُن کا آخری خط تھا"

میں نے سرسری طور پر خط کی طرف دیکھا۔ لکھا تھا۔ وہی خط تھا۔ جو اُس دن جمیلی نے مجھے دکھایا۔

میرے دل پر ایک نشتر سا لگا۔ "آوہ" میرے منہ سے بے ساختہ نکل گیا۔ اور میرا جی بھر آیا۔ میں نے کھڑکی سے باہر سامنے اُسی کالی چٹان پر ایک سوکھا ہوا درخت بل کھا رہا تھا۔ دیکھا۔ بائیں طرف وادی کی پہاڑی پر ہوا چیل کے درختوں سے لپٹ لپٹ کر رو رہی تھی۔ اور گھاٹی میں جھگڑی کا جھرنا کراہ رہا تھا۔

پیری تمام ذکر جوانی میں کٹ گئی ۔۔۔ کیا رات تھی کہ ایک کہانی میں کٹ گئی

آنکھوں کو شغل گریہ ہمیشہ رہا عزیزؔ ۔۔۔ دریا کی ساری عمر روانی میں کٹ گئی

عزیز لکھنوی

شکیلہ اختر

شفیق

مجھے اپنے غریب دوست سے بے حد محبت تھی۔ مجھے کبھی اس کی بہتی ہوئی گندی ناک سے گھن نہیں آئی۔ وہ زیادہ تر ایک ہی جگہ بیٹھا اپنی چپیاتی ہوئی آنکھوں سے مکھیاں اڑایا کرتا۔ اس کے بھورے بالوں نے جٹاؤں کی صورت اختیار کر لی تھی۔ اور کرتے کے دونوں آستینوں پر کہنیوں تک ناک کی غلاظت جمی پڑتی تھی۔

ساری لڑکیاں مجھ سے جھگڑ کر علیحدہ ہوگئیں تھیں۔ انہیں یہ شکایت تھی۔ کہ آخر میں آنو پر کیوں حکم چلاتی رہوں۔ میرے بس کی بات نہ تھی۔ بھلا میں یہ کیسے گوارا کر لیتی۔ کہ میں ان سے بڑی ہو کر بھی لونڈیوں کی طرح دوڑ دوڑ کر ان کا کام کرتی پھروں۔ لیکن میرے عزیز دوست نے کبھی اس کا شکوہ نہیں کیا۔ کہ ہمیشہ وہ دربان ہی کیوں بنتا رہے۔ شاید ایسے موقعوں پر اُسے اس کا یقین رہتا تھا کہ اس کی تخلیق ہی ایسی اداکاری کے لئے ہے۔ وہ اطمینان سے اینٹ کے بے ڈھنگے ڈھیر پر بیٹھا لگاتار اپنی چندھی آنکھوں پر دو ہتڑ لگا کر مکھیوں کو مارتا رہتا۔

ایک روز میں دیر سے شفیق کا انتظار کر رہی تھی۔ اتنے میں وہ بھونتے، منہ پھاڑے بمشکل اپنی آنکھیں کھولنے کی کوشش کرتا ہوا خوش ہو کر بولا ”بڑی اچھی چیز لایا ہے رانو بی بی! دیکھو نے ای بھونا“ اس نے اپنی پھولی ہوئی جیب دکھاتے ہوئے کہا۔

”کھاؤ سے رانو۔ بڑا اچھا ہے جی“۔ میں نے اُسے گھورتے ہوئے کہا۔ میں تیرے گندے جیب کا نہیں کھاتی۔ دور ہو، میری باتوں کو سن کر وہ ایسے چپ ہو گیا۔ جیسے اس کو یہ یقین تھا۔ کہ میں بھونا دیکھتے ہی سارا جھپٹ کر کھا جاؤنگی۔

ہم اپنے نانا سے تم ہی لاتو مانگ کے لایا تھا۔ رانو، وہ آہستہ سے بولا ــــ!

”دیکھ تو تیرے جیب کے پاس کتنا میل ہے! کیسے اس میں کا کھاؤں“ میں نے منہ بناتے ہوئے کہا۔

”جیب کے اندر تو نانے میل ہے“ اس نے مری ہوئی آواز میں مجھے تکتے ہوئے کہا۔ ”اور جو تم ہم کو حلوا پوڑی دو ہو، تو ہم کیسے کھا جا ہیں؟“

”تو کیا تیری طرح میں بھی ایسے ہی گندی میلی کچیلی رہتی ہوں دیکھ تو میری جیب کیسی صاف ہے۔“

”جیب نے میلا ہے، مگر بھونا کہاں میلا ہوا ہے رانو“ وہ مکی کا سفید سفید لاوا دکھاتے ہوئے بولا۔

”اور یہ جو تیرے ہاتھ پر اتنی مکھیاں لگ رہی ہیں شو! اچھا تو میرے جیب سے تم ہی نکال لو“ اور جیسے ہی میں نے اس کے جیب میں ہاتھ ڈالا تھا۔ کہ شیطان کے بچے منیر نے چیخ کر اماں سے کہدیا ”یہی دیکھئے رانو شفیق کے جیب کا بھونا کھا رہی ہیں“

”اماں نے گرج کر کہا“ لا تو اسے پکڑ کر، میں بھونا دونا چھوڑ کر باہر بھاگی۔ دروازے سے چھپ کر دیکھا۔ بچارہ شفیق اپنا گرا ہوا لاوا اٹھا اٹھا کر جیب میں بھر رہا تھا۔

دوسرے دن جب میں اسے ترلوز کی قاش دینے لگی۔ تو اُس نے للچائی نظروں سے اُسے تکتے ہوئے کہا۔

”اب ہم کبھی نا لیں گے۔ تم ہی نے کل میرا بھونا پھیک دیو تھا نہ“

”ارے میں نے پھینکا تھا؟ کہ منیر نے اماں سے کہہ دیا تھا! تو نہیں جانتا سب کہتے ہیں نا کہ شفیق کے یہاں کی کوئی چیز مت کھاؤ نہیں تو مر جاؤ گی۔“

جاؤ رانو۔ تو ہم بھی اب تمرے ساتھ نا کھیلیں گے۔ اُس نے روٹھ کر کہا۔

"ارے سُن تو۔ دیکھو سب سے چھپا کر وہ بھونا لا دے سمجھا" میں نے اُسے مناتے ہوئے کہا۔

تو میرے گھر چلو نے۔" اچھا چل، مگر کسی سے کہے گا تو نہیں نہ؟"

میں اماں سے چھپ کر ڈرتی ڈرتی شفیق کے گھر پہونچی۔ اس سے پہلے میں کبھی ایسے مکان میں نہیں آئی تھی۔ بھوُنس کا ٹوٹا پھوٹا ہوا سیاہ چھپر ہیبت ناک بھوت کی طرح اُن کے سروں پر آندھا ہوا تھا۔ اور مٹی کی ٹیڑھی ترچھی دیواریں ایسی معلوم ہو رہی تھیں جیسے سُوکھے ہوئے حلقوں سے یہ کھر کھراتی سانس کو بھی اپنے ڈراؤنے ہونٹوں سے گھونٹنا چاہتی ہوں۔

میں نے شفیق کے خوبصورت چہرے کو دیکھتے ہوئے کہا "تو کہاں پہ سوتا ہے شفیق۔؟"

"ہم یہاں پہ سوتیں ہیں،" وہ میرا ہاتھ پکڑ کر ایک طرف لے گیا۔ اللہ۔ میں حیران رہ گئی۔ "ڈربہ پہ سوتا ہے۔ شفیق؟ اوہ مرغی کی ساری جوئیں جو تیرے کپڑے پہ چڑھ جاتی ہونگی"

"تو پھر کہاں پر سوئیں رانو۔ دیکھو تو نیچے بکری بندھی ہتی ہے۔ اُس کونے میں نانا سوئیں ہیں۔ او ہم کو اپنے پاس نا سولاویں ہیں۔ اور ماں کہتی ہے۔ کہ او کوٹھڑی کی دیوال گر جاگی ——

"دیکھو اس ڈربہ میں میری چار مُرغی ہے۔ اور بکری کو بھی دو بچہ ہُوا ہے۔ ای دیکھو ہم سیم کا بیج لو یا ہے۔ اور ای کدو کا، جب پھلے گا نہ، تو تم کو بھی دیگے۔ اور ہاں میرے ایک نانا بھی ہیں۔ چلو تم کو دکھاویں۔ وہ میرا ہاتھ پکڑ کر ساری چیزیں دکھا رہا تھا۔ اور جب بکری کی مینگنیں بہتے ہوئے کیچڑ اور مرغی کی گندگی سے ہوتی ہوئی میں اُسارے کے دوسرے کونے میں چھپاتے ہوئے ٹاٹ کے پردے کے پاس پہونچی۔ تو میرا جی متلانے لگا "سا پھو۔ پردے کے پیچھے سے آواز آئی۔ وہ میرا ہاتھ پکڑ کر ٹاٹ کے اُس پار لے گیا۔ اللہ۔ میں بُت بنی کھڑی رہی۔

انسان اس صورت میں بھی پیدا کیا جا سکتا ہے؟" میں سوچنے لگی۔ "اللہ میاں کو ایسے بناتے وقت گھن بھی نہ آئی تھی" "سا پھو تو صبح سے کہاں گیا تھا بیٹا؟ دیکھ تو تیرے لایہ ٹکڑی رکھا ہے" گوشت کے اس مکروہ لوتھڑے میں اک جنبش ہوئی۔ اور میں حیران رہ گئی۔ سیاہ لال لال زخموں سے بھرے ہوئے ہاتھ کی ساری انگلیاں غائب تھیں۔ "نانا دیکھو تو۔ رانو بی بی تم کو دیکھے آئی ہیں،" شفیق جوش مسرت سے چیخ کر بولا "کہاں ہیں بیٹا کہاں؟" وہ انتہائی خوشی سے بڑبڑا کر اُٹھ بیٹھا۔ اس نے اپنی چندھی آنکھوں پر سے بھنبھناتی ہوئی مکھیوں کو اُڑاتے ہوئے کہا "جیتی رہو بیٹی تمہیں دیکھ کے بڑا جی خوش ہوا۔ کاہے کھڑی ہو؟ —— ! جا بیٹا —— ! بچھوان کا پیڑھا اُٹھا لا —— شفیق دوڑ کر پیڑھا اٹھا لایا۔ لیکن میرا دماغ چکرا رہا تھا۔ زخموں کی سڑی اور جیسا ندبُو سے میری ناک پھٹی جا رہی تھیں۔ چپچپاتی ہوئی زمین پاس ہی نالی کے جمے ہوئے سبز کیچڑ اور ملتے ہوئے ٹاٹ کی بدبُو سے میرا دم گھٹ رہا تھا۔ اور سب سے بڑھ کر گندے اور غلیظ کپڑوں کے ڈھیر سے چمٹا ہوا یہ انسان۔ جسکے بدن کے اکثر حصے بجبجاتے ہوئے زخم بنکر بُری طرح بدبو پھیلا رہے تھے۔ مجھے ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے اب اِس ہیبت ناک فضا میں دم گھٹ کر مر جاؤنگی، بڑی حسرت سے میری آنکھوں میں میرا صاف اور بہترین مکان گھومنے لگا۔

آج کس کا منہ دیکھ کر اُٹھی تھی، میں نے دل میں سوچا۔ اب اگر یہاں سے گئی۔ تو پھر کبھی نہ آؤنگی۔

"تم کاہے چپ ہو رانو بی بی؟" شفیق نے مہربان میزبان کی طرح پوچھا۔

سا پھو! تمری بڑی تعریف کرتا رہے ہے۔ بیٹی۔ بڈھے نے مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔ اُس کی آنکھوں کو دیکھتے ہی میری آنکھیں جُھک گئیں۔

آہ ان بے پلکوں کی سُرخ، پھُولی ہوئی کناروں والی آنکھوں میں کتنی آرزوؤں کا خون جھلک رہا تھا۔ اُس کے چہرے کے سیاہ زخموں سے بھرے ہوئے خدّ و خال پر کیسی غمنا کی چھائی

ہوئی تھی۔ لیکن اُس کے لبوں پر ایک افسردہ سا تبسم تھا۔ وہ اپنے پیلے پیلے دانت نکال کر اپنی حسرتوں کو چھپا رہا تھا۔ زندگی کی ایک لرزتی ہوئی ہلکی سی لہر اس کے لبوں پر دوڑ رہی تھی۔ اور وہ اپنی ساری مصیبتوں کو اپنے اِس ادھورے سے تبسم میں بھلا دینے کی کوشش کر رہا تھا۔ بڈھا اپنی بیپ سے لتھڑی ہوئی تھوتھنی انگلیوں سے بمشکل بالس کا پنکھا لیکر میرے نزدیک کھسک آیا۔ بڑی گرمی ہے بیٹی۔ اس نے بڑی محبت سے کہا۔ تم کو ساجھو بہت چاہتا ہے۔ ہر دم بس تم ہی کو یاد کرتا رہتے ہے۔ تم بھی تو اُس کا بڑا خیال کرو ہو۔ اسی لئے تو بیٹی تم ہم سب کے لئے سب ہی کچھ ہو۔ یہی ایک بچارہ بچ رہا ہے۔ سب ہی مر گئے۔ بیٹی تم میرے بچہ کو کتنا پیار کرتی ہو۔ اسی لئے تو اگر تم کہو تو ہم اپنے کھال کا جوتا بنا کر تمہیں خوشی سے پہنا دیں۔"

ان سیاہ، تھجھاتے ہوئے داغوں سے بھرے ہوئے چمڑے کا جوتا —؟ ایمان سے! میں تو کبھی نہ پہنوں گی۔ میں نے کانپتے ہوئے اپنے پیر کی طرف ایسا دیکھا جیسے میں اسکے چمڑے کا جوتا پہنے کھڑی ہوں۔

شفیق بڈھے کی گھٹڑی سے گکڑی نکال کر تڑتڑتے ہوئے بولا۔ بہو ناتو سب ختم ہو گیا۔ رانو بھی لو۔ اوہا ہم اوہا تم۔" لیکن بڈھا اس کے ہاتھوں پر جھپٹ پڑا۔ نا سا بھو۔ رانو بی بی کو مت دے،"

کاہے نانا، ؟ تو ہم کیسے کھا ہیں؟ اس نے بھولے پن سے پوچھا تو "تو میرے ساتھ ہر دم سے ہے بیٹا"،

اُس نے اپنی جھڑی ہوئی انگلیوں کو دیکھتے ہوئے ٹھنڈی سانس بھری۔

شفیق مجھے میرے گھر تک پہونچانے گیا۔ لیکن میں راستہ بھر کیدم چپ رہی۔ مجھے تو ایسا لگ رہا تھا۔ جیسے جان چھڑا کر میں دوزخ سے بھاگی آ رہی ہوں۔ میرا جی متلا رہا تھا۔ اُس روز میں نے کھانا بھی نہ کھایا۔

میں دروازے پر بیٹھا شفیق کو چڑا رہا تھا۔ جب تیرے نانا کو ہم ڈنڈے سے مار سیاہ کو ڈرا دیں ہیں۔ تو کیسے بڈھا رونے لگے ہے،"

میں کانپ اٹھی۔ اِن سرخ پھولی ہوئی کناروں والی آنکھوں سے کیسے آنسو بہتے ہونگے!"

مجھے بار بار شفیق اپنے گھر جانے کہتا۔ لیکن میں لرز جاتی "نہیں شفیق مجھے ڈر لگتا ہے۔ تیرے بچارے نانا کی انگلی دیکھ کر بہت افسوس آتا ہے۔" کاہے کو افسوس لگے ہے رانو۔ ؟ اور تو اللہ میاں ایسا بنائیں ہیں۔"

"نہیں رے شفیق، اللہ میاں نے ایسا نہیں بنایا ہے اماں کہتی ہیں، اُن کو بیماری ہے،"

" ہاں۔ بیماری ہے،" اُس نے چڑ کر کہا "تو کہاں ڈاکٹر آوے ہے؟ اور دوا کی شیشی کہاں رکھی رہے ہے۔ ؟ تم جو بیمار تھیو تو کتنی شیشی تھی ٹیبل پر،" مجھے شفیق کی باتوں پر یقین آ گیا۔

"تو اللہ میاں نا اچھے ہیں۔ تیرے نانا بچارے کی انگلیاں اُنہوں نے نہیں بنائیں،" اور اسکے بدلے میں اتنے بڑے بڑے زخم دے دئے۔ تو یہ ہم تو نہیں بولتے اللہ میاں سے ایک دم خراب ہیں وہ"

"اللہ میاں کو بُرا نا کہو رانو،" اس نے پریشان ہو کر کہا۔ میں سکول بند ہونے پر جب دو مہینے بعد گھر لوٹی۔ تو اماں نے افسردہ لہجے میں کہا "رانو — ! تیرا شفیق بچارہ — ! کیا ہوا اماں۔ ؟ میں نے بے صبری سے کہا۔ وہ بچارہ اس مہینہ ہیضہ سے مر گیا — ! مر گیا۔ میرے کانوں میں دیر تک یہ گونجتا رہا۔ میں بہت دیر تک اُس لئے روتی رہی۔ کاہے مر گیا وہ۔ اب کون میرے ساتھ کھیلے گا ؟ —

جب میں نے اپنے آنسو پونچھ ڈالے۔ تو مجھے خیال ہوا۔ اماں نے مجھے چھیڑنے کو کہدیا ہوگا۔ میں دوپہر کو سب سے چھپ کر شفیق کے گھر گئی۔

بچارہ نانا۔ وہ مجھے دیکھتے ہی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ اور اُسکے ساتھ ہی میں بھی آہستہ آہستہ دیر تک روتی رہی۔ بڈھا نانا اُسکو کتنا چاہتا تھا۔ مجھے اس روز ذرا گھن نہیں آئی۔ وہ بہت دیر تک مجھ سے شفیق کی باتیں کرتا رہا۔ بچارہ مرتے وقت بھی مجھے یاد کر رہا تھا۔ میں روز اپنے شفیق کی باتیں سننے بڈھے نانا کے پاس

جاتی۔ اب مجھے ٹاٹ کے پردے سے گھن نہیں آتی۔ مجھے اس ٹاٹ اُس ٹھٹھری ہوئی زمین اور زخموں سے بھرے ہوئے بڈھے سے محبت ہوگئی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا۔ اسی ٹاٹ سے شفیق لپٹا تھا۔ اسی زمین پر وہ بیٹھا رہتا تھا۔ اور اُسے اپنے نانا سے کتنی محبت تھی۔ پھر میں اُسے کیوں نہ چاہتی۔ وہ میرے شفیق کا نانا تھا۔ میں اکثر اپنے نعمت خانے سے اپنے بچارے شفیق کا حصہ حلوہ اور پھل چرا چرا کر دیتی۔ وہ اپنی کپکپاتی ہوئی انگلیوں سے پکڑ کر جلدی جلدی ایسے کھانے لگتا۔ جیسے کوئی اُس کے منہ کا نوالہ چھینے کو آ رہا ہو

شفیق کی ماں خود اپنے فاقے سے تنگ آ کر دوسری جگہ نوکری کرنے چلی گئی تھی۔ بچارے بڈھے نانا کو بستی کا کوئی آدمی رحم کر کے اس کا کھانا اور پانی اُسکے پاس رکھ جاتا۔

میرا اسکول کھل رہا تھا۔ میں جانے سے پہلے صبح ہی صبح جب اس سے ملنے گئی۔ تو وہ بے خبر سو رہا تھا۔ اور ایک تیز بدبو ہر طرف پھیلی ہوئی تھی —— اس روز پہلے کی طرح پھر میرا جی متلانے لگا۔ لیکن میں نے سوچا وہ شفیق کا نانا تھا۔ میں نے زور زور سے پکارا میں جا رہی ہوں نانا —— اُٹھو۔ لیکن وہ سویا ہی رہا۔ اچھا تو میں جاتی ہوں۔ تم مت اُٹھو ——!

جب میں گھر آ گئی۔ تو کچھ دیر کے بعد منیر نے کہا "بڈھا کوڑھی مر گیا۔ بی بی۔ اب اُسے کوئی نہیں چھوتا ہے" منو نے ہنستے ہوئے کہا "بگلا۔ اُسے چھوئے گا کون؟ —— ارے وہیں پر گڑھا کھود کر سب اُسے بانس سے دھکیل دیں ——"!

میری گاڑی رات کی تاریکی میں تیزی سے گزرتی جا رہی تھی دور سے درختوں کی قطاریں ایسی نظر آ رہی تھیں جیسے کسی کوڑھی کی ٹنڈ منڈ انگلیاں ہوں۔ اور رہ رہ کر پہیوں کی آواز ایسی معلوم ہو رہی تھی جیسے بہت سے کتے ایک ساتھ مل کر کسی لاش کو اپنے خونی جبڑوں سے چبا رہے ہوں: "کڑا" "کڑ کڑا" "چپڑ" "چپڑ"

اس اندھیرے میں میری آنکھوں سے آنسوؤں کے موٹے موٹے قطرے گرنے لگے۔ لیکن میں انہیں دیکھ نہ سکی۔

گیتانجلی

تیرے قلب پر افسردگی طاری ہے۔ اور تیری آنکھیں اب بھی خواب آلود ہیں۔

کیا تیرے پاس یہ خبر نہیں آئی۔ کہ پھول کانٹوں کے درمیان کس شان سے حکومت کر رہا ہے۔ جاگ، جاگ، وقت کو بیکار نہ جانے دے اس راہ سنگین کے اختتام پر ایک اچھوتی تنہائی کے ملک میں میرا محبوب تنہا بیٹھا ہوا ہے۔

اسے دھوکا نہ دے، جاگ، اٹھ جاگ، کیا ہے۔ اگر آسمان ہانپتا ہے۔ اور دوپہر کی حدت آفتاب سے ہانپ رہا ہے

کیا ہے۔ اگر جلتی ہوئی ریت اپنی لباس کی چادر پھیلا رہی ہے۔ کیا تیرے عمیق دل میں کوئی مسرت نہیں ہے۔ کیا تیرے ہر قدم پر ساز جادو اور دکھ نغمہ شیریں میں تبدیل نہ ہو جائیگا؟ وجہ یہ ہے کہ میں اسقدر متروکات کا مجرم ہوں۔

اس دن جب کنول کھلا، افسوس میرا قلب بھٹکتا پھر رہا تھا۔ اور میں اس سے بے خبر تھا۔ میری ٹوکری خالی تھی اور پھول پڑے تھے کسی کو ان کی پرواہ نہ تھی۔

شاہد احمد دہلوی

جنگلی بھینسا

اگلی چھٹیوں کا ذکر ہے۔ کہ میں اپنی شادی کے بعد میری کے ساتھ اپنے ایک سابق افسر کے ہاں ہفتہ عشرہ گذارنے کے ارادے سے گیا۔ کرنل ایک بڈھا آدمی تھا۔ اور اس نے وظیفے پر علیحدہ ہونے کے بعد ایک دیہات میں گھر بنا لیا تھا۔ گھر کی دیواروں پر شکار کے زمانے کی یادگاریں لگی ہوئی تھیں۔ کرنل یہاں اکیلا رہتا تھا۔ صحت نے جواب دے دیا تھا۔ لیکن کرنل نے جی نہیں چھوڑا تھا۔ اس کا مزاج شگفتہ اور طبیعت چونچال رہتی تھی۔ اس امید پر کہ اس کی صحت اتنی اچھی ضرور ہو جائے گی۔ کہ بقیہ زندگی ہندوستان کے محبوب جنگلوں میں گزار سکے۔

طعام شب کے بعد ہم تینوں آتشدان کے سامنے جا بیٹھے۔ اور ہندوستان کے متعلق گفتگو چھڑ گئی۔ کرنل کی کہانیاں سن سن کر میری تعجب و مسرت سے اچھل اچھل پڑتی تھی۔ بات میں بات نکلتی رہی۔ یہاں تک کہ جوتشیوں کا ذکر چھڑ گیا۔

میری نے کہا "مجھے تو جوتشیوں کی باتوں کا بالکل یقین نہیں آتا۔ ان میں سے بیشتر جھوٹے ہوتے ہیں۔ مجھے تو ایک مثال بھی ایسی معلوم نہیں۔ کہ کسی جوتشی نے کوئی آنے والی بات صحیح بتائی ہو۔ وہی معمولی باتیں ہوتی ہیں جنہیں ہر سمجھدار آدمی قیاس کر سکتا ہے۔

میری کے اس منطقی اظہار خیال پر میں اور کرنل بے ساختہ ہنس پڑے۔ دراصل ہمیں اس وقت جبل پور کی ایک شام یاد آ گئی۔ اُس دن ایک جوتشی نے ہم دونوں کی تقدیروں کا حال بتایا تھا۔ اور اُس کی پیشین گوئیاں بڑی حد تک سچی نکلی تھیں۔ ہم فوجی طعام خانہ کے صحن میں بیٹھے تھے۔ ایک جٹا دھاری سادھو گیروا کپڑے پہنے، بھبوت ملے۔ ہمارے پاس آیا اور بولا۔ "صاحب کا ہاتھ بانچیں۔ بھاگ کا لکھا بتائیں" اُس وقت ہم بھی بیکار بیٹھے تھے۔ سوچا چلو یہی اچھا مشغلہ رہے گا۔ میں نے کہا۔ "دیکھو بابا، اگر ہماری قسمت کی باتیں اچھی اور سچی ہوں گی

تو ہم تمہیں ایک ایک روپیہ دینگے" سادھو نے جھٹ سے کرنل کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ "صاحب تو راجہ ہے۔ اور تم بہت غریب ہو

* * * * *

سادھو نے بہت سی باتیں بتائیں۔ ان میں سے کچھ بیتے ہوئے دنوں کی تھیں۔ اور کچھ حال کی۔ میرے بارے میں جو کچھ اس نے کہا۔ عام باتیں تھیں۔ اور بات ہے بھی یہی کہ میں اُن لوگوں میں سے ہوں جنہیں غیر معمولی واقعات کبھی پیش نہیں آتے۔ کرنل کے بارے میں سادھو مصر تھا کہ "صاحب کی موت جنگلی بھینسے سے ہوگی" اس پیش گوئی کے متعلق اُسے کامل یقین تھا۔ اور بار بار تاکید کرتا تھا۔ کہ جنگلی بھینسے کا شکار مت کھیلنا۔

کرنل نے میری بیوی سے کہا۔ "تو ہوا یہ کہ جب کبھی بھی کوئی پیش گوئی میرے متعلق کی گئی۔ میں نے ہمیشہ تقدیر کو شکست دی"

میری نے چہک کر کہا۔ "اچھا مجھے ساری باتیں تو بتائیے۔ بس ایسے ہی قصے سننے میں مجھے لطف آتا ہے۔ ہاں تو آپ نے کہا تھا۔ کہ آپ نے تقدیر کو ہمیشہ شکست دی۔ یہی تو میں بھی کہہ رہی تھی۔ میری دلیل کی اس سے تصدیق ہوتی ہے۔"

کرنل نے خوش ہو کر اپنا پائپ بھر کر جلایا۔ اور قصے سنانے شروع کر دیئے۔ پہلے جبلپور کے جوتشی کا قصہ سنایا۔ اور یہ بھی بتایا کہ اُس وقت میری سب سے بڑی خواہش یہی تھی۔ کہ کسی طرح ایک جنگلی بھینسا شکار کر لوں۔

مجھے جوتشیوں پر کوئی اعتقاد نہیں تھا۔ لیکن پھر بھی سادھو کی بات سُنکر ایک نامعلوم خوف دل میں بیٹھ گیا۔ بات دراصل یہ تھی کہ میں نے اور تمہارے شوہر نے یہ طے کر رکھا تھا۔ کہ دو ہفتے بعد اپنے دورے سے فارغ ہو کر ہم جنگلی بھینسے کے شکار کو گرداوری کے

کنارے جا بیٹھے"

* * * * *

دورہ ختم کرکے ہم گوداوری کے کنارے پہنچے۔ اور رام پور میں اپنا کیمپ بنایا۔ اپنے شوہر سے کہنا کہ تمہیں بھی کبھی اُس جگہ لے جائیں۔ میں نے ویسا اچھا جنگل بہت کم دیکھا ہے۔ پاس ہی ایک مندر کے کھنڈر ہیں اور اسکے چاروں طرف مہوے کے درخت ہیں۔ اس سے کچھ زیادہ فاصلہ نہیں ہے۔ قریب ہی پنڈاریوں کا ایک شکستہ قلعہ ہے۔ اس میں اب چیتے اور ریچھ رہتے ہیں۔ برابر سے ندی بہتی ہے۔ اور اسکا نغمہ فرحت سنائی دیتا ہے۔

شام کا جھٹپٹا ہوتے ہی جنگل میں جاگ سی ہو جاتی ہے۔ پہلے کسی بھوکے گلدار کی بولنے کی آواز سنائی دیتی۔ اسکے بعد دُور ندی کے کنارے سے جنگلی سؤر کے چیخنے کی آواز آتی۔ رات گئے جنگل پانی پینے آتیں۔ خوبصورت چرند چوکنے ہوکر پانی کی طرف بڑھتے۔ اور جنگلی سایوں میں ساکت کھڑے ہو جاتے، اتنے خاموش و ساکت کہ کسی کو ان کی موجودگی کا علم بھی نہ ہو یہاں تک کہ کسی خطرے کے احساس سے یکایک پلٹ کر وہ چیختے چلاتے جنگل میں گھس جاتے۔ اور انکے چیخنے اور درندوں میں آنے والی خشک ٹہنیوں کے ٹوٹنے دیر تک سنائی دیتے"

میری نے کہا "مگر یہ تو بتائیے۔ کہ جنگلی بھینسے کا کیا ہوا؟"

* * * * *

میں جانتا تھا۔ کہ بیچارے کرنل کے دل پر کیا گزر رہی ہے۔ اپنے محبوب جنگلوں سے علیحدہ ہونے پر میرا دل بھی دُکھ رہا تھا۔ لیکن میری کو اس تکلیف اور جدائی کا احساس کیسے ہو سکتا تھا۔

کرنل نے کہا "عزیزہ خاتون، میں نادم ہوں۔ کہ بات میں بات نکل آئی۔ اور میں بہک کر کہیں سے کہیں نکل گیا۔ تمہیں اندازہ نہیں ہو سکتا۔ کہ آجکل اُس زمانے کی یاد کس قدر ستاتی ہے۔ پھر ایسے موقعے بہت کم آتے ہیں۔ کہ میں شکار کے واقعات کسی کو سنا کر اپنے دل کی بھڑاس نکال سکوں۔ ہاں تو تم نے پوچھا ہے۔ کہ جنگلی بھینسے کا کیا ہوا؟

ہوا یہ کہ تیسرے دن کا ذکر ہے۔ ہم ندی کے بہاؤ پر کشتی میں جا رہے تھے۔ کہ ہمیں جنگلی بھینسوں کی ایک ڈار دکھائی دی۔ یہ نکل آئے تھے۔ اور تیر کر ندی پار کر رہے تھے۔ کشتی موڑ کر ہم نے ٹھہرائی تاکہ وہ ندی پار کر لیں۔ تو ہم اُن کا پیچھا کریں۔ رتن شکاری نے ہمیں یقین دلایا۔ کہ ان میں ایک بڑا سانڈ بھی ہے۔ کشتی سے اتر کر ہم نے ڈار کا پیچھا کیا۔ اور تھوڑی دیر بعد اُسے جا لیا۔ سامنے بانس کے دو جھنڈ تھے۔ اور ان کے بیچ میں وہ بھینسا کھڑا تھا میں نے اس پر گولی چلائی۔ اور گولی کے نشانے پر بیٹھنے کی مدھم آواز بھی سُنی۔ اسکے ساتھ ہی جانور کے کھانسنے کی آواز بھی آئی۔ جس سے معلوم ہوا۔ کہ اس کا پھیپھڑا زخمی ہو گیا ہے۔ بندوق کی آواز سے ڈار بھاگی۔ اور بھینسا بھی اسکے ساتھ ساتھ ہو لیا۔

* * * * *

ڈار کا پیچھا کرنے کی تفصیل بیان کرکے میں تمہیں پریشان نہیں کرونگا۔ بس یوں سمجھو۔ کہ اس میں کافی وقت لگا۔ بھینسے نے تھوڑی دیر کے بعد ڈار کا ساتھ چھوڑ دیا۔ رتن لال نے اسکا کھوج نکال لیا اُونچی اونچی گھاس میں بھینسا گھس گیا تھا۔ تمہارے میاں نے ایک درخت پر چڑھ کر مجھے آواز دی۔ کہ بھینسا نظر آ رہا ہے۔ اور اپنے پیروں پر کھڑا ہے، ابھی گرا نہیں ہے۔

گھاس کے جھنڈ ہٹاتا میں آگے بڑھا۔ پسینے کی لڑیاں بہ رہی تھیں۔ جانور کا پیچھا کرنے میں بڑی محنت کرنی پڑی تھی۔ بالآخر یکایک گھاس میں سے اسکا سر نکلا — بھینسا جھپٹ کر حملہ کرنے کے لئے نکلا۔ میں نے شست باندھ کر گھوڑا دبایا — کارتوس نہیں چلا میں نے دوسری نال ماری۔ مگر وہ بھی پھٹ کر کے رہ گئی۔ دونوں نالیں بیکار ثابت ہوئیں۔ ایک لمحہ کے لئے بھینسے کی خشم آلود آنکھوں سے میری آنکھیں چار ہوئیں۔ اس مختصر سے وقفے میں جو تشی کے الفاظ میرے ذہن میں بجلی کی طرح کوند گئے۔ اسی وقت میں نے بندوق دوبارہ بھرنے کی کوشش کی۔ لیکن میرے تعجب کی کوئی حد نہیں رہی۔ اور دل پر سے بوجھ بھی ہٹ گیا۔ یہ دیکھ کر کہ بھینسا ایک دم سے داہنی طرف کو مڑا اور سرپٹ روانہ ہو گیا۔

ہوا یہ کہ تمہارے میاں درخت پر سے گر پڑے۔ بھینسے نے گرنے کی آواز اور شور سنکر فوراً اپنے حملے کا رخ بدل دیا۔ اتنی

دیر میں میں نے اپنی بندوق پھر بھر لی تھی۔ اور بھینسے کے پھیلے دھڑ میں دو گولیاں پیوست کر دیں۔ دوسری گولی پر بھینسا ڈھیر ہو گیا

* * * * * * *

کرنل نے جب یہاں تک کہانی سُنا دی۔ تو اب میں نے دخل دینا مناسب سمجھا۔ تاکہ جوتشی کی پیش گوئی کو پھر موضوعِ سخن بنایا جائے

جوتشی نے مجھ سے کہا تھا۔ کہ تم کرنل کی افسوسناک موت اپنی آنکھوں سے دیکھو گے۔ لیکن کہانی کی بدنصیبی کہو یا کرنل کی خوش نصیبی کہ میں درخت پر سے منہ کے بل گرا۔ اور مجھے سوائے تاروں کے اور کچھ دکھائی نہیں دیا"

اور اسکے بعد ہی ایک عجیب واقعہ ہوا۔ میری بیوی نے میرا بازو زور سے پکڑا۔ آتشدان کے اوپر اُسی جنگلی بھینسے کا سر لگا ہوا تھا

اُن کی مدھم روشنی میں اُسکی شیشے کی آنکھیں اس طرح دیوانہ وار چمک رہی تھیں۔ گویا موت قریب ہو اور ایک وحشتناک عزم ٹمٹما سے ٹپک رہا ہو۔ بھینسے کے سر میں جُنبش ہوئی۔ اور ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے کرنل کے اوپر آ پڑا۔

* * * * * * *

جب ہم نے کرنل کو اٹھایا۔ وہ مر چکا تھا جنگلی بھینسے کا ایک سینگ کرنل کے دل میں گھس گیا تھا۔

جوتشی نے بالکل سچی پیش گوئی کی تھی۔ میں نے شروع سے آخر تک ساری باتیں اپنی آنکھوں سے دیکھی تھیں۔

یہ سارا واقعہ اس قدر عجب خیز ہے۔ کہ مجھے اب بھی یقین نہیں آتا۔ کہ ایسا واقعی ہے۔

تاجور سامری

سوزِ دوام

مرے ظاہر سے اے ہمدم یہ دھوکہ ہو گیا تجھ کو
کہ اب میں شادمانی کے نشے میں چُور رہتا ہوں
خدا کے واسطے ایسے نہ دے الزام تو مجھ کو

سماں ہوتا ہے جیسے اکثر ایسا موسمِ گل میں
پہنا دیتی ہے فطرت سبز جامہ ساری دنیا کو
کوئی صحرا نہیں رہتا ہے صحرا موسمِ گل میں

یونہی اے ہمنشیں اب خوگرِ غم ہو گیا ہوں میں
ہجومِ رنج ہی میرے لئے عشرت کی محفل ہے
مگر تجھ کو گماں ہے عشرتوں میں کھو گیا ہوں میں

بھڑکتی آگ جیسے سرد ہو جاتی ہے جل بجھ کر
مگر اس راکھ میں چنگاریاں پوشیدہ رہتی ہیں
وہی سوزِ نہاں رکھتا ہوں میں بھی مشعلِ خاکستر

شبیر محمد اختر

بہانے

شرابی اپنا محبوب گانا گنگنا رہا تھا ——

اندھیری رات اور پھر بڑھتا ہوا طوفان، بجلی کی بستر فلک پر بے تاب کروٹیں، بادل کی دل ہلا دینے والی گرج۔ تمام شہر پر موت کا سناٹا چھایا ہوا تھا۔ بازار تاریکی کی آغوش میں سوتے پڑے تھے۔ مکانوں میں تمام روشنیاں گل ہو چکی تھیں۔ اور مکین دروازے بند کئے محوِ خواب تھے، سڑکوں کے کنارے بجلی کے کھمبے خاموش اور افسردہ سے کھڑے تھے، بادل کی پیہم گرج ماتم پوش رات کو اور بھی پُرخوفناک بنا رہی تھی۔

لیکن شرابی اپنے ماحول سے بے خبر ——— ساغر و مینا کا ہوش رکھتے ہوئے اپنے کمرے میں بند صوفے پر پڑا تھا۔ گلاس ہاتھ میں اور بوتل نظر کے سامنے۔

"جیون —" وہ لہرا کر گنگنا رہا تھا "جیون جیوتی جاگ رہی ہے"

اُس نے جھوم کر ساغر بلند کیا۔ ہونٹوں کے قریب لایا، اور ایک ہی گھونٹ میں خالی کر دیا۔ بوتل کا منہ گلاس میں ڈال کر اُسے اُلٹ دیا۔ اور پھر جھنجھلا کر خالی بوتل کو دیوار سے دے مارا، یہ دوسری بوتل تھی۔ جسے وہ اس طرح پاش پاش کر چکا تھا۔ ایک لمحہ کے لئے وہ سر اپنے بازوؤں پر جھکائے کچھ سوچتا رہا۔ اور پھر اپنی جگہ سے اٹھ کر لڑکھڑاتا ہوا الماری کی طرف بڑھا، اس نے آخری بوتل نکالی۔ مسرت کی سرخی اُس کے چہرے پر دوڑ گئی۔ وہ چیخ اٹھا۔

"جاگ رہی ہے۔ جیون جیوتی!"

وہ اپنا مرغوب گیت گنگناتا ہوا واپس لوٹا، بادل کی کڑک سے زمین دہل گئی، بجلی ٹوٹ کر قریب کہیں گری۔ اور شرابی چھوٹی میز سے ٹھوکر کھا کر سنبھل گیا۔ چاندی کا فریم فرش پر آ رہا۔ شیشے کی شکست سے وہ چونک پڑا، اُس کی نظریں تصویر پر جھکیں۔ اور وہیں جم کر رہ گئیں۔ اُس کا رنگ زرد پڑ گیا۔ سر سے پاؤں تک ایک کپکپی سی کوند گئی۔ اُس کی خوفزدہ نظریں اپنی مرحوم بیوی کی آنکھوں میں گڑ گئیں غم و حرماں کا مجسمہ اُسے حسرت بھری نظروں سے تک رہا تھا۔

"سوشیلا" اُس کے تھرتھراتے ہوئے ہونٹوں سے ایک لفظ نکلا۔

اُس کے پاؤں لڑکھڑائے۔ اور تصویر کے قریب آ کر بیٹھ گیا۔ اُس کی نگاہیں ایک لمحے کے لئے بھی تصویر سے نہیں ہٹیں۔

کلاک نے بارہ بجانے شروع کئے۔

وہ چونک پڑا۔ اُس کی وحشت انگیز نظریں کلاک کی طرف اٹھیں اُسے یوں محسوس ہوا کہ سینکڑوں گھنٹے ایک ساتھ بجتے جا رہے تھے۔ کمرے میں بہت سی آوازیں سرگوشیاں کرتی سنائی دیں۔ اُس کے سامنے۔ دائیں بائیں اور پشت پر دیوار سے چسپاں ہزاروں پراسرار آنکھیں اُسے گھورتی ہوئی نظر آئیں۔ وہ گھبرا کر اٹھ کھڑا ہوا ——— کئی خاموش اور سیاہ سائے اُس کی نظروں کے سامنے چاروں کونوں سے آگے۔ اور اپنے لانبے لانبے خوفناک ہاتھ اُس کی طرف اٹھاتے ہوئے بڑھے۔ وہ اچھل کر صوفے پر جا پڑا۔ اور سمٹ کر بیٹھ گیا۔ اُس نے پاگلوں کی طرح منہ کھولے چاروں طرف دیکھنا شروع کیا۔ اُس کی پیشانی پر پسینے کے موٹے موٹے قطرے چمک رہے تھے۔ وہ جلد جلد سانس لے رہا تھا۔ اُسے اپنے ارد گرد کی دنیا زور زور سے گھومتی ہوئی محسوس ہوئی اُس نے اپنے دونوں ہاتھوں سے چہرہ کو ڈھانپ لیا۔ اور ایک دبی ہوئی چیخ اُس کے حلق سے نکلی۔ کلاک کی آخری ٹن کے ساتھ یہ طلسم ٹوٹ گیا۔

اُس نے آہستہ آہستہ اپنے ہاتھ چہرے سے ہٹائے اُس کا رنگ سپید ہو رہا تھا۔ وحشت انگیز نظروں سے اُس نے اِدھر اُدھر دیکھا اُس کی نظریں پہلے بوتل پر کچھ دیر کے لئے رکیں اور پھر تصویر پر مرکوز

ہو گئیں۔

"سوشی!" وہ زیرِ لب بڑبڑایا۔

کمرے میں آہستہ آہستہ تاریکی پھیلنی شروع ہوئی۔ بادل کی گرج مدھم ہوتی ہوتی خاموش ہو گئی۔ ایک منٹ کے بعد کمرہ میں ہر طرف اندھیرا چھا گیا۔

وہ دبے پاؤں اپنی جگہ سے اٹھا۔ اور ہاتھ بڑھا کر بوتل کو تھام لیا۔

"میں کہتی ہوں۔ پی!" اسے اپنی بیوی کی آواز سنائی دی۔

"کون!" وہ پاگلوں کی طرح چلایا "کون ہے؟"

تاریک گوشے سے ایک انسانی جسم نمودار ہوا۔

"سوشی! سوشی!! تو پھر یہاں؟"

کہاں جاؤں؟ اسے جواب دیا گیا۔ آپ میرے دیوتا ہیں۔ یہ چار دیواری میرا سورگ ہے۔ کہاں جا سکتی ہوں۔ آپ کو اس حالت میں چھوڑ کر؟۔ آپ دن رات اکیلے پڑے بیٹھے رہتے ہیں۔ میرا جی دکھتا ہے۔ اسے نہ پیا کیجئے آپ۔ اسے . . . ."

"خاموش!" وہ گرج کر بولا "تو یہاں پھر کیوں آئی۔ نکل جا یہاں سے سُنا۔ نکل جا!"

اس نے بوتل کو شانے سے اوپر اٹھایا اور گھما کر اس کی طرف پھینکا۔ ایک آہ کے ساتھ وہ زمین پر آ رہی۔ اس کی نظریں فرش پہ رینگتے ہوئے خون پر جم گئیں۔

تاریکی آہستہ آہستہ دور ہو گئی۔ شرابی نے اپنا سر بازوؤں سے اوپر اٹھایا۔ وہ صوفے پر سمٹا ہوا پڑا تھا۔ بوتل میز پہ موجود تھی!

"سوشی" وہ اپنی جگہ سے اٹھا۔ اور تصویر کو نہایت احتیاط سے اٹھا کر ہاتھوں میں تھام لیا۔

اس کے سامنے چار سال پیشتر کے خونی حادثہ کی تصویر پھر گئی اس کے چہرے پر تکلیف اور بیزاری کے آثار ظاہر ہوئے۔ اس نے تصویر ایک طرف رکھ دی۔ اور بوتل کی طرف گھورنا شروع کیا۔ اس کی نگاہوں میں نفرت جھلک اٹھی،

وہ آہستہ سے اپنی جگہ سے اٹھا۔ اور آئینہ کے سامنے جا کر کھڑا ہو گیا۔

وہ کچھ دیر تو یونہی کھڑا اپنے عکس کو تاکتا رہا۔ اور پھر مڑا —

"بیوی کا قاتل۔ شرابی!" اس کی پشت سے آواز آئی۔

وہ چونک کر پلٹا۔

"کون ہو تم؟" وہ چلایا۔

اس کا عکس مسکرا رہا تھا۔

"نہیں جانتے مجھے؟" اسے جواب ملا "میں جانتا ہوں تمہیں! تم دنیا میں سب سے زیادہ کمینے انسان ہو!"

"میں! کس لئے؟ کیوں؟"

"تم گناہ میں ڈوب چکے ہو۔ اس دلدل سے اب تم باہر نہیں نکل سکتے!"

"تمہیں کیا؟ تم مجھے کس قدر سمجھتے ہو؟ تم مجھے نہیں پہچانتے۔ تم نہیں جانتے میں کون ہوں۔ ایک دنیا کہتی ہے۔ میں پاپی ہوں۔ سب اندھے ہیں، تم بھی! مجھے کوئی نہیں جان سکا۔ میں پاپی ہوں۔ اتنا سب مانتے ہیں، لیکن میں پاپی کیوں ہوں۔ یہ جاننے کی کوشش کوئی نہیں کرتا۔ مجھے سب گنہگار کہتے ہیں۔ لیکن کون مجھے گناہ کرنے پر مجبور کرتا ہے۔ یہ کوئی نہیں سمجھتا۔ تم سمجھتے ہو۔ کہ ایک پاپی پاپ کرتے وقت شاید یہ محسوس نہیں کرتا۔ کہ وہ کیا کر رہا ہے۔ تم سمجھتے ہو کہ ایک پاپی پاپ کرتے وقت شاید یہ محسوس نہیں کرتا۔ کہ وہ کیا کر رہا ہے۔ تم سمجھتے ہو کہ گنہگار کو نیکی سے نفرت ہے، نہیں۔ ایسا نہیں ہے۔ میں شراب پینا نہیں چاہتا۔ لیکن مجھے پلائی جاتی ہے۔ حالات مجھے مجبور کرتے ہیں مجھے مجبور کیا جاتا ہے۔ کہ میں گناہ کروں۔ تم سمجھتے ہو کہ میں آزاد ہوں حالانکہ مجھے پیدا ہوتے ہی حالات کے حوالے کر دیا جاتا ہے۔ میں مجبوریوں کا غلام ہو کر رہ جاتا ہوں۔ میرا دل صاف ہے۔ تمہارے پنڈتوں اور پجاریوں کے دلوں سے بھی زیادہ صاف۔ میرا ضمیر روشن ہے۔ روزِ اول کی طرح روشن! میں گنہگار ہوں؟ پاپی ہوں؟ مجھے گنہگار اور پاپی بنایا گیا ہے!"

"خواہ کچھ بھی ہو — تمہیں اپنے فعل پر قابو ہونا چاہیئے" عکس نے جواب دیا "مجبوریاں ایک ایسی کسوٹی ہیں۔ جن پر گھس کر

تمہارے اخلاق کا امتحان لیا جاتا ہے۔ حالات تمہیں مجبور کریں کہ تم گناہ کی طرف مائل ہو۔ اور تم اپنا دامن بچا کر نکل جاؤ، یہی نیکی کا معیار ہے اور تم اس معیار تک اپنے آپ کو نہ پہنچا سکے۔ حالات نے تمہیں شراب نوشی پر مجبور کیا۔ حالات نے تمہیں اپنی غریب بیوی کا —— !

"اُس کا نام نہ لو۔ اُس کا ذکر مت کرو" شرابی نے چیخ کر کہا "تم انسان کے افعال سے اُس کے اخلاق کو جانچتے ہو۔ یہ غلط ہے۔ اُس کے دل کو ٹٹولو۔ شاید وہ جو کچھ نظر آرہا ہے۔ وہ نہیں ہے۔ میں نیک اور بد کو سمجھتا ہوں۔ میں ان میں تمیز کر سکتا ہوں۔ میں جانتا ہوں کہ بدی سے دور رہنا چاہیئے۔ لیکن میں ایسا کر نہیں سکتا۔ میرا ماحول مجھے اس کی اجازت نہیں دیتا۔ میرے حالات میرے رستے میں ہاتھ پھیلا کر کھڑے ہو جاتے ہیں . . . . . "

"بہانے، محض بہانے ہیں یہ سب!"

"خاموش!" وہ کتے کی طرح بھونکا، اور کرسی اٹھا کر آئینہ پر دے ماری!

ہزاروں چیخیں فضا میں گونج گئیں۔

شرابی نے اپنے دونوں ہاتھوں سے کانوں کو دبا لیا۔

"بہانے نہ ہیں" وہ چلایا "بہانے تو تم بناتے ہو۔ تم!"

بادل زور سے گرجا۔ بجلی چمکی اور اُس نے اپنے ہاتھ کانوں سے ہٹائے۔ وہ بے دم ہو کر میز کے قریب آرام کرسی میں گر گیا۔

"تم کہتے ہو۔ کہ میں گناہ میں ڈوبتا جا رہا ہوں۔ ڈوبتا جا رہا ہوں۔ اور موت کے سوا اب مجھے کوئی چیز اس دلدل سے باہر نہیں نکال سکتی۔ لیکن اس میں میرا کیا قصور؟ میں جو کچھ ہوں، وہ میں نہ تھا، وہ میں بننا نہ چاہتا تھا۔ لیکن میرا ماحول، میری مجبوریاں۔ میری زندگی کی باگیں تھامے ہوئے ہیں۔ وہ انہیں جدھر چاہیں۔ موڑ دیں۔ میں کیا کر سکتا ہوں۔ مجھے اب بھی آزاد کر دو، اب بھی میرے خیالات مجھ سے چھین لو اور میں تمہیں سب سے بڑا پارسا بنکر دکھا سکتا ہوں۔ لیکن اب ایسا نہیں ہو سکتا۔ مجھے زندگی میں جو کھیل کھیلنا ہے۔ اُس کے الفاظ میرے حصے میں لکھے جا چکے ہیں اور اب یہ صرف بہانے ہیں۔ میرا رخ بدلنے کے لئے۔ لیکن میں کیا کروں۔ باگ ڈور تو میرے ماحول کے ہاتھوں میں ہیں۔ میں بدل نہیں سکتا۔ یہ ناممکن ہے۔ ناممکن!"

وہ اٹھا اور بوتل کا کاگ اڑا کر ساغر کو لبریز کر لیا۔

طوفان کم ہوتا جا رہا تھا۔ بجلی کی چمک دور افق پر کبھی کبھی اب بھی نظر آجاتی تھی۔ بادل کی گرج مدھم ہوتی جا رہی تھی

وہ کرسی میں مخمور پڑا تھا۔ آخری بوتل ختم ہو رہی تھی۔

وہ گنگنا رہا تھا۔

"جیون جیوتی۔ جاگ رہی ہے۔ چھوڑ بہانے۔ چھوڑ بہانے!"

—— ایک دھماکے کے ساتھ تیسری بوتل دیوار سے ٹکرا کر پاش پاش ہو گئی۔

گناہ

اگر گناہ کا وجود نہ ہوتا تو عفو کی تمیز ناممکن تھی۔

ایک گناہ بہت ہے اور ہزار طاعت قلیل

گناہ نہ کرنا اچھا ہے۔ اور ارادہ گناہ نہ کرنا اُس سے اچھا ہے۔

گناہ ناسور ہے اگر ترک نہ کرو تو برابر بڑھتا رہیگا۔

گناہ وہ مردہ مکھیاں ہیں جو عطر میں پڑی ہوتی ہوں۔

میں تو گناہ اس لئے کرتا ہوں کہ اس سے بچنا بھی ایک نوع کی ریاکاری ہے۔

غلام عباس مولوی

شرابی

شمالی ہواؤں کے تیز و تند جھکڑ بڑے بڑے سیاہ بادلوں کو آپس میں ٹکرا کر موسلا دھار پانی برسا رہے تھے۔

غضبناک سمندر ببوکے شیر کی طرح گرج رہا تھا۔ پُرشور موجیں ساحل سے ٹکرا کر ہنگامہ رعد و برق میں اضافہ کر رہی تھیں۔ اور پہاڑیوں سے بھی زیادہ بلند ہو ہو کر جھاگ کی صورت قہر برسا رہی تھیں۔

"وادی تاک" پر طوفان باد و باراں کا تسلط تھا۔ ماہی گیروں کی جھونپڑیاں کانپ رہی تھیں۔ اور ان کی دیواروں پر سے چھتوں کی گرفت ڈھیلی ہوئی جا رہی تھی۔ گلیاں سنسان تھیں۔ ہوا کے جھونکے اس زور سے چھوٹے چھوٹے راستوں پر سے گزرتے تھے۔ کہ اِکے ڈُکے راہگیر جھونپڑیوں کی دیواریں تھام کر رُک جاتے تھے۔ بچے سہمے ہوئے اپنے اپنے گھروں میں محبوس تھے۔ کوئی اگر باہر نکل آتا تو شاید خزاں رسیدہ پتے کی طرح فضا میں اُڑ کر جھونپڑیوں کے اُس پار جا پڑتا۔

ماہی گیروں نے کشتیاں ساحل سے دور لیجا کر کھڑی کر دی تھیں۔ کیونکہ طغیانی کے موقع پر ساحل کی ہر چیز بہاؤ کی نظر ہو جایا کرتی تھی۔ ملاح دُور ہی سے کشتیوں کی آڑ میں چھپے ہوئے آسمان اور سمندر کی اس جنگ کو دیکھ رہے تھے۔

یوں بھی اُس روز ساحل پر ماہی گیر بہت کم تھے۔ لیکن شام ہوتے ہوتے جو تھے وہ بھی شکار سے مایوس ہو کر لوٹ گئے۔ غروب آفتاب کے ساتھ ہی متلاطم سمندر اور غصہ ور ہواؤں کی جنگ کے تمام منظر پر تاریکی چھا گئی۔ اس وقت ساحل پر صرف دو ملاح باقی رہ گئے۔ جو اپنے بھاری بھرکم کوٹ کی بڑی بڑی جیبوں میں ہاتھ ڈالے کھڑے تھے۔ ان کے موٹے موٹے کنٹوپ کانوں سے نیچے آ رہے تھے۔ جن میں سے ان کی بے پناہ داڑھیاں نکل کر گلوں پہ پھیلی ہوئی تھیں۔ ان کی جلد دھوپ میں جھلسی ہوئی اور آنکھیں اس کشتی بان کی طرح سیاہ جو تمام دن شکاری پرندے کی مانند افق کے اس پار ٹکٹکی لگائے دیکھا کرتا ہے۔

"آؤ شامی! کیا کلب گھر نہیں چلو گے؟ آج میری طرف سے دعوت رہی" ان میں سے ایک نے کہا۔

دوسرا کسی قدر پس و پیش میں پڑ گیا۔ ایک طرف تاش کی بازیاں اور شراب کی بوتلیں تھیں۔ اور دوسری جانب بیوی کا خیال تھا۔ جو اس ہیبت ناک رات کو جھونپڑی میں تنہا اس کا انتظار کر رہی تھی۔ وہ اچھی طرح جانتا تھا۔ کہ ہاں کے کلب میں جانے کا مطلب یہ ہے۔ کہ وہ گھر لوٹنے سے پہلے نشہ میں چور ہو گا۔ جو کچھ اچھی بات نہیں ہے۔ اس نے سوچتے سوچتے غیر ارادی طور پر کہا۔

"آخر یہ تمہاری دعوتیں روزانہ کیوں ہوں! تم نے کوئی شرط تو بدی نہیں ہے۔ کہ کسی دن بھی مجھے اس وقت تک گھر نہ جانے دو گے۔ جب تک میں نشہ میں چور نہ ہو جاؤں!"

کہنے کو تو اس نے خفیف سے انکار کے یہ چند جملے کہہ دئیے لیکن دل ہی دل میں وہ اس فاقہ مستی کے خیال سے مسرور تھا۔ اس کے لبوں پر ایک حریص مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔

لیکن طولوَن، اس کا دوست، کب ماننے والا تھا۔ اس نے اصرار سے کہا۔ "آؤ بھی، کم از کم آج کی رات تو ایسی نہیں ہے۔ کہ بلا دو گھونٹ پئے گھر چلا جائے۔ تمہیں اس کا احساس ہے، شامی! کہ باد و باراں کی اس سرد رات میں آتشِ سیال کے چند جرعے کس قدر جان بخش ثابت ہو سکتے ہیں؟ آخر پس و پیش کیوں۔ وہی بیوی کا خیال ہے؟ بھئی واہ! یہ بھی کوئی بات ہوئی۔ یقین جانو کہ وہ تمہارے بغیر بھی بستر گرما رہی ہوں گی۔"

"نہیں طولوں آج تو میں نہیں آؤں گا۔ گذشتہ شب تم نے مجھے اس قدر پلوا دی تھی۔ کہ میں ہوش و حواس کھو بیٹھا تھا۔ پھر ستم ظریفی یہ ہوئی۔ کہ مکان کے قریب پہنچ جانے کے باوجود اپنا دروازہ نہ پا سکا۔ نتیجہ یہ ہؤا کہ صبح میں مکان کے سامنے ہی پگڈنڈی کے کنارے نشیب میں پڑا ہؤا تھا" اس نے اپنی مدہوشی کی کیفیات پر ایک ندامت آگیں قہقہہ لگایا۔ بہرحال وہ بالکل غیر ارادی طور پر اپنے دوست کے ہمراہ ہاماَن کے کلب کی طرف بڑھ رہا تھا۔ دماغ کی مذبذب کیفیت کی وجہ سے شامی کے قدم بھاری ضرور ہو گئے تھے لیکن وہ کوئی قطعی فیصلہ کرنے سے قاصر رہا۔ طولوں اُسے شراب خانے کی طرف کھینچ رہا تھا اور گاہے گاہے ہوا کے پُر زور جھونکے اُسے دھکیل کر دو قدم اور آگے بڑھا دیتے۔ تھے۔

وہ ان مشترکہ طاقتوں کے مقابلے سے مجبور کلب گھر کی طرف بڑھا چلا گیا۔

——— (۲) ———

کلب گھر نہایت نیچی چھت کا ایک قدرے وسیع کمرہ ملاحوں تمباکو کے دھوئیں اور شور و شر سے بھرا ہؤا تھا۔ لوگ موٹے موٹے لبادوں میں ملبوس میزوں پر کہنیاں ٹیکے اس ہنگامہ پرور فضا میں اپنی آواز کو قابل سماعت بنانے کے لئے چیخ چیخ کر باتیں کر رہے تھے جس قدر لوگ زیادہ ہوتے جاتے تھے اسی نسبت سے کمرے کی فضا میں آواز کی لہروں اور دھوئیں کے حلقوں کا اضافہ ہوتا جاتا تھا۔

طولوں اور شامی نے ایک گوشے میں پڑی ہوئی میز پر بیٹھ کر تاش کی بازی شروع کی۔ اور شربتِ ممنوعہ کے جام پہ جام ان کے خشک حلق سے اترنے لگے۔

تاش کی بازی نے اپنا رنگ جمایا اور کھیلنے والوں کے بڑھتے ہوئے انہماک کی مناسبت سے بوتلوں کے کاگ بھی تیزی کے ساتھ اُڑنے لگے۔

طولوں بوتلوں پر بوتلیں خالی کر رہا تھا۔ اور ساتھ ہی ساتھ ملازم کو "اور لاؤ" کے اشارے کرتا جاتا تھا۔ ہر مرتبہ ملازم کے چہرے پر ہلکا سا تبسم کھیل جاتا تھا۔ جیسے اس کے ساتھ کوئی لطیف مذاق کیا گیا ہو۔ شامی بھی جھوم جھوم کر شراب کی زیادہ سے زیادہ مقدار اپنے میں جذب کر رہا تھا۔ اور گاہے گاہے ایک معنی خیز قہقہہ لگا کر اپنے ہمدم و محسن کی جانب تشکر و امتنان کی نظروں سے دیکھ لیتا تھا۔

کچھ وقت بعد کلب کے اور لوگ آہستہ آہستہ اٹھنا شروع ہو گئے۔ ہر بار جب دروازہ کھلتا تھا تو ہوا کا ایک سرد جھونکا کمرے میں داخل ہو جاتا تھا۔ جس سے تمباکو کا دھواں کمرے کی فضا میں تیزی سے گھومنے لگتا۔ چھت سے لٹکا ہؤا لیمپ بھی بدمست شرابی کی طرح جھوم جاتا اور اس کی لَو فانوس میں کانپ کانپ کر رہ جاتی ہوا کے ہر جھونکے کے ساتھ بیرونی فضا کی سرد آہیں اور سمندر کا شور گریہ سنائی دے جاتا تھا۔

شامی پر آہستہ آہستہ سکر کی کیفیات طاری ہو گئیں۔ کوٹ کے بالائی بٹن کھلے ہوئے۔ ٹانگیں دراز، ایک ہاتھ فالج زدہ عضو کی طرح کرسی سے نیچے لٹکا ہؤا۔ اور دوسرے ہاتھ میں لرزتے ہوئے تاش کے پتے!

——— (۳) ———

رفتہ رفتہ تمام شرابی رخصت ہو گئے۔ لیکن یہ دونوں تھے کہ اُٹھنے کا نام ہی نہ لیتے تھے۔ ہاماں جو اپنے ان منچلے سرپرستوں میں ضرورت سے زیادہ دلچسپی لے رہا تھا۔ ان کے پاس آیا۔ اور مسکرا کر بولا۔

"کہئے شامی صاحب، کیا کیفیتیں ہیں؟ پیاس تو آپ کی زائل ہو چکی ہوگی؟"

"نہیں . . . . جی نہیں۔ جس قدر میں اپنے حلق کو اس آتشیں شربت سے تر کرتا ہوں اُسی قدر پیاس بڑھتی جاتی ہے ....

کلب کے مالک نے اپنے بدمست کرمفرما کی شاعری سننے کی تکلیف گوارا نہ کی اور مُڑ کر طولوں سے مخاطب ہوا: "آپکے بھائی صاحب تشریف نہیں لائے آج؟"

"ہوں، درست، بھائی صاحب تشریف نہیں لائے آج۔ آج شاید انہیں حرارت کی ضرورت نہیں ہے۔" طولوں نے قہقہہ لگا کر

جوئے دیا۔ اتنے میں دونوں کی نظریں شامی پر پڑیں۔ جو تاش سمیٹ کر میز پر ڈالتے ہوئے اپنی جیت کا اعلان کر رہا تھا۔

کلب کے مالک نے مسکرا کر کہا "بہت خوب صاحبان! اب میں سونے جا رہا ہوں۔ لیمپ اور یہ بوتل چھوڑے جاتا ہوں۔ اس میں ابھی دو دو پہلی سکوں کی اور باقی ہے۔ جب آپ رخصت ہوں تو لیمپ گل کر دیجئے گا۔ اور دروازے میں قفل لگا کر روشندان سے کنجی اندر ڈال دیجئے گا۔"

"بہتر... بہتر" طولوں نے جواب دیا۔ "آپ اطمینان رکھیئے۔ سب کچھ ٹھیک ہو جائیگا۔"

ہاماں دونوں مہمانوں سے رخصت ہو کر چوبی زینے کی طرف لوٹ گیا۔ اس کے بھاری قدموں کی چاپ بھی دو منٹ بعد کمرے کی خاموش فضا میں تحلیل ہو گئی۔

دونوں شرابی ایکبار پھر اپنے شغل میں منہمک ہو گئے۔ گاہے گاہے ہوا کے جھونکے کلب گھر کے در و دیوار ہلا دیتے تھے۔ اور یہ دونوں دروازے کی جانب دیکھنے لگتے تھے۔ جیسے کسی کے آنے کا کھٹکا ہو۔ طولوں متواتر گلاس پر گلاس بھر رہا تھا۔ کہ یکبارگی گھنٹے نے بارہ بجائے اور وہ چونک کر اس چوکیدار کی طرح اُٹھ کھڑا ہوا۔ جس کی ڈیوٹی کا وقت ختم ہو گیا ہو۔

"اُٹھو" شامی "اب ہمیں چلنا چاہیئے۔"

شامی بمشکل اپنے پیروں پر کھڑا ہوا۔ اور میز کے سہارے سے توازن سنبھال کر لڑکھڑاتا ہوا دروازے تک پہنچا۔ اس دوران میں طولوں نے لیمپ گل کیا۔ انہوں نے باہر پہنچکر دروازے میں قفل لگایا کنجی روشندان سے اندر پھینکی اور واپس ہوئے۔

گلی کے موڑ پر پہنچکر طولوں نے کہا: "اچھا شامی! اب شب بخیر... پھر ملیں گے۔ بقولِ شخصے 'اگر خدا لایا'" اتنا کہہ کر وہ مڑا اور رات کی تاریکی میں نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

(۴)

شامی بمشکل چند قدم آگے بڑھا ہوگا۔ کہ اُس کے پیر ڈگمگانے لگے۔ توازن برقرار رکھنے کے لئے اس نے ہاتھ پھیلا دیئے۔ اتفاق سے اس کا دایاں ہاتھ ایک دیوار پر پڑا جس کے سہارے اس نے چلنا شروع کیا۔ تھوڑے تھوڑے وقفے سے ہوا کا ایک آدھ سخت جھونکا گلی سے گزرتے ہوئے اسے چند قدم اور آگے دھکیل دیتا تھا اس سے وہ کچھ دُور دوڑ کر رک جاتا تھا۔ اور اپنی زائل شدہ قوتوں کو یکجا کر کے لڑکھڑاتے ہوئے پیروں پر چلنے لگتا تھا۔

وہ غیر ارادی طور پر اپنے گھر کی جانب جا رہا تھا جس طرح شام کو پرندے آشیانوں کی سمت لوٹتے ہیں۔ کشاں کشاں وہ قیام گاہ تک پہنچ گیا۔ اس نے زور سے دروازہ پر دستک دی اور چیخنا شروع کیا۔

"مینا...... او مینا دروازہ کھولو... سنتی ہو مینا!"

اندر سے کوئی جواب نہ ملا۔

شامی کا اضمحلال ناقابلِ برداشت حد تک بڑھ رہا تھا۔ اس نے سہارے کی خاطر دروازے سے ٹیک لگانا چاہی کہ یکبارگی دونوں پٹ کھل گئے۔ وہ اپنا توازن نہ سنبھال سکا۔ اور منہ کے بل صحن کمرے کے درمیان میں جا پڑا۔ حالتِ مدہوشی میں اس نے محسوس کیا کہ کوئی شخص اس سے بچکر کمرے سے باہر نکلا اور تاریکی میں فرار ہو گیا شامی کے سراپا میں خوف اور اندیشے کی ایک بجلی دوڑ گئی۔ لمحہ بھر وہ فرش پر ساکت سامت پڑا رہا۔ جب ذرا ہوش بجا ہوئے تو وہ پڑے پڑے اس عجیب و غریب وجود پر غور کرنے لگا۔ لیکن شرابی کی بدمست عقل کے مدہوش افکار کوئی نتیجہ مرتب نہ کر سکے۔ بھوت! پریت! چور! مینا کا کوئی ملاقاتی۔ اُس کی کچھ سمجھ میں نہ آیا کہ وہ کون تھا جو اس ہوشیاری سے فرار ہو گیا۔ بالآخر اس نے پھر آواز دی۔

"مینا!"

اس مرتبہ بھی اُس کی بیوی نے کوئی جواب نہیں دیا۔

یک بیک اس کے مختل دماغ میں ایک شبہ پیدا ہوا۔ شبہ نہیں بلکہ شبہ کا نہایت ہی غیر واضح ہیولا جو مبہم طور پر خیال کی صورت اختیار کر رہا تھا۔ بت کی طرح بیٹھے بیٹھے اس نے اپنے کھوئے ہوئے حواس کو یکجا کرنے کی کوشش کی۔ اس کے دل میں بیسیوں قسم کے شکوک پیدا ہونے لگے۔ اس وقت اس کا دماغ بھی اس کے

ڈگمگاتے ہوئے پیروں کی مانند متزلزل تھا۔

ایک بار پھر اُس نے ذرا کرخت لہجے میں اپنی بیوی کو آواز دی "وہ کون تھا مینا۔ آخر کہتی کیوں نہیں ہو۔ خوف نہ کرو۔ مجھے بتا دو!

لیکن تاریکی میں نہ تو مینا ہی دکھائی دی اور نہ کوئی جواب ملا۔

وہ جھنجھلا اُٹھا "میں نے پی رکھی ہے، خیر یونہی سہی۔ میں نشہ میں چور ہوں۔ اُس کمبخت نے مجھے کئی جام پلا دیئے۔ تاکہ آدھی رات سے پہلے گھر نہ پہنچ سکوں۔ مگر ہاں اگر میں نے پی بھی لی تو کیا لیکن تم ہاتم مینا ـــــ بتاؤ وہ کون تھا ورنہ یاد رکھو یہ اچھا نہ ہوگا۔"

وہ کچھ سوچکر خاموش ہوگیا۔ لیکن تھوڑے سے وقفہ کے بعد پھر وہی شرابی کی منطق لڑائی شروع کی۔

وہ شیطان مجھے روزانہ اس شہد سے ہاں کے کلب میں لے جاتا ہے۔ تاکہ جب میں گھر لوٹوں تو عقل و حواس وہیں چھوڑ آیا ہوں، رذیل! کتا! شرابی!!

شامی غصے سے اندھا ہو رہا تھا۔ اس کے منہ سے کراہت انگیز کف جاری تھا۔ بمشکل دو زانو ہو کر بیٹھ گیا۔ اور جھنجھلا کر بولا۔

"ہاں تو بتا دو، مینا، وہ کون تھا۔ ورنہ . . . . . ورنہ یاد رکھو کہ مجھ سے برا کوئی نہ ہوگا۔ اب مجھے دھوکے میں نہیں رکھا جا سکتا مجھے سب کچھ بتا دو۔ ورنہ . . . . خون، مینا۔ مجھ پر خون سوار ہو رہا ہے

وہ اُٹھ کر کھڑا ہوگیا۔ غصہ سے اس کا جسم لرز رہا تھا۔ آپ آتشیں نے اس کی رگ رگ میں آگ لگا رکھی تھی۔ اندھیرے میں اس نے آگے قدم بڑھایا۔ ایک کرسی سے ٹھوکر لگی۔ حالت غیض و غضب میں اُسے اُٹھا لیا۔ اور خوابگاہ میں پہنچا۔ تاریکی میں ہاتھ بڑھا کر اس نے مسہری پر اپنی بیوی کے گرم جسم کو محسوس کیا۔ مینا کو موجود پاکر وہ دیوانہ وار چیخ اٹھا۔

"تو تم، بدخصال عورت، یہیں موجود ہو۔ اور جواب نہیں دیتیں؟ کیوں؟

اس نے مضبوط ہاتھوں میں کرسی بلند کر کے اپنی پوری طاقت سے مسہری پر کھینچ مارا۔ اس کے ساتھ ہی بستر پر سے ایک ہیبتناک چیخ بلند ہوئی۔ شامی کے غصے کو ایک اور تازیانہ لگا۔ اس نے دیوانہ وار کرسی گھما کر مارنی شروع کر دی۔

رات کے سناٹے اور کمرے کی تاریکی میں دو منٹ تک وحشت خیز چیخیں سنائی دیتی رہیں۔ اس کے بعد پھر سارے ماحول پر خموشی طاری ہوگئی۔

کرسی ٹوٹ چکی تھی۔ اس کا ایک پایہ اب بھی شامی کے ہاتھ میں تھا۔ اور وہ تھکے ہوئے کتے کی مانند ہانپ رہا تھا۔

"تو کیا تم نہیں بتاؤگی۔ کہ وہ کون تھا۔ مینا۔ میں تمہیں آخری موقع دیتا ہوں۔ بولو"

مینا نے اب بھی کوئی جواب نہ دیا۔

شامی میں سکت باقی نہ تھی۔ اپنے پیروں پر کھڑا رہنا اس کے لئے دشوار ہو رہا تھا۔ اس لئے وہیں فرش پر بیٹھ گیا۔ بیٹھتے ہی غیرارادی طور پر اُسی جگہ لیٹا اور پھیل کر سو گیا۔

صبح کھلے ہوئے دروازے میں سے ایک پڑوسی کی نظر کمرے میں پڑی ـــــ شامی کرسی کے شکستہ ٹکڑوں پر خراٹے لے رہا تھا۔ اور خون میں ڈوبے ہوئے بستر پر ایک مضغۂ گوشت پڑا تھا۔

تاریخ کے اوراق کھول کر دیکھو ہر سلطنت کا تاج و تخت شراب کے پیالے میں غرق دکھائی دیتا ہے!

قدرت نے انسان کو عقل بخشی لیکن شراب اس عقل کو سلب کر دیتی ہے

شراب کے نقصان اس کے فائدوں سے کہیں زیادہ ہیں!

شراب ایک ایسا زہر ہے جس سے انسان کی اخلاقی موت واقع ہوتی ہے۔

علی عباس حسینی

کوڑا گھر

صبح کے سات بج رہے تھے۔ مسجدوں سے تسبیح و تحلیل کی صدا مندروں سے ناقوس اور گھنٹوں کی آواز اب نہ سنائی دیتی تھی۔ ڈولن پل کے ساڑھے چھ والی سیٹی بھی کب کی بج چکی تھی۔ مزدوروں کا دل بھی جا چکا تھا۔ میونسپلٹی کی کوڑا گاڑی بھی اپنا پیٹ بھر کر ڈکار لی سدھار چکی تھی۔ اب سڑک پر سناٹا، اس طرح کا سناٹا جیسا بیوہ کے دل میں ہوتا ہے۔ بھیانک، اجاڑ، زندگی کے ہنگاموں سے خالی!

دفعتاً اس خاموش سڑک پر کھڑ کھڑاہٹ ہوئی اور تین مہترانیاں چھوٹی چھوٹی آہنی ٹھیلا گاڑیاں لئے ہوئے نمودار ہوئیں ان کی منزل وہی کوڑا گھر تھا۔ جواب سے پہلے مہتروں کے جھنڈ کو خوش آمدید کہہ چکا تھا۔

مہترانیوں کی پوشاک قریب قریب ایک ہی طرح کی تھی۔ لہنگا، شلوکا، دوپٹہ، کثیف، گندہ، متعفن! پھر بھی ان میں چھیڑ چھل برابر جاری تھی۔

سنوں میں یوں ہی سا الٹ پل تھا۔ تیس، پچیس، بیس۔ بجھتی ہوئی دھوپ، ڈھلتی ہوئی دھوپ اور چڑھتی ہوئی دھوپ مگر گرمی سب میں تھی۔ کسی میں نرم کسی میں مدھم، کسی میں تیز!

تینوں آکر اپنی منزل پہ ٹھہریں۔ وہی کوڑا گھر! ——— ایک ٹھیلے گاڑی سے پھوڑا نکالا گیا۔ آپس میں ہنس کر بحث ہونے لگی۔ سوال یہ تھا کہ کوڑا گھر میں گھس کر پھوڑے سے گاڑیاں لادے کون؟

سب سے بڑی نے کہا: "آج تو کوڑا سکھو کی ماں کو لادنا چاہیئے۔"

مجھلی بولی: "واہ بھوجی واہ! ہر سٹے مجھی سے محنت لینا چاہتی ہو۔ رات بھر تمہارے بھتیجوں اور بھائی کی سیوا کروں، دن بھر تم پھوڑا چلواؤ! واہ بھوجی واہ! اچھی کہی!"

بڑی نے آنکھ مٹکا کے کہا: "تو تم رات بھر بھائی کی سیوا کرو ہی کیوں؟ وہ بھڑوا دے ہی کیا دیتا ہے! جب دیکھو تاڑی پی کے اول فول بکتا پھرتا ہے۔ یا پھر ہر چھٹے چھمینے تمہارے مرنے کو ایک لڑکا کھڑا کر دیتا ہے!"

چھوٹی ہنس کر بولی: "اور جو سکھو کی ماں ہی کا من چاہتا ہو کہ وہ سکھو کے ساتھ ساتھ منگلو کی ماں بھی بنیں۔ جھگڑو کی بھی اور للتو کی بھی!"

سکھو کی ماں غصہ کا چہرہ بنا کر اس کی طرف جھپٹی "رہ تو جا، پاجی! بانڑی! بانجھ!"

بڑی بولی: "تو اس کے کوئی چیتھڑا ابھی نہ ہوا تو اس میں اس کا کیا دوش؟ رام لال بیچارہ جوان ہوتے ہی چل بسا اور یہ اب تک یونہی بیٹھی ہے۔"

سکھو کی ماں نے کہا: "دوش کیوں نہیں؟ سب اسی کا پاجی پن ہے۔ ارے یہ بڑی نٹ کھٹ ہے۔ اس نے چار حرف ہندی کے جو پڑھ لئے ہیں۔ بس اب یہ شہزادے کا آس لگائے بیٹھی ہے۔ کسی شہزادے کا! اس کے ہاں تو وہی مثل ہے صورت چڑیل کی اور دماغ پریوں کا!"

جوان مہترانی نے ہنس کر سکھو کی ماں کا ہاتھ تھام لیا اور وہ کلائی مروڑ کر بولی "کیوں ری، ہمارا دماغ پریوں کا ہے؟"

وہ چیخی "ارے کلائی ٹوٹی! چھوڑ کلائی! بانڑی نگوڑی! بھلا بھینس چڑھ رہی ہے! ارے، آہ!"

بڑی تالی بجا کے تھرکنے لگی: "ارے سیاں، میں تورے لگوں پیاں، چھوڑ موری بہیاں، چھوڑ موری کلیاں۔ ارے چھوڑ

موری کلیاں!"

سکھو کی ماں نے کراہتے، آہ، آہ کرتے، کوستے، گالی دیتے ہوئے ایکبار گھبراہٹ کا چہرہ بنایا: "ارے دیکھو وہ جمیدار آرہا ہے۔

جوان مہترانی کے ہاتھ سے مجھلی کی کلائی بالکل اسی طرح چھوٹ گئی جس طرح نورجہاں کے دست سیمیں سے کبوتر چھوٹ گیا تھا۔

وہاں اگر معصومیت، بھولے پن اور سادگی نے گرفت کو ڈھیلا کیا تھا۔ تو یہاں پیٹ کے ڈر نوکری کے خطرے نے! —— اس نے پلٹ کر دیکھا۔ خالی سڑک اسی طرح دھوپ میں چمک رہی تھی۔ جیسے کسی بوڑھی بیگم کے سپید بال! دونوں مہترانیاں ہنسنے لگیں۔ اور وہ کھسیانی سی ہوگئی۔ اس کے چہرے پر جھینپ کے بعد والا غصہ جھلکنے لگا۔

اس غصے کی وجہ صرف یہی نہ تھی کہ وہ چرکا کھا گئی تھی اور سکھو کی ماں نے اسے بیوقوف بنا لیا تھا، بلکہ اس غصے کی تہہ میں "بانزمی اور بھلا بھینس" کے لفظوں کی چبھن تھی۔ یہ دونوں لفظ کانٹے کی طرح کھٹک رہے تھے۔ آج اگر اس کے پاس جھگڑو بلو سکھو کے ایسے دو چار چوہے ہوتے تو بھلا اسے کیسے کوئی بانزی کہتا، کیسے بھلا بھینس پکارتا۔ وہ اس وقت سکھو کی ماں کو تو مزا چکھا ہی دیگی! وہ جھپٹ کے آگے بڑھی۔

بڑی پھرتی سے بیچ میں آگئی۔ وہ بات رفع دفع کرنے والے لہجے میں بولی "اب تو تم نے سکھو کی ماں کے ہاتھ مروڑ مروڑ کے توڑ ہی دیئے۔ اب تم ہی ٹھیلے بھرو۔!"

جوان مہترانی نے خاموشی سے پھوڑا اٹھا لیا۔ کوڑا گھر کا پھاٹک کھولا۔ لہنگا اٹھا کر آگے سے سمیٹا اور پیچھے کھونس لیا۔ پھر وہ کوڑے کے انبار پر بالکل اسی طرح پل پڑی جس طرح معلم سرخ پنسل لیکر طلاب کے مضامین کی اصلاح پر جھک پڑتے ہیں۔!

اس نے ایک منٹ دم نہ لیا۔ اس نے چند ہی لمحوں میں تینوں ٹھیلے بھر دیئے۔

بڑی اور مجھلی اپنے اپنے ٹھیلے لیکر اس طرف چل دیں۔ جدھر میونسپلٹی پرانا تالاب پٹوا کر "ہریجن نگر" بنانے والی تھی۔ وہ دروازہ بند کرنے اور لہنگے اور پاؤں سے گندگی جھاڑنے کے لئے رک گئی۔ اس نے کوڑا گھر سے نکل کر لہنگے کا ازاربند کھولا، وہ پیچھے کھسے ہوئے حصے کو جھٹکا دیکر آگے لائی اور پنکھے کی شکن برابر کر کے کمربند باندھنے لگی۔

"ارے بھوجی یہ نازک کمر اس طرح نہ کسا کرو نہیں تو ٹوٹ جائے گی۔!"

یہ ایک نوجوان مہتر تھا۔ ٹانگوں میں میلی سی دھوتی، جسم پہ پھٹا ہوا کرتا، گردن میں ایک لال چیٹ۔ اور کان میں آدھی جلی ہوئی بیڑی! —— سوکھا، بدصورت، ہوبہو مہتر، سر سے پاؤں تک مہتر، بالکل مہتر! —— مگر جوان! —— رانڈ کے سانڈ!

جوان مہترانی کمربند میں گرہ لگاتے ہوئے ٹھٹک کر "تم تو ہمیں چھیڑ دوگے" والے انداز میں بولی

"منو یہ تمہارا ہر ستے کا چھیڑنا ہمیں نہیں بھاتا۔!"

وہ اپنے میلے دانت نکال کر بولا: "تو بھوجی ہم سے قسم لے لو جو ہم خالی خولی دلگی کرتے ہوں۔ ہم تو تم سے سگائی کرنا چاہتے ہیں۔ تم ہی تو نخرے کرتی ہو —— ارے پگلی یہ جوانی کے دن بہت جلد بیت جائیں گے!"

وہ تنک کر بولی: "تو بیت جائیں کس کو پروا ہے!"

وہ ذرا متانت سے بولا: "تم کیا جانو کہ پرش استری کے ملاپ میں کیسی آگ ہے جس سے گھر جلتے نہیں۔ بستے اور بنتے ہیں!"

وہ آنکھیں چمکا کر بولی "ارے ہم کچھ نہیں جانتے، پر اتنا جانتے ہیں کہ تم کو شہر میں رہ کے باتیں اچھی بنانا آگئی ہیں"۔

وہ مسکرا کر بولا: "ارے بھوجی، ہم بات ہی نہیں بناتے ہم استری بھی اچھی بناتے ہیں، تم بن کے دیکھ لو۔!"

وہ لاجواب ہوکر بولی۔ "تم کیا ہمیں استری بناؤ گے، ہم تو تمہارے منہ پر تھوکیں بھی نہیں!" نوجوان مہتر بالکل اسی شان سے آہستہ آہستہ بڑھا جس شان سے مرغا نئی مرغی کی طرف بڑھتا ہے۔

"مہترانی دیکھو! اچھا نہ ہوگا" کہتی پیچھے ہٹی۔ مہتر نے ہاتھ بڑھا کر اس کی کلائی تھام لی۔ "کان کھول کے سن لو جی۔ خوشامد سے نہ مانوگی تو میں زبردستی کروں گا۔!"

وہ آنکھیں پھیلا کے بولی: "دن دہاڑے اسٹرک پر!"

وہ بے پروائی سے بولا: "اونہہ کیا ہوا! پکڑے جائیں گے تو سب یہی کہیں گے کہ مہتر بھنگی ہے۔ نیچ ذات! جیل بھی جائیں گے تو وہاں بھی یہی کام کرنا ہوگا۔!"

"اور میرا کیا ہوگا؟"

"تم کو سب برادری سے نکال دیں گے۔"

"ہم کاہیکو نکالے جائیں، تم نکلو!"

"اچھا تو پھر قول دو کہ آج رات کو ملیپس کے پیچھے ملوگی۔"

"اچھے آئے قول لینے والے۔!"

اس نے کلائی مروڑی، دے زبان! "شترگربہ سہی مگر لب و لہجہ میں پیار کا اصرار تھا! مہترانی اس طرح ہانپنے لگی جیسے وہ سر پر وزنی بوجھ لادے ایک نہ ختم ہونیوالے زینے پر چڑھ رہی ہو۔ مہتر کی آنکھیں اور چمکنے لگیں۔ مہترانی کی پلکیں جھپک چلیں۔

اتنے میں موٹر کا ہارن سنائی دیا۔ دونوں نے پلٹ کے دیکھا دور سے اگلا حصہ سورج کی کرن میں اس طرح چمک رہا تھا۔ جیسے تاریکی میں جنگلی جانور کی آنکھیں۔ مہتر نے کلائی چھوڑی۔ آہستہ سے کہا: "آئیگی نا؟ ہاں کہہ دے! بھگوان قسم ابھی بزار سے تیرے لئے وہ پھڑکتا ہوا لہنگا خرید دوں کہ برادری بھر میں کسی کے پاس نہ نکلے!"

مہترانی نے سر جھکا کر گردن ہلادی۔

مہتر کی باچھیں کھل گئیں۔ وہ جھومتا ہوا، گنگناتا ہوا، چمکتے ہوئے موٹر سے آنکھیں لڑاتا ہوا چل دیا۔ مہترانی اُس کی پیٹھ کو کنکھیوں سے دیکھ رہی تھی۔ کہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا موٹر کے پاس آگیا۔ اس نے اس پر چھلتی ہوئی نظر ڈالی۔ آگے کی سیٹ پر ڈرائیور تھا۔ پیچھے کی سیٹ پر تین ہندوستانی عورتیں "اپ ٹو ڈیٹ" قسم کی۔ انگریزی شان کے بال۔ گالوں پر پاؤڈر، ہونٹوں پر لالی کانوں میں ہیروں کے بندے۔ اور جسم میں خوبصورت ریشمی ساڑیاں۔

مہترانی کو اتنی بیش قیمت ساڑیاں ایک ساتھ دیکھ کر کچھ اچنبا سا ہوا۔ وہ منہ کھولے ٹکٹکی باندھے ان عورتوں کو دیکھنے لگی۔ موٹر والیاں مہترانی کی اس حیرت و حسرت بھری نگاہ پر مسکرادیں۔ ان میں سے ایک نے "چھی چھی!" کہا۔ اور موٹر کے باہر تھوک دیا ——— اور سب نے سینٹ سے بسے ہوئے ریشمی رومال سے نتھنے چھپا لئے!

مہترانی کا جسم کسی خاص جذبے سے کانپنے لگا۔ اس کی جھکی ہوئی آنکھیں اس کے پاؤں پر جم گئیں۔ وہ ننگے تھے۔ اور کیچڑ، گوبر اور گندگی سے اَٹے ہوئے۔ ان کی انگلیاں پھیلی ہوئی تھیں۔ ان کی جلد پھٹی ہوئی تھی۔ اس نے گھبرا کر اپنے ہاتھوں کو دیکھا، ہتھیلیوں میں جگہ جگہ گھٹے پڑے ہوئے، انگوٹھی اور چھلے کی جگہ کوڑے اور مٹی کے گول اور لمبے دھبے تھے۔ وہ پھر ایک بار کانپی اور اُس نے پھوڑا زمین پر پھینک کر دونوں ہاتھوں سے منہ چھپا لیا۔!

اُسے خشک سسکیاں سی آنے لگیں، وہ چکرا کے زمین پر بیٹھ گئی۔ بیٹھنے میں اُس کا پاؤں اسی تھوک پر پڑ گیا۔ جو موٹر والیوں کی طرف سے اُس کی صورت اور اُس کے کام کے صلے میں انعام کے طور پر ملا تھا۔ اُسے محسوس ہوا جیسے اس کا پاؤں سانپ پر پڑ گیا ہو وہ جھجک کے پیچھے ہٹی۔ وہ اُٹھ کر کھڑی ہوگئی۔ پھر وہ پھوڑا کندھے پر رکھ کے چند قدم موٹر کے پیچھے لپکی۔ اس نے دیکھا تو وہ دور نکل گیا تھا۔ اس نے "اخ تھو" کر کے سڑک پر تھوک دیا۔ پھر وہ مسکراتی ہوئی ٹھیلے گاڑی کی طرف آئی۔ اور اُسے ٹھیل کے سڑک پر چلی۔ وہ کوڑے گاڑی کو ٹھیلتی جاتی تھی اور آپ ہی آپ مسکراتی جاتی تھی۔ شاید وہ ملیپس کے پیچھے اپنے کو ایک پھڑکتا ہوا لہنگا پہنے اپنے شہزادے کے سامنے ناچتی ہوئی دیکھ رہی تھی!

انتظاریہ

محمد رفیع اللہ راشد

شہزادہ خسرو

یہ شاہزادہ راجہ بھگوان داس والی انبیر کی دختر کے بطن سے سنہ ۹۹۵ھ پیدا ہوا۔ اس وقت جہانگیر کی عمر ۱۸ سال تھی شہنشاہ اکبر نے ولیعہد سلطنت کے ہاں اولیں فرزند کی ولادت پر بے انتہا خوشی منائی۔ اور اپنی نگہداشت و سرپرستی میں تعلیم و تربیت کا انتظام کیا۔ قسام ازل نے خسرو کو جمال صورت اور کمال سیرت عطا کرنے میں بڑی فیاضی سے کام لیا تھا۔ وہ نہایت وجیہہ و شکیل اولوالعزم و شجاع تھا۔ اکبر اسکے ساتھ نہایت شفقت اور نوازش سے پیش آتا تھا۔

کمسنی ہی میں اس کی شادی اعظم خاں خانخاناں کی دختر سے اکبر کی تجویز کے مطابق ہوئی تھی۔ اعظم خاں اکبری امرا میں بڑے پایہ کے امیر تھے۔ بادشاہ کے رضاعی بھائی (کوکہ) ہونے کی وجہ سے دربار میں ان کا کافی اثر تھا۔ اس تازہ تعلق سے انکے اعزاز میں خاص اضافہ ہوا۔ اور خسرو کو بھی اس قوی بازو امیر سے وابستہ ہونے میں مزید تقویت کا موقعہ ملا۔

ادھر خسرو عمر و اقبال کی ترقیوں کے ساتھ ساتھ اپنی سعادت مندیوں میں اکبر کی نظروں میں آئے دن مکرم محبوب ہوتا جا رہا تھا۔ اُدھر جہانگیر کی خود سرانہ بے اعتدالیاں۔ شراب نوشی کے چرچے۔ بادشاہ کو مغموم و متاسف۔ اور اس کی اصلاح سے مایوس کر رہے تھے۔ اکبر نے اس قسم کی خبریں ملنے کے مواقعہ پر متعدد مرتبہ اپنی زبان سے یہ الفاظ کہے تھے۔ کہ

"سلیم کی بے راہ روی سے ثابت ہوتا ہے۔ کہ وہ شہنشاہ ہند بنائے جانے کی صلاحیت نہیں رکھتا۔ البتہ خسرو ہر حیثیت سے اپنے باپ کے مقابلہ پر تفوق رکھتا ہے۔ اور وہ امور جہانبانی کی قابلیت کا بدرجہ اتم مالک ہے۔"

یہ باتیں اگرچہ جہانگیر کو عبرت دلانے۔ یا خسرو کی دلجوئی کے لئے کہی جاتی تھیں۔ لیکن خسرو اور اسکے حامی اصلیت سمجھ کر یہی خیال کرتے تھے۔ کہ اکبر جہانگیر کے بجائے خسرو کو وارث سلطنت قرار دیگا۔ خانخاناں اعظم خاں کو تو اپنے داماد کے بادشاہ بننے کی یہانتک آرزو تھی۔ کہ بقول صاحب دربار اکبری۔ وہ بڑی حسرت سے کہا کرتے کہ ———

"کاش ایسا ہو۔ کہ ایک کان میں ملک الموت پیغام مرگ سنائے۔ اور دوسرے کان میں کوئی۔ خسرو کے بادشاہ ہونے کی خوشخبری سنا دے۔ تو مجھے مرنے کا غم نہ ہوگا"

اکبر کے الفاظ اور لوگوں کے خیالات راز نہیں رہے تھے۔ جہانگیر کو بھی علم ہو چکا تھا۔ اور اس نے امکانی قوتوں سے ہاتھ پاؤں مارنے شروع کر دئے تھے۔ تفصیل ان حوادث کی یہ ہے۔ کہ ابھی باپ بیٹوں (اکبر و جہانگیر) کے اختلافات دلوں میں تو پرورش پا رہے تھے۔ لیکن ظاہرا دونوں طرف سے صفائی یا ظاہرداری برتی جا رہی تھی۔ جہانگیر گستاخیوں کے بعد معذرت کر لیتا۔ اور اکبر پند و نصائح یا تہدیدی فرامین بھیجکر عفو و درگذر سے کام لیا کرتا تھا۔ سنہ ۱۰۰۸ھ میں اکبر کو ممالک دکن کی تسخیر کے لئے دارالسلطنت سے دور جانے کا موقعہ ملا۔ اس نے قبل اسکے کہ خود عازم سفر ہو۔ جہانگیر کی دلجوئی کر کے ایک لشکر جرار کے ساتھ جہانگیر کو رانا کی تادیب کے لئے روانہ کر دیا۔ اور قابل اطمینان طریقہ پر دارالسلطنت کا انتظام کر کے برہانپور کی طرف روانہ ہو گیا۔ جہانگیر نے رانا کے مقابلہ میں جنگ آزمائی جاری تو رکھی

لیکن باپ کی نقل و حرکت پر بھی توجہ مبذول رکھی۔ اور جب یہ علم ہوگیا۔ کہ شہنشاہ مہماتِ دکن میں بُری طرح اُلجھ گیا ہے۔ اس کا احمد نگر تک دھاوا مانا تھا۔ لیکن مہینوں ہوگئے اور وہ ابھی تک فرمانروائے برہانپور سے قلعہ اسیر لینے میں کامیاب نہیں ہوا ہے۔ فرصت کو غنیمت جان کر اپنی بادشاہی کا انتظام مقدم سمجھا۔ رانا کی مہم سے دستکش ہو کر یلغار کرتا ہوا الہ آباد جا پہنچا۔ اور اپنی سلطنت کی بساط بچھا دی۔ اپنے نام کے سکے ڈھلوائے۔ اپنے معاون امرا و رفقائے کار کو منصب و جاگیر سے مالامال کیا۔ خطابات سے سرفرازی بخشی۔ اور اپنی بادشاہی کے اشتہار کے طور پر اپنے نام کے سکے جو بادشاہی کے اعلان کا ثبوت تھے۔ آناً فاناً ہندوستان کے مختلف صوبوں میں پھیلا دئے۔ اور خاص طور سے یہ سکے برہانپور بھی اسلئے بھیجے۔ کہ بوڑھا شہنشاہ سلطنت پر جہانگیری قبضہ ہو جانے کی خبر سے میدانِ کارزار میں شکستہ دل ہو جائے۔[1]

لیکن انہیں دنوں یہاں پانسہ پلٹ چکا تھا۔ احمد نگر، برار، بیجاپور نے اطاعت و باجگذاری قبول کر لی تھی۔ والئ خاندیس بہادر خاں فاروقی نے بھی طولانی محاصرہ[2] اور اپنے رفقا کی بددلی[3] سے تنگ آ کر جی جی انکہ[4] کے توسط سے خود کو اکبر کی سپردگی میں دے کر قلعہ اسیر کی کنجیاں پیش کر دیں۔

ان فتوحاتِ عظیم کے بعد جشن منانے یا کم از کم اس پیرانہ سالی میں اسقدر مسلسل تگ و دو کے بعد سستانا تو در بات تھی۔ اکبر تو جی جی کے انتقال[5] پر خاطر خواہ سوگ بھی نہ منا سکا۔ صرف اس غم میں داڑھی مونچھیں منڈوا ئیں۔ بہ تعجیل جہانگیر کی شورش فرو کرنے کے ارادہ سے لاہور روانہ ہو گیا۔ محمد معصوم نامی نے تاریخ کہی

ــ یک عدد و نامی فزود و انگاہ گفت۔ شاہ والاعازم لاہور شد (دیکھو کتبہ جامع برہانپور کے مینار، پر کندہ ہے)

[1] مولوی محمد حسین آزاد کے الفاظ ہیں۔ کہ جہانگیر نے اپنے نام کے سکے اکبر تک اس لئے پہنچائے۔ کہ باپ دیکھے۔ اور جلے۔

[2] قلعہ اسیر کا یہ محاصرہ گیارہ ماہ اور چند دن پوری شدت۔ کے ساتھ جاری رہا۔ اکبر بنفسہ موجود تھا۔ اسکے نامور ماہرینِ جنگ قلعہ کشا سرداروں نے جان ہار کوششیں کیں۔ لیکن قلعہ کے قدرتی محل وقوع اور استواری کے سامنے کچھ پیش نہ جاسکی۔

[3] فاروقی بادشاہ کے جو رفقا محصور ہو کر قلعہ اسیر کی حفاظت کر رہے تھے۔ انکے املاک اور حرم شہر برہانپور میں انکے محلات میں غیر محفوظ موجود تھے۔ محاصرین نے ان پر دست تعدی دراز کیا۔ شہر لوٹ لیا گیا۔ قلعہ نشینوں کے ناموس کو اسیر و دستگیر کر کے پائیں قلعہ ایسے مقامات پر بے پردہ تشہیر کیا گیا۔ جہاں سے قلعہ نشین دیکھ سکیں محصورین نے یہ حالات کئے۔ اور ناموس کی تباہی کو برداشت نہ کر کے طے کیا۔ کہ یا تو قلعہ سے باہر نکل کر جنگ کریں۔ یا دیوار سے پھاند کر اپنی جانیں دیدیں۔ بعض نے یہ کوشش بھی کی۔ کہ بہادر خاں کو باندھ کر اکبر کے حوالہ کر دیں۔ اب بہادر خاں کے لئے بجز اسکے چارہ کار نہ رہا تھا۔ کہ وہ اپنے آپ کو اکبر کے سپرد کر دے

[4] جی جی انکہ اکبر کی انا اعظم خاں خانخاناں کی والدہ تھیں۔ اس مہم میں منجملہ دیگر پردہ نشینانِ حرم شاہی کے اکبر کے ساتھ تھیں۔ بہادر خاں کو بہت عزیز رکھتی تھیں۔ بہادر خاں مع اپنے والد راجہ علیخاں (عادلشاہ فاروقی) کے ۱۰ سال آگرہ میں بحیثیت پناہ گزیں رہ چکا تھا۔ اور جی جی کی شرکت بلکہ سرپرستی میں بہادر خاں کی شادی ابوالفضل کی بہن سے عمل میں آئی تھی۔ یہی وجہ تھی۔ کہ بہادر خاں نے جی جی کے دامن میں پناہ لی۔

[5] بہادر خاں سے کنجیاں حاصل ہوئیں۔ اور ضروری انتظام کے بعد اکبر قلعہ میں گیا ہوا تھا۔ کہ جی جی فوری علالت کے بعد فوت ہو گئیں۔ یہ خبر اکبر کو قلعہ میں پہنچائی گئی۔ اس نے قلعہ میں بھدر اکیا۔ لشکر میں بھدرا کی خبر پہنچی۔ تو تقلیداً صدہا مردانِ صفا کیش نے لمبی لمبی ڈاڑھیاں منڈوا دیں اتفاق سے قلعہ سے امتناعی ہدایت آ گئی۔ اور بقیہ ڈاڑھیاں باقی رہ گئیں۔ جی جی کو برہانپور دفن کیا گیا۔ اور مزار پر گنبد بنا دیا گیا۔ آجتک یہ قبرستان اسی نسبت سے دائی انکہ کا قبرستان کہلاتا ہے۔

دارالسلطنت پہنچ کر اکبر نے محسوس کیا۔ کہ وہ جہانگیر کو قابو میں لانے سے قاصر ہے۔ آگے نہ بڑھا۔ اور حکمت عملی سے ادھر ادھر کاغذی گھوڑے دوڑاتا رہا۔ جہانگیر باپ کی کمزوری سے باخبر تھا۔ کچھ دن تامل کر کے ۱۰۱۰ھ میں ۳۰ ہزار سوار اور بے شمار ہاتھی اور دوسرا سامان ساتھ لے کر الہ آباد سے نکل کر آگرے کا رخ کیا۔ ظاہر یہ کیا۔ کہ باپ کی قدمبوسی کو جا رہے ہیں۔ اٹاوہ تک پہنچا تھا۔ کہ اکبر کا ملامت آمیز مکتوب ملا۔ جس کا مفہوم یہ تھا۔ کہ ایک سعادت مند فرزند کا اس حشم و خدم کے ساتھ باپ کے گھر آنا محل نظر ہے۔ ہاں اگر یہ سپاہ مجرا کے لئے لائی گئی ہے۔ تو ہم نے سب کا مجرا قبول کیا۔ اپنے ملازمین کو وہیں سے اُن کی جاگیروں پر رخصت کر دو۔ اور تم جریدہ آ کر ملو۔ اور اگر جریدہ آنا پسند نہ کرو۔ تو تم بھی الہ آباد واپس چلے جاؤ۔ جہانگیر نے جواب میں معذرت و شکایت آمیز عرضی بھیجی۔ لیکن وہیں سے واپس چلا گیا۔ الہ آباد پہنچ کر ازسر نو اپنی قوت کو علانیہ بڑھاتا رہا۔ نیز اسی زمانہ میں ابوالفضل کو قتل کرا کے اکبر کی ہمت پست کر دی

اب اکبر کو زیادہ فکر ہوئی۔ وہ سمجھ چکا تھا۔ کہ جہانگیر کو قوت سے دبانا غیر ممکن ہے۔ نرمی و آشتی سے اس کی دلجوئی پر کاربند ہوا اور سلیمہ سلطان کو بھیج کر صفائی کی کوشش کی۔ بیگم کی فہمائش کا جہانگیر پر کافی اثر ہوا۔ اور وہ بے تکلف بیگم کے ہمراہ آگرہ چلا آیا۔ یہاں بھی صاف دلی کا برتاؤ کیا گیا۔ اور خصوصی نوازشات و تجدید ولیعہدی کے بعد اسکو پھر رانا کی سرکوبی کے لئے روانہ کر دیا گیا۔ فتحپور تک ہی گیا تھا۔ کہ جہانگیر کو پھر کچھ مراک آ گئی۔ آخر کار باپ بیٹوں میں خطوط اور تحائف کی رد و بدل کے بعد یہ پھر الہ آباد چلا گیا۔ اور پھر ازسر نو باہم رنجشیں بڑھنا شروع ہو گئیں۔ یہ صورت حال خسرو کی کامیابی کے لئے سازگار تھی۔ جہانگیر بھی اکبر کی خفگی کو خسرو کی دراندازی سے تعبیر کیا کرتا۔ تزک جہانگیری کے الفاظ یہ ہیں۔

خسرو از بے راہ روی در ملازمت عرش آشیانی ہموارہ بشکوۂ شہنشاہی می پرداخت۔

(دیباچہ تزک جہانگیری صفحہ ۱۳)

اور بھی دو سال اسی عالم میں گزر گئے۔ اور سب مایوس تھے۔ کہ اب باپ بیٹوں میں صفائی نہ ہو سکے گی۔ لیکن ابھی اکبر کو ایک آخری کوشش کرنا باقی تھی۔ ۱۰۱۲ھ میں شہنشاہ نے قصد کیا۔ کہ خود الہ آباد جا کر جہانگیر کو منا لائے۔ مریم مکانی (اکبر کی والدہ) کو اس رائے سے اختلاف تھا۔ لیکن وہ انہیں بھی ساتھ لے کر آگرہ سے روانہ ہو گیا۔ اتفاقی طور پر بعض ناگہانی موانع پیش آ گئے۔ اور اسی اثنا میں مریم مکانی ۴ روز علیل رہ کر فوت ہو گئیں۔ اکبر نے والدہ کے غم میں صف ماتم بچھائی۔ انکا تابوت دہلی روانہ کیا۔ اور اس سانحہ کو ناموافق شگون سمجھ کر آگرہ واپس چلا آیا۔

جہانگیر بھی اس سانحہ سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ اور بے تکلف آگرہ پہنچ کر باپ کی غمگساری کا فرض ادا کیا۔ اکبر نے اس پر ازسر نو اکرام و نوازشات مبذول کیں۔ لیکن جب وہ بعد مراسم تعزیت رخصت ہونے لگا۔ تو اکبر نے اجازت نہ دی۔ اور کہا کہ کثرت مے نوشی سے تمہارا مزاج خلل پذیر ہو گیا ہے۔ چند روز یہیں رہو۔ اور عبادت خانہ میں نظر بند کر دیا۔ چند روز بعد نظر بندی سے آزادی تو ملی۔ لیکن آگرہ سے اور کہیں جانے کی ممانعت تھی۔

کچھ عرصہ بعد اکبر نے ہاتھیوں کی لڑائی کا انتظام کیا۔ طرہ یہ ہوا تھا۔ کہ جہانگیر کے ہاتھی سے خسرو کا ہاتھی لڑے۔ اور جو ہاتھی مغلوب ہو اس کی مدد کے لئے بادشاہ کا ہاتھی چھوڑا جائے۔ جو دونوں ہاتھیوں کو چھڑا دے۔ لڑائی میں خسرو کا ہاتھی مغلوب ہو گیا۔ اور جب شاہی ہاتھی اس کی امداد کو بڑھایا گیا۔ تو جہانگیر کے ملازموں میں سے کسی نے پتھر مار کر فیلبان کو زخمی کر دیا۔ خسرو نے بادشاہ سے شکایت کی۔ لیکن شاہجہان (شہزادہ خرم) کی کوشش سے معاملہ رفت گزشت ہوا۔ اور اس واقعہ کے بالکل بعد اکبر مرض الموت میں مبتلا ہو گیا۔ خسرو اور اسکے حامی سمجھے بیٹھے تھے۔ کہ بادشاہ خسرو کو وارث سلطنت قرار دیگا۔ لیکن اس نے بستر مرگ پر جہانگیر کی خطا معاف

کی توسب کی آنکھیں کھل گئیں۔ چونکہ خسرو کا ذاتی اثر و رسوخ اور ذاتی طاقت خود بھی کم نہ تھی۔ پھر سلطنت کے رکنِ رکین راجہ مان صاحب مان سنگھ اور اعظم خاں اسکے ذی اثر تھے۔ کہ تمام طاقتیں ان کی مٹھی میں تھیں۔ جہانگیر اور اوسکے معدودے چند رفقا کی جانیں خطرہ میں تھیں یہ رنگ دیکھ کر اکبر نے مان سنگھ کو کابل اور اعظم خاں کو بنگالہ روانہ کر دیا۔ اور بقیہ امرا سے جہانگیر کی تخت نشینی کا عہد لے کر اطمینان کی سانس لی۔ اور یہی سانس اُس کی آخری سانس تھی۔ اکبر کی وفات اور جہانگیر کی تخت نشینی خسرو کی موجودگی میں ہوئی۔ اور وہ غریب کان نہ ہلا سکا۔ اب جہانگیر شہنشاہِ ہند تھا۔ اور خسرو نظر بند۔ چند ماہ خسرو کو اسی عالم میں گذارنے پڑے۔ نظر بندی کی گرفتاری اس کو شدت سے جکڑے ہوئے تھی۔ آخر کار چھ ماہ بعد ۸ ذالحجہ سنہ ۱۰۱۴ھ کو موقع ملا۔ اور ساڑھے تین سو جاں نثاروں کے ساتھ فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا۔ اور سیدھا لاہور کا رخ کیا۔ خسرو کی مقبولیت کا یہ عالم تھا۔ کہ صرف دس دن کے عرصہ میں جبکہ ۱۸ ذالحجہ کو وہ لاہور پہنچا ہے۔ اسکے ساتھ بارہ ہزار جنگ جُو اور بے شمار دولت تھی۔ حاکم لاہور جہانگیری احکام کے ماتحت ضروری استحکام کے بعد قلعہ بند ہو بیٹھا۔ خسرو نے آتے ہی محاصرہ کر لیا۔ ۹ روز تک محاصرہ میں شدت کیگئی۔ لیکن تسخیر میں کامیابی نہ ہو سکی۔

اب جہانگیری امرا کے آنے کا سلسلہ شروع ہو چکا تھا۔ اور خود جہانگیر بھی بڑی تشویش اور گھبراہٹ کی حالت میں تعاقب کے لئے روانہ ہو چکا تھا۔ یعنی بشدت تمام بارش ہو رہی تھی۔ اس کی بھی پرواہ نہ کی۔ اور باوجود بھوک اور رغبت کے مرغوب طعام سامنے آنے پر بھی سیر ہو کر کھائے بغیر سوار ہو گیا تھا۔ چنانچہ خود لکھتا ہے۔

"ہم در شب باآنکہ بارانِ عظیم بود طبل کوچ زدہ سوار شدم۔ صباح آں بہ سلطان پور رسیدہ شد۔ تا نیم روز در سلطانپور بودم بحسب اتفاق در ہمیں ساعت میانِ افواجِ قاہرہ و جماعت مقہور مقابلہ و مقاتلہ دست میدہد۔ معز الملک طشتِ بریانی آوردہ بودمے خواستم۔ کہ از روئے رغبت میل نمایم۔ کہ خبر جنگ لمن رسیدہ بمجرد شنیدن باآں کہ طبیعت مائل بخوردنِ بریانی بود۔ یک لقمہ برائے شگون خوردہ سوار شدم۔ و مقید برسیدن مردم۔ وکمی افواجِ قاہرہ نگشتہ بشتاب ہرچہ تمام تر متوجہ گشتم۔ جلیۃ خاصہ خود راہر چند طلبیدم حاضر نہ ساختند۔ از سلاح بجز نیزہ و شمشیرے حاضر نہ بود۔ خود را بلطف ایزدی سپردہ بے ملاحظہ روانہ شدم۔ در اول سوارے زیادہ از پنجاہ سوار ہمراہ نبودند و ہیچ کس را خبر ہم نبود۔ کہ امروز جنگ خواہد شد۔ مجملاً تا بہ سرپل گوبند وال رسیدن چہار پانصد سوار از نیک و بد جمع شدہ باشند"

(تزک جہانگیری صفحہ ۳۰)

ادھر جہانگیر روادی میں بڑی تیزی کے ساتھ میدان جنگ کی طرف بڑھ رہا ہے۔ ادھر لڑائی کا فیصلہ ہو چکا تھا۔ خسرو کی قسمت نے یاوری نہ کی۔ ایسی شکست کھائی۔ کہ بے سروسامانی کے عالم میں بدشواری جان سلامت لے جا سکا۔ جہانگیر کے جاسوس دم دم کی خبریں لا رہے تھے۔ ہنوز گوبند وال کا پُل عبور کر سکا تھا۔ کہ قاصد نے فتح کی خوشخبری سنائی۔ اور اسکے صلے میں خوشخبر خاں کے خطاب سے سرفراز ہوا۔ اتفاقاً اسی وقت دوسرا قاصد آیا۔ جسے جہانگیر نے خسرو کی قوت کا اندازہ لگانے کے لئے بھیجا ہوا تھا۔ اس نے آ کر خسرو کی شوکت و حشمت مبالغہ کے ساتھ بیان کی۔ حالانکہ متواتر قاصد چلے آ رہے تھے۔ اور فتح کی خبریں سنا رہے تھے۔ لیکن وہ باور نہ کرتا۔ اور کہتا۔ کہ ہرگز نہیں۔ میں نے بچشم خود جُز سامان جنگ اور سبزہ آزما دلاور اور کثیر التعداد فوج دیکھی ہے۔ وہ زنہار

شکست نہیں پاسکی ہوگی۔ حتےٰ کہ اب خسرو کا سنگھاسن اور اسکے دو خواجہ سرا مع دیگر مالِ غنیمت کے حضور میں پیش ہوئے۔ تب کہیں وہ باور کرسکا۔ کہ خسرو کو شکست ہوئی ہے۔

جہانگیر ابھی تک سواری سے نہیں اترا تھا۔ فتح کا اطمینان کرلینے کے بعد کرکھولی۔ اور خسرو کے لئے ہوئے اسباب کا جائزہ لیا جانے لگا۔ جس میں منجملہ دیگر نفائس کے جواہرات کا وہ صندوقچہ بھی تھا۔ جو خسرو ہمیشہ ساتھ رکھتا تھا اس سے ظاہر ہے۔ کہ خسرو کس قدر بے سروسامان ہوکر فرار ہوسکا تھا۔ جہانگیر نے اسکے تعاقب کا معقول انتظام کیا۔ پندرہ ہزار روپیہ مہابت خان کو اور بیس ہزار روپیہ دیگر امیلوں کو اور سہزا منقرہ عطا کئے۔ اور تاکید کردی۔ کہ راہ میں جس طرح ضرورت ہو صرف کریں۔ اور تازہ دم فوجیں تعاقب پر مامور کرکے تمام ممالک محروسہ میں اطلاعیں بھیجدیں۔ کہ خسرو جہاں ملے گرفتار کرلیا جائے۔ اور خود بھی اس ارادہ سے کہ کابل تک اسکا پیچھا نہ چھوڑے۔ عازم سفر رہا۔

خسرو معدود سے چند ہمراہیوں سمیت دریائے چناب کو عبور کرتے ہوئے گرفتار کرلیا گیا۔ جہانگیر نے خسرو کو تو قید رکھا۔ لیکن اسکے رفقا کو عبرت انگیز سزائیں دیں۔ عبدالرحیم کو گدھے کی کھال میں اور حسین بیگ کو بیل کی کھال میں زندہ سلواکر تشہیر کرایا۔ اتفاق سے عبدالرحیم زندہ بچ نکلا ہوا۔ اور قید کیا گیا۔

خاص و عام میں خسرو کی مقبولیت سے جہانگیر اسقدر خائف تھا۔ کہ عالم اسیری میں بھی پابزنجیر اپنے سے دور نہ کرتا۔ سفر و حضر میں ہر جگہ ساتھ رکھتا تھا۔ چنانچہ دوسرے سال کابل گیا۔ تو وہاں کے باغات اور پُرفضا منظر دیکھ کر قیدی فرزند کی حالت پر رحم آیا۔ اس کی بیڑیاں کٹوادیں۔ مگر حراست بدستور رہی

خسرو نے قید میں کم تکلیفیں نہیں اٹھائی تھیں۔ اسکے علاوہ شہنشاہی کی امید بھی نہیں ٹوٹی تھی۔ پھر توڑ جوڑ شروع کی۔ اس مرتبہ نورالدین ابن آصف خاں۔ اور غیاث الدین ابن اعتماد الدولہ جیسے باا‌ثر امرا اُس کی اعانت پر کمربستہ تھے۔ لیکن انکے ارادوں کے بروئے کار آنے سے قبل راز افشا ہوگیا۔ خسرو پھر قید و بند کی کڑیاں جھیلنے پر مجبور ہوا اور اسکے معاون مقتول و معضوب۔

اس مرتبہ خسرو کو طولانی قید بھگتنی پڑی۔ کم و بیش چھ سال بعد جہانگیر نے اتنی رعایت کی۔ کہ اسکو کورنش بجالانے کی اجازت دی۔ لیکن جلد ہی مشکوک ہوکر حضوری سے روک دیا۔ اور اسی شبہ میں اسکے خسر اعظم خاں کو گوالیار کے قلعے میں قید کردیا۔

جہانگیر نے ۱۶۲۱ء یا ۱۶۲۰ء جلوس تک اسے دل سے بھلائے رکھا۔ لیکن آخر فرزند تھا۔ اور مسلسل ۱۴ سال قید میں گزر چکے تھے۔ سنہ مذکور میں اس کی خطائیں معاف کرکے طوق و زنجیر کی بندشوں سے تو آزاد کردیا لیکن حراست سے آزادی پھر بھی نہ دی۔

دوسرے سال ۱۶۲۹ء میں دکن کی شورشوں کی خبر ملی۔ اور شاہجہاں کو پھر اس مہم پر نامزد کیا گیا۔ تو اس نے بحالتِ اسیری خسرو کو اپنے ساتھ لیجانے کی خواہش کی۔ یا بقول بعض شرط لگادی۔

جہانگیر نے عالم مستی میں خسرو کو اسکے سپرد کردیا۔ لیکن نہایت لجاجت اور منت کے انداز میں خوش نصیب بیٹے (شاہجہاں) سے بدنصیب بیٹے (خسرو) کی حفاظتِ جان کا پیمان لیا۔ شاہجہان نے برہانپور پہنچ کر خسرو کو قلعہ برہانپور میں محبوس کیا۔ اور جنگ و صلح سے متخاصمین کا معاملہ یکسو کیا۔ تمام ممالک دکن جہانگیری اقتدار میں آگیا۔ باپ کو فتحنامہ۔ مالِ غنیمت تحائف و پیشکش روانہ کرکے خود فتح و کامرانی کا جشن منانے کے لئے برہانپور آیا۔ دھوم دھام سے جشن منایا گیا۔ ادھر جشن و طرب کی شہنائیاں فضا میں گونج رہی تھیں۔ ادھر رات کی تاریکی میں رازدارانہ طریقہ پر نہایت خاموشی کے ساتھ قلعہ برہانپور میں کے محبس میں سوئے ہوئے خفتہ نصیب قیدی کا گلا گھونٹ کر کام تمام کردیا گیا۔ اور مشہور یہ کیا۔ کہ خسرو درد گردہ کے عارضہ سے دفعتاً فوت ہوگیا ہے۔ اس مصنوعی خبر کو حقیقت کا رنگ دینے کے لئے شاہجہان نے خود بھی بہت

"اس تماشے کی ضرورت نہیں۔ اٹھو اور تمہیں جو کچھ کہنا ہو صاف صاف کہہ ڈالو۔"

وہ رومال سے آنکھیں پونچھتا ہوا اٹھا اور کہنے لگا۔

"حضور۔۔۔ اللہ نے نصیب سے۔۔۔ آج یہ قدم دکھائے۔۔۔۔ چار مہینے ہو گئے۔۔۔ گھر کا گھر پریشان ہے۔ بیگم صاحب کا حال تو پوچھو نہیں۔۔۔ آج تک آنکھ کا آنسو نہیں سوکھا — دن بھر میں ایک نوالہ منہ میں جاتا ہو تو حرام ہے۔ بڑے سرکار بھی بیگم صاحب پر خفا ہو کر جاگیر چلے گئے۔۔۔۔۔ حضور۔۔۔!"
یہ کہتا ہوا وہ میری طرف بڑھا۔ اور ہاتھ جوڑ کر کہنے لگا۔ "اب خطا معاف ہو۔ اور گھر تشریف لے چلیں۔" پھر اس پر رقت طاری ہوئی اور وہ میرے قدموں پر گر پڑا۔

"حضور! یہ قدم اب چھوڑنے کا نہیں۔ یہیں مر جاؤں گا یا آپ کو گھر لے جاؤں گا۔"

یہ عزم مصمم!

بہت سی باتیں اس نے ایک دم میں بیان کر دیں کہ ایک لمحے کے لئے میرا دماغ چکرا گیا۔ مجھے محسوس ہوا کہ ایک نئی طرز کا معاملہ درپیش ہے۔ میری طبیعت گھبرانے لگی اور میں اس سے پیچھا چھڑا کر بھاگنا چاہتا تھا۔ کہ یکایک میرے دل میں ایک خیال پیدا ہوا۔ یہ ظاہر ہے کہ اسے غلط فہمی ہو گئی تھی۔ یا پھر وہ مجھے گہری چال میں پھنسانا چاہتا تھا۔ لیکن بہرحال، اس کی رقت کا خیال کر کے اُسے جھڑکنا مناسب نہیں ہوا۔ اس لئے میں نے اُسے زمین سے اُٹھایا اور سمجھانے لگا۔

"دیکھو تم کو شاید کچھ غلط فہمی ہو گئی ہے۔ مجھے ان باتوں سے کوئی تعلق نہیں۔۔۔۔ تم کسی اور کے دھوکے میں ہو۔۔۔"

"حضور! بیگم صاحب کا ایسا خیال ہی تھا کہ آپ یہ فرمائینگے۔۔۔۔ کیسے تعلق۔ نہیں سرکار! بیگم صاحب آپ کی ہوئیں تو گھر بار پھر کس کا؟ اتنی سی بات پر بھی کہیں وارے نیارے ہو لئے ہیں۔ میں خدمت کرتے کرتے بڈھا ہونے کو آیا۔ چار مہینے کے اندر باہر آپ کو کیسے بھول جاؤں گا؟ حضور آپ بچنے کی لاکھ کوشش کریں لیکن بیگم صاحب کی دعائیں قبول ہوئیں۔ اللہ نے آج آپ کے قدم دکھائے۔ اب اگر آپ کو چھوڑ کر گیا۔ تو مالکنی کو کیا منہ دکھاؤں گا!"

جو واقعہ وہ سمجھانا چاہتا تھا، اس کے کچھ کچھ خدوخال اب سمجھ میں آ رہے تھے۔ لیکن جو حصہ اب بھی پس پردہ تھا، اُس کو سمجھنے کے لئے میرا ذہن بے چین تھا۔ کانٹے سے دامن چھڑانے کے لئے جھکا تھا، یہ کیا معلوم تھا کہ سارا دامن جھاڑی میں اُلجھ جائے گا! اس واقعہ کے تمام اچھے اور بُرے پہلو گنجفے کے پتوں کی طرح جلد جلد میرے ذہن سے گذرنے لگے۔ معاً ایک خیال میرے ذہن میں آیا۔ اور میرے ہونٹوں پر تبسم کی لہر دوڑ گئی۔ میرے ذہن نے ان واقعات میں ایک رومان پیدا کرنے کی کوشش کی۔ دقت طلبی اور مہم پسندی کا ایک جذبہ جو نوعمری اور غیر ذمہ داری کا لازمی نتیجہ ہے، مجھے ابھارنے لگا کہ اب واقعات کو کریدنے کی بجائے ان کو قبول کر لینا چاہئے۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ ضمیر نے ملامت کی کہ یہ اُس کی غلط فہمی سے ناجائز فائدہ اٹھانا ہے۔ اس لئے میں نے جرأت کر کے کہا۔

"میں کہہ رہا ہوں کہ تم کو غلط فہمی ہو گئی ہے۔ مجھے ان باتوں سے کوئی واسطہ نہیں۔"

"میں سمجھ گیا سرکار! آپ کا مطلب" وہ کہنے لگا: "آپ پیچھا چھڑا کر بھاگنا چاہتے ہیں۔ لیکن میں آپ کو اللہ اور اس کے رسول کا واسطہ دے کر کہتا ہوں کہ آپ اگر اب گھر نہ چلے تو بیگم صاحب کا خون ناحق آپ کی گردن پر ہو گا۔ اور ان کے ساتھ نہ معلوم اور کتنے لوگوں کا۔۔۔۔"

اس کی اس بھاری غلط فہمی پر مجھے سخت حیرت تھی۔ اُس کو سمجھانے کی میں جتنی کوشش کر رہا تھا، اُسے اتنا ہی یقین ہوتا دکھائی دے رہا تھا۔ کہ میں بچ کر بھاگنا چاہتا ہوں۔ اُسکے انداز کا تیقن، اس کی غلط فہمی کا پتہ دیتا تھا۔ قدیم وضع کا سیدھا سادھا غریب آدمی! وہ نشے میں بھی نہیں تھا —— اب اس معاملے میں چند اجزا موثر بھی پیدا ہو گئے تھے۔ مثلاً، بیگم صاحب" اور" خون ناحق" وغیرہ — ایسے موقع پر کوئی سخت

دل اور کاروباری وضع کا انسان ہوتا تو ممکن ہے کہ اس طرح
کی نفسی باریکیوں میں نہ الجھتا اور دامن جھٹک کر چل کھڑا ہوتا۔
لیکن میری حساس فطرت نے، بات کی بات میں بیگم صاحب کے
"خونِ ناحق" کی ذمہ داری اپنی گردن پر قبول کرلی۔ اب اس قصہ
کے جھوٹ سچ کا یقین حاصل کئے بغیر، میں اس میں کود نے
آمادہ نظر آنے لگا۔ عجیب تر یہ کہ اس کے انجام کے متعلق جتنے
ناخوشگوار خیالات ذہن میں آتے، وہ وہم پسندی کی رو میں بہ
جاتے۔ عقلِ مآل اندیش ڈرا رہی تھی کہ پرائی آگ میں نہ کود۔
دل کا استدلال یہ تھا کہ تمہارے بے وقوف بننے سے بھی اگر کسی
کی جان بچ سکتی ہے۔ تو پیچھے ہٹنا گناہ ہے۔ شاہ آرتھر کے
سورماؤں اور حاتم طائی کی ہمدردانہ مہموں کے قصے ایک ایک کر
ذہن میں پھرنے لگے۔ اس شخص کی غلط فہمی کی صداقت کا اندازہ
کرنے کی ایک آخری کوشش میں نے اور بھی کی۔

"تمہاری سمجھ ہی میں نہیں آتا، تو مجھے چلنے میں شاید کچھ
زیادہ اصرار نہ ہو۔ . . . ممکن ہے۔ . . . کیا کہتے تھے تم . . . .
ہاں، تمہاری بیگم صاحب کی کوئی خدمت مجھ سے ہوسکے۔ . . ."

اس کے ہاتھ بے تحاشا آسمان کی طرف اٹھ گئے۔

"خدا حضور کے عمر و اقبال میں ترقی دے۔" وہ کہنے لگا۔
"اپنے بوڑھے نمک خوار کی لاج رکھ لی۔ وہ تو آپ جی سخت کر کے
ہی گئے تھے۔ مالکن کو بھلانے بیٹھے تھے۔ ہم غریبوں کا کیا ٹھکانا ہے
سرکار! اپنا گھر آخر اپنا ہی ہے۔ یہ سچ ہے۔ رنجش کے بعد ملنے
میں جی اسی طرح کے حیلے حوالے کرتا ہے۔ لیکن آپ مرد ہیں، جی
بڑا کریں۔ سوچیں کہ عورت ذات پر کیا ستم کا پہاڑ ٹوٹ پڑا ہے
آپ خفا بھی ہوئے تو دل بہلانے کے لئے دوست احباب مل گئے
وہ کہاں جائیں، کس کی ہو کر رہیں۔ . . ."

رومال کے گوشے سے اس نے جلد جلد آنسو پونچھے اور
پھر کہنے لگا ——— "چلئے سرکار۔ اب دیر کس بات کی ہے۔ آپ
کا سامان کل میں جا کر لادوں گا۔"

میں اس کی رقت انگیز حرکتوں سے اتنا متاثر تھا کہ کچھ تصفیہ
کئے بغیر اس کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ تھوڑی دور جانے کے
بعد مجھے خیال ہوا کہ کہیں میں نے غلطی تو نہیں کی؟ مجھے اور
اطمینان کرلینا چاہئے تھا۔ لیکن ایک اور خیال سے میری تسلی
ہو رہی تھی کہ میں نے قول دیا ہے۔ سر تو نہیں دیا ہے۔ جب
چاہوں گا، اس مکڑی کے جالے کو توڑ کر نکل آؤں گا۔

چند منٹ میں ہم اس مقام تک پہنچ گئے۔ جہاں سے
میری قیام گاہ کو راستہ مڑتا تھا۔ میں نے سوچا کہ واپس ہوتے
ہوتے، نہ معلوم کتنی رات ہو جائے۔ گھر جا کر اطلاع کر دینی
چاہئے کہ میں دیر سے لوٹوں گا۔ اس شخص کے متعلق میرے دل
میں ابھی تک شبہات تھے۔ اس لئے میں نہیں چاہتا تھا کہ وہ
میرا گھر دیکھ لے۔ لیکن یہ میں اس سے صاف صاف بھی نہیں کہنا
چاہتا تھا۔ میں اسے ایک مہم سمجھ رہا تھا۔ اور اس میں پڑنے اور
نکل آنے کے خیال سے میں لطف اندوز ہو رہا تھا۔ پہلے وہ مجھے
گانٹھنا چاہتا تھا، لیکن اب مجھے اس کا چھوٹنا گوارا نہیں تھا۔ اس لئے
میں نے ایک ترکیب سے اُسے سمجھایا۔

"یہاں مجھے ایک صاحب سے ضروری کام ہے۔ ان سے
مل کر دو چار منٹ میں واپس آتا ہوں۔ تم یہیں ٹھیرے رہو۔"

اس نے مجسم التجا بن کر، اور ہاتھ جوڑ کر کہا۔

"حضور! غلام کے ساتھ چلنے میں کیا ہرج ہے . . . . .
میں چپکا باہر کھڑا رہوں گا۔"

میں نے اُسے دلاسا دیا:

"تم فکر نہ کرو کہ میں تمہیں چھوڑ کر چلا جاؤں گا۔ کام ضروری
ہے۔ اور تمہارا ساتھ چلنا مناسب نہیں۔ یہیں ٹھہرے رہو۔
میں ابھی آتا ہوں۔"

"سرکار آپ کے پھر کھو جانے کا ڈر ہے۔ چار مہینے کے بعد
یہ صورت نظر آئی ہے۔ . . ."

"میں تمہارے ساتھ چلنے کا وعدہ کر چکا ہوں۔ اب جب
تک تم خود نہ چھوڑ دو۔ میں تمہارے ساتھ ہوں۔ اطمینان رکھو
اچھا۔ میں ابھی آیا۔"

یہ کہتے ہوئے میں جلد جلد قدم بڑھاتا گھر کی طرف چلا۔ لیکن اندر داخل ہونے سے پہلے میں نے پیچھے پلٹ کر دیکھا۔ تو معلوم ہوا کہ وہ کچھ فاصلہ پر برابر میرے پیچھے لگا چلا آرہا ہے جب میں پلٹا تو وہ جلد کسی گوشہ میں چھپ گیا۔ اور میں موقع کو غنیمت سمجھ کر جلد گھر کے اندر داخل ہو گیا۔

یہ رات کے کھانے کا وقت تھا۔ لیکن اب نہ تو کھانے کے لئے وقت تھا اور نہ اس کی خواہش۔ اس لئے میں نے ملازم کو بلا کر سمجھا دیا کہ میں رات میں دیر سے لوٹوں گا۔ کھانے کے لئے کوئی میرا انتظار نہ کرے۔

اس کے بعد کھڑے کھڑے میں نے ہاتھ منہ دھوئے، بالوں کو درست کیا اور دو چار بسکٹ منہ میں ڈال کر، گلاس بھر پانی پی لیا تاکہ کچھ سہارا رہے۔ احتیاط کی خاطر دس دس روپیہ کے دو نوٹ بھی میں نے جیب میں رکھ لئے اور اپنا ڈنڈا سنبھال کر، اسی احساس کے ساتھ گھر سے چل کھڑا ہوا۔ جس احساس کے ساتھ قدیم زمانے کے ہیرو کسی بڑی مہم کے سر کرنے کے لئے روانہ ہوتے ہونگے۔

مجھے واپس آتا دیکھ کر، اُس شخص کی جان میں جان آئی — وہ جلد جلد آگے بڑھا اور کہنے لگا۔

"حضور! ابھی ابھی شرفو، ادھر سے سیکل پر جا رہا تھا۔ آپ کے تشریف لانے کی خوشخبری، بیگم صاحب سے کہنے گیا ہے۔ سرکار! وہ جھوٹ ہی سمجھ رہا تھا۔ بڑی مشکل سے یقین دلانا پڑا۔"

مجھے محسوس ہوا کہ میرے اطراف اور اس سے بڑھ کر میرے ذہن میں عجیب فضا پیدا ہوتی جا رہی ہے۔ گھر — بیگم صاحب — بڑی بیگم صاحب — چھوٹی بیگم صاحب۔ شرفو۔ ملازمین اور خدا جانے کیا کیا چیزیں آنِ واحد میں میرے ذہن میں آتی اور چلی جاتی تھیں۔ میرے ہاتھ پاؤں پھولنے لگے تھے۔ سردی نہیں تھی۔ لیکن دانت بجا چاہتے تھے۔ اس میں خوف کو ہرگز دخل نہیں، بلکہ یہ میری شوق کشتگی کا نتیجہ تھا۔ میری منزلِ مقصود مبہم تھی۔ اور اسی میں مجھے لطف آرہا تھا۔ اگر یہ واضح اور معین ہو جاتی تو شاید لطف باقی نہ رہتا یہ رومان بڑی حد تک میری اپنی پیدا کردہ چیز تھی۔ ایسے رومان ہر شخص پیدا کرسکتا ہے۔

جس خطرے سے میں تھوڑی دیر پہلے بھاگنا چاہتا تھا، وہ مجھے اب عزیز نظر آرہا تھا۔ اس وقت اگر کوئی میری فریب خوردگی کو بے نقاب کرنے کی کوشش کرتا، تو مجھے سخت صدمہ پہنچتا۔

غرض انہیں خیالات کی رو میں بہتا ہوا، میں چلا ہی گیا آگے — اور آگے — میرا رہبر — میرا انبیا دبھی خاموش میرے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔ بعض وقت ہماری خاموشی تکلیف دہ معلوم ہوتی، تو میں اس سے ایک آدھ سوال کر لیتا۔

"تو کیا .... بیگم صاحب بہت رنجیدہ ہیں ....؟"

"خداوند! یہ پوچھنے کی بات ہے۔ گھر کی رونق آپ سے ہے۔ جب آپ ہی نہ ہوئے تو گھر کیا، بیگم صاحب کیا!"

"اچھا، گھر میں اب کون کون ہیں .... اور بیگم صاحب اور ...؟"

"اور کون ہونے چلا حضور! بڑے سرکار تو خفا ہو کر جاگیر چلے گئے۔ اب بیگم صاحب بڑی بیگم صاحب اور بیگم صاحب کی بہن ہیں"

بیگم صاحب اور بیگم صاحب کی بہن کا مجھے اتنا خیال نہیں تھا۔ لیکن یہ "بڑی بیگم صاحب" کا معاملہ ذرا ٹیڑھا نظر آرہا تھا۔ لیکن اب میں کشتی تیرا چکا تھا۔ لنگر خدا کے ہاتھ!

"ہاں، تم کہتے تھے نا .... کیا کہا تھا .... میری صورت نکل آئی ہے؟ .... اتنے دن کے بعد ... کیا وہ پہچان سکیں گی ....؟"

"سرکار، یہ بھی کوئی بولنے کی بات ہے! ایسی کیا آنکھوں پر چربی چھا گئی ہے کہ آپ کو نہ پہچان سکیں — بیگم صاحب کو بھی اب خوب سبق مل گیا۔ رنجش، سرکار کس گھر میں نہیں ہوتی لیکن اتنی سی بات پر بھی کہیں یہ رشتے ٹوٹے ہیں!"

ظالم نے ایک اور ضرب لگائی۔ یہ "رشتے" کیا ہیں جو ٹوٹ نہ سکیں! بہن بھائی کا رشتہ، دور کی قرابتوں کا رشتہ، غرض

رشتے ہزاروں ہی ہیں . . . . ایک اور رشتہ بھی ہے . . . . اس کے خیال ہی سے دل بلیوں اچھلنے لگا۔ اس وقت ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس رشتے کا سوال ہی درحقیقت اس معاملے کی جان ہے لیکن میں اب ایسی حالت میں پڑ گیا تھا کہ صاف پوچھ بھی نہیں سکتا تھا۔ یا پوچھنا نہیں چاہتا تھا۔ لیکن اس رشتے پر قیاس آرائیوں نے دیر تک مجھے محو رکھا۔

اب میرا رہبر جلد جلد قدم بڑھانے لگا جس سے مجھے یقین ہو گیا کہ منزلِ مقصود دور نہیں ہے۔ ایک معما آج تک میری سمجھ میں نہ آسکا۔ وہ یہ کہ میرا رہبر میرے پیچھے پیچھے چل رہا تھا۔ پھر میں منزلِ مقصود کو سیدھا کس طرح پہنچ سکا؟ ایسے موقعوں پر شاید "بصیرت" کام کر جاتی ہے!!

میرا رہبر ایک اچھے خاصے دو منزلہ مکان کے سامنے رُکا یہ مکان شاہراہ سے کسی قدر ہٹا ہوا تھا۔ لیکن بہت صاف ستھرا اور متمول آدمی کا مکان معلوم ہوتا تھا۔ سامنے اور دونوں طرف تھوڑا سا کھلا حصہ تھا، اور آگے متوسط درجے کے شائستہ مکانات کا سلسلہ چلا گیا۔

جب ہم گھر کے قریب پہنچے اندر سے بات چیت کی اور کچھ بچوں کے رونے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ ہمارے پہنچتے ہی ایک ملازم جو باہر دروازے کے پاس کھڑا تھا، بھاگتا ہوا اندر گیا۔ اُس کے جاتے ہی آوازیں اس طرح یک لخت موقوف ہو گئیں، جیسے کسی نے ریڈیو سٹ کی کل بند کر دی ہو۔ نہ معلوم کس طرح میرے ذہن میں یکایک طلسمات کا خیال آیا۔

میرے رہبر نے آگے بڑھ کر دروازے پر آواز دی۔

"شرفو! سرکار آ گئے۔" اس کی آواز سے مسرت ٹپکی پڑتی تھی۔ میں سکتے کی حالت میں دروازے سے ذرا ہٹا ہوا کھڑا تھا۔ اور وہ میری صورت اس طرح تک رہا تھا گویا اندر قدم رنجہ فرمانے کی استدعا کر رہا ہے۔

حقیقت میں میرے لئے یہ امتحان کا وقت تھا۔ یہاں تک تو میں نہ معلوم کس محویت کی حالت میں چلا آیا۔ لیکن یہاں پہنچے کے بعد میرا احساس بیدار سا ہوا اور اس کے ساتھ ہی ہمت جواب دینے لگی۔ اب ایک قدم پر فیصلہ تھا۔ یا تو ناؤ منجدھار میں پڑتی یا پار لگتی۔ پہلا قدم جو اُٹھتا، وہ یقیناً اہمیت آفریں ہوتا ——— جوں ہی میں نے اندر قدم رکھا، "الف لیلہ" کے دیو ہیکل حبشی ننگی تلواریں سر پر تانے نظر آنے لگے! کچھ غنڈوں کی لاٹھیں میرے سر پر برستی ہوئی معلوم ہوئیں۔ پھر ایک تاریک تہ خانہ میرے لئے آغوش کشادہ دکھائی دیا۔ اتنے میں ایک پری جمال دوشیزہ دوڑتی ہوئی آئی اور میرے گلے میں باہیں ڈال کر فرطِ مسرت سے کہنے لگی ——— "تم! تم آ گئے؟ . . . . آخر . . . میں نے . . . . ایک روز . . . . میں نے تمہیں دیکھا تھا . . . . راستے میں۔ سب کچھ نہ پوچھئے۔ اس وقت چین حرام ہو گیا . . . . آخر آپ کو بلانے کی یہ ترکیب سوچی . . . . "

ان چند لمحوں کے اندر اندر خیالات کا جو طوفان میرے دماغ سے گذر گیا۔ اس کی شرح ایک کتاب کی وسعت چاہتی ہے میں انہیں خیالات میں ڈوبا ہوا تھا کہ میرے رہبر کی صدا نے مجھے چونکا دیا۔

". . . . . سرکار! اندر تشریف لے چلیں۔"

اس وقت پہلا خیال میرے ذہن میں یہ آیا کہ، میں نے بڑی جرأت سے کام لیا۔ مجھے واپس جانا چاہئے لیکن ہیں . . ؟

آنکھیں بند کر کے میں نے جو قدم اٹھایا تو بجائے گھر سے جانے کے گھر کے اندر تھا۔ اور جو قدم اُٹھ گیا تو پھر رُکنے کا نام نہیں لیتا تھا۔ ایک فوق فطری اثر کے تحت میں بڑھا ہی چلا گیا ——— آگے ——— آگے ——— ڈیوڑھی کا حصہ طے کیا، زنانہ دروازے کو پار کیا، صحن کو عبور کیا، سیڑھیاں چڑھیں، پیش دالان کی باری آئی۔ وہ بھی بات کی بات میں طے ہو گیا، آخر دالان سے گذر کر میں سیدھی جانب کے کمرے میں گھسا۔ یہیں میرا رہبر کھڑا ہو گیا تھا۔

دالان میں میلے کچیلے کپڑوں والی ایک عورت نے مجھے سلام بھی کیا۔ میری نظر اچٹتی ہوئی ایک دسترخوان پر بھی پڑی،

جو دالان کے اس سرے پر بچھا ہوا تھا۔ غالباً کچھ لوگ کھانا کھا رہے تھے۔ میرے آنے سے پہلے اٹھ گئے

کمرے میں گھس کر نہ معلوم کیوں مجھے اطمینان سا محسوس ہوا کہ اب میں محفوظ ہوں۔ ذرا کی ذرا خیالات کو جمع کرنے کا موقع مل جائیگا۔ لیکن . . . . ! لیکن یہاں پہنچکر سب سے پہلا حقیقی ہیجان مجھے نصیب ہوا۔ کمرے میں سفید چادر کا فرش بچھا ہوا تھا۔ اور اس پر درمیان میں دیوار سے لگی ہوئی قالین بچھی تھی۔ قالین کے گوشے میں ایک پاندان کھلا ہوا رکھا تھا۔ اور پاندان کے سامنے ایک نہایت حسین لڑکی، پندرہ سولہ کا سن، اتنے متناسب اعضا کہ ایسی لڑکی میں نے آج تک نہیں دیکھی۔ بیٹھی ہوئی پان کے بیڑے بنا رہی تھی۔ اس سے کچھ فاصلے پر ایک معمر عورت جو خادمہ معلوم ہوتی تھی، بیٹھی ہوئی تھی۔ مجھے آتا دیکھ کر خادمہ کھڑی ہوگئی، اور ادب سے سلام کرکے کمرے سے چلی گئی۔ اس کے جاتے ہی لڑکی نے جلد جلد پان تھالی میں رکھے اور پاندان بند کرکے اپنا لباس درست کرتی ہوئی اُٹھی۔ میری طرف پلٹ کر اس نے نیچی نظریں کئے، مجھے سلام کیا اور کمرے سے باہر چلی گئی۔

یہ سب اس قدر جلد جلد واقع ہوا کہ مجھے کچھ سوچنے کا موقع ہی نہ مل سکا۔ میں مبہوت کھڑا تھا۔ اس سرو خراماں کے جانے کے بعد میرے حواس کچھ درست ہوئے۔ سب سے پہلے میری نظریں کمرے کا جائزہ لینے لگیں۔

کمرہ قدیم وضع کے ساز و سامان سے سجا ہوا تھا۔ سیدھی جانب چھپر کھٹ پڑا تھا۔ اور اس طرف سنگھار میز دھری تھی۔ قالین کے ایک گوشہ پر گراما فون کھلا ہوا دھرا تھا۔ اور رکارڈ بھی اِدھر اُدھر پڑے تھے۔

"اب آگے کیا ہوگا؟" میں نے کچھ سوچنے کی کوشش کی، لیکن پہلے ہی قدم پر ایسا دھکا لگا تھا کہ جی تلملا گیا۔ مجھ میں اتنی سمجھ ضرور تھی کہ ایک ایسا گوشہ تلاش کرکے بیٹھ جاؤں، جہاں سے لوگ جھانکیں بھی تو میں نظر نہ آسکوں۔ دیوار پر لٹکی ہوئی تصویروں کو دیکھنے کے بہانے میں نے منہ بھی دیوار کی طرف پھیر لیا۔ میں سوچ رہا تھا۔

"خدایا! کیا بھنگ کھائے ہوئے انسانوں کی دنیا میں تو نہیں آگیا۔ اتنے لوگوں میں سے ایک نے بھی مجھے نہ پہچانا۔ نہ شرفو نے نہ خادمہ نے۔ اور نہ تو اور اُس آفتِ جاں نے بھی نہ پہچانا۔ جو ابھی مجھے نیم بسمل چھوڑ کر گئی تھی ——— شاید پھر کبھی نہ نظر آنے کے لئے۔ کیا اس گم گشتہ میں اور مجھ میں واقعی اتنی مشابہت ہے؟" یہاں ایک نیا جذبہ میرے دل میں بیدار ہوا۔ اور شیکسپیئر کی کامیڈی "آف ارِرز" کا تماشہ میری نظروں کے سامنے پھرنے لگا۔ میں اپنے آپ کو بھولتا جا رہا تھا۔ کیا عجب ہے کہ میں 'میں' نہ رہا ہوں۔

ایک خندہ ریز صدا نے مرے خیالات کے سلسلے کو توڑ دیا۔ کتنی شیریں، کتنی دلکش صدا تھی۔ جی چاہتا تھا کہ یہی صدا عمر بھر سنتا رہوں۔ یہ نغمہ سرمدی نیچے سُروں میں شروع ہوا، اور رفتہ رفتہ دلکش بلندی تک پہنچ گیا۔ اس کے تحکمانہ لہجے سے پتہ چلتا تھا کہ یہی میری ——— نہیں 'میرے رہبر کی' "مالکنی" ہوگی ——" مالکنی! "مالکنی کے خیال سے دل بلیوں اچھلنے لگا۔ اگر وہ واقعی "مالکنی" ہو! . . . یا؟ . . . . مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ اُس کی آواز سے مسرّت ٹپک رہی ہے۔ ایک وقت بچوں کو گڑبڑ کرنے پر ڈانٹا گیا، دوسری دفعہ شرفو کو آفتابے میں گرم پانی لانے کی ہدایت کی گئی۔ رفتہ رفتہ یہ آواز قریب سنائی دینے لگی میرا دل دھڑکنے لگا۔ ماما کو فرش صاف کرنے کا حکم دیا گیا۔ تھوڑی دیر کیلئے وہ صدا دور سنائی دی، جیسے کوئل کی گونج کسی دامنِ صحرا میں —— پھر کچھ دیر خاموشی طاری رہی۔ اتنے میں دفعتاً وہ صدا عین دروازہ کے پاس تھی:

"گوری بیگم! ذرا اوپر سے میرا رومال تو اُٹھا لانا . . کہاں گئیں گوری بیگم، اچھا میری بی، تم ہی جاکر لاؤ۔"

میری روح کا تار تار اس آواز کے ضرب سے بج رہا تھا۔ اتنے میں ہوا کا ایک عطر بیز جھونکا آیا۔ میری زبان سے بے ساختہ نکلا ——— یا حافظ۔ یا اللہ۔ ساتھ ہی سیاہ ریشمی ساری کا کچھ حصہ نظر آیا جس پر بیل بوٹے آسمان کے تاروں کی طرح جگمگا رہے تھے۔ دل نے کہا ——— کوئی اندر آگیا! آنکھیں ملکر دیکھا تو کسی کی پیٹھ کا ایک حصہ دکھائی دیا۔ "دیدہ اختر" دالان کی طرف تھے۔ پیٹھ پر بال آدھے

چوٹی میں گوندھے ہوئے ہوئے تھے اور آدھے کھلے ہوا میں اڑ رہے تھے ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ رنجش کے بعد ایک دم سامنے آتے ہوئے حجاب ہو رہا ہے مجھ سے چارے کی کشمکش دیکھنے کے قابل تھی۔ سوچ رہا تھا کہ اب کیا کروں؟ اس فتنے کو جو نازل ہو رہا تھا، کس طرح برداشت کروں انجان بیٹھا رہوں یا کھڑے ہو کر استقبال کروں۔ کچھ کہوں یا خاموش رہوں۔ اتنے میں وہ بلّی اور پورا چاند میرے مقابل تھا۔ میں نہ بیٹھا رہا نہ اُٹھ سکا۔ یعنی کچھ اُٹھا کچھ بیٹھا۔ یکایک وہ لوٹ گئی۔ میرا دل دھک سے رہ گیا۔ وہ دروازے کے پاس گئی اور شرفو کو پکار کر بازار سے پان لانے کا حکم دیا گیا۔ اور کسی سے کچھ اور کہا گیا میں سن نہیں رہا تھا۔

میرے دل نے رقت سے دعا کی۔ "خدایا یہ کھیل یہ آنکھ مچولی۔ یہ تذبذب کہیں ختم ہو"۔ میری دعا قبول ہوئی، وہ خوبصورت سر پھر دروازے میں دکھائی دیا۔ اب کی دفعہ وہ سیدھی چلی آئی۔ بغیر رکے کمرے کے وسط تک میں دل کی ایک اضطراری حرکت کے باعث اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ میرا کھڑا ہونا تھا کہ وہ رُکی۔ میرے چہرے کو غور سے دیکھا اور ایک چیخ مار کر پلٹی اور ڈری ہوئی ہرنی کی طرح آن کی آن میں کمرے سے باہر ہو گئی۔

دالان میں تھوڑی دیر کے لئے ہلڑ مچ گیا۔ کوئی پوچھتا تھا۔ "کیوں بی کیا ہوا؟"—— کوئی کہتا تھا—— "رضیہ! آخر کچھ بولو تو۔ . . ." لیکن پھر جلد ہی ایک بڑی بوڑھی خاتون کی آواز نے اس گڑبڑ کو کانا پھوسی میں تبدیل کر دیا۔ ہر طرف دبی زبان کی گفتگو کی آوازیں آنے لگیں۔ غصّوں کا اظہار ہونے لگا۔

اِس ساری گڑبڑ کا کچھ مطلب تو میری سمجھ میں بھی آ گیا۔ لیکن مجھے فکر یہ تھی کہ آگے کیا ہو گا۔ ایک مجرم کی پوری سنسنی کیفیت مجھ پر طاری تھی۔ اور ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ اس مہم کے منتہا کی منزل گزر چکی۔ اب اس نشہ کا اتار ہے۔ دالان میں غالباً میرے "صیاد" کو بلا کر ڈانٹا جا رہا تھا شرفو پر دانت چبائے جا رہے تھے۔ کوئی اِدھر سے اُدھر اُدھر سے اِدھر آ رہا جا رہا تھا۔ ایسے میں مجھے محسوس ہوا کہ کوئی دروازے سے جھانک رہا ہے۔ پھر جو غور کیا تو معلوم ہوا کہ ایک نہیں کئی سر ایک دوسرے پر پیش قدمی کرنا چاہ رہے ہیں۔

دومنٹ کے بعد میرا "صیاد" مجرموں کی صورت بنائے کمرے میں داخل ہوا۔ میں ہر افتاد کے لئے تیار تھا۔ اور سوچ چکا تھا کہ اگر اب پسیجا تو خیر نہیں۔ اس شخص کی حالت نہایت قابل رحم تھی، مجھے اپنی پریشانی میں بھی اس پر ترس آ گیا۔ اس نے نظریں زمین پر گاڑھ کر کہا۔

"حضور!"

پھر اُس نے نظر اٹھائی اور کہا۔

"حضور!"

میں نے لہجہ سخت بنا کر کہا۔

"ہوں"

اُس نے ہاتھ جوڑ کر کہا

"خداوند . . ." وہ آگے کچھ نہ کہہ سکا۔ اور ایسی منت بھری نظروں مجھے دیکھنے لگا۔ معلوم ہوتا تھا کہ وہ سخت ذہنی کشمکش میں مبتلا ہے میں نے اسی سخت لہجے میں کہا۔

"چلیں . . . ؟"

اس پر اس نے ہاتھ جوڑ کر کہا۔

"حضور . . . بیگم صاحب . . ." وہ ایک حالت کرب میں دو قدم آگے بڑھا۔ پلٹ کر دروازے کی طرف دیکھا اور پھر باہر چلا گیا۔ غالباً وہ بیگم صاحب کو غلط فہمی میں مبتلا سمجھ رہا تھا لیکن انہیں یقین دلانا اسکے بس کی بات نہیں تھی تب وہ پھر کمرے میں واپس آیا تو میں نے دروازے کی طرف اشارا کیا۔

وہ دروازے کے پاس جا کر کھڑا ہو گیا۔ میرے پیروں میں خود بخود حرکت پیدا ہوئی۔ اور بغیر اس کے جواب کا انتظار کئے میں چلنے لگا۔ کمرے سے نکلا۔ دالان سے لوگ بھاگ بھاگ کر کمروں میں چھپ گئے۔ میں اس طرح جیسے کوئی طیش میں چلتا ہے، قدم زور زور سے پٹکتا ہوا، دالان، پیش دالان سے گذرا، زینے سے اترا، صحن کو عبور کر کے دروازے سے باہر نکلا۔ دروازے سے باہر قدم رکھنا تھا کہ میری رفتار میں تیزی پیدا ہو گئی۔ اور میں بغیر مڑے، بغیر توقف کئے اس ذرا سے نکل بھاگا۔ نہ معلوم میرے جانے کے بعد وہاں کیا ہوا ؟

سید محی الدین قادری زورؔ

شب برات

یہ ان موضوعوں میں سے ہے جن پر محمد قلی قطب شاہ نے دل کھول کر اپنی طبیعت کی جولانی دکھائی ہے۔ چنانچہ کلیات میں اس کے متعلق دس نہایت دلچسپ اور اہم نظمیں موجود ہیں۔ محمد قلی کو پانی اور سبزہ کی طرح روشنی سے بھی بڑی دلچسپی تھی۔ وہ ہر اس موقع سے فائدہ اُٹھانا چاہتا تھا جس میں اسے جشن چراغاں سے لطف اندوزی نصیب ہو سکتی تھی۔ اور شب برات میں تو جی کھول کر چراغوں۔ آتشبازیوں اور شاہانہ رنگ رلیوں میں منہمک ہو جاتا تھا۔ وہ کہتا ہے کہ:۔

"یہاں شب برات آئی کہ خوشی و خرمی کی روشنی تمام دنیا میں پھیل گئی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شب برات اپنے ساتھ خوشیوں اور عشرتوں کی ایسی براتیں لے کر آتی ہے کہ ان کی روشنی سے تمام عالم جگمگانے لگتا ہے۔ چونکہ محمد قلی پر ائمہ معصومین کی نظر عنایت ہے۔ اس لئے وہ نبیؐ اور علیؓ کے کرم کی وجہ سے پھلتا پھولتا رہتا ہے۔ اور خود عیش و عشرت اس کی بارگاہ میں خوشی کے مارے شادیانے بجانے لگتے ہیں۔ اسی وجہ سے خدا قطب شاہ کو شاہنشاہی کا رتبہ دیکر اس کی دہائی یا اس کی آقائی کا اعلان تمام کائنات میں پھراتا ہے۔ اور اس کے دشمنوں کو دنیا سے نیست و نابود کر کے مفقود کر دیتا ہے۔

دوسری نظم میں لکھتا ہے کہ:۔

"شب برات کی وجہ سے تمام راتوں کو شرف حاصل ہوا اور سب راتوں میں شب برات ہی کو شرف حاصل ہے کثرت چراغاں کی وجہ سے رات ایسی منور ہو گئی کہ معلوم ہوتا ہے بغیر سورج طلوع ہوئے دن نکل آیا ہے۔ زمین کے ان چراغوں کا عکس جب آسمان پر پڑا تو وہ بھی آئینہ کی طرح جھلکنے لگا۔ آتشبازی اور چراغوں کی وجہ سے دنیا ایسی روشن ہو جاتی ہے کہ اس اجالے کو دیکھ کر آفتاب شرما گیا اور اسی شرم کے مارے رات کو کبھی اپنا منہ نہیں دکھاتا۔"

"شب برات میں جو مہتاب چھوڑے جاتے ہیں تو ان کی تابانی ایسی معلوم ہوتی ہے جیسے ظلمات میں آبِ خضر۔ گلشن میں جب پھولبازیاں چھوڑی جاتی ہیں تو زمین پر سورج۔ چاند اور تارے اتر آتے ہیں۔ اور ان کی روشنی کی جھلک آسمان تک پہنچ جاتی ہے۔ خدائے تعالیٰ نے قطب شاہ کو ایسی تجلی بخشی کہ اس نے رات کو دن سے زیادہ روشن کر کے چمکا دیا۔"

تیسری نظم میں کہتا ہے کہ:۔

"شب برات کی مبارک رات اپنے ساتھ اپنے روزی خواروں یا ملازموں یعنی خوشی عیش مانند اور عشرت کو براتی بنا کر لے آتی ہے محمدؐ نے جنگ احد میں علیؓ کو ساتھ لیکر کامیابی حاصل کی۔ کیونکہ ان کی تلوار کے چمکنے سے تاریکی کی فوجیں بھاگ گئیں۔"

"اس رات میں معشوقوں کے دہن پستے۔ آنکھیں شکر کی طرح شیریں۔ اور ہونٹ گھڑوں کی مصری کی طرح نازک نظر آتے ہیں۔ اور ان کے چہرہ پر پسینہ کی بوندیں خشخش کی طرح باریک نظر آتی ہیں۔ سہیلیو سہیلیوں کی کاجل لگی ہوئی آنکھیں سیاہ باداموں کی طرح ٹھوڑی سیب کی طرح اور دانت چار دلیوں کی طرح نظر آتے ہیں۔"

اسی طرح پوری نظم میں سہیلیوں کے حسن اور لباس کی تعریف کی ہے۔ ان کا آتشبازی چھوڑنا اور اس کی جھلک سے ان کے جسم

پر زیوروں کا جگمگا اُٹھنا نہایت تفصیل سے بیان کیا ہے۔

چوتھی نظم کا تذکرہ بھاگ متی کے ذکر میں کیا جا چکا ہے۔ اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ شب برات کی تقریب میں دربار اور ڈیوڑھی کی خاص خاص طوائفیں بڑے اہتمام کے ساتھ سج دھج کر کے اور شاہی طمطراق کے ساتھ اپنے اپنے مکانوں سے آتی تھیں بھاگ متی کی نسبت تاریخوں میں لکھا ہے کہ جب وہ دربار کو آتی تو اس کے ایک ہزار سوار اس کی جلو میں رہتے۔ جب اس کی معمولی آمد اس شان سے ہوتی تھی تو شب برات کی تقریب میں وہ جو کچھ اہتمام کرتی کم تھا۔ اس لئے بادشاہ نے اس موضوع پر ایک خاص نظم لکھدی ہے جس میں اس امر پر زور دیا ہے کہ:۔

"وہ اپنے ساتھ آسمان کے مہر و ماہ سے زیادہ روشنی رکھنے والے لاکھوں چاند سورج اپنے ساتھ لاتی ہے۔ کیا تعجب کہ زمین آسمان پر لاف زنی کرنے لگے۔ کیونکہ وہ زمین کو صاف و شفاف آسمان کی طرح جھلکا دیتی ہے"

پانچویں نظم میں محمد قلی لکھتا ہے کہ:۔

"شب برات پھر سے مبارک سلامت کی خبر لیکر آئی ہے کیونکہ اس رات میرے بخت کا طالع سورج کی طرح جھلکنے لگتا ہے۔ میری سکھی کے چہرہ کی روشنی کے سامنے اس عید کا اجالا شرمانے لگتا ہے۔ اس عید میں سُکھ اور آنند کا نور از سر نو مجھ پر چنبر کی طرح چھا جاتا ہے۔ نیا دلہن بنکر آنند کرنے والی دوشیزاؤں کے ہاتھ سے مئے عشرت پیتا ہے اور زہرا الحان کے ساتھ بادشاہ کیلئے نغمہ گانے لگتی ہے"۔

"شب برات کے عیش کی آنند لے اپنے حسن کی ایسی جھلکاریں دکھائیں کہ دنیا کے دل میں پھر سے زندگی کا نور پیدا ہونے لگا تھا کی سب پیاریاں عید کا سنگار کرتی ہیں تاکہ بادشاہ کو ایک کا سنگار دوسرے سے زیادہ پسند آئے۔

آنند کے بھیدوں اور چاؤوں کی وجہ سے پیاری (ایک خاص سہیلی) پیکر دل میں کھیلنے لگتی ہے۔ کیونکہ وہ اپنے جوبن کے چمن میں خوشبو مہکا لیتی ہے۔

نبیؐ کے صدقے میں قطب شاہ کو ہمیشہ لاکھوں عیدیں بھی نصیب ہوں کیونکہ جینے کی دعا اس کیلئے کل مسرت کی خوشبو لے آتی ہے۔

چھٹی نظم میں بادشاہ نے اپنی سہیلی پیاری کے آتش بازی کھیلنے کا ذکر کیا ہے۔ اس سلسلہ میں شب برات کی آتش بازیوں کے بہت سے نام بھی ہمارے لئے محفوظ کر دیئے ہیں۔ کہتا ہے ــ

شب برات نے کوہ طور کے نور کو اب تمام عالم میں پھیلا دیا ہے اور خضر نے اپنے ہاتھ سے مجھ کو آب حیات پلا دیا!

"شب برات اپنے ساتھ خوشی کی براتیں لے آئی ہے اور قطب شاہ ان براتوں کو لیکر رات اور دن آنند کے ساتھ گذارتا ہے پیاری کا سرو قد ہوائی کی طرح (بلندی کی طرف مائل) اور اس کے ناک کی پھلڑی مہ بازی کی طرح ہے۔ پیشانی پر مہتاب کی طرح ٹیکہ لگاتی ہے۔ اور ہونٹوں پر سورج جیسی چمک دمک نظر آتی ہے۔ اس کے رات جیسے سیاہ بالوں میں کیوڑا بھنورے کی طرح نظر آتا ہے۔ تالوں اور پٹاخوں کی آوازوں سے آسمان کے اندر میں غل پڑتا ہے۔ اس کی چوٹی کا پھندنا طاؤس کی طرح ناچ رہا ہے۔ ہوائی کو اپنا حاجب بنا کر وہ اپنی دارائی کا اعلان کرتی ہے۔

اس کے بالوں کے جوڑے میں پھولوں کی جولڑیاں ہیں وہ زوکریوں کے جھیلے کی طرح ہیں۔

اے قطب شاہ تجھ کو نبی کے صدقے میں بڑی اچھی پیاری ملی ہے۔

ساتویں نظم کی ردیف ہی لفظ روشن ہے جس کی وجہ سے تمام نظم شب برات کی روشنی سے جگمگا رہی ہے۔ اور معلوم ہوتا ہے کہ اس عید سے قبل بادشاہ کو کسی جنگ میں کامیابی نصیب ہوئی تھی جس کی طرف مقطع میں اشارہ کرتا ہے۔

دشمنوں کے سینے پھاٹکوں کی طرح کیوں نہ پھوٹیں اور ترٹخیں جب کہ خدا نے قطب شاہ کو ایک روشن فتح اور کامرانی عطا کی ہے۔

آٹھویں نظم طویل ہے اور اس موضوع کی اچھی نظموں میں شمار ہوتی ہے۔ اس میں محمد قلی لکھتا ہے کہ:۔

شب برات نے آکر تمام عالم اس طرح روشن کر دیا ہے جس طرح نورِ موسوی کی وجہ سے وادیٔ ایمن روشن ہوگئی تھی۔
اپ رخسار کی جھلکیں دکھا کر عاشقوں کی آنکھوں کو ایک نور سے معمور گلشن بنا دیا ہے۔ چونکہ اس رات کو زلفِ خوباں کے ساتھ نسبت ہے اس لئے جس طرح معشوقوں کے جسم پر زیبائش و آرائش کی وجہ سے نور جھلکنے لگتا ہے۔ اسی طرح اس رات کو بھی نورانی لباس زیب دیتا ہے۔ اس عید کی لطف اندوزی کی ہوس کا دنیا کو خبط ہے کیونکہ اس میں محبت کی ہواؤں کے جھونکے تن اور من کو شگفتہ کر دیتے ہیں۔

نبیؐ کے صدقے میں اے قطب شاہ تو لاکھ سال خوش و خرم زندہ رہ۔ کیونکہ تیری ہی وجہ سے اس عید میں شمع عیش روشن رہتی ہے۔

محمد قلی کی شراب سے متعلق نویں نظم شاعرانہ کمال کا بہترین نمونہ ہے۔ یہ نظم نہایت مرصع ہے اور اس میں ایسی اعلیٰ پائے کی تشبیہیں استعمال کی گئی ہیں کہ اس کو اردو شاعری کے شہ پاروں میں شمار کیا جا سکتا ہے۔ اگرچہ نثر میں اس کی تمام خوبیوں کا اندازہ نہیں ہو سکتا تاہم قوتِ تخیل کا کچھ نہ کچھ پتہ چل سکتا ہے۔ وہ کہتا ہے۔

میری ماہ رویوں نے اپنے چہروں کی روشنی سے شب برات کو روشن کر دیا ہے۔ اس میں سے کوئی سورج نظر آتی ہے کوئی چاند اور کوئی تارہ ہر طرف سے ایک نازنین زرین کا لباس پہن کر آئی ہے۔ تاکہ بادشاہ کے ساتھ چمن میں نکلے۔ شرابِ عشق پینے سے ان کے جسم جھلکنے لگے ہیں۔ وہ اپنے نوجوان چہروں کے آب و رنگ، اور آفتاب جیسی جھلک سے مہتاب کو بیتاب بنا کر پگلا رہی ہیں۔
نازنین اس انداز سے محوِ خرام ہے کہ زلفوں کے لہرانے کی وجہ سے خوشبو آسمان تک پہنچی ہے اور آسمان مہک گیا ہے جس کی وجہ سے فرشتے فریفتہ ہو کر لاکھوں کی تعداد میں اتر آئے ہیں۔
ایک سے ایک کے پستان نیا ہو خوبصورت ہیں جن پر سیاہ بالوں کی لٹیں ایسی نظر آتی ہیں جیسے پہاڑوں پر کالے کالے بادل چڑھائی کرنے آئے ہیں
نازنین کے رخسار مہتاب اور پھولوں کے ہار۔ پھول جھڑیاں نظر آتے ہیں۔ اس کے دونوں بھو حاجیوں کی طرح ایک دوسرے پر حملہ کر رہے ہیں۔
علی جیو کے یہاں سے یہ حکم لے لئے ہیں کہ یہ جہاں امن و امان کے ساتھ ہمیشہ قطب زماں کے حکم کے تلے رہے۔

شب برات کی نظموں کے سلسلے میں آخری نظم آتش بازی کی بہت سی اصطلاحوں کی آئینہ دار ہے اور عجیب بات ہے کہ ان میں سے اکثر اصطلاحیں اب بھی رائج ہیں۔ اس نظم کے چند شعر ذیل میں درج ہیں۔ جن میں اصطلاحوں کے نیچے خط کھینچا گیا ہے۔

ہوایاں سو کے بنگڑیاں چکراں جو	گھنڑیاں بازیاں سو اپ جوبن کری رے
نین مستی کے گلریزاں سو بھر کر	نل طاؤس چک چومن کری رے
پہلی ناسک جھمکنے تھے ہے شب برات	دھرت کون اج نس جوں گہن کری رے
لڑیاں موتیاں کیاں نچ ہننے کیاں جھیلان	تو جھیلاں نتھے جگت درپن کری رے

خدا گواہ کہ دونوں ہیں دشمنِ پرواز ۔ غمِ قفس ہو کہ راحت ہو آشیانے کی

(گوپال متل)

ڈاکٹر تاثیر ایم۔ اے پی ایچ، ڈی

غزل

محبت ناصبوری بے قراری　　محبت قہقہے، فریاد زاری

نہ ہونا ہو تو ترکش بے جراحت　　جو ہونا ہو تو پہلا وار کاری

خرد نے ہاتھ پر تلوار رکھ دی　　جنوں نے گھونپ دی دل میں کٹاری

نگاہوں سے نگاہیں لڑ رہی ہیں　　ابھی آئی نہیں ہے دل کی باری

کبھی نور یقیں آنکھوں میں روشن

جھلکتی ہے کبھی بے اعتباری

حکیم احمد شجاع

موت کی پیدائش

یہ اُس زمانے کا قصہ ہے جب اس عالمِ ایجاد کی بنیاد رکھی گئی تھی۔ یہ دنیا اس وقت وہ دنیا نہ تھی۔ جو آج نظر آتی ہے۔ جنت کا نام سنتے ہی جس دنیا کا نقشہ ہماری آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے۔ اس وقت یہ دنیا وہی جنت تھی۔ ہر طرف لہلہاتے ہوئے کھیت۔ پھولوں اور پھلوں سے لدے ہوئے باغ۔ جن میں ہمیشہ بہنے والی ندیاں اور نہریں بہتی تھیں۔ شاداب درخت جن کی شاخوں پر پرندے چہچہاتے تھے۔ سرسبز وادیاں جن میں جانور چرتے چگتے تھے۔ ان جانوروں میں اس وقت کوئی درندہ نہ تھا۔ ان پرندوں میں اس وقت کوئی ایک دوسرے کی جان کا دشمن نہ تھا۔ خدا کی بے شمار نعمتوں سے بھرپور یہ دنیا اس وقت ایک ایسی دنیا تھی۔ جس پر دن رات آسمان سے رحمت برستی تھی۔ جس کی وسیع فضا امن اور راحت کی مسرتوں سے سرشار تھی۔ دکھ ابھی پیدا نہ ہوا تھا۔ موت ابھی کتمِ عدم میں سو رہی تھی۔ زندگی کا جام غم کی تلخی سے ناآشنا تھا۔ حیات، ممات کے اندیشے سے بے نیاز تھی۔

مگر اس دنیا کا ہر دن اس سے پہلے گزرے ہوئے کسی دن کی ایک نقل ہوتا تھا۔ اس دنیا کی ہر رات اس سے پہلے گذری ہوئی کسی رات کی ایک تصویر ہوتی تھی۔ یہ دنیا ہر تغیر سے ناآشنا ہر انقلاب سے بیگانہ تھی۔ ایک ہی خوشگوار موسم جس میں اس دنیا کے رہنے والے اپنے شب و روز ہنستے کھیلتے گزار دیتے۔ حادثوں اور ناگہانی آفتوں سے بے خطر ایک زمانہ جو کسی تبدیلی، کسی تغیر کے بغیر بسر ہوتا چلا جاتا۔ رات کو آسمان پر تارے چمکتے ــــــــ اور دن کو آسمان سورج کی روشنی سے منور رہتا۔ رات کو اس دنیا پر نیند کی خاموشی مسلط ہو جاتی اور دن کو نقل و حرکت کی بیداری اس دنیا کے رہنے والوں کو نیند سے بیدار کر دیتی۔ فرشتے دن رات آسمانوں اور زمینوں میں خدا کی حمد و ثنا کی تسبیح پڑھتے رہتے۔ خدا اپنے فرشتوں کی عبادت اور اپنی مخلوق کی آسائش سے خوش اور مطمئن تھا۔

مگر یہ خوشی اور اطمینان صرف مخلوق کی خوشی اور اس کے اطمینان کا عکس تھا۔ خالق کی خلاقیت نہ اس خوشی سے خوش تھی نہ اس اطمینان سے مطمئن۔ خالق اپنی مخلوق میں کسی اور چیز کو دیکھنے کا آرزومند تھا۔ ایک ایسی چیز کو جس میں خالق کا عکس ہو۔ خلاقیت کی شان ہو۔ وہ اب ایک ایسی مخلوق کو پیدا کرنے کا متمنی تھا۔ جو اس دنیا کو تغیر اور انقلاب سے بیدار کر دے۔ جو اس دنیا کے شب و روز کو ان کی بے کیف مسرتوں سے تھکا دے۔ جو زمان و مکان کی غیر محدود وسعتوں کو ایک نئی حرارت، ایک نئی زندگی سے مشتعل کر دے۔ یکایک مشیتِ ایزدی میں حرکت پیدا ہوئی۔ کائنات کی فضاؤں میں "کن" کی آواز گونج گئی۔ اور پھر آن کی آن میں وہ سب کچھ ہو گیا۔ جو خالق کی مشیت چاہتی تھی کہ ہو۔ اس دنیا میں ہر طرف ایک نئی مخلوق نظر آنے لگی۔ وہ مخلوق جس سے اب خدا چاہتا تھا کہ اس کی دنیا آباد ہو۔ اس نئی مخلوق کے پیدا ہوتے ہی اس کائنات میں ایک تزلزل برپا ہو گیا۔ آسمانوں کی بلندیوں اور زمینوں کی گہرائیوں سے چیخوں کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ بہتے ہوئے دریا رک گئے۔ جمی ہوئی یخ پگھلنے لگی۔ پہاڑ اپنی جگہ سے اکھڑنے لگے۔ ستارے ٹوٹ ٹوٹ کر آسمان سے گرنے لگے۔ زمانہ سہم سہم کر تھرانے لگا۔ مکان تعینات کی حدود سے آزاد ہو گیا۔ پتھر کی بے جان رگوں میں زندگی کا لہو دوڑنے لگا۔ مٹی

جذبات کی گرمی سے تمتما اٹھی - پانی میں احساسات کی آگ بھڑک اٹھی - بجلی نے کوندنا اور رعد نے کڑکنا شروع کیا - طوفان اُٹھنے لگے - سیلاب اُبلنے لگے -

خدا کی اس نئی مخلوق نے یہ سب کچھ دیکھا - سب کچھ سنا - اور پھر وہ سب کچھ محسوس کیا - جو احساس اور جذبات کے اس نئے پیکر کی فطرت کا تقاضا تھا - وہ طوفان جو اُٹھے تھے - اس نئی مخلوق کی رگ رگ میں سما گئے - وہ سیلاب جو اُبلے تھے اس کے رونگٹے رونگٹے میں جذب ہو گئے - وہ بجلیاں جو کوندی تھیں اس کی آنکھوں میں چمکنے لگیں - وہ کڑک جس نے اس کائنات کا دل ہلا دیا تھا - اس کی آواز بن گئی - اور پھر وہ سب کچھ ہونے لگا جو اس دنیا میں اس سے پہلے نہ ہوا تھا - فتنہ و فساد کی ایک آگ تھی کہ بھڑک اٹھی - قتل و غارت کا ایک بازار تھا کہ گرم ہو گیا - کائنات کا ساز جو اب تک خوشی اور مسرت کے نغموں کے سوا کسی اور آہنگ سے آشنا نہ تھا - دکھ اور درد کی لَے سے تھرتھرانے لگا - دنیا کا سکون جو ہر اضطراب ہر اضطرار سے بیگانہ تھا - ایک نامعلوم کرب سے بیقرار ہو کر تڑپنے لگا - پھول جو اب تک صرف کھلنا ہی جانتے تھے مرجھانے لگے - کونپلیں جو اب تک صرف پھوٹنا اور پھیلنا ہی جانتی تھیں کملانے لگیں - آغاز انجام سے - کمال زوال سے مُبدّل ہو گیا -

فرشتوں نے یہ سب کچھ دیکھا - پھر وہ حیران ہو کر ایک دوسرے سے پوچھنے لگے - خدا کی اس نئی مخلوق کا کیا نام ہے فضائے عالم میں ایک گونج پیدا ہوئی "انسان" فرشتوں کے دل کی گہرائیوں سے ایک سہمی ہوئی آواز نکلی -

" انسان یا موت "

راز یزدانی

راز و نیاز

کہیں ایسا نہ ہو منہ پھیر کے جانے والے / کہ تغافل سے کھٹک جائیں زمانے والے
وہ دوبارہ نہیں چلمن کو اٹھانے والے / کتنے بے ہوش تھے سب ہوش میں آنے والے
وجہِ وحشت بھی تو سوچیں گے زمانے والے / احتیاط اے مجھے دیوانہ بنانے والے
دامنِ صبر بھی ہاتھوں سے اگر چھوٹ گیا / اور میرے ہاتھ سے دامن کو چھڑانے والے
میں تیری زحمتِ بیداد کے لائق تو نہ تھا / تیرے قربان، مرے دل کے جلانے والے
ہاں ابھی یاد ہے احسانِ تجلّی مجھ کو / ہاں میں اب ہوش میں ہوں ہوش اڑانے والے
لطف تو جب ہے کہ خاکستر دل بھی نہ رہے / بجلیاں اپنے تبسم سے گرانے والے
اب اسے کفر سمجھ لو - کہ محبت کہہ دو / دل میں بس جاتے ہیں آنکھوں میں سمانے والے
لب پہ اک نام نہ لانے کا اگر ہوش رہے / تو کسے عذر - ہے دیوانہ بنانے والے
اعتراف اور محبت کا کسے کہتے ہیں / اور فقط مجھ سے نگاہوں کو بچانے والے

دل کی ہستی ہے محبت میں عجب راز اے رازؔ
جس کو سمجھے ہیں نہ سمجھیں گے زمانے والے

محمد دین فوق

غلام قادر روہیلہ

غلام قادر روہیلہ کو سب جانتے ہیں۔ کہ اس نے اکبر اور شاہ جہان کے جانشین شاہ عالم ثانی کو اندھا کر کے کیا کچھ اذیتیں پہنچائی تھیں۔ ان تاریخوں میں جو عام طور پر مل سکتی ہیں۔ ان مظالم کی تشریح نہیں ہے۔ جو اس بے رحم جلاد نے بادشاہ اور شاہی خاندان کے دوسرے افراد شاہزادوں اور بیگمات پر توڑے۔

دورانِ قیام بھوپال میں تاریخِ مالوہ میری نظر سے گذری جس میں غلام قادر کے جور و جبر۔ بادشاہ کی مظلومی۔ اور شاہزادوں کی بے کسی و ذلت کا جو تذکرہ مل سکا۔ اسے ارباب بصیرت کے لئے پیش کرتا ہوں۔

عالمگیر کے بعد خاندانِ مغلیہ کی خانہ جنگیاں جو اس خاندان کے ورثہ میں مسلسل چلی آئی تھیں۔ برابر جاری تھیں۔ مگر اس پر ستم یہ ہوا کہ امرائے دربار کی سازشیں اور نااتفاقیاں خانہ جنگیوں سے بھی زیادہ نقصان رساں نکلیں۔ یہ سلسلہ ابوظفر بہادر شاہ تک جو صرف دہلی کا بادشاہ تھا۔ برابر جاری رہا۔ شاہ عالم ثانی جو عالمگیر ثانی کے بعد تخت پر بیٹھا۔ انہی سازشوں اور خانہ جنگیوں کا شکار ہو کر روز بروز کمزور ہو رہا تھا۔ اس کے عہد میں دو امیر تھے۔ جن کے مقابلہ میں کسی اور امیر و وزیر حتےٰ کہ بادشاہ کو بھی سر اٹھانے کی طاقت نہ تھی۔

ایک امیر کا نام غلام قادر روہیلہ تھا۔ جو ضابطہ خان بن نجیب الدولہ کا بیٹا تھا۔ دوسرا مرزا اسمٰعیل بیگ تھا۔ دونوں کی سرکار الگ الگ تھیں۔ دیوان الگ تھے۔ اور وہ تیس تیس۔ تیس تیس ہزار فوج رکھتے تھے۔ جو لوٹ مار کے طمع اور لالچ میں ہر وقت مرنے مارنے کو تیار رہتی تھی۔

شاہ عالم انکے پنجہ سے نکلنا چاہتا تھا۔ اور اسی لئے وہ مہاجی سندھیا (گوالیار) اور مرہٹوں کو خوش رکھتا تھا۔ لیکن روہیلہ اور اس کا ساتھی یہ چاہتے تھے۔ کہ بادشاہ کو بالکل اپنے قابو میں کر کے جو چاہیں۔ اس سے لکھوا لیا کریں۔ جب انہوں نے دیکھا۔ کہ بادشاہ ان کے قبضۂ اختیار سے باہر نکلنے کے لئے ہاتھ پاؤں مار رہا ہے۔ تو وہ اسپر مرہٹہ پرستی۔ ہندو نوازی اور بداطواری و نالائقی کے الزام لگا کر اسے معزول کرنے۔ اور کسی دوسرے شہزادے کو جو ان کے ہاتھ میں کٹھ پتلی بنکر رہ سکے۔ بادشاہ بنانے کے منصوبے سوچنے لگے۔

بادشاہ کو خبر ہوئی۔ مرزا کو بلوایا۔ اور منت و زاری کے ساتھ اس کو اس ارادے سے منع کیا۔ مرزا کو بادشاہ کی بے کسی پر رحم آگیا اس نے غلام قادر کو بھی کہہ سُن کر راضی کر لیا۔ آخر عہد و پیمان ہوئے کلام اللہ درمیان میں رکھا گیا۔ اور یہ فیصلہ ہوا کہ سیندھیا کی طاقت چونکہ بڑھ رہی ہے۔ اور سلطنت کو اس سے خطرہ ہے۔ اس لئے سب سے پہلے اس کا استیصال کیا جائے۔

اس تجویز سے غلام قادر کا اصل مقصد یہ تھا۔ کہ بادشاہ کو سندھیا اور سندھیا کو بادشاہ کی دوستی و مروت کا جو خیال ہے وہ بالکل زائل ہو جائے۔ اور جب مہاجی نابود ہو جائے گا۔ تو پھر بادشاہ ہمارے پنجے سے کبھی نکلنے کی کوشش نہیں کریگا۔ بادشاہ نے روہیلہ کے خوف سے سندھیا پر فوج کشی کرنے کا حکم تو دے دیا۔ مگر اسے روہیلہ کے قول و قرار پر یقین نہ آیا۔ غلام قادر نے سندھیا کو یہ جتانے کے لئے۔ کہ جس بادشاہ پر تم کو اس قدر ناز ہے۔ وہ تمہارا کس قدر دشمن ہے۔ یہ چال چلی۔ کہ بادشاہ کے بیٹے شکوہ کو بھی اس کی مرضی اور بادشاہ کی اجازت کے بغیر زبردستی اپنے ہمراہ لے لیا۔

بادشاہ نے مہاجی سندھیا کے نام ایک خفیہ رقعہ لکھا۔ جس میں اپنی مجبوریوں کا ذکر اس طرح کیا۔ کہ ان نمک حراموں نے

ہمیں قید کر رکھا ہے۔ ہم ان کی مرضی کے بغیر کوئی کام اور حرکت نہیں کر سکتے۔ ان کے دباؤ اور خوف سے ہم آپ کے مقابلہ میں اپنا فرزند بھیج رہے ہیں۔ ان نمک حراموں کا علاج کراؤ۔ اور ہمیں ان کی قیدِ بے زنجیر سے نجات دلاؤ۔"

بادشاہ کا بخت برگشتہ تھا۔ اس لئے قاصد راستے ہی میں پکڑا گیا۔ غلام قادر اور مرزا اسمٰعیل کو خبر ہوئی۔ دونوں نے وہ رقعہ بادشاہ کو دکھایا۔ اور بہت تندی و تیزی سے اس کے ساتھ گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ ہم مریں یا جئیں۔ اس کی ہمیں پروا نہیں، لیکن تمہیں اب زندہ نہیں چھوڑ سکتے۔ مرزا تو پھر بھی کسی وقت نرم ہو جاتا تھا۔ لیکن روہیلہ گستاخی پہ اترا ہوا تھا۔

دوسرے دن روہیلے نے مرزا کی فوج کے ہمراہ قلعہ کے اندر ڈیرے ڈالے۔ بادشاہ کے تمام آدمی قلعہ سے باہر نکال دئے گئے۔ چوکی پہرہ انہوں نے اپنا مقرر کیا۔ بادشاہ کو دائیں بائیں، آگے پیچھے سب بیگانے اور جان لیوا ہی نظر آتے تھے۔ قلعہ میں اب روہیلوں کی حکومت تھی جب روہیلہ کا اطمینان ہو گیا۔ تو اس نے بادشاہ کو تخت سے اتارا۔ اسکے بیٹوں۔ ان کی بیگمات اور شہزادوں کو حبس میں رکھا۔ مرزا بیدار بخت کو جو محمد شاہ بادشاہ کا نبیرہ تھا۔ برائے نام تخت پہ بٹھایا اور اسکے نام کا سکہ جاری کرایا۔ جس پر یہ شعر کندہ تھا۔ ؎

بزر سکہ زد وارثِ تاج و تخت
محمدؐ جہاں شاہ بیدار بخت

مرزا اور روہیلہ چونکہ آپس میں بھی بدگمان تھے۔ اس لئے باہم یہ عہد ہوئے۔ کہ جس قدر مال و اسباب قلعہ کی لوٹ سے ملے۔ وہ برابر برابر تقسیم ہو۔ مرزا نے یہ عہد بھی کیا۔ کہ بادشاہ اور اسکے خاندان اور بیگمات کے ساتھ کوئی سختی نہ ہو۔ اسلئے کہ جب اسکو تخت سے اتار کر قید کر لیا ہے۔ اور اس کا تمام مال و اسباب ہم اپنے قبضے میں کر ہی لیں گے۔ اور اس سے زیادہ تکلیف دینے یا بیگمات کو اور زیادہ رنج پہنچانے کی کیا ضرورت ہے۔

دوسرے دن روہیلے نے بادشاہ کو مال و خزانہ کی دریافت کے سلسلے میں تنگ کرنا شروع کیا۔ بادشاہ نے بے عزتی کے خوف سے تمام کنجیاں اسکے سامنے رکھ دیں۔ جب تمام خزانہ روہیلہ نے لے لیا تو کہا۔ تمہارا ذاتی مال و اسباب کہاں ہے۔ اس کا پتہ بتاؤ۔ جواہرات وغیرہ جو کچھ بادشاہ کے پاس تھے۔ سب روہیلہ کو دئے گئے۔ لیکن اس ظالم کو پھر بھی صبر نہ آیا۔ اس نے اور روپیہ طلب کیا۔ بادشاہ نے کہا۔ اب تو صرف تن کے کپڑے باقی ہیں۔ اگر اور کچھ میرے پاس ہوتا۔ تو اتنی بے عزتی کیوں کراتا۔

روہیلہ یہاں سے فارغ ہو کر بیگمات اور شہزادیوں کے پاس پہنچا۔ اس وحشی کے وہاں آنے سے ایک کہرام مچ گیا۔ اس نے سب کو مجبور کیا۔ کہ جس کو اپنی آبرو اور جان کا خوف ہو۔ وہ جو کچھ زیور جواہرات روپیہ پاس رکھتی ہے۔ ہمارے سامنے لا کے رکھ دے ورنہ ہم سختی سے پیش آئینگے۔ اور بے عزتی کرینگے۔ بیگمات نے اس ظالم کے خوف سے کانوں کی بالیاں اور ہاتھوں کے چھلے تک اتار دئے۔ پھر وہ شاہزادوں کے پاس گیا۔ وہ بے چارے بے بس اسکے آگے کیا حقیقت رکھتے تھے۔ جو کچھ ان کے پاس تھا۔ انہوں نے بلا حیل و حجت اسے دیدیا۔

اسکے بعد اس نے دیوان عام۔ اور دیوان خاص کی چھتوں پہ نظر ڈالی۔ اور ان پر ہاتھ صاف کیا۔ یہاں تک کہ طلائی برتن۔ طلائی چھت اور طلائی کلس بھی اس کی زد سے نہ بچ سکے۔

اتنی لوٹ کھسوٹ کے بعد جس کا اندازہ کئی لاکھ تک کیا جاتا ہے۔ اس نے مرزا کو دو لاکھ روپیہ دیا۔ اور بارہ توپیں بھی قلعہ کی لوٹ سے عنایت کیں۔ مرزا پورا حصہ نہ ملنے کی وجہ سے کشیدہ خاطر ہوا، اور جب اس نے یہ سُنا۔ کہ روہیلہ بادشاہ پر زیادتی کرتا ہے۔ اور شہزادوں اور بیگموں کو ایذائیں دیتا ہے۔ تو ان لغو حرکتوں سے اسکو منع کیا، اور کہا۔ کہ رعایا میں جب یہ خبریں پھیلیں گی۔ تو بہت سے لوگوں کے دلوں میں تمہاری طرف سے نفرت پیدا ہو جانے کی وہ جوش میں آ جائینگے، اور پھر فوجوں کا یہ اجتماع بھی کسی کام نہ آ سکے گا۔ روہیلہ خود غرضی میں مبتلا تھا، انتقامی جذبات میں بھرا ہوا تھا۔ اور لوٹ کھسوٹ کے لالچ میں اندھا ہو رہا تھا، اس پہ مرزا کی نصیحت کا کچھ اثر نہ ہوا۔ آخر اور لوگوں کے طعن و تشنیع سے

بچنے کے لئے مرزا اپنی فوج قلعہ سے باہر لے گیا۔ مورخوں کا بیان ہے کہ مرزا نے اپنی فوج قلعہ سے باہر نکال کر بڑی سیاسی غلطی کی۔ اگر اس کی سپاہ قلعہ میں رہتی۔ اور اپنی سیاست قائم رکھتی۔ تو روہیلے خاندانِ تیموریہ پر اس قدر ظلم نہ کر سکتے

اب روہیلہ بالکل آزاد تھا۔ اس کا حکم تھا کہ شہزادیاں بالکل بے پردہ رہیں۔ اور بغیر کسی چادر اوڑھنے کے باہر آئیں۔ اور دیوانِ عام میں وہ ننگے سر اور ننگے پاؤں آئیں۔ اونے اونے روہیلے غیرت و حمیت کو بالائے طاق رکھ کر ان کو ٹھوکریں مارتے۔ چھیڑ خانی کرتے۔ اور ایسی ایسی ناگفتہ باتیں کہتے جن سے ان کا کلیجہ چھلنی ہو جاتا۔ زمین سخت تھی۔ ورنہ وہ غیرت کی ماری نازوں پلی اس میں سما جاتیں۔ آسمان دور تھا۔ اور ان کی کوتاہی قسمت ان کی فریاد و فغاں کو وہاں پہنچنے نہیں دیتی تھی۔ اس بہائم صفت روہیلہ اور اسکے وحشی ہمراہیوں نے ایک قدم اور آگے بڑھایا۔ دف نواز بلوائے۔ وہ دف بجاتے تختِ زریں پر بیٹھنے والی نازپروردہ شاہزادیوں کے پاؤں میں گھنگرو بندھوا کر ان کو دف کی ضرب کے ساتھ ناچنے اور قدم اٹھانے کا حکم دیا جاتا۔ جب سرِ عام یہ عبرت انگیز اور اشک خون رلانے والا تماشہ ہو چکتا۔ تو شہزادیوں کے نام یہ حکم صادر کیا جاتا۔ کہ وہ ہر روہیلہ سردار کے ڈیرے پر جائیں اور مجرا بجا لائیں

شاہزادوں کی حالت بھی قابلِ رحم تھی، انہیں اس قدر پیٹا جاتا کہ ان کے شور و فغاں کی صدائیں آسمان سے ٹکرا کر ناکام لوٹ آتی تھیں۔ وحشی روہیلوں نے شہزادوں کے پاؤں میں بھی گھونگرو بندھوائے اور انہیں ناچنے اور گانے کا حکم دیا۔ بے چارے خوف کے مارے ناچتے اور گاتے تھے۔ زمین و آسمان اس ظلم پر کانپ رہے تھے۔ اور روہیلہ فرطِ وحشت سے اچھل اچھل پڑتا ہے۔

جب مغل خاندان کی ان رسوائیوں پر بھی اس وحشی کا کلیجہ ٹھنڈا نہ ہوا۔ تو بادشاہ کو بلوایا۔ کہ آپ کے دربار تو بہت ہو چکے آج ہمارا دربار بھی دیکھئے اور ملاحظہ فرمائیے۔ کہ آپ کی تفریحِ طبع کے لئے کس قسم کے ساز و سامان مہیا کئے ہیں۔ اسکے بعد بدتمیز تخت پر بیٹھا۔ بادشاہ کو ایک طرف کھڑا کیا۔ اور حکم دیا کہ گانے والوں کو بلاؤ۔ شہزادے اور شاہزادیاں گھونگرو باندھے حاضرِ دربار ہوئے۔ اور اس بدتمیز کے حکم سے جب تک وہ کہتا رہا۔ ناچتے اور گاتے رہے۔ بادشاہ ایک طرف دم بخود کھڑا اپنی قسمت کو رو رہا تھا اور دم نہ مار سکتا تھا۔

جب یہ شقی القلب اس سے بھی سیر نہ ہوا۔ تو اس نے بادشاہ کو کوڑوں سے مارنا شروع کیا۔ اور ایسی بے دردی سے پیٹا۔ کہ بادشاہ اس کی تاب نہ لا کر زمین پر گر پڑا، وہ تڑپتا اور لوٹتا تھا۔ اور رحم کی التجائیں کرتا تھا۔ مگر وہ کچھ نہ سنتا تھا۔ پھر وہ بادشاہ کی چھاتی پر چڑھ بیٹھا۔ اور خنجر سے اس کی آنکھیں نکالنے لگا۔ بادشاہ نے آہ سرد بھری اور کہا:-

"یہ آنکھیں ساٹھ برس تک کلام اللہ شریف پڑھتی رہی ہیں۔ ظالم ان پر رحم کر اور انہیں بے نور نہ کر۔"

اسکے جواب میں اس بے رحم نے بوڑھے بادشاہ کے بیٹوں اور پوتوں کو جو اسکے سامنے ہی کھڑے تھے۔ بے تحاشا مارنا شروع کیا۔ بادشاہ کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ اس نے کہا:-

"ان آنکھوں کو یہ عذاب اور مصیبت نہ دکھا۔ بہتر ہے۔ کہ نکال لے۔"

چنانچہ اس بے رحم سفاک نے خنجر سے بادشاہ کی آنکھیں نکال لیں۔ یہ واقعہ ۱۰ اگست ۱۷۸۸ء کا ہے۔

اسکے بعد اس نے بادشاہ کو قید خانے میں بھیج دیا۔ اور بارہ پہر تک اس مظلوم کو بے آب و دانہ رکھا۔ بادشاہ نے اسی حالتِ اضطراب میں ایک درد انگیز نظم لکھی۔ جسکے چند شعر ذیل میں درج کئے جاتے ہیں ؎

آفتابِ فلکِ رفعتِ شاہی بودم — برد در شامِ زوال آہ سیاہ کاریِ ما
چشمِ ما کندہ شد از جورِ فلک بہتر شد — تا نہ بینم کہ کند غیر جہانداریِ ما
داد و فغاں بچۂ شوکتِ شاہی برباد — کیست جز ذاتِ خدا آنکہ کند یاریِ ما
کردہ بودیم گناہے کہ سزایش دیدم — ہست امید کہ بخشد گنہ گاریِ ما
شیر دادیم بہ افعی بچہ پروردیم — عاقبت گشتہ بہ جور ہے پئے خونخواریِ ما
آں گدا زادۂ سہداں کہ بہ دوزخ بردو — باعثِ جور و ستم شد بدل افگاریِ ما
شاہ تیمور کہ دارد سرِ نسبت با من — زود باشد کہ بیاید بہ مددگاریِ ما

ماد ہو جی سندھیا فرزند جگر بند منست ۔۔۔ ہست مصروف تلافی ستمگاریٔ ما
بود جانگاہ زر و مالِ جہاں ہمچو مرض ۔۔۔ دفع از فضل الٰہی شدہ بیماریٔ ما
راجہ و ماڈونہ بیدار رواہیر وچہ فقیر ۔۔۔ حیف باشد کہ نساز ندبہ غمخواریٔ ما
آصف الدولہ و انگریز کہ دل سوز منند ۔۔۔ چہ عجب گر بنمائید مددگاریٔ ما

گرچہ ما ز فلک امروز حوادث دیدیم
باز فردا دہد ایزد سر سرداریٔ ما

جو کچھ قلعہ کے اندر ہو رہا تھا، شہر والے اس سے مطلق بے خبر تھے۔ وہ صرف اتنا جانتے تھے کہ بادشاہ نظر بند ہے، اور بیدار بخت ایک کمزور دماغ شہزادہ ہے۔ جو برائے نام بادشاہ بنا دیا گیا ہے۔ آخر قلعہ کی خبریں شہر تک آئیں۔ مہاجی سندھیا کو بھی خبر ہوئی۔ اس نے بادشاہ کی حمایت کے لئے دہلی میں فوجیں بھیجیں۔ غلام قادر دہلی سے بھاگ کر میرٹھ آ چھپا۔ مگر وہاں پکڑا گیا۔ اور پابجولاں دہلی پہنچایا گیا۔ مہاجی سندھیا نے جب روہیلہ کی گرفتاری کا حال سُنا۔ تو اسے سزا دینے کے لئے خود دہلی آیا۔

غلام قادر کو ننگے بدن اونٹ پر بٹھایا گیا۔ اور سارے شہر میں اس کی تشہیر کی گئی۔ کاسۂ گدائی اسکے ہاتھ میں دیکر دہلی کے ہر کوچہ اور ہر گھر میں پا پیادہ اس سے بھیک منگوائی گئی۔ اور فقیرانہ صدائیں اس سے بہ جبر بلند کرائی گئیں۔ جواب میں ہر طرف سے جوتی پیزار کی بارش ہوتی تھی۔ غرض اس طرح شہر کے تمام لوگوں سے اُسے جوتیاں پڑائی گئیں۔ اسکے بعد ہر روز اسکے بدن کا ایک عضو کاٹا جاتا اور اس پر نمک چھڑکا جاتا۔ اول تو اسے کھانے پینے کو کچھ دیا جاتا تو کھانے اور پانی میں حد سے زیادہ نمک ملا دیا جاتا۔ آخر اسکے کان اور ناک بھی کاٹے گئے۔ اور ران پر بھی نمک افشانی کی گئی۔ اس کا ہر عضو کاٹکر اندھے بادشاہ کے پاس بھیجا جاتا۔ یہاں تک کہ جس طرح اس نے بادشاہ کی آنکھیں نکالی تھیں۔ اسی طرح اس کی آنکھیں بھی خنجر سے نکالی گئیں۔ مگر روہیلہ نہایت سخت جان تھا۔ باوجود ان اذیتوں کے جب تک اس ظالم کا سر نہ کاٹا گیا۔ اس وقت تک اس کی جان نہ نکلی۔

مہاداجی سندھیا

مہاداجی سندھیا مرہٹہ تاریخ کی ایک نمایاں ہستی ہے۔ اس کا باپ پیشوا کا ایک ادنیٰ ملازم تھا۔ لیکن آہستہ آہستہ گوالیار میں سندھیا خاندان کی حکومت قائم کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ مہاداجی سندھیا ۱۷۶۱ء میں پانی پت کے میدان میں تھا۔ اس جنگ نے اسے ہمیشہ کے لئے لنگڑا کر دیا تھا ۱۷۷۱ء میں اس نے شاہ عالم کو انگریزوں کی پناہ سے نکال کر اپنی حفاظت میں لیا۔ اب وہ شہنشاہ ہندوستان کا محافظ اعلیٰ اور تاج و تخت کی حفاظت کرنے والا تھا مرہٹوں کی پہلی جنگ میں اس نے انگریزوں سے شکست کھائی۔ اور مرہٹہ وفاق سے الگ ہو کر . . . وارن ہیسٹنگز کا دوست بن گیا۔ ۱۷۸۷ء میں راجپوتوں نے متحد ہو کر اسے شکست دی ۱۷۸۸ء میں غلام قادر روہیلہ نے اسے دربار دہلی سے بے دخل کر دیا . . . . شاہ عالم ایک سپاہی سے زیادہ شاعر معلوم ہوتا ہے۔ اس نے اپنے فرزند جگر بند مہاداجی کو پکارا۔ چار سال بعد مہاداجی نے دہلی پر قبضہ کر لیا۔ اس نے غلام قادر روہیلہ کا سر کاٹ کر شاہ عالم کے پاس بھجوا دیا۔ لیکن شاہ عالم اسے دیکھنے سے قاصر تھا۔ انہی ایام میں اندھے شہنشاہ نے پیشوا کو وکیل مطلق کا خطاب دیا۔ مہاداجی سندھیا نے پونا پہنچکر ایک شاندار دربار منعقد کیا جس میں شہنشاہ کا خطاب پیشوا کی خدمت میں پیش کیا گیا (کمپنی کی حکومت)

علی احمد بی۔ اے

کالیداس کی تشبیہیں

ہومر، ورجل اور شکسپیئر کو یونانی، رومی، اور انگریزی شاعروں میں اتنی فضیلت حاصل نہیں۔ جتنی کالیداس کو سنسکرت کے شعراء میں حاصل ہے۔ وہ آفتاب ہے اور دوسرے شاعر تارے۔ وہ کب اور کہاں پیدا ہوا؟ اس میں بہت کچھ اختلاف ہے۔ یورپین محققین اور ہندو مفکرین کی وقتاً فوقتاً نظریں اس کو ۶۵ قبل مسیح سے لے کر چھٹی صدی تک ڈھونڈتی ہیں مگر کہیں سراغ نہیں ملتا۔ روایتاً یہ معلوم ہوتا ہے۔ کہ کالیداس اجین کا باشندہ تھا۔ اجین کا ذکر خود کالیداس نے بھی اپنی ایک تصنیف "میگھ دوت" میں کیا ہے۔

قطع نظر دیگر محققین کے پروفیسر میکسملر اور ڈاکٹر کرن اس قدیم روایت پر متفق ہیں۔ کہ کالیداس بکرماجیت کے زمانہ میں سے تھا جو ۶۵ ق۔م میں گزرا ہے۔ جہاں تک اندرونی اور بیرونی شہادت مدد دیتی ہے۔ یہ تحقیق ایک حد تک ہندوؤں کے خیال کے مطابق صحیح ہو سکتی ہے کیونکہ راجہ بکرماجیت جس کا سمت اب تک ہندوؤں میں رائج ہے۔ اس کا سنہ ۱۹۹۶ء بکرمی ہے اور اسی حساب سے کالیداس کا زمانہ پہلی صدی عیسوی قرار پاتا ہے۔ چنانچہ اب یہ بات پایۂ ثبوت تک پہنچ چکی ہے۔ کہ کالیداس نے سنسکرت کے دوسرے دور میں جنم لیا۔ یہ وہی زمانہ تھا جب کہ ویدوں کی نیچرل شاعری کے مقابلہ میں مصنوعی شاعری اور عام طرز تخیل کا زور تھا۔ اس وقت کالیداس نے اپنی دماغی قوت اور خداداد قابلیت سے اسکو پھر زندہ کیا۔

کالیداس شعرائے سنسکرت کا سرتاج ہے۔ اس کی طباعی نے ہندی شاعری کو معراج کمال پر پہنچایا۔ اس نے "حسن" اور "عشق" کو اپنے فکر کی جولانگاہ بنا دیا اور شاعری کے آسمان پر ایسا آفتاب بنکر چمکا۔ جس کی تیز کرنوں نے مشرق و مغرب کو جگمگا دیا۔ اس کی تصانیف کے ترجمے انگریزی جرمن اور فرانسیسی اور اطالوی زبانوں میں ہوئے۔ رائن اور ٹیمز کے کناروں پر اسکے ڈرامے اسی جوش و خروش کے ساتھ پڑھے جاتے ہیں۔ جیسے گنگ و جمن کے اور گوداوری کے کناروں پر۔

پروفیسر لیسن کا قول ہے۔ "کالیداس ہندی شاعری کے آسمان کا سب سے روشن ستارہ ہے"

فلاسفر ہمبولٹ کہتا ہے۔ "شکنتلا کا مشہور مصنف کالیداس فطرت کا جو اثر عشاق کے دل پر پڑتا ہے۔ اُس کے بیان کرنے میں اُستاد ہے"

پروفیسر میکسملر نے سر ڈبلیو جونس کے شکنتلا کے ترجمے کو دیکھ کر کہا "کالیداس کی تصنیف شکنتلا نے میرے دل کو مسخر کر لیا ہے۔ اور شکنتلا میں کالیداس ہمارے واسطے ایک قیمتی موتی چھوڑ گیا ہے"

رومیش چندر دت مصنف "قدیم ہند" کا خیال ہے۔ "جس کسی نے شکنتلا کو پڑھا۔ وہ یہ ضرور محسوس کریگا۔ کہ اب تک کسی انسان کے دل میں اتنی خوبصورت اور نازک تخییل کا خیال نہیں آیا جتنی کہ شکنتلا میں بیان کی گئی ہے"

سر ایچ ولیمس کی رائے ہے۔ "کالیداس کی ہر تصنیف سے اسکے شاعرانہ فہم کی زرخیزی اور انسانی دل کی پوری واقفیت وسیع خیالی کے ساتھ ظاہر ہے۔ بیشک کالیداس ہندوستان کا شکسپیئر ثانی ہے"

مشہور نقاد شلیگل نے بھی شعراء میں کالیداس کو بہت بڑا مرتبہ دیا ہے۔ کالیداس ازل سے مصور کی نظر "شاعر کا دماغ" اور نقاش کا ہاتھ لے کر آیا تھا۔ اس کا طرز بیان اُس کی پیاری گنگا کے مشابہ ہے جس کا نتھرا نتھرا پانی کچھ اور ہی شان سے گنگناتا، لہراتا اور دھیرے دھیرے بہتا چلا جاتا ہے۔"

یوں تو کالیداس سے تقریباً ۲۰ کتابیں منسوب کی جاتی ہیں
لیکن نکتہ چینی کی کسوٹی پر صرف سات ہی پوری اترتی ہیں

رتو سنبھار ―― یعنی موسموں کے حالات۔ یہ پہلی تصنیف خیال کیجاتی ہے۔ اس میں کوی نے ہندوستان کے چھ موسموں کے مناظر اور تغیرات اور اُن سے پیدا ہونے والے جذبات و خیالات عمدہ و دلچسپ اسلوب میں ڈھالے ہیں۔ ہندوستان میں موسمی جذبات معاشرت میں داخل ہو گئے ہیں۔ برکھا رت بسنت سے کرآئی۔ باغوں میں جھولے پڑے۔ ساون اور ملار کی تانیں اڑانے لگے۔ حسینوں نے ہاتھوں اور پاؤں میں مہندی رچائی ―― موسم کے ان مناظر کی تصویر کالیداس نے اپنی جادو طراز قلم سے کھینچی ہے اور اس خوبی سے کھینچی ہے۔ کہ ہر رت کا سماں آنکھوں میں پھر جاتا ہے۔ دیگر تصانیف کی طرح اس کا ترجمہ بھی یورپ کی بیشتر زبانوں میں ہو چکا ہے مانیر ولیمس کا خیال ہے۔

"اس نظم کا ایک ایک شعر کسی نہ کسی ہندوستانی منظر کی ایک مکمل تصویر ہے۔

یہ کالیداس کے زمانۂ شباب کا نقش ہے جبھی تو شباب کی ساری خصوصیتیں اس نظم میں جھلکتی ہیں۔ استعارے اور تشبیہیں حسینوں کے حُسن سے سجے ہوئے ہیں۔

کمار سنبھو ―― یعنی جنگ کے دیوتا کارتیکا کی پیدائش کا حال۔ یہ رزمیہ نظم ہے۔ اس نظم کے ترجمے بھی مختلف زبانوں میں ہوتے ہیں اور وہ حصہ جہاں مہادیو جی کی شادی پاربتی جی کے ساتھ ہوئی ہے نہایت اعلیٰ حصہ ہے۔

رگھو ونش ―― یعنی خاندان راگھو کی تاریخ۔ یہ بھی ایک نہایت پرجوش رزمیہ نظم ہے جس میں سورج منبی خاندان کے جاہ و جلال کا ذکر ۱۹ بابوں میں کیا گیا ہے۔ اس کے ترجمے یونانی لاطینی۔ جرمن اور فرانسیسی زبان میں ہو چکے ہیں۔ اس نظم کے تین حصے ہیں۔

میگھ دوت ―― یعنی قاصد ابر جس میں ایک ہجر کے مارے جلاوطن قیدی نے ابر کو قاصد محبت بنایا ہے۔ ایلر ندوسن نے اس کا ترجمہ انگریزی نظم میں کیا ہے۔ یہ کالیداس کی بہترین تصنیفوں میں سے ہے۔

شکنتلا: ―― مشہور ڈرامہ جو تعریف کا محتاج نہیں۔

وکرم اروسی ―― دوسرا شاندار ڈرامہ ہے۔ اس تصنیف کے تین ترجمے انگریزی زبان میں ہیں۔ اور ایک جرمن زبان میں اس ڈرامے میں کالیداس نے زور بیان کی وہ کیفیت دکھلائی ہے۔ کہ خیالات امڈے پڑتے ہیں

سری نگر تلک ―― یہ ایک عشقیہ مضامین کی کتاب ہے۔ جس میں عشق کی ابتدا اور اُس کا انجام بڑی خوبی اور دلچسپی سے بیان کیا گیا ہے۔

ان سات تصنیفوں میں سے کوئی ایک بھی اُس کے بقائے دوام کے لئے کافی ہے۔ ان تصانیف کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ کالیداس کا طرز بیان نہایت سادہ لیکن دلکش اور جامع ہے۔ وہ متقدمین کی لفاظی سے بھی اُسی طرح دور ہے۔ جس طرح متاخرین کے ... سے۔ اگرچہ اُس کے کلام میں صنائع بدائع موجود ہیں۔ لیکن ان میں آورد کا نام نہیں۔ ہر مصرعہ، ہر شعر اور ہر اشلوک میں اس کی بوقلموں تخیل اور عمیق مطالعہ فطرت کا پتہ چلتا ہے۔ یہ سچ ہے اردو اور فارسی شعرا کی بلند پروازی انہیں آسمان پہ زحل، عطارد اور مشتری تک لے پہنچی۔ لیکن کالیداس اس قدر اونچا نہ اڑ سکا۔ اُس کا تخیل ستاروں کی طرح بلند نہیں۔ بلکہ سبزہ زار کی طرح وسیع ہے۔ جس میں ہرنیاں کلیلیں کرتی ہیں۔ کوئلیں کوکتی ہیں۔ سبزہ لہلہاتا ہے۔ اور بلوریں چشمے بہتے ہیں۔ بھونرا، دہوی، کنگی، کدم اور میم سب کو وہ ہماری آنکھوں کے سامنے لاتا ہے بے جان اور بے حس چیزوں کی طرح نہیں۔ بلکہ اُس میں جان ڈال کر۔ اور وہ سب قدرت کی ہمدردی سے یکساں متصف معلوم ہوتے ہیں۔ اور خاص کر تشبیہوں میں تو اُسکو کمال حاصل ہے۔ کہ ہر تشبیہ معنی کے لحاظ سے دلفریب اور باعتبار موزونیت تام ہے جگہ جگہ تشبیہات کے خوشرنگ پھول مشام روح کو مہکاتے نظر

آ گئے ہیں۔

تشبیہہ حسنِ کلام کا سب سے بڑا زیور ہے۔ نظم و نثر کی ساری دلکشی اسی کی بدولت ہے۔ لیکن جب تک یہ نیچرل حالت میں ہوتی ہیں۔ ان کا اصلی حسن برقرار رہتا ہے۔ جہاں تکلف، غرابت اور غیر معتدل ندرت پیدا ہوئے اثر جاتا رہا۔ تشبیہیں اگر پاس پاس کے یا ملتے جلتے آنکھوں کے سامنے ہوں۔ تو کلام میں خواہ وہ کسی زبان کا کیوں نہ ہو لطافت و نزاکت پیدا ہو جاتی ہے۔ لیکن جب تشبیہہ اصل سے بہت دور ہو جائے اور اصل سے تشبیہہ کا درجہ صرف نازک خیالی تک محدود ہو جائے تو اس کے سمجھنے میں سخت دقت ہوتی ہے اور جب ایک بات سمجھ میں نہ آئے۔ تو ظاہر ہے۔ اس کا اثر ہی کیا ہوگا۔

تشبیہہ مفرد بھی ہوتی ہے۔ اور مرکب بھی۔ مفرد تشبیہہ میں چنداں جدت نہیں ہوتی۔ اس لئے کہ مفرد چیزوں کی طرف ہر شخص کا خیال منتقل ہو سکتا ہے۔ البتہ مرکب تشبیہہ میں ہر وقت جدت پیدا ہو سکتی ہے۔ ان خصوصیات کے مدنظر کالیداس کے کلام میں تشبیہہ کی جس قدر خوبیاں پائی جاتی ہیں۔ سنسکرت زبان میں اس کی نظیر نہیں ملتی۔ وہ مرکب تشبیہات بے تکان استعمال کرتا ہے۔ اگر تشبیہات قریب الفہم اور سریع الانتقال الی الذہن ہیں۔ اور یہ تشبیہہ کا بہت بڑا کمال ہے۔ کالیداس کی تشبیہوں کا ایک بہت بڑا کمال یہ ہے۔ کہ وہ پڑھنے والے کے دل میں معاً ایک نشتر بن کر اتر جاتی ہیں۔ حق یہ ہے۔ کہ وہ ایسے واقعات قلم بند کرتا ہے۔ جو اسی سرزمین پر اور ہمارے مشاہدے میں آ چکے ہیں۔

"درختوں کے لہلاتے ہوئے سبز جھنڈ چھائے ہیں۔ جامن کی ٹہنیاں آموں کے درختوں سے ملکر کھچڑی ہو رہی ہیں عشق پیچاں کروندے کی جھاڑی سے اس طرح بل کھا کر چمٹ رہا ہے۔ جس طرح کوئی بیل کسی سے چمٹ جائے اور اس کی باریک پتیاں اس طرح اپنا سر زمین کی طرح جھکا رہی ہیں۔ جس طرح کوئی سانپ نیچے پھیلا کر جھومتا ہو"

کالیداس کی تشبیہوں کا لطف بالخصوص اس کی "میگھ دوت" میں حاصل ہوتا ہے۔ تشبیہات کی بجلی دفعتاً بے تکلفی سے چمک کر پڑھنے والے کے دل و دماغ کو روشن کر دیتی ہے۔ اردو و فارسی کے شعراء نے صبا کو نامہ بر بنایا۔ اور دو صدی تک صبا نے یہ خدمت انجام دی لیکن کالیداس نے ایک نیا قاصد بنایا وہ "میگھ" یعنی ابر کو اپنا قاصد بنا کر غم سناتا ہے۔ اس افسانے کا ہیرو یکش جو کسی خطا پر جلاوطن کر دیا گیا تھا۔ قاصد ابر کو اپنی بیوی کے گھر کا پتہ بتا کر "سندیسہ" بھیجتا ہے اور راستہ کی دلفریب رنگین تصویریں کھینچتا ہے۔ تشبیہیں ملاحظہ ہوں۔

"پانی کی شراب پی کر تو پہاڑوں کی چوٹیوں پر ایسا معلوم ہوگا، جیسے جنگل کی آگ سے جلے ہوئے پہاڑ باہم ایک دوسرے سے ملتے ہیں۔ امرکوٹ پہاڑی کے آموں سے چھایا ہوا نظر آئے گا۔ اس کی بلند چوٹی پر جب اپنی سیاہی پھیلا دیگا۔ تو ایسی خوبصورتی ہو جائے گی۔ جیسی کہ کسی حسین عورت کی جب کہ وہ سر سے پاؤں تک سونے کے زیور سے لدی ہو۔ اور اس پر وہ اپنے سیاہ لانبے بال کھولدے"

"یہاں سے آگے چل کر تجھے ریوا ندی نربدا ملے گی جو وندھیاچل میں بہتی ہوئی دور سے ایسی دکھائی دیتی ہے۔ جیسے ہاتھی کے جسم پر سفید کھریا مٹی سے فیلبان سنگار کرتا ہے"

"بھونرے پھولوں سے اس کے لینے کے لئے ان کے اندر اس طرح گھستے ہوں گے۔ جیسے دل میں بدی سماتی ہے"

"تو آہستہ آہستہ گرج کر اس دو نیرتی ندی پر چھا جانا اور اس کا پانی اس طرح سے کھینچ لینا جیسے کوئی متوالا عاشق اپنی معشوقہ کو پیار کر کے اس کی پیشانی سے پسینہ پونچھتا ہے"

"اسی راستے سے تجھے نرو ندھیا ندی بہتی ملے گی جس کے کناروں پر ہنسوں کی بیٹھی ہوئی ٹکڑیاں ایسی

نظر آئے گی جیسے کسی حسین کی نازک کمر میں چاندی کی
زنجیر۔ اور ان کی پریاں گھنگروؤں کی پیاری جھنکار معلوم
ہوں گی"

"صبح کے سہانے وقت سورج نئی دلہن کی طرح پورب
سے پچھم کی طرف اس طرح جھانکے گا جس طرح کوئی الھڑ
بیاہی لڑکی اپنی سسرال کا راستہ دیکھتی ہے"۔ یہاں سے
آگے چل کر تجھے گمبھیرا ندی ملے گی۔ جس کا پانی ایسا
شفاف ہے جیسے کسی کسن کا پاک دل"

"یہاں دشپور کی عورتیں بہت ہی شوخ ہیں
جب تو انہیں اپنے سانولے لبھانے والے چہرے کو دکھائے
گا۔ تو وہ تجھے دیکھنے اپنی شوخ نگاہیں اوپر اٹھائیں گی
ان کی کالی پتلی اور سفید آنکھ ایسی بھلی معلوم ہو گی جیسے
سدا بہار گلاب کے درخت کے اوپر بھنورے منڈلاتے
ہوں"

"جب تو پانی لینے کو گنگا جی پر جھکے گا۔ تو تیرے کالے
رنگ کی چھایا سفید پانی پر پڑ کر ایسی معلوم ہو گی گویا
پریاگ میں گنگا اور جمنا کا سنگم ہوا ہے۔ یا جیسے کسی مہاتما
باطن درویش کے پاک دل پر شیطان اپنا تسلط کر لے"

"اسی گنگا کے کنارے الکاپوری ایسی آباد نظر آئے
گی۔ جیسے کوئی عورت سفید ساڑھی پہنے اپنے پیارے شوہر
کے آغوش میں بیٹھی ہو"

"الکاپوری کے بڑے سنگ مرمر کے محلوں پر رات کو
تاروں کی چھاؤں ایسی بھلی معلوم ہوتی ہے۔ جیسے کسی
نئی بیاہی دلہن کے گھونگھٹ میں آنچل پہ لگے ہوئے تارے
اور ماتھے پہ لگی ہوئی بندی"

"تجھ کو دیکھ کر الکاپوری کی رہنے والی عورتیں اپنے نئے
ابھرے ہوئے سینوں کو رنگین کپڑوں سے چھپا لیں گی
اور ہوا بار بار انہیں چھیڑنے کے لئے انکا آنچل سرکا
دے گی۔ جس کی وجہ سے انکے گلے کی سنہری روپہلی
زنجیریں چمک کر عجب بہار دینگی۔ اور ایسا معلوم ہو گا۔
کہ چاند اور سورج کے درمیان بجلی کوندتی ہے"

"میرے بغیر وہ ایسی رہتی ہو گی۔ جیسے چکوے کے
بغیر چکوی"

"اس دکھش کی بیوی کے چھپٹی گالوں سے وہ
رونق اور دلفریبی جاتی رہی ہو گی۔ اور وہ بال کھولے
ہوئے اپنا سر ہاتھ پر ٹیکے ہو گی۔ اور یہ ایسا معلوم ہو گا
گویا گہن یا چاند آدھا بدلی میں چھپ گیا ہے"

"وہ اپنی آنکھوں کو آنسو بھرے پلکوں سے ڈھانکتی
ہوئی کچھ سوتی جاگتی ایسی معلوم ہو گی۔ جیسے کملنی
کا اوس سے کملا کملایا ہوا پھول"

"وکرم اروسی" میں بالخصوص فطرت کی جیتی جاگتی تصویریں
ہیں۔ اور مکالمہ میں ناصحانہ قلبیہ زیادہ کثرت سے پائے جاتے ہیں۔ لیکن
ساتھ ہی ساتھ تشبیہات کے خوشنما پھول بھی حسن بیان کو دوبالا کرنے
کے لئے جا بجا موجود ہیں۔ یہ تشبیہ جس اعتبار سے بھی دیکھی جائے۔ نادر اور
اچھوتی ہے حقیقت تو یہ ہے۔ کہ ایک ایک تشبیہ ایسی ہے۔ کہ اگر گھنٹوں
بھی غور کیا جائے۔ تو نیا لطف آتا رہے۔ مہاکوی کے اس ڈرامے کا
درجہ شکنتلا سے کچھ کم نہیں۔ اروسی اس ڈرامہ کی حسین ہیروئن اور
پرو راوس اس ڈرامے کا بہادر ہیرو ہے۔ اروسی کی پیدائش کے متعلق
ایک دلچسپ روایت ہے۔ جس کا ذکر دلچسپی سے خالی نہ ہو گا۔ نارائن اور
نر دو قدیم رشی ہیں۔ جن کا ذکر ویدوں میں بھی ہے۔ وہ وشنو کے
اوتار بھی سمجھے جاتے ہیں۔ چونکہ ان کا زہد و اتقا بڑھا ہوا تھا۔ اس لئے
اندر کو ان پر حسد ہوا۔ اور اس نے ان کے بہکانے کے لئے عشق کے
دیوتا کام کو بسنت اور آسمانی پریوں کے ساتھ بھیجا۔ رشی اندر کا مطلب
سمجھ گئے۔ اور بہت ہی اخلاق سے پیش آئے۔ پھر رشی نارائن نے ایک
پھول اپنی ران پر رکھا۔ جو فوراً ایک پری کی شکل اختیار کر گیا۔ جسکے
حسن و جمال کی یہ کیفیت تھی۔ کہ ساری آسمانی پریاں اس کو دیکھ کر
شرما گئیں۔ اس کا نام اروسی قرار پایا۔ اس تصنیف کی تشبیہیں بھی ملاحظہ
ہوں۔

اروسی جو خوف کھا کر بیہوش ہو گئی تھی۔ ہوش میں آرہی ہے۔ پرورواس قریب بیٹھا ہو۔ اس کی سہیلی چترلیکھا سے کہتا ہے۔

"تمہاری سکھی ہوش میں آرہی ہے۔ دیکھو اس مہ جبین کے دماغ سے غفلت کا پردہ اٹھ رہا ہے۔ جیسے اندھیرا چاند نکلتے ہی رات سے جدا ہونا شروع ہو جاتا ہے۔ یا جیسے گنگا کناروں سے گرے ہوئے گرد و غبار سے پیچھا چھڑا کر صاف اور شفاف بہنے لگتی ہے"۔

پھر اروسی سے مخاطب ہو کر کہتا ہے۔

"او سندری! تمہاری سکھیاں وہ سامنے ہیمکوٹ کی چوٹی پر بیٹھی ہوئی تمہارے چہرے کو جس پر تازگی کے آثار نمایاں ہوتے جاتے ہیں۔ ایسے ہی اشتیاق سے دیکھ رہی ہیں جیسے لوگ چاند کو گرہن کی گرفت سے آزاد ہوتا دیکھتے ہیں"

ہیرو دان چلی آتی ہے۔ ہیرو اپنے سینے میں ایک میٹھی خلش محسوس کرتا ہے۔ اور دل ہی دل میں کہتا ہے۔

"وہ آسمانی پری میرا دل زبردستی میرے سینے سے نکال کر فضائے عالم سے عالم بالا کو لے کر چلتی نظر آئی۔ جیسے راج ہنس کنول کے ٹوٹتے ہوئے ڈنٹھل سے اس کا لطیف ریشہ نکال کر ہوا ہو جاتا ہے"

محبت اپنا اثر دکھاتی ہے۔ اروسی بھی اپنے پریمی پرورواس سے ملنے کو بےچین ہوتی ہے۔ چترلیکھا اسے لے کر جاتی ہے۔ اور دور ہی سے راجہ کی طرف اشارہ کر کے کہتی ہے۔

"دیکھو وہ سامنے بیٹھا تمہارا انتظار کر رہا ہے۔ جیسے چاند نکلنے کے بعد کچھ دیر چاندنی کا انتظار کرتا ہے"

چترلیکھا کو چھیڑ کی سوجھتی ہے۔ اروسی کو درخت کی آڑ میں چھپا کر خود راجہ کے سامنے جاتی ہے۔ اور کہتی ہے۔ "مہاراج کی جے" پرورواس جواب دیتا ہے۔

"دیوی تمہارا آنا مبارک ہو۔ لیکن معاف کرنا۔ تمہاری سکھی کو تمہارے ہمراہ نہ دیکھ کر اتنی خوشی نہ ہوئی۔ جو تم دونوں کو دیکھنے سے ہوتی ہے۔ کہ گنگا جمنا کا سنگم دیکھنے کے بعد تنہا جمنا کا نظارہ اتنا بھلا نہیں معلوم ہوتا"

پھر کیا ہوا رانی روٹھ کر چلی گئی۔

"رانی صاحبہ تو ایسے غصہ میں بھری ہوئی گئیں۔ جیسے برسات میں ندی نالے زور شور سے بہا کرتے ہیں"

انتظار کی گھڑیاں بھی قیامت ہوتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ پرورواس اپنا دل مناظر قدرت سے بہلانے کی ناکام کوشش کرتا ہے۔

"چاند کی شعاعیں جو ابھی اودے پہاڑ کے پیچھے چھپا ہوا ہے۔ ہر طرف سے تاریکی کو دور کر رہی ہیں اور سمت مشرق کی بعینہ یہ کیفیت ہے۔ جیسے کوئی نورانی چہرہ سنوارے ہوئے زلفوں کے بیچ میں سے نظروں کو بھاتے لیتا ہو"

مندرجہ بالا تشبیہ کی توضیح یہ ہے۔ کہ ہندی شعرا کے خیال کے مطابق مشرق دلہن اور چاند دولہا ہے۔ اور شوہر کے جدا ہونے کی وجہ سے مشرق نے بالوں میں کنگھی تک نہ کی تھی۔ بال یونہی بکھرے ہوئے تھے۔ لیکن اب چونکہ چاند نکلنے والا ہے۔ اس لئے مشرق نے خوب سنگار کیا ہے۔

انتظار! مایوسی! اضطراب!

"دردِ دل کی عجیب کیفیت ہے۔ جس طرح دریا کا بہاؤ ناہموار چٹانوں سے ٹکرا کر سینکڑوں نالوں میں تقسیم ہو جاتا ہے۔ اسی طرح دل کا دشمن عشق وصال میں رکاوٹیں پڑنے سے سوگنا قوت حاصل کر لیتا ہے"

یہ تھیں "وکرم اروسی" کی چند تشبیہیں۔ اب "شکنتلا" کی طرف آئیے۔ یوں تو کالیداس کی ہر تصنیف عشق و محبت کی شراب میں ڈوبی ہوئی ہے۔ لیکن شکنتلا کو جو مقبولیت حاصل ہے وہ کسی شاعر کی کسی تصنیف کو حاصل نہیں۔ کالیداس کی دوسری تصنیفوں کی طرح اس میں بھی قدم قدم پر تشبیہات کی نئی نئی کونپلیں اور استعارات کے معطر پھول کھلے ہیں۔ شکنتلا اپنی سہیلیوں کے ساتھ گھڑوں میں پانی لا لا کر پیڑوں کو سینچ رہی ہے۔ دشینت (ہیرو) درختوں کی

دشینت اس منظر کو دیکھتا ہے۔ اور کہتا ہے

"اس گلبدن سے کام لینا ایسا ہے۔ جیسے کوئی
پھولوں کی پنکھڑی کو کانٹوں سے چھیلتا ہو"

"درختوں کے سہارے کھڑی ہوئی شکنتلا یوں دکھائی
دیتی ہے۔ گویا شاخوں سے بیل لپٹی ہوئی ہے۔ اور دونو
سُرخ لب جیسے بیل کے لال پتے"

"گھڑوں کو اٹھاتے اٹھاتے وہ پسینے سے شرابور
ہوگئی ہے۔ اور کان میں کرن پھول کا یہ حال ہوگیا ہے
جیسے گالوں سے پنکھڑیاں چپکی ہوں"

"گھوڑوں کے سُم سے گرد اڑا اڑ کر پیڑوں پر یوں
پڑ رہی ہے جس طرح کوئی ٹڈی دل آ کر شفق پہ چھا جائے"

"کنول کے پتے ایسے نرم ہیں۔ جیسے توتے کا پیٹ"

دشینت کی زبان سے شکنتلا کی تعریف سنئے

"میرے خیال میں وہ ایسی ہے۔ جیسے کوئی بے
سونگھا پھول ——— کوئی انبندھا موتی ——— بے ٹوٹی
ہوئی کونپل ——— یا اچھوتا میوہ ——— تازہ شہد
——— بے پہنا ہوا ہار۔

شکنتلا سسرال جانے کے لئے باپ سے رخصت ہونے
آئی ہے۔

"آپ کی گود سے جدا ہو کر اب میں کس طرح جیوں گی۔
ہائے میری وہی حالت ہے۔ جو صندل کے شاخ کی بیلکر
دوہ پہاڑ جیسپر صندل ہوتا ہے اسے ٹوٹ کر ہوتی ہے"

جوگی کی بددعا سے دشینت ماضی کو بھول جاتا ہے۔ وہ بھول جاتا
ہے۔ کہ تپوبن میں اس نے شکنتلا سے بیاہ کیا تھا۔ اور جب جبین شکنتلا
دحبس کے متعلق گوئٹے کہتا ہے "جو کچھ زمین و آسمان میں ہے۔ وہ سب
کالیداس نے ایک نام میں جمع کر دیا ہے۔ شکنتلا کا نام زبان پر آیا۔ اور
گویا وہ ساری نعمتیں حاصل ہو گئیں) دربار میں آ کر اس کا بھولا
سپنا یاد دلانے کی کوشش کرتی ہے۔ تو راجہ کہتا ہے۔

"عجب کشمکش میں ہوں سالکھ دماغ پر زور ڈالتا
ہوں، لیکن مجھے خیال نہیں پڑتا۔ کہ میں نے اس ایسرا
دیوی سے شادی کی بھی ہے۔ یا نہیں۔ اب نہ تو
مجھ میں اس کو قبول کر لینے کی ہی جرأت ہے۔ اور نہ
ہی چھوڑ دینے کی ہمت۔ میری یہ حالت بالکل اُس
بھونرے کی سی ہے۔ جو صبح سویرے گند کے پھول
پر آ بیٹھتا ہے۔ لیکن پھول کی پنکھڑیاں اوس سے
تر ہونے کی وجہ سے نہ تو وہ رس ہی لینے پاتا ہے۔ اور نہ
اُسے چھوڑ کر چلا جانا چاہتا ہے"

"کمار سنبھو" کی بھی چند نازک تشبیہیں درج کی جاتی ہیں۔ کالیداس
پاربتی کے حسن کی تصویر کھینچ رہا ہے۔

"وہ خرام پاؤں کے اٹھتے ہوئے انگوٹھے اور ناخنوں
کی سرخی ٹپکنے سے ایسا معلوم ہوتا تھا۔ گویا وہ گل لالہ
چن رہی ہیں"

اُس کا بے عیب حسن ایک غنچۂ نو شگفتہ ہے۔ یا
ایک نرم شاخ ہے۔ جو ابھی خراشِ ناخن سے نا آشنا ہے
یا ایک دُرّ ——— ناسفتہ"

"تلون آمیز نظر کو اُس نیلے کنول کے پھول سے
تشبیہ دی جا سکتی ہے۔ جو تند ہواؤں سے تھپیڑے
کھا رہا ہو"

موتی کسی شفاف مونگے میں جاگزیں ہو یا کوئی نو
دمیدہ پھول کونپل میں چھپا رہے۔ تو اُس پاربتی
کے سرخ لبوں کے شیریں تبسم سے تعبیر دی جا سکتی ہے"

کالیداس کے لئے دنیا ایک دفتر شاعری تھا۔ جس چیز پر
نگاہ ڈالی۔ اُسے شعر کے قالب میں ڈھال دیا۔ اُس کی فطرت شناسی
ٹینی سن اور ورڈسورتھ کی طرح سہی اور حقیقی ہے

———

انتہائی رعایت سے فائدہ اٹھانے کا

نادر موقعہ

مندرجہ ذیل کتابوں کی قیمتوں میں اس قدر زیادہ رعایت کردی گئی ہے کہ قیمتیں برائے نام رہ گئی ہیں۔ اور بالکل مفت کے برابر ہیں۔ تمام کی تمام کتابیں بے حد مفید اور کارآمد ہیں۔ یہ خاص رعایت اس غرض کو مدنظر رکھ کر کیگئی ہے کہ امیر و غریب یکساں طور پر مستفید ہوسکیں۔ مذہب سے دلچسپی رکھنے والے حضرات کے لئے یہ بہترین موقع ہے۔ کہ ہم سے یہ کتابیں منگوا کر لوگوں میں مفت تقسیم کریں۔ اسلام کی برتری ثابت کرنے کے لئے یہ نہایت مؤثر طریقہ ہے۔ ہمیں امید ہے کہ دینی تڑپ رکھنے والے دوست اس انتہائی رعایت سے ضرور فائدہ اٹھائینگے۔

نمبر شمار	نام کتاب	اصلی قیمت	قیمت رعایتی	نمبر شمار	نام کتاب	اصلی قیمت	قیمت رعایتی
۱	شمائل حبیبی بلا ترجمہ	۸ر	۴ر	۱۰	ORTHODOX ISLAM, (انگریزی)	۸ر	۴ر
۲	شمائل مطبوعہ جرمنی - -	عہ/ر	۸ر	۱۱	لائف آف سوامی دیانند (انگریزی)	۱۲ر	۲ر
۳	بیان القرآن پارہ اول ..	۸ر	۱ر	۱۲	جیبیہ	۳ر	۱ر
۴	" " ہفتم ..	۸ر	۱ر	۱۳	FUTURE OF ISLAM IN INDIA		
۵	" " ہشتم ..	۸ر	۱ر		(انگریزی)	۸ر	۱ر
۶	تاریخ خلافت راشدہ	عہ/ر	۱۲ر	۱۴	النبوۃ فی الاسلام (انگریزی)	۶ر	۱ر
۷	شمائل شریف مترجم حنائی ..	عہ/ر	۸ر	۱۵	ہسٹری آف بالی ہوومنٹ (انگریزی)	عہ/ر	۴ر
۸	جمع قرآن	۱۲ر	۴ر	۱۶	(انگریزی)	۲ر	۱ر
۹	WOMAN IN ISLAM, (انگریزی)	۱ر	۸ر	۱۷	عثمانؓ	۴ر	۱ر

ادارہ

چوہدری برکت علی

راجندر سنگھ بیدی

احسان دانش

ادبِ لطیف لاہور

چندہ سالانہ

چار روپے چار آنے

قیمت فی پرچہ ۵ر

جلد ۱۲ مارچ سنہ ۱۹۴۱ء شمارہ ۶

مندرجات

اشارات

لاہور کی ادبی محفلیں نسبتاً سونی ہو رہی ہیں۔ اس کی وجہ کلی طور پر موسم کی شرارت نہیں بلکہ یہ ہے کہ یہاں سے حسرت صاحب، کرشن چند صاحب اور چند ایک اور ادیب دہلی انتقال فرما گئے ہیں اور چند انتقال فرمانے والے ہیں۔ دہلی کے چمبک پتھر نے بمبئی کے لوح چمن کو بھی کھینچ لیا ہے۔ اور اب منٹو صاحب بھی دہلی میں رونق افروز ہیں۔ اسلئے ہمیں دہلی کی نعمتوں سے بجا طور پر حسد ہے۔ بہت مدت بعد ان لوگوں کی کوئی نہ کوئی خبر ہم تک پہنچ جاتی ہے۔ مثلاً یہ کہ کرشن چند صاحب کرشن چند ہی نہیں بلکہ کرشن چند ایم اے ہیں اور انہیں یقین ہو رہا ہے۔ کہ وہ اس دنیا میں محض ایک بلبلہ کی حیثیت رکھتے ہیں" اور بقول سعدی ؎

تا کی ایں باد کبر و آتش خشم ⁂ شرم بادت کہ قطرۂ آبی

پھر ابھی ابھی جناب احمد علی نے جنگ اور ادیب کے عنوان سے نیا ادب، میں مضمون لکھا ہے۔ جس میں بتایا ہے۔ کہ اس جنگ نے تمام ترقی پسند مصنفین کو عجب گومگو میں ڈال دیا ہے۔ ان میں سے بعض کا تو خیال ہے۔ کہ فاشیت کے خلاف انگریزوں کی امداد کرنی چاہیئے چنانچہ اسی لئے ہیرلڈ نکلسن اور ولیم پلومر نے "اگرچہ (سرکاری) ملازمت تو نہیں کی تاہم ریڈیو اور اخبار وں کے ذریعہ اس بات کا اعلان شروع کر دیا ہے۔ کہ ملک کو فاشیت اور حملہ سے بچانے کے لئے حکومت کی مدد کرنی چاہیئے۔ بہت سے وہ مصنف بھی جن کی سیاسیات جنگ سے پہلے انقلابی تھیں۔ اب حکومت کا ساتھ دینے لگے ہیں۔ اسکی کئی وجہیں ہیں۔ ایک تو یہ کہ بہت سے ادیب روس اور جرمنی کے معاہدہ کے بعد اشتراکیت سے برگشتہ خاطر ہو کر سیاسیات سے علیحدہ ہو گئے۔ مثلاً جون سٹریچی، سٹیون سپنڈر" کرشن چند نے اس مضمون کو دوبارہ سہ بارہ پڑھا ہے۔ اور اُن کے خیال کے مطابق اگر آلڈس ہکسلے کے سے بیدار مغز آدمی نے امریکہ جا کر یوگ کی مشق شروع کر دی ہے۔ تو انہیں دہلی جا کر یہ کہنے سے کوئی نہیں روک سکتا کہ انسان پانی کا بلبلا ہے وغیرہ . . . . اور وہ ادب لطیف کے لئے لکھیں بھی تو کیا خاک لکھیں؟

دوسری طرف سعادت حسن منٹو سومرسٹ ماہم (SOMERSET MAUGHAM) پر دل و جان سے فدا ہیں، اور حسرت صاحب حیران ہیں کہ چونکہ انہوں نے اس نام کا مصنف نہیں پڑھا اسلئے وہ ادیب کہلانے کے مستحق بھی ہیں یا نہیں۔ بارے کچھ لے دے کے بعد منٹو اور حسرت صاحب میں تصفیہ ہو جاتا ہے۔ اور آخر فیصلہ یہ ہوتا ہے کہ ہم (حسرت صاحب) بھی سومرسٹ ماہم ہیں۔ اور آپ (منٹو) بھی سومرسٹ ماہم ہیں" اور سامان اکل و شرب کے ارد گرد سب سومرسٹ ماہم ہیں . . . . . .

——— پرانے دیوتے کوچ کرتے ہیں۔ اور نئے دیوتا ان کی جگہ لیتے ہیں

مغرب کی لیبارٹری میں جو تجربہ کیا جا رہا ہے۔ اس میں استعمال کیا جانے والا تیزاب بہت تیز (EFFERVESCENT) ہے اور ہمیں امید ہے۔ نتیجہ جلد ہی ظاہر ہو جائیگا اور مصنفین کو دماغی سکون میسر ہو سکے گا۔ کیا یہ ضروری ہے کہ ہم جنگ کے فیصلہ کا انتظار کریں۔ یا مغرب ہی ہمارے فیض کا سرچشمہ ہو؟

سالنامہ 'ادب لطیف'، کے متعلق ہمیں ابھی تک توصیفی خط موصول ہوئے ہیں۔ ادبی حلقوں نے سالنامہ کی سادگی، ترتیب و تدوین کو پسند کرتے ہوئے ہماری ہمت کو سراہا ہے جسکے لئے ہم انکے ممنون ہیں۔ لیکن سالنامہ کے متعلق ہمیں آجتک ایک بھی تنقیدی خط نہیں موصول ہوا حالانکہ توصیفی خط کی نسبت تنقیدی خط کی ضرورت اسلئے زیادہ ہوتی ہے۔ کہ آئندہ پرچوں میں نقائص کا اعادہ ہو سکے۔

'ادب لطیف'، کا موجودہ سرورق سردار جسونت سنگھ کے موقلم کا رہین منت ہے۔ اور اس کی سادگی اور خوبصورتی کے سبب اسے احباب نے بہت پسند کیا ہے۔ 'آبگینے' 'رنگ و بو'، 'پرواز لق لق' اور مکتبہ اردو کی دوسری کتابوں کے سرورق سردار صاحب ہی کے ذوق سلیم کا نتیجہ ہیں۔ آپ ایک نوجوان فنکار ہیں۔ لیکن آپ ابھی سے عامیانہ اور بازاری چیز سے بہت بلند ہیں۔ ہمیں توقع ہے۔ کہ آپ کمرشل آرٹ میں بہت ترقی کرینگے

مکتبہ اُردو سے جو کتابیں شائع ہو رہی ہیں ان کے نام ہیں 'نئے زاویئے'، 'کمپنی کی حکومت دوسرا ایڈیشن'، اور راشد کی نظمیں بعنوان 'ماورا'۔

'ادب لطیف'، کا مئی کا پرچہ افسانہ نمبر ہوگا۔ ابھی سے اچھے اچھے افسانے حاصل کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ اہل قلم حضرات سے درخواست ہے۔ کہ وہ اپنے افسانے ابھی سے بھیج دیں تاکہ ترتیب دینے میں آسانی رہے۔

ادارہ

سید برکات احمد

وفاقِ عالم

ایک نئی تجویز اور اُس کا تجزیہ

خداوند نے ان کو وہاں سے تمام روئے زمین پر پراگندہ کیا ۔
سو وہ اس شہر کے بنانے سے باز رہے ۔ اسلئے اُس کا نام بابل ہوا کیونکہ
خداوند نے وہاں ساری زمین کی زبانوں میں اختلاف ڈالا اور وہاں سے
خداوند نے انکو تمام روئے زمین پر پراگندہ کر دیا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

پیدائش ۔ ۱۱

مینار بابل کا واقعہ تو آپ کو یاد ہوگا؟ ۔۔۔ دنیا کے رہنے والوں نے سوچا ۔ کہ ایک بہت اونچا مینار تیار کیا جائے ۔ خیال کا آنا تھا کہ کام شروع کر دیا گیا ۔ اللہ میاں کو یہ بات کب پسند آتی! اُنہوں نے اسی وقت سب انسانوں کو پراگندہ کر دیا ۔ اور سب کی زبانیں مختلف کر دیں ۔۔۔ اوس دن سے اب تک انسان متحد اور متفق ہونے کی کوشش کر رہا ہے ۔

اتفاق و اتحاد کی کوشش اور معیار حکومت کو بلند کرنے کی سعی ہمیشہ ہی جاری رہی ۔ افلاطون کی " ریاست " ارسطو کی "سیاست" ، طامس مور کی " اٹوپیا " (؟) سویٹ کی سلطنت ، این ہمزاور مارکس کا " سرمایہ " اسی سلسلہ کی کڑیاں ہیں ۔ بدھ مت مسیحیت اور اسلام نے معیار انسانیت کی بلندی اور اتحاد کے لئے جو کوششیں کی ہیں ۔ انکے نتائج بھی ہمارے سامنے ہیں ۔

انسان ؟ ۔۔۔ کیا یہ مدنی الطبع جانور کبھی متحد ہو سکے گا ؟ کیا کبھی افلاطون اور مور کی خیالی حکومتیں جامہ عمل پہن سکتی ہیں ؟ یہ سوال پھر ایک بار دنیا کے کئی حصوں میں دوہرایا جا رہا ہے ۔

کہیں کہیں سے آوازیں اُٹھیں " اشتمالیت ، اشتراکیت ، مگر کیا تیسری انٹرنیشنل کی ناکامیابی ۔ اور ٹراٹسکی کی موت کے بعد یہ جواب دیا جا سکتا ہے ؟

لوگ مشکوک سے نظر آتے ہیں ۔

امریکہ سے بھی ایک جواب دیا گیا ۔ اور کچھ برطانوی اور فرانسیسی حلقوں نے اسکی تائید بھی کی

" وفاقِ عالم " ۔۔۔ یہ تھا جواب

لوگ پوچھتے ہیں یہ نئی چیز کیا ہے ؟ " وفاقِ عالم " ؟ یہ نام تو اُنہوں نے پہلے نہیں سُنا ۔

جس طرح فرقہ وارانہ اختلافات اور ذات پات کا فرق کسی ملک اور قوم کی ترقی میں روک ہوتا ہے ۔ اسی طرح قوموں اور ملکوں کے اختلافات رنگ و نسل کا امتیاز انسانی ترقی میں ایک بڑی روک ہے ۔ ہمیں ہندوستانی اور امریکن ، جاپانی

اور جرمن کہلانے کی بجائے اپنے آپ کو صرف انسان کہلانا چاہیئے۔ اور اگر ہم سب انسان ہیں۔ تو پھر ہماری حکومت بھی ایک ہونی چاہیئے

جہاں تک اس خیال کا تعلق ہے۔ یہ بہت پرانا ہے۔ یہودی تو اس قسم کی ایک آسمانی بادشاہت کے عرصے سے منتظر تھے۔ فرق صرف اتنا ہے۔ کہ انہوں نے اسے مذہبی رنگ دے کر اپنے لئے مخصوص کر دیا تھا۔ اسکے بعد سینٹ پال نے بھی اسی پیغام کی اشاعت کی۔ اور مسلمانوں نے بھی اخوت و مساوات کے نام سے اس کی تبلیغ کی۔ مگر موجودہ شکل میں اسکا وجود شاید جنگِ عظیم کے بعد ہوا۔ جنگ کی تباہ کاریوں نے انسان کو دعوت فکر دی۔ اور پریذیڈنٹ ولسن نے جمیعۃ الاقوام کے نام سے اس تجویز کو پیش کیا۔ مگر یہ بےچاری جمیعۃ آخر میں کفن کھسوٹوں کی انجمن بن گئی۔ اور یہ تجربہ بری طرح ناکام رہا — موجودہ جنگ نے پھر لوگوں کی توجہ اس طرف پھیری ہے۔ اور اب ہمارے سامنے "وفاقِ عالم" کی تجویز پیش کی گئی ہے۔

ریاست کا کوئی نظام جب تک مکمل نہیں کہا جا سکتا۔ جب تک کے اوس میں بیکاری کو دور کرنے کے وسائل، اقتصادی مشکلات کا حل، شخصی آزادی، بدامنی کا انسداد، بیرونی حملوں سے بچاؤ، تمدن کی حفاظت اور معیار زندگی کو بلند کرنے کے طریقے شامل نہ ہوں

موجودہ وفاق کا نقشہ بھی اسی خاکہ پر تیار کیا گیا ہے۔ بہر حال تفصیل میں پڑنے سے قبل ایک بات جان لیجئے۔ اور وہ یہ کہ دنیا کی حکومتوں کے ایک مرکزی نظام سے الحاق کا نام وفاقِ عالم ہے۔ اس نظام سے ملحق ہر ایک ریاست داخلی معاملات میں آزاد اور خود مختار ہوگی۔ مگر نہ تو فوج رکھ سکے گی اور نہ اوس کی کوئی خارجی حکمت عملی ہوگی۔ نہ اسے کسی وفاقی ریاست کے سامان کی درآمد پر محصول لگانے کا اختیار ہوگا اور نہ ریاست جمہوری دستور کے خلاف چلے گی۔ انفرادی آزادی اور شخصی حقوق کے سلب کرنے کا اختیار بھی اسی ریاست کو نہ ہوگا۔

کیا یہ قابلِ عمل ہے؟

اس نظام پر سب سے بڑا اعتراض یہ ہو سکتا ہے۔ کہ کیا یہ تجویز کبھی قابل عمل ہو سکتی ہے؟ اور کیا مختلف اقوام مختلف فرقے، مختلف تمدن اور معاشرت کے لوگ ایک ساتھ اس نظام کے ماتحت مل سکتے ہیں۔ کیا معاشرت کا فرق، جغرافیائی حالات اس میں روک نہ ہونگے؟

اعتراض بظاہر معقول اور وزنی معلوم ہوتا ہے۔ مگر یہ اعتراض وفاقی نظام کو نہ سمجھنے کی وجہ سے ہے۔ وفاقی نظام سے ملحق ہر حکومت آزاد ہوگی۔ اور ملک اپنی زبان۔ اپنی معاشرت تہذیب۔ تجارت اور تمدن کا مالک ہوگا۔ اس مرکزی نظام کا مقصد ہرگز لوگوں کو ایک تمدن۔ ایک تہذیب اور ایک ہی معاشرت دینا نہیں۔ بلکہ یہ تو صرف اتنا چاہتا ہے۔ کہ دنیا میں امن اور انفرادی آزادی کو قائم کیا جائے۔

اعتراض کا پہلا حصہ کہ یہ کہاں تک قابل عمل ہے۔ قائم رہتا ہے۔ کیا یہ نظام بھی صرف ایک نظری تخلیق ہی نہیں؟۔ کیا یہ بھی مور کی اٹوپیا ہی نہیں —؟

ریاستہائے متحدہ امریکہ کا وفاقی نظام اس اعتراض کا عملی جواب ہے۔ امریکہ کے وفاقی نظام سے دو سال قبل ۱۷۸۷ء میں طامس پائن (اسی نظام کے بنانے والوں میں سے ایک اہم ہستی) نے لکھا تھا۔ کہ "اتنے مختلف الخیال مختلف المذہب مختلف تمدن اور معاشرت کے پیرو اور مختلف زبانیں بولنے والے لوگوں کا ایک ایسے نظام میں بندھ جانا ناممکن معلوم ہوتا ہے" — مگر کیا اب بھی کوئی اس امریکی نظام کو ناقابل عمل ناممکن اور ناکامیاب کہہ سکتا ہے؟

آج کل کوئی ایسی نئی نفسیاتی ۔ سیاسی یا معاشرتی شکل نہیں ۔ جو ۱۷۸۷ء میں امریکہ کے سامنے نہ تھی ۔

یہ نظام تو دراصل اس لئے ہے کہ مختلف قوموں اور ملکوں کو آپس میں لڑنے سے باز رکھا جائے ۔ ایک ایسی آزاد تجارت قائم کی جائے ۔ جو "حفاظتی محصول" ، اور چنگی سے مستثنیٰ ہو ۔ اور جو مقابلہ کی صحیح روح کو قائم رکھ سکے ۔ وہ تمام روپیہ جو محکمہ محصول فوج اور وزارت خارجہ پر خرچ کرتا ہے ۔ اگر ملک کی فلاح اور بہبود پر خرچ کیا جائے ۔ تو اُس ملک کے لوگوں کا معیار زندگی کتنا بلند ہو جائیگا ۔۔۔ ؟ اگر دنیا میں جنگیں اسی طرح ہوتی رہیں تو وہ تمام تہذیب ۔ تمدن جو انسانیت کا ہزاروں سال کا سرمایہ ہے ۔ بالکل ختم ہو جائیگی ۔

ایک اور اعتراض ہوتا ہے ۔ کہ کیوں نہ اسی مقصد کے لئے اشتراکی نظام قائم کیا جائے ؟ اس اعتراض کے تین حصے ہیں

(۱) جنگ سرمایہ داری کی وجہ سے ہوتی ہے ۔ اس لئے جنگ سے بچنے کا بہترین اور صحیح طریقہ یہ ہے ۔ کہ سرمایہ داری کو ختم کیا جائے ۔

(ب) اگر ایسا وفاقی نظام قائم کر دیا گیا ۔ تو انقلاب مشکل ہو جائیگا ۔ اور سماجی اصلاح بھی ناممکن ہو جائیگی ۔

(س) ایسا وفاقی نظام سرمایہ داروں کے ہاتھ میں غربا اور متوسط طبقہ پر ظلم کرنے کا ایک آلہ بنکر رہ جائیگا ۔

اعتراض کے پہلے حصے پر غور کرتے وقت یہ دیکھنا پڑیگا ۔ کہ آیا لڑائی کی وجہ سرمایہ داری ہے ۔ یا کچھ اور ۔۔۔ سر نارمن اینجل نے جو لڑائی کا نظریہ قائم کیا ہے ۔ وہ آسانی سے غلط ثابت نہیں کیا جا سکتا ۔ اور اُن کا یہ خیال کہ لڑائی کی وجہ حکومتوں کی طاقت اور طاقت کی ہوس اور اُسکی حفاظت کا خیال ہے ۔ ہر حکومت اپنا اقتدار منوانا چاہتی ہے ۔ اور اپنے آپ کو ممتاز کر کے اپنے لئے وہ حقوق حاصل کرنا چاہتی ہے ۔ جو اور حکومتوں کو حاصل نہ ہوں ۔ طاقت کی ہوس صرف جذبات کی آسودگی کے لئے ہوتی ہے ۔ سرمایہ اس کی وجہ نہیں ہوتا ۔ بہرحال اگر یہ مان بھی لیا جائے ۔ تو کیا ہر ایک حکومت اشتراکیت قبول کرے گی ۔ وفاقی نظام صرف جمہوریت اور انفرادی آزادی چاہتا ہے ۔ مگر اشتراکیت کے مطالبات بہت زیادہ سخت ہیں ۔۔۔ کیا انہیں کوئی حکومت قبول کرے گی ؟ یقیناً یہ ماننا پڑے گا ۔ کہ دنیا میں اشتراکیت کا نظام پھیلانے کی نسبت وفاقی نظام کا قیام کرنا آسان ہے ۔۔ اشتراکیت ایک تبدیلی چاہتی ہے ۔ اور بہت بڑی تبدیلی نہ صرف ہمارے طرز حکومت میں بلکہ ہماری عادتوں میں خصلتوں میں سوچنے اور غور و فکر کے طریقوں میں اور محسوسات میں ۔ غرضیکہ مکمل زندگی میں ایک انقلاب چاہتی ہے ۔ کیا یہ آسان کام ہے اسکے بالمقابل وفاقی نظام اس قسم کی تبدیلیاں نہیں چاہتا ہر شخص کو آزادی دیتا ہے ۔ اور ہر قوم اس میں آزادی کے ساتھ اپنا تمدن ۔ معاشرت اور سماجی نظام رکھ سکتی ہے ۔

(ب) انقلاب دو طرح ہوتا ہے ۔ یا تو عوام میں ان کی تکالیف اور مشکلات کی ترویج و اشاعت کی جائے اور اُن کے جذبات کو اتنا ابھارا جائے ۔ کہ اسکے ذریعہ انقلاب ہو جائے ۔ جیسے روس میں ہوا ۔ یا پھر حالات خود اتنے ناقابل برداشت ہو جائیں ۔ کہ لوگ زندگی سے بالکل مایوس ہو جائیں ۔ زندگی میں اُنکے لئے کشش باقی نہ رہے ۔ بھوکے مرنے لگیں ۔ اور انسانی آسائشوں سے بالکل محروم کر دیئے جائیں تب انقلاب ہو سکتا ہے ۔ انقلاب فرانس اس کی مثال موجود ہے ۔ اگر ایسے ناقابل برداشت حالات وفاقی نظام میں پیدا نہ ہو سکیں ۔ تو گویا یہ تو وفاقی نظام کی تعریف ہوئی نہ کہ خرابی ۔۔۔ رہی سماجی خرابی تو اُس کا راستہ کھلا ہے ۔۔۔ وفاقی نظام نہ تو کسی ایسی تحریک کو روکتا ہے ۔ اور نہ اُسکی کسی طرح سے

حوصلہ شکنی کرتا ہے۔

(۳) کیا حقیقتاً یہ نظام سرمایہ داروں کے ہاتھوں میں عوام پر ظلم کرنے کا ایک آلہ ہوگا؟ یہ اعتراض حقیقتاً سب سے زیادہ غیر معقول ہے ۔۔۔ وفاق عالم کے دستور میں سب سے پہلی چیز "انسانی حقوق کا منشور" ہے۔ اسکے گیارہ نکات دراصل انسانی آزادی کا سب سے بڑا معاہدہ ہیں۔ یہ منشور دراصل میگنا کارٹا، بل آف رائٹس اور ہیبس کارپس کا نچوڑ ہے پچھلے دنوں ٹائمز میں کچھ مراسلات شائع ہوئے تھے۔ ان ہی میں سے ایک مراسلہ ایچ۔ جی۔ ویلز کا تھا۔ مسٹر ویلز نے انسانی حقوق کا ایک منشور پیش کیا تھا۔ اور مناسب ہوگا۔ اگر اُس کا بھی اسی مضمون میں تذکرہ کردیا جائے۔ اگرچہ یہ منشور وفاق عالم کے موجودہ دستور میں شامل نہیں۔ لیکن اگر یہ بہتر ہو تو کوئی وجہ نہیں۔ کہ اسے دستور میں شامل نہ کرلیا جائے۔

منشور یہ ہے:۔

۱۔ ہر شخص کو بلا رنگ و نسل کی تخصیص کے کھانے کپڑے راحت و آرام اور صحت برقرار رکھنے کی تمام آسائشیں حاصل کرنے کا پورا حق ہوگا

۲۔ اسے ایک اچھا شہری بنانے کے لئے معقول تعلیم دی جائے گی۔ اوسے ہر قسم کی معلومات حاصل کرنے کی پوری آزادی حاصل ہوگی۔

۳۔ اوس کی تمام جائداد اور ملکیت جو اُس نے جائز طریقے سے حاصل کی ہے۔ بالکل محفوظ رہے گی۔

۴۔ ہر شخص کو جائز نکتہ چینی اور تنقید کا حق حاصل ہوگا لیکن کوئی شخص کسی دوسرے شخص کے متعلق جھوٹی باتیں ہتک آمیز فقرات۔ یا اس قسم کی اور تکلیف دہ باتیں نہ کرسکیگا حکومت کے دفاتر میں کسی شخص کے متعلق ایسی خفیہ تحریریں اور ریکارڈ نہ ہونگے جنہیں وہ دیکھ نہ سکے۔ اگر اُن کی صداقت میں شبہ ہو تو اسے ان تحریرات کے ثبوت طلب کرنے کا حق ہوگا ۔۔۔ یہ تحریریں کسی مقدمہ میں بلا ثبوت کے کام نہ آسکیں گی

۵۔ اوسے ہر قسم کا کام کرنے کی اجازت ہوگی۔ اور کام کی نوعیت کے لحاظ سے پوری اُجرت وصول کرنے کا حق ہوگا۔

۶۔ وہ دنیا کے ہر حصے میں آجاسکے گا۔ پاسپورٹ اور ویزا کی قیود سے آزاد ہوگا۔ لیکن اسکا گھر اوسکا محفوظ "قلعہ" ہوگا جس میں کوئی داخل نہ ہوسکے گا۔

۷۔ اُسے دنیا کی ہر جائز چیز بیچنے اور خریدنے کا حق ہوگا لیکن وہ کوئی چیز اتنی بڑی تعداد میں خرید و فروخت نہیں کر سکتا۔ جس سے اوروں کو نقصان پہنچنے کا احتمال ہو۔

۸۔ کسی کو تین ہفتہ سے زیادہ بلا جرم بتائے قید نہیں کیا جاسکے گا ۔۔۔ اور کوئی شخص بلا سماعت تین مہینہ سے زیادہ قید نہیں کیا جاسکے گا۔

۹۔ کسی آدمی کے ناک، کان یا اعضا نہیں کاٹے جائینگے اُسے مارا پیٹا نہیں جاسکتا۔ یا اور کوئی جسمانی تکلیف نہیں پہنچائی جاسکتی۔ نہ قید تنہائی میں رکھا جاسکتا ہے۔ اور نہ اس قسم کی کوئی اور ذہنی تکلیف پہنچائی جائے گی۔ زیادہ سے زیادہ سزائے قید پندرہ برس با مشقت یا پھانسی کی سزا ہوگی۔

۱۰۔ یہ تمام حقوق باقاعدہ ایک قانون کی صورت میں تبدیل کردئے جائیں گے۔ اور اس قانون کی خوب اچھی طرح اشاعت کی جائے گی۔

وفاقی نظام کا دستور

آیئے اب اسکے دستور پر ذرا نظر ڈالیں۔ وفاقی نظام کے تمام ممالک اپنی حکومت جمہوری نظام کے ماتحت سنبھالیں گے۔ داخلی پالیسی انکے ہاتھ نہیں ہوگی ۔۔۔ وفاقی ممالک کے تمام باشندے ہر ملک میں بلا پاسپورٹ آجا سکینگے۔ جہاں چاہیں رہ سکتے ہیں ان ممالک کے درمیان میں تجارت آزاد ہوگی۔

یونین کی حکومت ایک کانگریس کے ہاتھ میں ہوگی جسکے دو ایوان ہونگے۔ ہاؤس آف ڈپٹیز اور سینٹ۔ ہر شخص کو حقِ انتخاب ہوگا۔ پہلے ایوان کے لئے پچیس برس کی عمر اور دوسرے ایوان کے لئے تیس برس کی عمر ضروری ہے

ہر دس لاکھ آدمیوں میں سے ایک ڈپٹی اور ڈھائی کروڑ آدمیوں میں سے ایک سینیٹ کا ممبر منتخب ہوگا۔ تمام کام چلانے کے لئے پانچ آدمیوں کا ایک بورڈ ہوگا۔ ان میں سے تین کو عوام منتخب کرینگے۔ ایک ممبر ہاؤس آف ڈپٹیز کا اور ایک سینٹ کا منتخب کیا ہوا ہوگا۔

یہ ہے اس تجویز کا مختصر سا خاکہ۔ ظاہر ہے۔ کہ یہ ابھی بالکل ہی ابتدائی حالات میں ہے۔ جو کچھ اس میں خامیاں ہیں۔ ان سے بھی انکار نہیں۔ بہر حال یہ خیال ایک بار پھر دعوتِ فکر دیتا ہے ضرورت ہے کہ ہم اس پر سوچیں۔ اور اسے زیادہ سے زیادہ عملی جامہ بنانے کی کوشش کریں۔

اس نظام کی تائید میں سب سے زیادہ آوازیں انگلستان سے اٹھ رہی ہیں۔ مسٹر ایچ۔ جی۔ ویلز بڑے زور شور سے اپنے منشور کی اشاعت کر رہے ہیں۔ انگلستان کا مشہور جریدہ جب تک مسٹر ورنان بارٹلیٹ۔ ایم۔ پی کی ادارت میں نکلتا رہا۔ اس کا ترجمان رہا۔ اور تو اور جب فرانس نے جرمنی کے آگے ہتھیار ڈالے۔ تو برطانوی حکومت نے بھی فرانس کو اسی قسم کی ایک وفاقی پیش کش کی۔ مگر برطانیہ اس قسم کا ایک وفاقی نظام قبول کر کے اپنی مستعمرات ختم کر دے گا۔ کیا شہنشاہیت کا یہ بلند قصر وفاقِ عالم کی نذر کر دیا جائیگا؟

بہت سے انگلستان کے مدبرین کا یہ خیال ہے۔ اور جارج برنارڈ شا نے تو کئی بار ظاہر کیا ہے کہ انگلستان اور ریاستہائے متحدہ امریکہ کا مستقبل میں الحاق ہو جائے گا۔ اگر کسی وفاقی نظام کے ماتحت ایسا ہوا تو کیا "برطانیہ عظمیٰ" کی ایک دوسرے درجہ کی حیثیت نہ رہ جائے گی؟ کیا معیارِ انسانیت کو بلند کرنے کے لئے برطانیہ، امریکہ اور فرانس قربانی کے لئے تیار ہونگے؟

ان سوالوں کے جواب کی ابھی دنیا منتظر ہے۔

احمد ندیم قاسمی

گاؤں کی شام

دھندلکے پربتوں پر چھا رہے ہیں — اُجالے کے کنول کملا رہے ہیں
گپھاؤں میں کہیں ننھے گڈریے — جوانی کے ترانے گا رہے ہیں
اندھیری کھوہ میں بھیڑوں کے ریوڑ — بھُٹھر کر ٹھنڈ سے ممیا رہے ہیں
فضاؤں میں حسیں پر پھڑپھڑاتے — پرندے گھونسلوں میں آ رہے ہیں
دھوآں گاؤں پہ پھیلا جا رہا ہے — نظر سے کھیت چھپتے جا رہے ہیں
افق کے پاس اِکے دُکے تارے — اندھیرے سے اُبلتے آ رہے ہیں
معطر وادیوں کے مست جھونکے — فرازِ کوہ کو مہکا رہے ہیں
کہیں کوئل دمادم کوکتی ہے — کہیں ڈڈے بہم چلّا رہے ہیں
وہ لہراتی ہوئی پگڈنڈیوں پر — مسافر سر جھکائے جا رہے ہیں
مسافر؟ — اے نگاہِ بادہ آشام — یہ تجھ پر نشے سے کیوں چھا رہے ہیں

اِنہیں بے گار میں پکڑا گیا ہے
یہ سب بے چارے تھانے جا رہے ہیں

مسعود احمد قریشی

تمہید ادب پر ۔

فیض کی شاعری

قدرت نے ہر زندہ چیز میں بڑھنے اور پھولنے پھلنے کا مادہ ودیعت کیا ہے۔ دراصل پھولنا پھلنا ہی زندگی ہے۔ اور اس سے محرومی گویا موت کی نشانی ہے۔ اردو زبان بھی ایک جیتی جاگتی زبان ہے۔ اور چونکہ ابھی عالم شباب میں قدم رکھ رہی ہے۔ اس میں بڑھنے کا مادہ دنیا کی اور زبانوں کی طرح موجود ہے۔ یہاں تک کہ ہر لحہ اسکے رنگ روپ پر ایک نئی کیفیت نظر آتی ہے۔ ہم اس کیفیت کو ابھی اچھی طرح سمجھ کر اسکو کوئی نام بھی نہیں دینے پاتے۔ کہ ایک اور تبدیلی پیش نظر ہوتی ہے۔ اردو ادب اور پھر خاص طور پر شعری ادب تیزی سے اپنی تکمیل کے لئے سوئے منزل رواں ہے۔ اگر ادیب ذرا بھی قدامت پسند واقع ہوا ہو۔ تو اسکے دوران حیات میں ہی جب اسے حسن کو ایک تنقیدی نظر سے دیکھتا ہے تو اپنے متین نازو انداز دیکھ کر وہ خود ہی جھینکا سا ہو جاتا ہے اور ناپ شناپ باتیں کرنے سے جھجک کر پیچھے ہٹ جاتا ہے۔ موجودہ دور ظاہری اور معنوی دونوں لحاظ سے ایک جداگانہ دور ہے۔ معنوی لحاظ سے یہ زیادہ مختلف ہے۔ ادب کا بنیادی تصور ہی بدل چکا۔ اور اس انقلاب میں جس مشاطہ کا ہاتھ بالکل نمایاں طور پر نظر آ رہا ہے وہ نظریہ اضافیت ہے۔ اس نظریے نے صرف اس کی آرائش و زیبائش کو ہی نظر فریب نہیں بنایا۔ بلکہ عملی جراحی سے اس کے خد و خال تک کو بدل کر رکھ دیا ہے۔ یہ نظریہ آئین سٹائین کا نظریہ اضافیت نہیں۔ بلکہ زندگی کے ناقد کا اضافی نظریہ ہے جو ہر شے پر حاوی ہے۔ زمانہ سلف میں تو ہر شے کا تصور مطلق تھا۔ یعنی ہر شے اپنے اپنے ماحول میں بالکل آزاد تھی دوسرے لفظوں میں فن برائے فن کا نظریہ اُن ادیبوں کی اختراع تھی جو بزدلی اور پست ہمتی کی وجہ سے زندگی کے تلخ حقائق کا مقابلہ نہ کر سکتے تھے۔ اسلئے گریز پر مائل ہوئے۔ اور ادب کو زندگی سے بالکل علیحدہ کر کے اس کی حسین خوابگاہوں میں پناہ لینے لگے۔ اس نظریے کو کم ہمت ادیبوں میں بہت فروغ حاصل ہوا۔ اور اگر کسی شاہین جگر ادیب نے کبھی اسکے خلاف آواز اٹھائی بھی۔ تو گدھوں کے اس گروہ نے اپنی مکروہ چیخوں سے اُس کی آواز کو بالکل دبا دیا۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارا پرانا ادب ایک حد تک بے جان، ناکارہ اور دماغی عیاشی بنکر رہ گیا۔ ملک اور قوم تو کیا خود ادیب اس سے بیگانہ تھا۔ یہاں تک کہ عشق و حسن کے تمام قصے بھی بالکل فرضی اور تصنع تھے۔ اور اس داغ سے کسی میر، سودا، ذوق یا غالب کا دامن پاک نہیں۔ گو یہ چیز بہت تلخ ہے اور ماننے کو دل نہیں چاہتا لیکن حقیقت کو ہم ماننے پر مجبور ہیں۔ آخر یہ پردۂ فریب چاک ہو کر رہا۔ اور اضافی نظر دوسرے شعبوں کی طرح ادب پر بھی اثر انداز ہوا اب ہر شے اپنی تکمیل کے لئے دوسری شے کی محتاج ہے۔ مذہب سیاست کا محتاج، سیاست اقتصادیات کی، اقتصادیات سماج کی اور سماج مذہب کی، اسطرح ایک ازلی دایرہ بن چکا ہے۔ اس نظریے کے ماتحت ہمارا ادب بھی انفرادی طور پر ان تمام شعبوں اور پھر ان کے مجموعے یعنی زندگی سے بیگانہ نہیں رہ سکتا۔ پرانے ادب اور ترقی پسند ادب میں بنیادی طور پر بڑا فرق یہی ہے کہ جہاں ایک اپنے ماحول میں بالکل آزاد اور الگ تھلگ تھا۔ وہاں دوسرا زندگی سے متاثر ہوتا ہے اور زندگی کو متاثر کرتا ہے۔

اردو شاعری کا موجودہ دور اپنی خصوصیات کی وجہ سے ایک ممتاز حیثیت رکھتا ہے۔ ظاہری لحاظ سے بھی اور معنوی لحاظ سے بھی اس وقت دو بڑے گروہ ہیں۔ دونوں اپنے اپنے نظریوں کا اظہار بڑی شد و مد سے کر رہے ہیں۔ اور اپنی اپنی روش پر قائم رہتے ہوئے مستقبل کو اپنے ہاتھوں میں لینے کی کوشش میں مصروف ہیں۔ ایک گروہ کہتا ہے۔ کہ ہمیں اپنی پرانی طرز پر قائم رہتے ہوئے ہی ترقی کی طرف قدم اٹھانا چاہیئے۔ ردیف قافیہ کی پابندی اور اوزان کی قیود ہی ہونی چاہیئے تاکہ ہم اپنے ماضی سے بالکل ہی کٹ کر نہ رہ جائیں۔ اکثریت ابھی تک اسی نظریے کو اپنائے ہوئے ہے۔ یہ بات کسی حد تک ٹھیک بھی ہے۔ زندگی اپنی تکمیل کے لئے ہر وقت تغیر پذیر رہتی ہے۔ لیکن بڑے بڑے انقلاب پسند دماغ بھی بشرطیکہ اُن کا مقصد تعمیری ہو۔ ماضی سے یک لخت قطع تعلق نہیں کر سکتے۔ کیونکہ ماضی کے بغیر مستقبل ایک بے معنی سی چیز ہے۔ یہ قانونِ قدرت ہے۔ کہ ماضی اور مستقبل حال کی کڑی کے ذریعے ایک ہی سلسلے میں منسلک نظر آئیں۔ اور اس طرح ماضی اپنا زور اور زندگی مستقبل کی نذر کرتی رہے دوسرا گروہ ان پابندیوں سے یکسر بے نیاز ہو کر شاعری کو مغربی طرز اور نئی نئی روشوں پر ڈالنے کے لئے تلا ہوا ہے۔ اور آجکل یہ تحریک پھر بڑے زور شور سے اٹھی ہے۔ معنوی لحاظ سے بھی یہی دو گروہ ہیں۔ پہلا گروہ کہتا ہے۔ کہ حسن و عشق کی دنیا کا اس دردکی ماری دنیا سے کوئی تعلق نہیں۔ اور اُس دنیا کے خالق اور نقیب یعنی شاعر کو بھی اس دنیا کی کشمکش سے بے نیاز رہ کر اپنی مخصوص آواز میں پیغام بقا دیتے رہنا چاہیئے۔ کیونکہ دنیا اس کشمکش سے اُسی وقت نجات پا سکتی ہے۔ جب وہ ان لافانی نغموں کو اپنا رہبر بنائے۔ دوسرا گروہ کہتا ہے۔ کہ ہمیں ہر ہر لفظ سے یہ ظاہر کر دینا چاہیئے۔ کہ ہم اسی دنیا کے رہنے والے ہیں۔ اور اس کی تقدیر بنانے اور اسکو صراطِ مستقیم پر چلانے کے اتنا ہی ذمہ دار ہیں۔ جتنا کوئی اور بلکہ سب سے زیادہ۔ اُس کے دکھوں کو دور کرنے کے لئے ہمیں کوئی تخیلاتی نہیں۔ بلکہ حقیقی راستہ تلاش کرنا ہے۔ فیضؔ ان دونوں گروہوں کے درمیان ارتقائی کڑی ہے۔ وہ پہلے گروہ سے بہت گہرا روحانی تعلق رکھتا ہے۔ اس لحاظ سے فیضؔ اپنے زمانے کا نمایندہ شاعر ہے۔ کیونکہ ایک ناقد فیضؔ کے کلام سے اس دور کے ادب کے مختلف پہلوؤں کا جائزہ بڑی آسانی سے لے سکتا ہے۔ وہ ردیف و قافیہ کا پابند بھی ہے اور آزاد بھی۔

فیض نے ماضی اور مستقبل کے امتزاج سے اپنے لئے ایک نئی راہ ایجاد کر لی ہے۔ معنوی لحاظ سے اُس کی شاعری اُس انقلابِ عظیم کی حامل ہے جو تجسس پسند اور بلند ہمت طبائع کے سینوں میں پرورش پا کر دنیا کو بدل دیتا ہے۔ لیکن ظاہری لحاظ سے مشرق اور مغرب یا ماضی اور مستقبل کا ایک لطیف امتزاج ہے۔ دونوں اپنی اپنی خوبیوں کو لئے ایک دوسرے میں مدغم ہوتے جاتے ہیں۔ اور ایک زوردار حال پیدا ہو جاتا ہے جو زندگی کی تر و تازگی لئے ہے۔

فیضؔ کے دل میں موجودہ ماحول اور سماجی نظام کے سنہری طلسم کو توڑنے کی آرزو ہمیشہ کروٹیں لیتی رہتی ہے۔ وہ اس فضا کو یکسر بدل دینا چاہتا ہے جہاں غریب کو زندہ رہنے کا حق حاصل نہیں۔ یہ جذبہ اُسکے دل میں روز بروز ایک شدت اختیار کرتا جاتا ہے۔ وہ کبھی کبھی اُس جذبے کی تلخیوں سے بچنے کے لئے حریم دوست کی رنگین فضاؤں میں کھو جانا چاہتا ہے۔ لیکن یہ جذبہ اُسکے دل و دماغ پر اس طرح مسلط ہو چکا ہے۔ کہ یہ رنگین فضائیں بھی اُسکے اثر سے مسموم ہو جاتی ہیں۔ اور وہاں ویرانی اور اداسی کے سوائے کچھ باقی نہیں رہتا۔ اُس کی محبوبہ کی بے بسی کا خیال اُس کو تمام دنیا کی مجبوریوں اور لاچاریوں کی یاد دلا دیتا ہے۔

اسکے پیش نظر رومانیت کے حسین ولطیف پردوں پر تڑپتی ہوئی انسانیت ہے جو قانونِ تقابل (LAW OF CONTROST) سے ہمیں بیاور بھی بھیانک نظر آتی ہیں۔ہم اس ظالم ماحول کو جسکے شکنجے میں انسانیت پسی جارہی ہے۔بدلنے پر کمربستہ ہوجاتے ہیں یہ اندازِ گریز فیضؔ کی طبع ثانی بن چکا ہے۔وہ حسن کی پائیداروں بہاروں غمِ الفت کی مصائب فرسایوں اور محبوبہ کی کھوئی ہوئی ساحر آنکھوں کا ذکر چھیڑ کر زندگی کے سیہ خانوں میں لے جاتا ہے۔وہ سرمایہ داری کی بھیانک تصویر دکھاتا ہے۔وہ سرمایہ دار کو نہیں مٹانا چاہتا بلکہ اُس سرمایہ داری کو مٹانا چاہتا ہے۔جس کی شراب سے بدمست ہوکر انسان ۔۔ درندہ بنجاتا ہے۔وہ سرمایہ دار اور مزدور، امیر اور غریب میں نفرت کا بیج بو کر اُن کو ایک دوسرے کا دشمن نہیں بنانا چاہتا جس سے خانہ جنگی ہو اور دونوہی مٹ جائیں وہ سرمایہ دار اور مزدور کو اس صیاد ماحول کے دو شکار سمجھتا ہے۔فرق صرف یہ ہے۔کہ ایک شکار کو صیاد نے کچھ ڈھیل دے دی ہے تاکہ اس کو آلۂ کار بنا سکے۔اور اُس کی آڑ میں دوسرے پر ظلم وستم کر سکے۔وہ سرمایہ داری کو ایک دلفریب طلسم سمجھتا ہے جس میں دونوہی پھنس چکے ہیں۔ایک اسیرِ فریفتہ ہو کر اور دوسرا مجبور اً۔وہ دونوں سے اظہارِ ہمدردی کرتا ہے۔مزدور سے زیادہ کیونکہ وہ اس صیاد کا بے بس شکار ہے۔وہ سرمایہ داری کو اِن الفاظ میں بیان کرتا ہے:-

ان گنت صدیوں کے تاریک بہیمانہ طلسم
ریشم واطلس وکمخواب میں بنوائے ہوئے

فیضؔ کے خیال میں دنیا کو برائیوں سے پاک کرنے کے لئے کسی جرنیل یا سیاست داں کی ضرورت نہیں۔وہ علامہ اقبال مرحوم کے نظریے کا قائل ہے:- "ضمیرِ امتاں را می کند پاک کلیمے یا حکیمے نے نوازے"

وہ شیلے کی طرح اس بات کا قائل ہے۔کہ دنیا کسی پریمی کی منتظر ہے۔جس کے سامنے وہ اپنی بنیادی غلطیاں اور اندرونی برائیاں کھول کر رکھ دے گی۔جو اپنی ناکام محبت میں ایسے ایسے تجربات حاصل کر چکا ہوتا ہے۔جو کسی دوسرے کے بس کی بات نہیں۔وہ "رقیب" والی نظم میں اس گمنام، بے وجود اور بے نشان ہستی کو تقلید کورانہ کی وجہ سے اس قدر صلواتیں سنائی جاچکی ہیں۔ان الفاظ میں مخاطب کرتا ہے!

آکہ وابستہ ہیں۔اُس حسن کی یادیں تجھ سے۔
جس نے اس دل کو پری خانہ بنا رکھا تھا۔

سب چونک پڑتے ہیں۔یہ عجیب بات کیا ہوئی؟ یہ اخوت! اور رقیب کے ساتھ!! لیکن وہ تمام دنیا اور فرسودہ رسموں سے بے پروا ہو کر کہے جاتا ہے۔

آشنا ہیں ترے قدموں سے وہ راہیں جن پر
اُس کی مدہوش جوانی نے عنایت کی ہے۔
کارواں گزرے ہیں جن سے اُسی رعنائی کے
جس کی ان آنکھوں نے بے سود عبادت کی ہے،

کیا یہی وہ وجہ نہیں جس نے آجتک مقلد شعرا کے بھیانک جذبات کو رقابت پر آمادہ کیا۔اور وہ اپنے خیالی تیروں سے رقیب

کے نام کو جھیلنی کرنے کو کامیابی سمجھنے لگے۔ فیض اُس کو بتاتا ہے کہاں دونوں کا آپس میں ایک خاص اور گہرا تعلق ہے یعنی:۔

"تجھ سے کھیلی ہیں وہ محبوب ہوائیں جن میں — اُسکے ملبوس کی افسردہ مہک باقی ہے۔
تجھ پہ برسا ہے اُسی بام کے مہتاب کا نور — جس میں بیتی ہوئی راتوں کی کسک باقی ہے"

اور اس سے بھی بڑھ کر تو اُس کا رازداں ہے۔ تجھے ہر بات معلوم ہے۔ شاعر کے لئے رقیب قابل پرستش ہو چکا ہے کیونکہ اُس کو وہ مسرتیں حاصل ہو چکی ہیں جن کی تمنا میں ہی اُس کی زندگی مٹ گئی۔

"تو نے دیکھی ہے وہ پیشانی، وہ رخسار وہ ہونٹ — زندگی جنکے تصور میں لٹا دی ہم نے
تجھ پہ اٹھی ہیں وہ کھوئی ہوئی ساحر آنکھیں — تجھ کو معلوم ہے کیوں عمر گنوا دی ہم نے"

یہاں تک اُن کے ذاتی معاملات تھے۔ جن کی یاد دلا کر وہ رقیب کو اپنا بنا چکا ہے۔ لیکن یہ اُس کی منزل تو نہیں۔ ایک فرد واحد کی ہمدردی اُسکے لئے کیا وقعت رکھتی ہے۔ وہ تو ناکام الفت ہو کر خود کو دنیا کے لئے وقف کر چکا ہے۔ رقیب کی ہمدردی ابھی تک صرف اُس کی اپنی ذات تک محدود ہے۔ اس سے دنیا کو کیا فائدہ اُسے تو دنیا کو سدھارنا ہے۔ اس لئے وہ پہلی کوشش میں کامیاب ہو کر پلٹا کھاتا ہے۔ ذاتی باتوں کو چھوڑ دیتا ہے اور عام انسانی ہمدردی کے جذبات کو تحریک دیتا ہے۔

ہم پہ مشترکہ ہیں احسان غم الفت کے — اتنے احسان کہ گنواؤں تو گنوا نہ سکوں

اور وہ احسان کیا ہیں، شاعر نے عشق میں کیا سیکھا ہے؟

عاجزی سیکھی غریبوں کی حمایت سیکھی — یاس و حرمان کے دکھ درد کے معنی سیکھے
زیر دستوں کے مصائب کو سمجھنا سیکھا — سرد آہوں کے رخ زرد کے معنی سیکھے

فیض محبت کو ایک بے کار عیاشی اور فضول جذبہ نہیں سمجھتا۔ انسان کی آپس کی محبت بھی اُسکے لئے اتنی ہی اہم، حقیقی اور ضروری ہے جتنے دنیا کے اور "اہم مسائل"، بلکہ اُن سے بھی زیادہ ضروری۔ وہ اس سایوں کی دنیا میں اس حقیقت کے پرتو سے ان تمام مسائل کو بدل سکتا ہے۔ محبت کے غم، خوشیاں، تغیر اور واقعات کے ساتھ اُن کا تعمیری یا تخریبی تصادم اس کے کلام کا بنیادی اور مرکزی عنصر ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ہے۔ وہ اس تصادم اور اسکے نتائج کو ایک عمیق تنقیدی نظر سے دیکھتا ہے۔ جس میں اُس کی فلاسفی اور گہری سوجھ کی آب ہوتی ہے۔ وہ اس محبت کا پرستار ہے جو ایک بے پناہ خاموش قوت کی مالک ہے۔ جو بزدلوں کی طرح ایک خیالی فردوس کے خواب نہیں دیکھتی۔ جس کی نظریں افق پار کی رنگین دنیا کی تلاش میں سرگرداں نہیں بلکہ اس دنیا کو اپنی دلی خواہشات کے مطابق ڈھال کر اسی کو فردوس بناتی ہے۔ جو اس ماحول سے آزاد ہو کر ایسی فضا کی تخلیق کرتی ہے جو اُسکے قدرتی نشو و نما میں ممد و معاون ثابت ہو۔ وہ دنیا کی قسمت بنانے میں دوسروں سے بڑھ چڑھ کر حصہ لیتی ہے بمصروف عمل رہتی ہے۔ اور ساتھ ہی ساتھ افسردہ طبیعتوں کو شاندار مستقبل کی جھلک دکھا کر حوصلہ دیتی جاتی ہے۔ ایسی ہی محبت کی ایک جھلک ہم تنہائی میں دیکھتے ہیں۔ جہاں شاعر پہلے اپنی محبوبہ کو اپنے ڈگمگاتے ہوئے "آج" کا نقشہ دکھاتا ہے:۔

چند روز اور مری جان فقط چند ہی روز — ظلم کی چھاؤں میں دم لینے پہ مجبور ہیں ہم

چند روز اور ستم سہہ لیں تڑپ لیں رو لیں — اپنے اجداد کی میراث ہے معذور ہیں ہم

اور یہ ناجائز پابندیاں اس قدر سخت ہو چکی ہیں کہ :-

جسم پر قید ہے جذبات پہ زنجیریں ہیں — فکر محبوس ہے گفتار پہ تعزیریں ہیں۔
زندگی کیا کسی مفلس کی قبا ہے جس میں — ہر گھڑی درد کے پیوند لگے جاتے ہیں

اپنی ہمت ہے کہ ہم پھر بھی جئے جاتے ہیں۔

لیکن وہ مایوس ہونا تو جانتا ہی نہیں۔ اسے حق کی فتح کا اس قدر پختہ یقین ہو چکا ہے۔ کہ وہ ان پابندیوں کو صرف چند روزہ سمجھتا ہے۔ اور اپنی محبوبہ کو ان الفاظ میں تسلی دیتا ہے۔ اور اپنے عزم آہنیں کا اظہار کرتا ہے۔

لیکن اب ظلم کی میعاد کے دن تھوڑے ہیں — اک ذرا صبر کہ فریاد کے دن تھوڑے ہیں
عرصۂ دہر کی جھلسی ہوئی ویرانی میں — ہم کو رہنا ہے پہ یونہی تو نہیں رہنا ہے
اجنبی ہاتھوں کا بے نام گرانبار ستم — آج سہنا ہے ہمیشہ تو نہیں سہنا ہے

فیضؔ شاعرِ امید ہے۔ وہ نا امید ہونا نہیں جانتا۔ فیض مایوسی کی تاریکیوں میں گھرا ہوا بھی شعاعِ امید اور فریبِ تسلی، کا منتظر رہتا ہے۔ وہ بربادی میں آبادی کا رنگ تلاش کرتا ہے۔ اور اکثر آمادہ ہو کر یہ معلوم کرنا چاہتا ہے۔ کہ بربادی کی تکمیل میں کہاں تک کمی رہ گئی ہے۔ اور جب اس کو کوئی کسر نظر آ جاتی ہے۔ تو اس کو کچھ اس طرح اجاگر کرتا ہے۔ کہ دنیا سچ مچ دھوکا کھا جاتی ہے۔ وہ خود اپنے دل کو بھی فریب میں مبتلا کر لیتا ہے۔

وہ جانتا ہے۔ کہ دنیا خود ہی اپنے بوجھل دکھوں کے نیچے اس قدر دبی جا رہی ہے۔ کہ اسکے بے پایاں غم کی تاب بالکل نہ لا سکے گی۔ وہ قربانی پر تیار ہو جاتا ہے۔ اور اس غم کو اپنے دل میں ہی چھپائے رکھنے کی خطرناک سعی میں مصروف ہو جاتا ہے۔ اور دنیا کو خوش رکھنے کی پوری کوشش کرتا ہے۔ وہ اس بات کا غم نہیں کرتا۔ کہ اس کا آشیاں جل گیا۔ بلکہ اس بات پر خوش ہے کہ وہ شاخ تو ابھی سلامت ہے جس پر اسکا آشیاں تھا۔ وہ اس حقیر سی خوشی کو اپنے شاعرانہ اندازِ بیان اور الفاظ کے حسین طلسم میں پابند کر کے اس قدر وسعت دیتا ہے کہ وہ اسکے بے پایاں غم پر چھا جاتی ہے۔ اور پڑھنے والا محسوس کرتا ہے۔ کہ واقعی شاعر کے پاس ابھی وہ چیز باقی ہے۔ جس پر وہ ناز کر سکتا ہے۔ "رہگذر"، میں وہ اپنے محبوب کی جدائی کو بھولنے کی کوشش کرتا ہے۔ وہ کسی لاثانی حسن کے کھوئے جانے کے تلخ تاثرات سے امان پانا چاہتا ہے۔ وہ اُس جنتِ ارضی کی ایک جھلک دکھاتا ہے جس میں کبھی بستا تھا۔ کبھی وہ چونک اٹھتا ہے۔ اُس کا دل غم کے بوجھ تلے دب جاتا ہے۔ کیونکہ وہ حسن تو اب خواب ہو چکا۔ وہ اس انکشافِ حقیقت سے پژمردہ ہو جاتا ہے۔ لیکن یک دم ایک تازہ جوش سے اُٹھتا ہے۔ دنیا تو پہلے ہی دکھ درد سے لبریز ہے اسکے اتنے بڑے غم کو کیسے سہہ سکے گی، وہ دنیا کو فریب دینے پر آمادہ ہو جاتا ہے۔ اتنے بڑے غم کو رازداں کی پژمردگی کے خوف سے اپنے دل میں ہی دبا لیتا ہے۔ اس غم میں خوشی کو تلاش کرتا ہے۔ اور بتا کر اس بربادی کی تکمیل میں جو تھوڑی بہت کسر رہ گئی ہے۔ اسے ڈھونڈتا ہے۔ اور کامیاب ہو کر پکار اٹھتا ہے :-

غرض وہ حسن جو محتاجِ ننگ و نام نہیں — وہ حسن جس کا تصور بشر کا کام نہیں

کسی زمانے میں اس رہگذر سے گزرا تھا　　بصد غرور و تجمل ادھر سے گزرا تھا ۔
اور اب یہ رہگذر بھی ہے دلفریب و حسین　　ہے اس کی خاک میں کیف شرابِ شعر مکیں
ہوا میں شوخیٔ رفتار کی ادائیں ہیں　　فضا میں نرمیٔ گفتار کی نوائیں ہیں
غرض وہ حسن بھی اس جا کا جزوِ منظر ہے
نیازِ عشق کو اک سجدہ گاہ میسر ہے

جنسی احساسات کے لطیف اور نازک تاروں کو ٹٹولنا اور پھر اُن کو پوری طرح قدرت کے ساتھ سنبھالنا اور اُن کے موزوں اور ہم آہنگ نغمات پیدا کرنا فیضؔ کا خاص آرٹ ہے۔ اُس کی تمام تر شاعری فطری جذبات پر کسی نامعلوم پابندی کے خلاف ایک پیہم احتجاج ہے۔ سنگین لیکن مخمل میں لپٹا ہوا۔ وہ بے اختیار بھیانک قہقہے لگانا شروع کر دیتا ہے۔ اُسے اپنی تمام زندگی میں جو ایک طویل شبِ فراق کی مانند ہے۔ خوبیٔ قسمت سے وصل کا ایک لمحہ میسر آ گیا۔ اُس کی محبوبہ ماضی کی متواتر ناکامیوں اور مستقبل کے خوف سے سہمی ہوئی ہے۔ شاعر کے دل سے ہوک سی اٹھتی ہے:۔

آج کی رات سازِ درد نہ چھیڑ۔
دُکھ سے بھرپور دن تمام ہوئے　　اور کل کی خبر کسے معلوم ؟
مٹ چکی ہیں حدودِ فردا و دوش　　ہو نہ ہو اب سحر کسے معلوم ؟
زندگی ہیچ لیکن آج کی رات　　ایزدیت ہے ممکن آج کی رات
آج کی رات سازِ درد نہ چھیڑ

اسکے بعد وہ اپنی محبوبہ کو غمِ ماضی اور فکرِ فردا کو بھول جانے کا مشورہ دیتا ہے۔ اُسے اب ماضی کی رنگین شکایتوں اور شکووں کا بھی ذکر گوارا نہیں کیونکہ یہ بھی تو آخر سازِ درد ہی ہیں۔ اور ان کے چھیڑنے سے اس حسین فضا کے مسموم ہو جانے کا خطرہ ہے۔ یہ دو بند کی مختصر سی نظم میں حُسن کی مسرتیں، حیات کا اختصار، درد و الم کے طویل عرصہ میں خوشی کی ایک لمحے کی چمک نمایاں ہے یہ تمام باتیں اپنی انفرادی حیثیت میں نہیں۔ بلکہ ایک مجموعی کیفیت کی صورت میں اُسکے احساسات پر چھا جاتی ہیں۔ اور یہی وہ کیفیت ہے۔ جو فیضؔ کے فطری حزن و ملال اور احساسِ ناکامی کے باوجود اُس کا سرمایہ حیات ہے۔

آج کل حزنیہ ادب اور خصوصاً حزنیہ شاعری کو کوسنا ایک فیشن ہو گیا ہے۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے۔ کہ آجتک اردو شاعری کا متاعِ حیات صرف آنسو اور آہیں ہی ہیں۔ اگر تبسم کہیں نظر آتا ہے۔ تو محض چشم پوشی کے طور پر بالکل مرجھایا ہوا۔ اور بے جان، اور اس کا بڑا سبب بھی ہمارے ادیبوں کا کشمکشِ زندگی سے گریز ہے۔ یہی وجہ ہے۔ کہ بعض لوگ فیضؔ کے کلام میں بھی سوائے غم پرستی کے اور کچھ نہیں دیکھتے۔ وہ اس بات کو بھول جاتے ہیں کہ فیضؔ کیا کوئی بھی صاحبِ عقل الم فرسائی کے اس انداز کا قائل نہیں ہو سکتا۔ کہ روم تو جل رہا ہو اور نیرو اپنی بانسری کی خوش آئند تانوں سے مسحور ہو کر یہ سمجھ لے۔ کہ دنیا بھی اُس کی طرح غم ماندہ سے فارغ ہے۔ وہ اس بات کو برداشت نہیں کر سکتا۔ کہ دل رو رہا ہو۔ اور شعر الفن برائے فن کا ورد کئے جائیں۔ جب ماحول ہی افسردہ اور غمناک ہو۔ تو آپ زندگی کے آئینے یعنی ادب کو کس طرح نوچ کر اس سے علیحدہ پھینک سکتے ہیں۔ اور اگر پھینک بھی دیں۔ تو

اس کی قدر و قیمت کیا باقی رہ جائے گی۔ قنوطیت اور غم پرستی اور شے ہے۔ اور احساسِ زیاں دے کے لہو گرمانا اور۔ وہ آپ کو غم پرستی اور گوشہ گیری کی تعلیم نہیں دیتا۔ وہ تو اپنے کلام کا حسین آئینہ آپ کے سامنے پیش کرتا ہے۔ جسکو توجہ نواز کرنے کے لئے رومانوی نقش و نگار سے مزین کر دیتا ہے۔ سب سے پہلے آپ کی نظر ان دلکش نقوش پر پڑتی ہے۔ اور آپ ابھی اُن سے لطف اندوز ہو ہی رہے ہوتے ہیں۔ کہ یک لخت آپ کو اپنی اور پسِ منظر کے طور پر اس بھیانک ماحول کی تصویر اس میں نظر آنے لگتی ہے۔ اور چونکہ آپ کی نظروں میں پہلے حسین جلووں کا عکس ابھی تک ہوتا ہے۔ آپ کو یہ تصویر اور بھی کریہہ المنظر نظر آتی ہے۔ اور آپ اپنی زندگی کو بھی اُن حسین نقوش کی مانند دلفریب بنانے پر تل جاتے ہیں۔ اور اس خوفناک پسِ منظر یعنی سماجی نظام کو بھی بدل دینا اپنا فرض سمجھتے ہیں۔ یہ طلسمی آئینہ ہفت رنگ ہے۔ یکایک آپ کی نظریں امید کی روشنی سے چمک اٹھتی ہیں۔ اور اس آئینے میں ایک حسین مستقبل کا خاکہ دیکھتی ہیں۔ آپ اس خاکے میں رنگ بھرنے کے لئے اپنے خون کی رنگینیاں دینے پر بھی تیار ہو جاتے ہیں۔ اس تمام دوران میں ایک پیغمبرِ امید اپنے دل کو گرمانے والے ترانوں سے پیہم آپکا دل بڑھائے چلا جاتا ہے۔ اور آپکو کامیابی کی نوید ان الفاظ میں دیتا ہے "لیکن اب ظلم کی میعاد کے دن تھوڑے ہیں۔ اک ذرا صبر کہ فریاد کے دن تھوڑے ہیں"

اور اسکے بعد اپنے مستقل ارادوں کو آپ کے بازوئے عمل میں یوں منتقل کرتا ہے:-

عرصۂ دہر کی جھلسی ہوئی ویرانی میں — ہم کو رہنا ہے پہ یونہی تو نہیں رہنا ہے
اجنبی ہاتھوں کا بے نام گرانبار ستم — آج سہنا ہے ہمیشہ تو نہیں سہنا ہے۔

کیا یہ قنوطیت ہے؟ کیا یہ ہزیمت خوردہ ذہنیت ہے۔ یہ ذہنیت تو خود اُن لوگوں کی ہے۔ جو تلخ حقائق کا مقابلہ تو ایک طرف اُن کا ذکر بھی سن کر کانپ اٹھتے ہیں۔ مصیبتوں اور دکھ درد سے گھرے ہوئے ہیں۔ لیکن آنکھیں بند کرکے یہ سمجھ لینا چاہتے ہیں۔ کہ سب خطرہ ٹل گیا اور اب مسرت ہی مسرت ہے۔ اور یونہی آنکھیں بند کئے ہوئے اپنی بے روح خوشی کے نغمے الاپے جاتے ہیں۔ وہ غم امروز سے بچنے کے لئے ان اسباب و علل کو جن کا یہ نتیجہ ہے جڑ سے نہیں اکھیڑ پھینکتے۔ بلکہ خواب بیداری میں پناہ لیتے ہیں۔ اور جب کوئی عرضِ حال سے اُن کے طلسم کو توڑ ڈالتا ہے۔ تو خواہ مخواہ اُس سے الجھ پڑتے ہیں۔

فیض اپنے اس حزنیہ عنصر، ندرت اور سوز و گداز کے لحاظ سے جن کو اسکے کلام میں ایک ممتاز رتبہ حاصل ہے۔ غالب کے بہت زیادہ قریب ہے۔ اور کہیں کہیں اسیر ہوا بھی جاتا ہے۔ میرے اس اظہارِ خیال سے چند آنکھوں میں حیرت اور بے اعتباری جھلک پڑے گی۔ کچھ ماتھوں پہ تیوریاں پڑ جائیں گی۔ اور بعض متبرک زبانوں سے ایک دو کلمات خیر بھی نکل جائیں گے۔ اور مجھے ان ماضی پرست اور جذباتی ہستیوں سے پوری پوری ہمدردی بھی ہے۔ لیکن میں اس حقیر سی برہمی کے ڈر سے حقیقت سے اغماض تو نہیں کر سکتا۔ مجھے بھی غالب سے عقیدت ہے۔ اور شاید ان تمام لوگوں سے بڑھ کر لیکن اندھی عقیدت کو تو میں سم قاتل سمجھتا ہوں۔ غالب اور فیض دونوں کی نظر اپنے ماحول اور مستقبل کی طرف ہے۔ لیکن دونوں میں ایک نمایاں فرق بھی ہے۔ جو شاید زمانے کا اقتضا ہو۔ وہ یہ کہ غالب کے ہاں صرف افسردگی ہے ارادہ اور امید بالکل نہیں۔ اور فیض کے ہاں یہ تینوں چیزیں ہیں بلکہ دوسری دونوں پہلی پہ غالب۔ غالب کے عہد میں مغلیہ شان و شوکت کی شمع بجھتی نظر آتی تھی۔ تخریب جاری تھی۔ تعمیر کا نشان تک نہ تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے پرانی یادگاریں مٹتی جا رہی تھیں۔ وہ حالت تھی۔ جیسے کوئی کسی خوشنما پہاڑ کی بلند چوٹیوں پر سیر کرتا

کہ تا پھسل جائے اور گرتا گرتا آخر اُس مقام پر پہنچ جائے۔ جہاں نیچے گہرائیوں میں گر جائے۔ طبیعتوں میں ایک عام بے چینی اور پریشانی بڑھ رہی تھی۔ وہ بے چینی نہیں جو جستجو پر مجبور کر دے۔ بلکہ وہ بے چینی جو ہر موجود اور آئندہ سے بیزار کر دے۔ ذہنیتیں بگڑ رہی تھیں۔ حوصلے پست ہو رہے تھے۔ غالب خود بے پایاں مصائب میں گھرا ہوا تھا۔ ایسی حالت میں اُس نے اپنے درد ناک نغمے ویسے سروں میں بلند کئے۔ لوگ جدوجہد سے پہلے ہی بیزار تھے۔ صرف بہانے کے منتظر تھے۔ یہ نغمے اُن کو راس آئے۔ اور وہ سو گئے۔ غالب کے کلام میں غم پرستی ایک ضروری عنصر ہے۔ اُس کی شاعری ہلکے ہلکے نالے ہیں۔ اگر قہقہے ہیں۔ تو اسقدر کھوکھلے اور خوفناک جیسے کوئی شدت غم سے دیوانہ ہو کر ہنسنے لگے۔ اور اگر کہیں تبسم ہے۔ تو اسقدر پھیکا جیسے کوئی غمزدہ ساتھیوں کے مجبور کرنے پر مسکرائے، لبوں پر پژمردہ مسکراہٹ ہو اور آنکھوں میں آنسو!

فیض کا انداز موضوع سے بالکل ہم آہنگ ہوتا ہے۔ وہ الفاظ کے بے جان پیکر میں اپنے قلم کی ایک ہی جنبش سے ایک بے چین روح پیدا کر دیتا ہے۔ ہر لفظ زندہ ہو جاتا ہے۔ اور نظم کے مرکزی تخیل کو اس طرح جذب کر لیتا ہے۔ کہ معلوم ہوتا ہے۔ فیض نے وہ نظم اسی لفظ سے متاثر ہو کر لکھی ہے۔ الفاظ کی محض ترتیب سے ہی وہ ایک طلسمی اثر پیدا کرتا ہے۔ جس سے پڑھنے والا نہیں نکل سکتا۔ وہ لطیف سے لطیف غیر مرئی اشیا اور اس سے بڑھ کر غیر مرئی احساسات کو بھی اس قطعیت سے واضح اور معین تراکیب میں پیش کرتا ہے کہ پڑھنے والا اُنہیں دیکھتا ہے محسوس کرتا ہے۔ بعض اوقات وہ ایک لفظ سے وہ کام لیتا ہے۔ جو مصور اپنی تصویر سے بھی نہیں لے سکتا۔ کیونکہ وہاں ہمارا ذہن مصور کی عاید کردہ پابندیوں میں محدود ہو کر رہ جاتا ہے۔ لیکن شاعر ایک لفظ سے ہمارے تصور کے لئے ایک مرکزی نقطہ پیدا کر دیتا ہے۔ اور پھر ہمارے تخیل کو غور و فکر کی دعوت دیتا ہے۔ کہ اُسکے گرد اپنی بساط کے مطابق بلند پروازی کر سکے۔ لیکن ہمیں اُس نقطے کا پابند رہنا پڑیگا۔ کیونکہ مرکز کے بغیر کوئی دائرہ وجود میں نہیں آ سکتا۔

کارلائل لکھتا ہے۔ کہ حقیقی اور فطری شاعر وہ ہے۔ جس میں دیکھنے کی طاقت ہو۔ جو ایک نظر سے اشیا کے دلوں میں اُتر جائے۔ اور کہہ اُٹھے۔ "نگاہ مری نگاہ تیز چیر گئی دل وجود"۔ حقیقی شاعر اپنے منظر کے اِس یا اُس پہلو تک ہی محدود نہیں رہتا۔ بلکہ اُسکے دل تک اُتر جاتا ہے۔ کارلائل کے خیال کے مطابق کامیاب شاعر کو ایک "دیدۂ بینا" ہونا چاہیئے۔ لیکن میں اس سے بھی ایک قدم آگے بڑھ کر کہونگا کہ اُسے "دل بینا" ہونا چاہیئے۔ اُسے احساسات اور جذبات کو بھی مادی اشیا کی طرح نہ صرف محسوس کرنا چاہیئے۔ بلکہ دیکھنا چاہیئے۔ فیض "دل بینا" ہے۔ وہ صرف محسوسات کی دنیا تک ہی محدود نہیں رہتا۔ بلکہ اس سے آگے گزر کر اُس دنیا میں پہنچ جاتا ہے۔ جہاں مادی اور غیر مادی، جاندار اور بے جان سب اشیا ایک ہی سطح پر آ جاتی ہیں۔ سب حجابات اُٹھ جاتے ہیں۔ سب کی کیفیت اُسپر منکشف ہو جاتی ہے۔ بلکہ وہ اپنا غم ہلکا کرنے کے لئے شاعر کو اپنا محرم بنا لیتی ہے۔ اور اپنے راز جن کو وہ لوگوں کی ظاہر بین نگاہوں سے چھپانے کے لئے کسی اور نقاب میں لپیٹے ہوئے تھیں۔ اسکے دل بینا پر منعکس کر دیتی ہیں۔ وہ ایک کامیاب فنکار ہے۔ وہ ان رازوں کو دوسروں کے دلوں پر نقش کرنا اور اُن کی زبانوں سے بچانا جانتا ہے۔ پڑھنے والے کا دل اس عجیب بھید کو اپنی زندگی میں پہلی بار سنکر اچھل پڑتا ہے۔ لیکن جب وہ راز کسی اور کو بتانے لگتا ہے تو منہ دیکھتا رہ جاتا ہے۔ یہ راز الفاظ کی قید میں آنے سے انکار کر دیتا ہے۔ اور اسطرح یہ راز عام ہو کر بھی راز ہی رہ جاتا ہے۔ وہ ان غیر مرئی احساسات کو الفاظ کی قید میں لا کر ہماری ظاہر بین آنکھ اور بے حس دل میں اُتار دیتا ہے۔ جب یہ تنہائی سے اُسکا دل غمگین ہو جاتا ہے۔ اور وہ اپنے آپ کو دنیا میں سب سے زیادہ ناکام تصور کرنے لگتا ہے۔ تو

قدرت کے مناظر اور ہر وہ چیز جس پر اُس کی مایوس نظر پڑتی ہے اُس کی غمگساری کو پہنچ جاتی ہے۔ ایسے لمحوں میں فیضؔ ایک شاعرانہ یا زیادہ واضح الفاظ میں ایک پیغمبرانہ دل اور رسالت کا مالک ہوتا ہے۔ اُس کی ہر نظر ان اشیا کی گہرائیوں میں اُترتی جاتی ہے اور وہ ان حقیر حقیر جاندار اور بے روح اشیا کو بھی اپنے غم سے متاثر کر دیتا ہے۔ اس کی ایک نظم کے تخیل کی جزئیات کچھ اسطرح ہیں۔ رات ڈھل چکی ہے تارے اوجھل ہو رہے ہیں، ٹمٹماتے چراغ اور خاموش راستے ہاں کبھی کبھی کسی راہرو کے پاؤں کی آواز اس سکوت میں لرزش پیدا کر کے پھر اسی ابدی سکوت کا جزو بنجاتی ہے۔ صرف شاعر کے دل کی پیہم دھڑکن زندگی کی خبر دے رہی ہے۔ اُسے کسی کا انتظار ہے۔ وہ راہرو کے قدموں کی آواز اور اپنے دل کی دھڑکن کو بھی اُسی کی آوازِ پا سمجھ کر چونک اُٹھتا ہے اور اپنے آپ سے سوال کرتا ہے "پھر کوئی آیا دلِ زار؟ نہیں کوئی نہیں، اور مایوس ہو کر پکار اُٹھتا ہے "راہرو ہوگا کہیں اور چلا جائیگا"، لیکن وہ شاعر اُمید ہے۔ وہ اس غم سے نجات پانے کے لئے ارد گرد کے منظر پر نظر ڈالتا ہے "تاکہ اپنے دل کو بہلا سکے۔ لیکن وہاں تو ایک عجیب ہی سماں ہے۔ ہر شئے اُسے اپنے ہی غم میں ڈھلی ہوئی ملتی ہے۔ وہ دیکھتا ہے کہ رات بھی اُسکے آنے کی خوشی میں اپنے آپ کو چاند تاروں سے مزین کر کے نکلی تھی۔ اب ڈھل چکی ہے تارے بھی رات بھر آسمان پر کسی کی راہ تکتے رہے لیکن مایوس ہو کر اب مٹتے جاتے ہیں۔ اور سنگامرمریں غبار فضا میں بکھرتا جاتا ہے۔ چراغ بھی اسی گداز فرقت سے تمام رات جلتے رہے لیکن اسقدر سکون سے گویا خوابیدہ ہیں۔ لیکن اب وہ بھی ناامید ہو کر لڑکھڑا رہے ہیں جواب دے چکے ہیں۔ اُن کا چراغ حیات اب گل ہونے کو ہے۔ رہگذر تمام دن اور رات قدموں تلے روندی جاتی رہی۔ تاکہ کہیں اُسکے نقش پا کی قدمبوسی کا فخر حاصل ہو سکے۔ لیکن اب وہ بھی راستہ تک تک کر سو گئی۔ ہر ایک چیز اسی غم میں ڈوبی ہے۔ وہ اس غم کو برداشت کرنے پر تیار ہو جاتا ہے۔ وہ مایوس دل سے کہتا ہے۔ کہ اُسکے آنے کی کوئی امید نہیں۔ اسلئے "گل کرو شمعیں بڑھا دو مے و مینا و ایاغ"، اور اب اپنے بے خواب کواڑوں کو مقفل کر لو"، کیونکہ اب یہاں کوئی نہیں آئے گا بے خواب کواڑ اسلئے کہ وہ اسکے انتظار میں تمام رات چشم منتظر کی طرح کھلے رہے ہیں۔ یہاں کواڑوں کے دو مفہوم ہو سکتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ شاید اپنی آنکھوں کو کھلے کواڑوں سے تشبیہہ دی ہو۔ کیونکہ آن کے پردے بھی کواڑوں کے پٹوں کی طرح کھلے رہے ہیں۔ یا پھر اپنے دروازوں کو ہی بے خواب کہا ہو۔ کیونکہ وہ تمام رات کھلے رہے ہیں۔ ایک منٹ بھی آنکھ نہیں جھپک سکے۔ تاکہ اگر وہ آئے۔ تو اُن کو غافل یعنی بند دیکھ کر واپس نہ ہو جائے۔ اگر فیضؔ صرف یہی نظم لکھ کر ہی اپنی شاعرانہ زندگی ختم کر دیتا تو بھی مستقبل کا ناقد اُسے کسی بڑے سے بڑے شاعر کے پہلو میں جگہ دینے سے گریز نہ کرتا۔

فیضؔ شعری ادب میں ایک نئے اسکول کا بانی ہے۔ وہ زندگی کو ایک خاص نقطۂ نظر سے دیکھتا ہے۔ جس کی حقیقت اور صحت کا خود اُسکو پورا پورا الیقین ہے۔ وہ توجہ کو اپنی طرف کھینچنے کے لئے خوش پوش لیکن کھوکھلے اور بے روح الفاظ استعمال نہیں کرتا بلکہ اپنا مطلب ان لفظوں میں بیان کرتا ہے۔ جو آپ کو اپنی روح کی آواز معلوم ہوتی ہے۔ اُسکی زبان الفاظ اور طرز بیان ایک ایسے شیشے کی مانند ہیں۔ جو ڈاٹل کی حفاظت بھی کرے، زینت بھی دے اور رعنایاں بھی کرے۔ اُس کی زبان لطیف ہے۔ جو معانی کو دیکھنے میں کسی قسم کی رکاوٹ نہیں ڈالتی۔ زبان اُسکے خیالات کے بالکل ہمراہ چلتی ہے۔ اور اُن کی ہر کروٹ پر خود بھی بدل جاتی ہے۔ ایک ہی نظم میں اُسکی زبان اُسکے خیالات کے تغیر کے ساتھ ہی پلٹا کھاتی ہے۔ ابھی تو وہ حسن و عشق کی باتیں کر رہا ہوتا ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے۔ کہ بہاریں شباب پر ہیں۔ غنچے چٹک رہے ہیں۔ ہلکی ہلکی نسیم چل رہی ہے۔ لیکن اُسکے دماغی ہیجان کے ساتھ ہی اسکا لہجہ بدل

جاتا ہے۔ وہ زندگی کی گھناؤنی تصویر پیش کرتا ہے جس کی ہم تاب نہیں لا سکتے۔ فیض کی زبان بہت حسین اور پیاری ہے۔ جو دل میں اُترتی جاتی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے۔ کہ ہر ایک مصرع میں الفاظ ایک دُوسرے میں گھلتے ہوئے اپنی انفرادی ہستی تقریباً کھو چکے ہیں۔ اور اب وہ مجموعی طور پر صرف ایک مترنم لفظ بن چکے ہیں۔ اُسکے الفاظ خیالات کو ایک دائمی کشمکش میں نہیں رکھتے۔ کہ ایک اپنی طرف کھینچے۔ اور دوسرا کسی اور ہی جانب بلکہ وہ خیالات کے پیچھے پیچھے اُنکے حکم کے مطابق چلتے ہیں اسے الفاظ کو خیال کے سانچوں میں نہیں ڈھلنا پڑتا۔ بلکہ الفاظ خود اُس خیال کے سانچے میں ڈھلتے جاتے ہیں۔ اسلئے ہمیں خیالات کہیں بھی الفاظ کے کانٹوں میں اُلجھے ہوئے نہیں ملتے بلکہ یہ الفاظ بھی وہی اثر پیدا کرتے ہیں جسکو اُس خیال سے تحریک ہوتی ہے۔ فیض اپنی زبان کو عوام کی زبان کے زیادہ سے زیادہ قریب لانے کی کوشش کرتا ہے۔ اُسکی شاعری خلوص، سادگی، اور ندرت کا ایک لطیف مجموعہ ہے۔ پڑھنے والے کی ہستی آہستہ آہستہ نظم کی ہستی اور پھر اُسکے خالق یعنی شاعر کی ہستی میں تحلیل ہوتی جاتی ہے اور وہ آخر کار پکار اٹھتا ہے:۔

کہنے والے فسانہ میرا ہے صرف طرزِ بیاں تیرا ہے

فیض کے قطعات بھی اُسکی نظم کی تمام خصوصیات لئے ہوئے ہیں اور روانی خلوص اور سادگی ایسے عناصر ہیں جو اُسکے قطعات میں انتہائی بلندی کو پہنچے ہوئے ہیں۔ اس لحاظ سے موجودہ دور میں اختر انصاری ہی اُسکا ہم عنان نظر آتا ہے۔ اُسکے قطعات خارجی پہلو کی جگہ داخلی پہلو لئے ہوئے ہیں۔ وہ ان حسین چھوٹے چھوٹے ستاروں کو دنیا کی بربادیوں کے تلخ واقعات سے آباد کرنا نہیں چاہتا۔ بلکہ انکو صرف اپنے اور کسی کیلئے وقف کر لیتا ہے۔ اور انکو اپنی آتشناک تمناؤں بے آواز نالوں، اور شکستِ دل کی صداؤں سے معمور کرنا چاہتا ہے۔ واقعی ان حسین اجسام میں ایسی ہی چمکدار، مختصر لیکن گہری اور پُر سوز مخلوق کی ضرورت تھی۔ وہ انکو "جسم کی مایوس پکار" سے نہیں بلکہ "دل کی بے سود تڑپ" سے زندگی بخشتا ہے۔ اُسکے قطعات اُس المناک گیت کی مانند ہیں۔ جو الفاظ کے ساز پر گایا جاتا ہے اور انکے آخری مصرعے اُس لے کی مانند ہیں۔ جہاں ساز کی دردناک تانیں انتہائی بلندی تک پہنچ جاتی ہیں۔ اور پھر —— ساز کے تار توڑ کر ایک جاودانی چیخ فضا میں چھوڑ کر ہمیشہ کے لئے خاموش ہو جاتی ہے۔

(۱) فضائے دل پہ اداسی بکھرتی جاتی ہے + فسردگی ہے کہ جاں تک اترتی جاتی ہے
فریبِ زیست سے قدرت کا مدعا معلوم + یہ ہوش ہے کہ جوانی گزرتی جاتی ہے

(۲) رات یوں دل میں تری کھوئی ہوئی یاد آئی + جیسے ویرانے میں چپکے سے بہار آ جائے
جیسے صحراؤں میں ہولے سے چلے بادِ نسیم + جیسے بیمار کو بے وجہ قرار آ جائے

یہ قطعہ تقریباً تمام ادبی دنیا میں اشاعت سے پہلے ہی مشہور ہو چکا ہے:۔

وقفِ حرماں و یاس رہتا ہے + دل ہے اکثر اداس رہتا ہے تم تو غم دے کے بھول جاتے ہو + ہم کو احساں کا پاس رہتا ہے

مشاہیر کی قدر عموماً اُنکے مرنے کے بعد ہوتی ہے جسکی چند نفسیاتی وجوہات ہیں۔ ایک تو یہ کہ عین قربت بھی عین قربت نہیں۔ اگر کسی کو بہت ہی قریب سے دیکھا جائے۔ تو ہم اُسکا صرف ایک حقیر سا حصہ ہی دیکھ سکیں گے اور اُسکی عظمت کا صحیح اندازہ بالکل نہیں کر سکینگے۔ دوسرے وہی انسان کی فطری خود پسندی جس نے پیغمبروں کے انکار پر مجبور کیا۔ لوگ تصور ہی نہیں کر سکتے کہ ہماری ہی دنیا اور ہمارے ہی ماحول میں رہتا ہوا ہماری ہی شکل و صورت کا ایک انسان ہماری طرح ہی کھاتا پیتا ہم سے اسقدر بلند ہو سکتا ہے۔ یہ کوتاہ نظری انکو اس بات پر مجبور کر دیتی ہے۔ کہ اپنے ہمعصروں کی بلندیوں اور پستیوں کو اپنے ہی معیار پر رکھیں، اسقدر بلند عظمت کا تصور بھی اُنکے معمولی دماغوں میں نہیں سما سکتا۔ لیکن ایک عرصہ گزر جانے پر دُوری انکو اس قابل کر دیتی ہے کہ وہ اُن پر ہر پہلو سے ناقدانہ نظر ڈال سکیں۔ نیز اسوقت ہم ادب کو ادیب کی شخصیت سے نہیں۔ بلکہ ادیب کو ادب سے جانچتے ہیں اور ہندوستانی تو فطرتاً مردہ پرست واقع ہوئے ہیں۔ وہ اسبات کو برداشت نہیں کر سکتے کہ کسی ہمعصر کو اُن فنکاروں کے برابر جگہ دیں۔ جن کو وہ انسانی دیوتاؤں کے بلند رتبے پر فائز کر چکے ہیں [illegible]

طالب انصاری

غزل مسلسل

تصور کو رنگیں بناتی چلی آ — کسی سمت سے مسکراتی چلی آ

لبِ آب جو رات کی چاندنی میں — ضیائے قمر سے نہاتی چلی آ

مری آرزوؤں کے ویرانکدے میں — امیدوں کی بستی بساتی چلی آ

الجھتی ہوئی خار و گل سے چمن میں — ہر اک شے سے دامن بچاتی چلی آ

محبت کے نغموں سے سرشار ہو کر — چہکتی ہوئی گنگناتی چلی آ

جماتی ہوئی لب پہ رنگِ تبسم — کلی کی طرح مسکراتی چلی آ

کبھی آن کر مسکراتی ہوئی جا — کبھی لوٹ کر مسکراتی چلی آ

دکھاتی ہوئی مشعلِ روئے روشن — شبِ تار کو دن بناتی چلی آ

اڑاتی ہوئی رنگ و بو گلکدے میں — مہکتی ہوئی گل کھلاتی چلی آ

دکھاتی ہوئی اپنے جلوے قمر کو — ستاروں سے آنکھیں لڑاتی چلی آ

گراتی ہوئی برقِ حسن و تجلی — نگاہوں کو خیرہ بناتی چلی آ

ستاروں کی جاں آفریں روشنی میں — قمر کی طرح جگمگاتی چلی آ

حریمِ محبت میں آوازِ پا سے — کسی کا مقدر جگاتی چلی آ

بجاتی ہوئی بنسری بن کی جوگن — کوئی پیت کا گیت گاتی چلی آ

خدارا شبِ غم کے پچھلے پہر میں — سحر کی طرح جھلملاتی چلی آ

کدھر ہے تو اے عنبریں زلف والی
ہواؤں میں خوشبو اڑاتی چلی آ

راجندر سنگھ بیدی

بُکی

"۹۱۴"

"بی آں — ۱۶، تیسری قطار میں" بُکی نے ایک ہاتھ سے
اپنے بالوں کو دباتے ہوئے کہا۔ "آپ کو زحمت اٹھانے کی نوبت ہی
نہ آئے گی صاب، کنڈکٹر آپ کی مدد کریگا"

"شکریہ، تنکیو" کہتے ہوئے نوجوان مسکرایا اور مسکراتے
ہوئے اُس نے ایک اور چونی کونٹر پر رکھ دی۔ چونی جیب میں
ڈالتے ہوئے بکی نے آنکھیں بند کرلیں جیسے اُس کا دماغ بہت
تھک گیا ہو۔ وہ دن بھر کلکتہ کی ایک بیمہ کمپنی میں ٹائپ کیا کرتی
تھی۔ اور رات کو اس عظیم الشان سینما میں ٹکٹیں بیچا کرتی
تھوڑی سی تنخواہ کے علاوہ کسی رنگین مزاج نوجوان کے لئے
کسی لڑکی کے پہلو میں سیٹ بک کردینے کے عوض اسے چونی
زیادہ ملتی تھی اور اس کی آمدنی پر ایک بڑا کنبہ پل رہا تھا۔ ایک
بوڑھی، ہٹیلی ماں تھی۔ جو ذرا سی دیر کے بعد کھانا ملنے پر اپنا منہ
آپ ہی نوچ لیتی تھی۔ اسکے علاوہ ایک بیوہ بہن تھی جسے اُسکے
خاوند نے بیوگی سے دو برس پہلے محض اسلئے چھوڑ دیا تھا۔ کہ
آگ جلانے سے پہلے وہ تمام گھر میں دھواں بھر دیتی تھی۔ اور پھر
چھوٹے بھائی تھے اور بھانجے۔ ۔ ۔ ۔

کچھ دیر بعد موسے کی سی سبک رفتاری کے ساتھ وہی نوجوان
کونٹر کی طرف آیا اور آتے ہی اُس نے اپنی انگلیاں لکڑی کی
کونٹر پر بجائیں اور بولا "ور لیکن مادام — وہاں تو کوئی لڑکی نہیں"
بکی نے آنکھیں کھولتے ہوئے کہا "کہیں باہر ہوگی صاب
۔ ۔ ۔ اُس نے مجھ سے ٹکٹ خریدا ہے۔ میں ڈرتی ہوں آپ کو
انتظار کرنا پڑیگا"

"اُف!" نوجوان نے بیزاری سے کہا "ہمیشہ ایسا ہی تو ہوتا
ہے مس۔ ۔ ۔ مادام، ہمیشہ ایسا ہی تو ہوتا ہے"

پھر وہ لڑکا کچھ دور جاکر ساگوان کے خوبصورت چوکھٹوں
میں لگے ہوئے سٹلز کو دیکھنے لگا۔ اور ایک اضطراب کے عالم میں
اس نے آج شب کو، کے سرخ لیبل پھاڑنے شروع کردئے
پھر بکی کے پاس لوٹتے ہوئے بولا۔ "مایوسی سے تو انتظار اچھا ہے"

بکی نے اس بے صبر نوجوان کی طرف دیکھ کر مسکرا دیا اور دل
ہی دل میں اسکے خوبصورت بالوں کو سراہنے لگی۔ کتنے اچھے ہیں
اسکے بال، دولت اور فکر میں گھرے ہوئے سیٹھوں کی طرح وہ
گنجا نہیں۔ نہ ہی توندیلا ہے اور نہ دُبلا۔ بس۔ ۔ ۔ ٹھیک ہے اور
اسکے بال دھان کے ان کھیتوں کی طرح ہیں جنہوں نے مون
سون ہواؤں سے پورا فائدہ اٹھایا ہو۔ اس کی وضع قطع اور
باتوں سے شراب کی بو آتی ہے۔ حالانکہ شاید اس نے شراب
نہیں پی۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ وہ بہت ہی زیادہ جوان ہے
جیسے انگور پک جاتے ہیں تو ان سے شراب یعنی تخریب کی بو آنے
لگتی ہے۔

کچھ دیر بعد وہ لڑکا پردے اٹھا کر بڑے غور سے سینما
کی چھت کا معائنہ کرنے لگا۔ چھت میں مصنوعی ستارے چمک رہے
تھے۔ وہ جانتا تھا۔ کہ جب سینما میں روشنی گل ہو جائے گی۔ تو یہ
ستارے اور زیادہ چمکنے لگیں گے۔ اور بہت خوبصورت دکھائی

دیکھے۔ چھت کی طرف نظریں اٹھانے سے آسمان کا دھوکا ہوگا۔ وہ یقیناً اس منظر کو پسند کریگا۔ اور اپنے ساتھ بیٹھی ہوئی لڑکی کو کہے گا ـــــ ستارے کتنے خوبصورت ہیں اور . . . اور یہ سچ ہے۔ کہ اس نے تاروں بھرے آسمان پر کبھی نگاہ بھی نہیں ڈالی تھی۔ اور نہ قدرت کے اس کلکتہ کو جو کہ ہر روز رات کو آسمان پر دکھائی دیتا تھا۔ پسند کیا تھا۔ لیکن چھت پر چمکتے ہوئے ستاروں کو تو وہ اسلئے پسند کرتا تھا۔ کہ ان پر سچ مچ کے ستاروں کا دھوکا ہوتا تھا اور انسان ہمیشہ اصلیت کی نسبت اسکے دھوکے کو پسند کرتا ہے۔

پھر وہ نوجوان برآمدے میں ایک دیوار کے سہارے کھڑا ہو گیا۔ بکی کو یقین تھا۔ کہ وہ اس بیفکرے نوجوان کو پسند نہیں کر سکتی البتہ بڑی ہی آسانی سے نفرت کر سکتی ہے۔ اس کی وجہ یہ بھی کہ وہ بہت رحم دل تھی اور شاید اسی لئے وہ اسکے متعلق اپنے تخیل کو محبت کی آلودگی سے علیحدہ رکھنا چاہتی تھی۔ وگرنہ اسکے لئے یہ کسقدر آسان تھا۔ کہ شو کے شروع ہو جانے پر بکنگ آفس کے سامنے "ہاؤس فل" کا بورڈ لگا کر اس نوجوان کے ساتھ کی کسی سیٹ پر خود جا بیٹھتی۔

برآمدے کی دیوار پر نیا نیا پالش ہوا تھا اسلئے نوجوان کے کپڑے کسی قدر آلودہ ہو گئے۔ لیکن پرے ہٹ کر اس نے پھر اپنی انگلی سے دیوار کو چھوا۔ گویا کپڑوں کے آلودہ ہو جانے سے اسے دیوار کے نئے پالش کئے جانے کا یقین ہی نہ آتا ہو۔ پھر اس نے آوارہ نگاہوں سے سینما کی گھڑی کی طرف دیکھا جو کہ دائیں دیوار سے ہٹا کر منیجر کے کمرہ کے اوپر لگا دی گئی تھی۔ اس نے گھڑی کو اپنی اصلی جگہ پر دیکھ کر پھر اُسی جگہ کو دیکھا۔ جہاں سے وہ اٹھا لی گئی تھی بکی سوچنے لگی۔ انسان کی عادت بھی عجیب ہے، وہ جانتا ہے کہ ایک چیز اس جگہ سے ہٹا کر دوسری جگہ منتقل کر دی گئی ہے۔ لیکن نہ جانے وہ کیوں ایک بار پھر اُس جگہ کو دیکھتا ہے جہاں سے وہ چیز اٹھالی گئی ہو گویا اسکا ادراک اس تبدیلی کو یک بیک قبول نہیں کرتا اور شاید اسی لئے تھا سے ۲۴ پرگنہ کے دیہات میں گزارے ہوئے زندگی کے دن یاد بار یاد آتے تھے وہ دن جبکہ وہ تہذیب سے دور، دادا کے ہاں آرام و سکون کی زندگی بسر کرتی تھی۔ لیکن اب کلکتہ کے سے مہذب شہر میں زندگی کے معیار کو قائم رکھنے کے لئے اُسے کیا کچھ کرنا پڑتا تھا۔

بکی نے اپنے سامنے پڑے ہوئے سیٹوں کے پلین پر نظر دوڑانی شروع کی۔ آخر ایسے ہی بے صبر نوجوانوں کو کسی لڑکی کے پہلو میں جگہ دینے سے اُسے چونی ملتی تھی۔ اُس کی انگلی نقشے میں خالی نشستوں کے ساتھ ساتھ دوڑنے لگی۔ وہ نوجوان کو بکی کے ناخنوں پر گلابی پالش چمکتا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔ اور وہ نوجوان گھور گھور کر اس چمکتے ہوئے پالش کو دیکھنے لگا۔ جیسے اُسے اُن کے پالش ہونے میں یقین نہ آتا ہو۔ اور وہ اُن ناخنوں کو چھو کر دیکھنا چاہتا ہو . . . چھبیس . . . ستائیس . . . تیس چوتھی قطار . . . بارہ . . .

ـــــ بکی کی نگاہیں ایک سیٹ پر جا رکیں۔ وہ شاید اس سیٹ پر نشان لگانا بھول گئی تھی۔ اس سیٹ کے لئے بھی تو ایک لڑکی نے ٹکٹ خریدا تھا۔ وہ اس لڑکی کو جانتی بھی تو تھی ـــ مسز و، سوزا . . . اخاہ! اُسکے ساتھ مسٹر و، سوزا بھی تھے۔ وہ تھے یا نہیں تھے بکی ہلکی ہلکی سردرد میں بالکل بھول چکی تھی۔ اُسے تو اُن کی شکل تک یاد نہ رہی تھی بکی نے اپنے تھکے ہوئے دماغ پر زور ڈالنا شروع کیا حتےٰ کہ وہ اس چونی کو کوسنے لگی۔ جو اُسے اس کام کے لئے ملتی تھی۔

"جنٹلمین"، بکی نے اس نوجوان کو بلاتے ہوئے کہا "میں نے آپ کی سیٹ چوتھی لائن میں نمبر بارہ پر رکھی ہے۔ اور بارہ پر مس و، سوزا کی جگہ ہے۔ اور بکی نے جان بوجھ کر مسز کو مس کہا قدرت نے عورت کے ماتھے پر تو ایسی تخصیص کا کوئی نشان نہیں رکھا۔

اور پھر بکی کو اپنی چوٹی عزیز تھی۔ اسے اپنی ماں سے بہت محبت تھی۔ اور اپنی بہن پر اسے بہت ترس آتا تھا۔ ۔ ۔ ۔

۔ ۔ ۔ ۔ نوجوان نے اپنا ہیٹ اٹھاتے ہوئے کہا "شکریہ" اور ہال کے اندر داخل ہو گیا۔

بکی نے ایک سگریٹ سلگایا اور پھر پلین کا بغور مطالعہ کرنے لگی۔ جب وہ ایش ٹرے کو اپنے نزدیک سرکا رہی تھی تو ایک بدصورت سا لڑکا آیا اور اسکے پاس آکر کھڑا ہو گیا۔ بکی غور سے اسکے چہرے کی طرف دیکھنے لگی۔ وہ ابھی کمسن تھا۔ اس کی مسیں بھیگ رہی تھیں اور اسکے چہرے سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ عورتوں کے متعلق کچھ نہیں جانتا۔ البتہ جاننا چاہتا تھا۔ ماں اور بہن کے علاوہ اس نے دنیا میں کوئی عورت نہیں دیکھی تھی۔ اور اسکے چہرے پر ہلکی ہلکی شرم کے پیچھے ایک شدید سا ڈر دکھائی دے رہا تھا جو کہ اسکے چہرے کے بھدے نقوش کو اور بھدا بنا رہا تھا۔

لڑکے نے ٹکٹ کے پیسوں کے علاوہ ایک اور چونی بکی کی طرف سرکا دی۔ بکی کا منہ کھلا رہ گیا۔ "تم چاہتے ہو۔ ۔ ۔" وہ بولی اور چونی کو ایک نظر سے دیکھتے ہوئے اس نے جیب میں رکھ لیا اور پھر اپنے سامنے پڑے ہوئے پلین پر جھک گئی۔ 'ہاؤس فل' تھا صرف سولہ نمبر کی نشست خالی تھی۔ وہی نشست جو اس نے خوبصورت نوجوان کے لئے پہلے بک کی تھی لیکن ساتھ کی سیٹ میں لڑکی نہ ہونے سے خالی رہ گئی تھی۔ بکی نے سوچا اب وہ لڑکی ضرور آ بیٹھی ہو گی۔ کتنی خوبصورت تھی وہ لڑکی ۔۔ وہ بلانڈ اور اسکے بالوں کی لہریں یوں دکھائی دیتی تھیں جیسے دھان کے کھیت پر سے ہوا سرسراتی ہوئی گزر رہی ہو ۔۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ شاید اس نے بال کسی نوجوان کی توجہ کو کھینچنے کے لئے بنائے تھے۔ اسکے پہلو میں اس بیوقوف، بدصورت چھوکرے کو جگہ دینا اس لڑکی کی توہین کرنا تھا۔ اور یہ چھوکرا تو آموز ہی نہیں تھا بلکہ بالکل دیہاتی تھا۔ ۲۴ پرگنہ کی طرف کا رہنے والا ہی تو دکھائی دیتا تھا

اسکے چہرہ سے صاف ظاہر تھا کہ نہ تو وہ چھت کے ستاروں کی تعریف سے سلسلہ کلام شروع کر سکتا ہے۔ اور نہ ہی اس لڑکی کے بالوں کو دھان کے کھیت سے تشبیہ دے سکتا ہے وہ گدھا تو اصلی ستاروں کو پسند کرتا تھا۔ اور کہیں سے دھان کاٹتا اٹھ کر کلکتہ چلا آیا تھا

نوجوانوں کا غول اس کی طرف بڑھا آرہا تھا۔ لیکن سب نشستیں رک چکی تھیں۔ پلین سارے کا سارا بکی کے ہاتھ سے لگائے ہوئے نشانوں سے سرخ ہو رہا تھا۔ اس نے ہاتھ کے اشارے سے سب کو بتا دیا۔ کہ اب اس درجہ میں کوئی جگہ نہیں ہے اور وہ نوجوان اپنے اوورکوٹ تھامے اور پتلون کے پائنچے اٹھائے واپس چلے گئے۔

آسمان سے ننھی ننھی بوندا باندی ہونے پر سینما کے برآمدے پناہ گاہ بن گئے تھے۔ اسکے بعد مون سون کے بڑے بڑے بارانی ریلے آنے لگے۔ اور چند چھوکریاں اپنے گون سنبھالتی ہوئی سینما کی ایجزٹ (EXIT) کی طرف آ کھڑی ہوئیں۔ ان لڑکیوں کے ریلے دروازے کی طرف دھکیل دئیے جاتے تھے۔ اور ان بارانی ریلوں سے وہ ریلے زیادہ خوبصورت دکھائی دیتے تھے۔

اسوقت بکی کے دل میں اس دیہاتی نوجوان کے لئے ایک عجیب مادرانہ جذبہ پیدا ہوا۔ اس نے اپنے کمرے کے سامنے 'ہاؤس فل' کا تختہ لٹکا دیا۔ اور خود کھڑکی بند کرتے ہوئے باہر نکل آئی۔ اور اس چھوکرے کے کانپتے ہوئے ہاتھوں میں ٹکٹ دے دیا اور پھر خود اسے کنڈکٹر تک لے گئی۔ مسلسل کانپتے رہنے سے اس چھوکرے کی بدصورتی کے حسن میں اور بھی اضافہ ہو گیا تھا۔ کنڈکٹر نے احتیاط سے اس نوجوان کو سولہ نمبر کی نشست پر بٹھا دیا۔ بکی دروازے میں کھڑی اس چھوکرے اور اس کی رفیقہ کی طرف دیکھتی رہی۔ بلانڈ نے گھبرا کر اپنے دائیں طرف دیکھا۔ اور مضبوطی سے اپنی کرسی کی سلاخوں کو پکڑ لیا۔ اس لڑکی کو اپنی شام کے تباہ ہو جانے میں کوئی شک نہ رہا۔ بکی نے سوچا شاید وہ لڑکی بھی میری طرح ربط و حسن کی بجائے اپنی چونی یاد کر کے

ٹوٹ کو پسند کرتی ہو۔ اسکے بعد پردے چھٹ گئے۔ اور سینما شروع ہوا۔ انگریزی فلم — "میرا نام مجھ سے پہلے سفر کرتا ہے"۔ شروع ہوئی ہوگی کہ ایک دلفریب ٹیون پہ گایا جا رہا تھا —

"تاروں بھری رات کے نیچے —"

بکی نے ایک گہرا، ٹھنڈا سانس لیا۔ اور اپنے دل میں ٹیون کو گنگنانے لگی۔ تاروں بھری رات کے نیچے لیکن ابھی دوسرے شو کا ٹکٹ بنانا تھا۔ اور اُسے تین، ساڑھے تین روپے ہاتھ لگ چکے تھے۔ اب تو وہ بہت ہی تھک گئی تھی۔ اپنی آنکھوں کو شدت کی روشنی سے بچانے کے لئے اُسے ہال کا اندھیرا پسند تھا۔ وہ سوچنے لگی تاروں بھری رات کے نیچے کا دلفریب گانا سنکر اس بدصورت نوجوان کو کیا خوبصورت ستاروں سے بھرا ہوا آسمان یاد آئے گا یا ہال کی چھت۔ یا خوبصورت نشستیں جہاں ہر روز ایک نیا تجربہ ہوتا ہے۔ اسکے بعد بکی باہر نکل آئی کنڈکٹر جا رہا تھا۔ کہ بکی اسی جگہ کھڑی ہو کر لمحہ دو لمحہ کے لئے پکچر دیکھا کرتی ہے اور پھر فوراً ہی وہ مضطرب ہو کر باہر نکل جاتی ہے۔ گویا پردہ سیمیں پر کوئی بہت ہی خوفناک منظر دکھایا جا رہا ہو۔ حالانکہ یہ بات نہ تھی۔ وہ سکون سے ایک گانا بھی نہیں سن سکتی تھی۔ اُسے یوں محسوس ہوتا تھا۔ جیسے اُسکے دل کا برتن چھوٹا ہے اور موسیقی کتنا بڑا وہ اُسکے چھوٹے سے دل میں نہیں سما سکتا۔ وہ اپنا چھلکتا ہوا دل لے کر باہر نکل آتی اور تاروں بھری رات کے نیچے ۲۴ پرگنہ کے کسی گاؤں کے تالاب کا کنارہ اُسے یاد آ جاتا۔ جہاں اُس کی محبت پروان چڑھی اور لٹ گئی۔ جہاں سے ہندو عورتیں اپنا گھڑا بھر کر چلی آتی تھیں اس سے زیادہ جگہ ان کے مٹکوں میں نہ تھی۔ اور اس مٹکے کے پانی سے وہ کھانا بھی بناتی تھیں اور چوکا بھی کرتیں۔ گائے کے گوبر کو مٹی میں ملا کر وہ چوکے کو بڑی صفائی سے پوتا کرتیں اور بکی کا جی بھی چاہتا تھا۔ کہ وہ اتنے بڑے شاندار ہوٹلوں کو چھوڑ کر کسی ایسے علیحدہ کونے میں صبر و سکون سے پڑی رہے۔ اور ان ہی عورتوں کی طرح چارپائی پر لیٹ کر رات کو تاروں سے بھرے ہوئے آسمان کا تماشا کرے۔

وہ منیجر کے کمرہ کے پاس کھڑی ہو کر سگریٹ سلگانے لگی۔

کچھ دیر بعد ہال میں روشنی ہو گئی۔ ہاف ٹائم ہو چکا تھا۔ بکی نے پھر ایک دفعہ پردوں کے پیچھے سے سولہ اور اُسکے ساتھ کی نشست کی طرف دیکھا وہ لڑکا اور لڑکی ایک دوسرے کے لئے ویسے ہی اجنبی تھے۔ اور اپنی اپنی جگہ پہ سمٹ کر بیٹھے تھے۔ اگر وہ چھوکرا طریقے سے اس خوبصورت ٹیون کی تعریف کر دیتا تو کتنی اچھی بات ہوتی۔ لیکن وہ تو گم سم بیٹھا تھا۔

اب ہاف ٹائم میں وہ کوئی بات شروع کر سکتا تھا۔ لیکن وہ باہر چلا آیا۔ اُس کا چہرہ بہت اُترا ہوا تھا۔ وہ بار بار آنکھیں جھپکتا تھا اور اپنے لبوں پہ بے تحاشہ زبان پھیرتا۔ اور ان سب حرکتوں سے وہ بالکل ایک اُجڈ دیہاتی معلوم ہوتا تھا۔

"ہلو مس — مائم"۔ اُس نے باہر نکل کر ڈرتے ہوئے کہا۔

بکی نے مسکراتے ہوئے اُس کی طرف دیکھا اور بولی "ہلو — برائے، انجا ئیڈ آلرائیٹ دکھو، خوب لطف رہا نا؟"

اُس لڑکے نے ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں جواب دیا "مائم — میں تو کلکتہ دیکھنا چاہتا ہوں اور . . . اور . . . " اسکے بعد وہ ہکلانے لگا "میرا چچا کدار پہ میں دوکان کرتا ہے . . ."

بکی کا جی چاہا۔ کہ وہ صاف گوئی سے کام لیتی ہوئی کہدے کہ کلکتہ بالکل اس ہال کی چھت کا سا ہے۔ لیکن اس نوجوان نے چھت کو بغور دیکھا بھی نہیں تھا۔ اور بکی بھی یک لخت پریشان اور اُداس ہو گئی۔ اسکے سر میں زیادہ درد ہونے لگی۔ وہ اس دیہاتی نوجوان کو پسند کرنے لگی تھی۔ وہ بہت رحم دل تھی۔ اسکے بعد جب شو ختم ہوا تو بکی نے منیجر سے چھٹی لے لی۔ اوسوقت وہ دیہاتی، بدصورت نوجوان باہر آیا۔ بکی اُسکے قریب چلی گئی — بولی۔

"ہلو برائے — تم کہاں کا رہنے والا ہے؟"

"ہرش پور — ۲۴ پرگنہ کا۔"

"میں جانتی ہوں ہرش پور — میں ایک دفعہ مسٹر رے کے ہاں ایک ماہ ٹھہری تھی۔"

"سے وہاں ہاں لڑکے کا چہرہ چمک اٹھا۔ میں رے کو جانتا ہوں وہ ہمیں پڑھاتے رہے ہیں۔"

اسکے بعد کچھ دیر تک خاموشی رہی۔ پھر وہ لڑکا بولا۔ "تم اتنی مہربان ہو — کیا میں تمہارا نام جان سکتا ہوں؟"

"نلنی" وہ بولی۔ "لیکن یہاں سب لوگ مجھے مارگریٹ کہتے ہیں۔ مسٹر رے کا بڑا بھائی میرا باپ تھا۔ اسے مرے ہوئے دس برس ہو چکے ہیں۔ اُنہوں نے ایک اینگلو انڈین لڑکی سے شادی کی۔ وہ لڑکی میری ماں ہے . . . اور کیا تم کلکتہ دیکھنا چاہتا ہے؟"

چھوکرے نے سر ہلا دیا۔ مارگریٹ بولی۔ "چلو ہم کافی کی پیالی پئیں گے" اور وہ دونوں فرپو کی طرف چل دیئے۔ ہوٹل کے دروازے پر دو بڑے بڑے دودھیا بلب دور سے چاند کی مانند دکھائی دیتے تھے۔ مارگریٹ نے ان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "دور سے اصلی چاند کا دھوکا ہوتا ہے۔" نوجوان نے فوراً ہاں میں ہاں ملا دی۔ مارگریٹ اُن بلبوں کی طرف اشارہ کر کے کہنا چاہتی تھی۔ بس کلکتہ ایسا ہی ہے۔

پھر وہ ہوٹل میں داخل ہوئے اور کافی پینے لگے۔ اُس نوجوان کے چہرے سے صاف ظاہر تھا۔ کہ اُسے کافی کا تلخ ذائقہ پسند نہیں۔ وہ گنوار تھا۔ شاید وہ دوسرے کے گھونٹوں کے گھونٹ چڑھا جاتا تھا۔ کافی کے بعد مارگریٹ نے کئی چیزیں منگوائیں۔ اور وہ لڑکے کو ان میں سے کئی چیزوں کے نام نہ آتے۔ مارگریٹ کہتی

"یہ کیا ہے؟"

"نامعلوم"

"ساسیج — کہو ساسیج"

"ساسیج"

"یہ کیا ہے؟"

"نامعلوم"

"کٹلٹس — کہو کٹلٹس"

"کٹلٹس"

کبھی وہ لڑکا معصومانہ انداز سے کچھ اور کہہ دیتا۔ تو مارگریٹ اسے درست کرتی۔ جیسے بچپن میں ماں بچے کو نئے نئے نام لینے سکھاتی ہے۔ اور جب وہ الٹا سیدھا نام لیتا ہے۔ تو اُسے درست کرتی ہے۔ کافی پینے اور کچھ کھا چکنے کے بعد مارگریٹ نے پیسے نکالنے کے لئے جیب میں ہاتھ ڈالا۔ لیکن اس لڑکے نے تھام لیا۔ اور اپنی جیب سے پیسے نکال کر پلیٹ پر رکھ دئے۔ مارگریٹ کا خیال تھا۔ کہ کلکتہ میں عورت کا بل ادا کرنے کا اخلاق اس نوجوان کو نہ آتا ہوگا۔ لیکن اُس نے دیکھا۔ کہ وہ اس بات سے نا واقف تھا۔ ایسے ہی جیسے سینما میں چونی زیادہ دے کر عورت کے ساتھ سیٹ بک کروا لینے کا طریقہ اُسے کسی نے بتایا تھا۔ اسی طرح عورت کے ساتھ کافی پی کر اُسکے پیسے ادا کرنے کا اخلاق بھی کسی نے سکھا دیا ہوگا۔

مارگریٹ نے بتایا "کلکتہ بہت مہذب ہو چکا ہے۔ اور تہذیب بھی انگور کے دانوں کی طرح ہے۔ جب یہ بہت پک جاتی ہے تو اس سے شراب کی بو آنے لگتی ہے۔" اور جب مارگریٹ کو پتہ چلا کہ وہ لڑکا عورت کے متعلق بالکل کچھ نہیں جانتا۔ تو اُس نے نوجوان کا ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا۔

"بولئے کیا تم آج شب میرے مہمان بنو گے . . . میں آج اپنی ماں کے پاس نہیں جاؤں گی۔ یہاں گھر سے علیحدہ میرے پاس ایک بہت اچھا فلیٹ ہے۔ . . .

میں تمہیں بتاؤں گی عورت کیا چیز ہے۔ لیکن وہ عورت جس نے تمہیں سینما کے دروازے پر پایا۔ یا جسے تم نے ۲۴ پرگنہ میں دیکھا۔ یہاں تم اسے نہیں پا سکو گے . . . ہاں، تم اُس عورت کو دیکھ لوگے۔ وہ عورت جو کلکتہ ہے"

سید علی اختر

حقیقت

پہلی آواز

کچھ خاک کے بے قیمت ذرے، سرگرم فلک پیمائی ہیں
تاریک کرے پر دنیا کے عبرت کی گھٹائیں چھائی ہیں

آئینِ حیات فانی کی تکمیل سے رسم و راہ نہیں
لب تشنۂ عیش ابد، آنکھیں سپنوں میں دل آگاہ نہیں

برپا ہے فضائے ہستی میں ہنگامۂ جہل و نادانی
خود اپنے لہو سے کھیل رہا ہے صاحبِ تسخیرِ یزدانی

ہر دل کی مسرت پنہاں ہے اک صبر شکن خود بینی میں
ہر روح کو تسکیں ملتی ہے اک محشرِ بے آئینی میں

دہقاں کے لہو کی جنسِ گراں، خاشاک سے بڑھکر سستی ہے
سرمایہ کی جنت ہر جانب، ہر حلقہ بزمِ ہستی ہے

...دقت ہے اب انساں کو سبق نیکی کا سکھایا جائے گا!
بنیادِ غلط سے سر بفلک مینار کو ڈھایا جائے گا

...ہے پیامِ موسمِ گل، ترتیبِ چمن کی جائے گی
آراستہ پھر ان پھولوں سے ہستی کی دلہن کی جائے گی

عرفانِ حقیقت کی شمعیں، ہر گھر میں جلائی جائیں گی
"بھٹکی ہوئی بھیڑیں دنیا کی" اب راہ پہ لائی جائیں گی

(۲)

ذروں کو تجلی دی میں نے، پھولوں کو تبسم میں نے دیا
موجوں کو سبک سیری بخشی، بھر ذوقِ ترنم میں نے دیا

اسرارِ حقیقت ملتے تھے دنیا کو مرے افسانوں میں
اجزائے سکون سرمد تھے بیدار مرے طوفانوں میں

اک عمر کی پیاسی دنیا کو صہبا نے مری سرشار کیا
مدت کی سسکتی روحوں کو نغموں نے مرے بیدار کیا

دانش کی حقیقت سمجھائی، انساں کو انساں میں نے کیا
فطرت کے نہفتہ رازوں کو بے پردہ نمایاں میں نے کیا

(۳)

پھر لے کے وہی بے آئینی، ہنگامۂ باطل اٹھا ہے
ہلتی ہیں جڑیں پھر دنیا کی اک حشر سا گویا برپا ہے

ہستی کا فریبِ آسائش، ایوانِ عمل ڈھا کر ہی رہا
وہ طائرِ ناداں ہے انساں اس دام میں پھر آ کر ہی رہا

اک لہر سی ظلمت کی پنہاں، آئینۂ جانِ پاک میں ہے
پیمانۂ گل ہے دور میں لیکن انجمنِ خاشاک میں ہے

انساں کو خبر دو زلزلہ افگن بادل چھانے والا ہے
ہے گونج ابھی باقی جس کی طوفان وہ آنے والا ہے

...ت کے یہ اجزا بکھریں گے یہ موجِ طرب رک جائے گی
لہرائیں گے پرچم عرفاں کے دانش کی جبیں جھک جائے گی

...گی ہیں لرزنے لگا فلک، ایوانِ سکوں ویراں ہوگا
اقرارِ غلط اندیشی پر مجبور یہی انساں ہوگا

سارا یہ ہجومِ خار و خذف اب صرفِ ہوا ہو جائے گا
اس سیلِ رواں میں باطل کا ہر نقش فنا ہو جائے گا

منظور الحق کلیم

نواب غلام حسین خاں حسین

نواب غلام حسین نام اور حسین تخلص تھا۔ آپ عمدۃ الملک نواب بہادر خان بانی شاہجہان پور کے پوتے اور نواب شبر داد خاں صاحب کے اکلوتے فرزند تھے۔ گھر میں مال و دولت کی فراوانی تھی۔ قلعہ میں برابر مشاعرے ہوا کرتے تھے۔ اساتذۂ فن شرکت کرتے تھے۔ اور اُن کی قدر ہوتی تھی۔ ناسخ اور آتش جو اُس وقت آفتاب و ماہتاب تھے اکثر شریک ہوتے تھے۔ حسین نے فارسی کی تعلیم اپنے شہر کے استادوں سے حاصل کی اور اس میں فاضلانہ دستگاہ تھی۔ ذہن اور حافظہ غضب کا تھا اس کا پتہ نہیں۔ کہ فنِ شعر میں کسی سے تلمذ تھا یا طبیعت ہی استاد تھی حسین باکمال شاعر ہی نہ تھے۔ بلکہ اعلیٰ درجہ کے سخن فہم اور برجستہ گو بھی تھے۔ چنانچہ ایک مرتبہ ناسخ نے اپنا شعر؎

دے دوپٹا تو اپنا ململ کا ٭ ناتواں ہوں کفن بھی ہو ہلکا

سنا کر داد کے طالب ہوئے حسین نے کہا استاد اگر یوں کہیں تو کیسا ہو؎

ڈالدے سایہ اپنے آنچل کا ٭ ناتواں ہوں کفن بھی ہو ہلکا

ناسخ حیرت سے منہ دیکھنے لگے۔ اور کہا نواب یہ آپ ہی کا حصہ ہے۔ میرا شعر مشہور ہو گیا ہے۔ ورنہ بدل دیتا۔ اسی طرح آتش نے اپنا شعر؎ چال ہے مجھ ناتواں کی مرغ بسمل کی تڑپ

؎ ہر قدم پر ہے گماں یاں رہ گیا واں رہ گیا

سنایا۔ حسین نے کہا استاد اگر یوں پڑھیں تو کیسا ہو؎ چال ہے مجھ نیم جاں کی مرغِ بسمل کی تڑپ آتش سنکر تڑپ گئے اور اس اصلاح کی داد دی۔

آتش نے ایک مرتبہ اپنا مطلع۔

وہ نازنیں یہ نزاکت میں کچھ یگانہ ہوا

جو پہنی پھولوں کی بدھی تو درد شانہ ہوا

سنایا حسین نے فوراً تصرف کر کے یوں پڑھا؎

ادا و ناز و نزاکت میں وہ یگانہ ہوا

جو پہنی پھولوں کی بدھی تو درد شانہ ہوا

آتش نے ایک مرتبہ اپنا مطلع؎

ہوس نعمت کی بعد مرگ بھی رہتی ہے انسان کو

لحد میں پاس رکھ دیتے ہیں ورافتادہ دنداں کو

سنا کر کچھ فخریہ کلمات کہے۔ نواب کو خیال ہوا۔ کہ شاید مجھ پر طعن ہے۔ فوراً فرمایا؎

مزا ہے حلقۂ روشن دلاں میں قدر تمکیں تک

کیا محروم سو نعمت سے اک جنبش نے دنداں کو

آتش تاڑ گیا اور معافی مانگی۔ کہ روئے سخن آپ کی طرف نہیں تھا۔

ناسخ کا مشہور شعر؎ مسی مالیدہ لب پہ رنگ پاں ہے

تماشا ہے تہِ آتش دھواں ہے

دوسرے مصرع میں یوں تصرف کیا؎ دبا دو آگ کے نیچے دھواں ہے

مسرت نے ایک مرتبہ اپنا مصرع قیامت ناسخ نے بیدل کے شعر کا بجنسہ ترجمہ کیا تھا۔ اس کا لحاظ بھی ضروری ہے۔ بیدل کا شعر یہ ہے؎

مسی آلود بر لب رنگ پاں است
تماشا کن تہ آتش دھواں است

مسرت نے ایک مرتبہ اپنا مصرع "قیامت سرزہی سایہ بزیر نقش پائے او" سنایا اور خاموشی اختیار کر لی۔ نواب نے منشا سمجھ کر تین مطلعے فی البدیہہ موزوں کرکے سنائے ؎

مہ نو سرنگوں از ناخن انگشت پائے او ٭ شفق را غوطہ در خون میدہد رنگ حنائے او
زند آبے بروئے گلستاں ہا خاکپائے او ٭ بجاں لالہا منت نہد رنگِ حنائے او
صفا آئینہ را بخشد غبار نقش پائے او ٭ چراغ گل فروزد آتش رنگ حنائے او

مسرت اس برجستگی اور لطافت پر حیران رہ گیا۔

طبیعت نہایت غیور پائی تھی۔ عالی حوصلہ ایسے تھے۔ کہ غدر میں جب یہ گرفتار ہوئے لاکھ کوششیں ہوئیں۔ کہ اور باغیوں کا پتہ بتا دیں مگر کسی کو نہ بتایا۔ اس تفتیش سے ان کے احباب پریشان تھے۔ کہ کہیں کسی کا نام نہ بتا دیں۔ کچھ لوگ قید میں جا کر ملے اور ان سے کا پتہ لینا چاہا۔ نواب سمجھ گئے۔ اور دو شعر پڑھ کر خاموش ہو گئے ؎

برس رہی ہے میرے دل پہ بیکسی ونرا ٭ شکستہ حال ہوں اجڑا ہوا دیار ہوں میں
میں وہ نہیں ہوں کہ بار دلکا بار خاطر ہوں ٭ شکستہ دست ہوں اپنے گلے کا ہار ہوں میں

چوتھے مصرع کی تشبیہہ قابلِ صد آفریں ہے "شکستہ دست ہوں اپنے گلے کا ہار ہوں میں" دست شکستگی ہی گلے کا ہار ہوتا ہے۔

جوانی میں حسن پرستی کے ہاتھوں تمام علاقے تباہ ہو گئے لکھنو دہلی ایک تھا حسینانِ دہلی کے متعلق فرماتے ہیں ؎

ہم کو جلنے کے سوا کیا حاصل نظارہ تھا ٭ جا کے دہلی میں جسے دیکھا وہ آتش پا تھا
ایک دھوبن کو سرخ ساری میں دیکھ کر ؎
دور سے پیرہن سرخ دکھاتے نہ چلو ٭ خرمن صبر کو یوں آگ لگاتے نہ چلو

ایک جگہ اپنی غیور طبیعت کا نقشہ یوں کھینچتے ہیں

نروم بہ پیش دوناں نہ دہم وقار خود را
بہ طپانچہ سرخ سازم رخِ اعتبار خود را

آپ کی شاعری کا میدان فارسی تھا۔ اردو میں میر و مصحفی

یاد رکھنا کہ ریختہ گوئی ہے جسین ہنا روا ہے ٭ جو قدم بہ قدم میر نہ ہو
اگرچہ نخلِ سخن کے بہت ہیں فرع مگر ٭ اصول میرے ہے کافی غزل سرا کیلئے

ان دونوں کے بعد ناسخ اور آتش کو سمجھتے تھے یہ لوگ انکے سمجھتے بعد میر و مصحفی آمین نہیں شک اے حسین ٭ ناسخ و آتش یہ دو لکھنو کی جان تھے

آپ کا انتقال ۱۲۰۱ھ میں ہوا موضع مصری پور کے آبائی قبرستان میں دفن ہوئے۔ تائب نے تاریخ لکھی ؎

عشق و سرور سے مجھے تائب فروغ ہے ٭ دل محو درد ہے تو جگر محو داغ ہے
اندھیر ہے جہان میں وفات حسین سے ٭ ہاتف پکارتا ہے ہوا گل چراغ ہے

نمونہ کلام اردو

منشی مظہر ناقص کو تمام سمجھا ہے ٭ یہ معقولہ ہے نیا کیف کو کم سمجھا ہے
عجب طرح کا تقابل ہے لفظ و معنی میں ٭ زباں کو حال نہیں دل کو قال نہیں
آسماں سے اب بلا نازل زمیں پر چاہیئے ٭ ایڑیوں تک تیری چوٹی اے ستمگر چاہیئے
کر دو نہ چارہ گرو سرزنش خدا کیلئے ٭ مریض ہجر کو تم زہر دو خدا کے لئے

بارِ احسان سے غیور کو جو تکلیف ہوتی ہے۔ اور کسی چیز سے نہیں۔ چنانچہ فرماتے ہیں۔

آسماں ٹوٹ پڑے سر پہ تو اندیشہ کیا ٭ بارِ احسان یہ نہیں ہے کہ اٹھا بھی نہ سکوں
گندم کو کہا کہتے حضرت آدم نے کیا کیا ٭ اپنی تو کیا ہماری بھی مٹی خراب کی
مجھے ہے اپنی مجبوری پہ اب صبر ہی آتا ٭ خدا کو جب مقدر دعوے ہے اپنی کبریائی کا
قیامت میں بہرصورت اسے گر پڑکے دیکھوں گا ٭ مقرر ہے ارادہ مجکو قسمت آزمائی کا
حسین سادہ دل نے وقتِ پیری وائے نادانی ٭ لگایا دامنِ عصیاں میں دھبہ پارسائی کا

بعد زمانہ کی ناقدری کو دیکھیئے۔ کہ ایسے استاد کے کلام کا کوئی مجموعہ موجود نہیں۔ خدا بھلا کرے مولوی صبیح الدین میاں صاحب کا کہ انہوں نے نہیں معلوم کہاں کہاں سے یہ جواہرات اکٹھے کئے مؤلفہ تاریخ شاہجہانپور میں تحریر فرماتے ہیں کہ میرے ایک کارندے منشی احسان خاں صاحب نے ایک بیاض دی تھی جس میں انکی فارسی غزلیں تھیں۔ مگر اب یہ بیاض بھی مولانا کے یہاں سے غائب ہو گئی۔ نیاز الدین خاں نیاز کے پاس بھی اردو غزلیات کی ایک بیاض ہے جسمیں ۲۵۰ غزلیں تھیں۔ یہ بھی مشہور ہے۔ کہ آپکے کلام کا دو نسخہ نواب رامپور کے کتب خانہ میں موجود ہے۔

عبدالحمید ایم۔ اے

کرایہ کیلئے خالی ہے

کئی مہینوں سے سامنے مکان پر وہی منحوس فقرہ لکھا ہوا تھا

"کرایہ کے لئے خالی ہے"

جو کرایہ دار اس میں پہلے رہتے تھے۔ ننھے ننھے بچے تھے، وہ سامنے کھڑکی میں آ کھڑے ہوتے۔ یہ ان سے اپنا دل بہلایا کرتی رات کو جب سامنے کا کمرہ برقی قمقمے سے روشن ہو جاتا۔ اور اس میں وہ کھیلتے۔ شور مچاتے۔ تو یہ اپنے آپ کو ان میں تصور کرنے لگتی۔ جب ان کی ماما، انہیں دھمکا کر بستر پر نہ لٹا لیتی اسے سامانِ تفریح ملتا رہتا۔ مگر اب اُس منحوس فقرے سے گویا تمام سامانِ تفریح اُس سے چھن گیا،

یوں تو گھر میں اسکے اپنے بہن بھائی بھی تھے، وہ بھی تمام دن غل کرتے رہتے، کھیلیں کھیلتے، مگر اس کی پرواہ نہ کرتے، یہ ان کی کھیلوں میں شامل نہ ہو سکتی تھی، بچوں کی شوخ کھیلیں یہ نہ کھیل سکتی تھی۔ اُونچ نیچ، کوڑا چھپا کی یا آنکھ مچولی، ایسی کھیلیں جن میں ٹانگوں کا بے لگاؤ استعمال ہو اس کی قسمت میں نہ تھیں۔ قدرت نے اسے ٹانگوں کی طاقت سے محروم رکھا تھا۔

کبھی کبھار لکڑی کا سہارا لے کر یہ ان میں جا ملتی، ایک جگہ بیٹھ آنکھ مچولی میں منصف بنجاتی، اونچ نیچ میں فیصلہ کرتی۔ مگر اس کی ایسی روش سے بچوں کو اتنی نفرت ہو گئی جتنی کسی امتحان میں امیدواروں کو ممتحن سے ہوتی ہے۔ آہستہ آہستہ وہ اس سے دور رہنے لگی۔ حتےٰ کہ اسکے لئے تمام دنیا سمٹ سمٹا کر اس کا کمرہ بنکر رہ گئی، اور جب سے سامنے کا مکان خالی ہوا، اس کی رہی سہی تفریح بھی جاتی رہی۔

وہ اداس تھی۔ لیکن آخر جوانی نے اسے ایک نیا شغل دے دیا اسکے کمرے میں ایک تصویر ٹنگی ہوئی تھی، شام کے قریب وہ اُسکے سامنے بیٹھ جاتی، ایک لمبا تڑنگا نوجوان کاندھے پہ جال اور ہاتھ میں ایک ڈنڈا لئے تمام دن کی مشقت کے بعد گھر آتا اسے نظر آتا! آہستہ آہستہ مگر اعتبار کے ساتھ قدم اٹھاتا۔ اسے یوں معلوم ہوتا۔ کہ یہ اسکے انتظار میں بیٹھی ہے۔ اور ایک لمبا چوڑا واقعہ اُس کے ذہن میں یاد آنے لگتا؛ اسے یوں معلوم ہوتا۔ کہ وہ گھر کی صفائی کر چکی ہے، ہر چیز اپنی جگہ پر ہے، ماہی گیر کے لئے بستر لگا ہوا ہے۔ مرتنے موتیے کے چند پھول ہیں، اس نے روٹی تیار کر لی ہے۔ آگ سلگا رکھی ہے، کمرہ خوب گرم کر رکھا ہے، ماہی گیر آتا ہے۔ یہ بڑھ کر اسکے قدم لیتی ہے۔ وہ اسے اٹھا کر ماتھے پر بوسہ دیتا ہے۔ اور اسکے ہاتھ میں ہاتھ ڈالکر اندر آجاتا ہے۔ یہ کھانا لاکر اُسکے سامنے رکھتی ہے۔ دونوں کھاتے ہیں، جوں جوں رات گاڑھی ہوتی جاتی ہے۔ ان پر پریم کا نشہ زیادہ چھائے جاتا ہے۔

ابھی ذہن میں خیالات اسی حد تک پہونچتے۔ کہ اسے نیند آ جاتی اور اسکے خوابوں کی دنیا شروع ہو جاتی۔

اسے دنیا میں سب سے زیادہ عزیز اپنے یہی رنگین خواب تھے"

× × × × ×

سامنے کے مکان پر سے وہ منحوس فقرہ اٹھ گیا۔

تصویر کے پیچھے چڑیوں نے گھونسلا بنانا شروع کر دیا، بہار کا موسم آ پہنچا تھا،

سامنے کھڑکی کے قریب ایک میز لگی تھی۔ اسپر کتابیں نہایت

نفاست کے ساتھ رکھی تھیں۔ سامنے بیٹھ کر نیا کرایہ دار روز شام کو پڑھنے لگا، نوجوان چوڑا چکلا اور قدآور تھا۔ مگر سیاہی مائل اور چیچک رو، بال سنوارے ہوئے اور کپڑے احتیاط سے پہنتا تھا۔ دور سے چیچک کے داغ صاف دکھائی نہ دیتے تھے۔ پہلے روز وہ لڑکی کو اتنا خوبصورت معلوم نہ ہوا! البتہ اس کی جوانی تصویر والے ماہی گیر سے ملتی جلتی تھی، ماہی گیر صرف ایک لنگوٹی سی پہنے تھا۔ اسلئے اس کے جسم کی ہر لکیر نظر آتی تھی۔ اور سطافت کا اندازہ ہوتا تھا۔ مگر خدا جانے اس نوجوان کے جسم کی لکیریں کیسی تھیں، ہاں چہرے سے نظر آتا تھا کہ نوجوان باہمت اور گہرے جذبات کا مالک ہے۔

روز شام کو جب وہ پڑھنے بیٹھتا۔ تو وہ اسے دیکھا کرتی، اپنے کمرے کی روشنی پہلے گل کر لیتی۔ تاکہ وہ اسے نہ دیکھ سکے، آہستہ آہستہ اسے محسوس ہونے لگا۔ کہ وہ بدصورت نہیں۔ خوش رو ہے

ایک روز اس نے اپنے کمرے کی روشنی کو گل نہ کیا، جب وہ کھڑکی میں آئی۔ تو اس نے دیکھا۔ کہ نوجوان ایک پاؤں کھڑکی کی دہلیز پر رکھے ہاتھ میں سگرٹ سلگائے اس کی طرف دیکھ رہا ہے۔ اس نے جلدی سے روشنی گل کر دی، کچھ دیر وہ کھڑا رہا، پھر اپنی کرسی پر بیٹھ کر پڑھنے لگا! اس نے پھر روشنی کر لی۔ اس نے مڑ کر دیکھا، مسکرایا اور پھر کام میں مشغول ہو گیا، اسی روز اسے محسوس ہوا۔ کہ نوجوان حسین ہے۔ ماہی گیر سے بھی زیادہ حسین!

تھوڑے دنوں میں حجاب اٹھ گیا، روشنی دونوں کمروں میں رہتی، نوجوان بیٹھا کام کرتا تھا۔ وہ بیٹھی دیکھا کرتی،

آج شام کو بھی وہ روز کی طرح اپنی زیبائش و نمائش کی دھن سے فارغ ہو کر لڑکی کا سہارا چھوڑ کر ان کرسیوں کی پشتوں کا سہارا لیتے ہوئے۔ جو اس نے ایک لکیر میں اپنے شیشے سے لیکر کھڑکی تک لگائی ہوئی تھیں۔ کھڑکی تک پہنچی۔ مگر سامنے کھڑکی بند تھی شیشوں میں سے نظر آتا تھا۔ کہ اندر روشنی ہے،

وہ ضرور اندر ہے، مگر اس کے پاس کون ہے۔ جو اس نے کھڑکی بند کی ہے، کوئی اور . . . نہیں نوجوان ایسا نہیں، مگر اسے کہیں معلوم نہ ہو گیا ہو کہ میں روگی ہوں . . . نہیں اسے کیا معلوم، کھڑکی کی دہلیز کافی اونچی ہے۔ اور میری کھڑکی اس سے اونچی ہے . . . نہیں"

کسی عجیب مرقی جذبہ کے ماتحت اس نے قریب ہی سے چینی کا پھولدان اٹھایا، ایک دو مرتبہ اسے سر کے قریب لا کر ہلایا اور یکدم ایک ایسے جوش میں اس کی کھڑکی کی طرف دے مارا، وہ کھڑکی کے قریب دیوار پر لگا اور چکنا چور ہو گیا، کھڑکی کھلی، نوجوان نے سامنے دیکھا۔ پھر اپنے مکان کی دیوار کی طرف پھر اس کی طرف دیکھ کر مسکرایا کھڑکی کھلی رہی۔ اور وہ پڑھنے لگا،

"یہ اس نے مجھے تنگ کرنے کی خاطر کیا ہے، اندر کوئی دوسرا نہ تھا، ہاں . . . یہ مجھے پہلے ہی سے امید تھی، وہ ایسا نہیں ہے۔ مگر مجھے تنگ کیوں کیا، وہ چاہتا ہے کہ میں اسے اپنی ساری محبت یکدم دے دوں، ایسا نہیں ہوگا، جب تک وہ تمام محبت میرے لئے وقف نہ کر دے، میں بھی اسے تنگ کر سکتی ہوں، کر دوں گی، میں بھی کل اپنی کھڑکی کا دروازہ بند رکھوں گی

اس نے مڑ کر دیکھا، تصویر کے نیچے چڑیوں نے گھونسلا تیار کر لیا تھا۔ ماہی گیر گھر آ رہا تھا، مگر اسکے خوابوں کی دنیا بدل چکی تھی:

آج کھڑکی بند رہے گی، کل بھی، اور پرسوں بھی،

آج اسے محسوس ہو رہا ہوگا۔ کہ میرا کیا حال ہوا تھا۔ کھڑکی بند کر لی تھی نا اس نے آج میں نے بھی کر لی ہے، اس وقت وہ کمرے میں تیزی سے چل رہا ہوگا، کبھی ادھر آتا ہوگا۔ کبھی ادھر جاتا ہوگا پھر کھڑکی میں کھڑے ہو کر ایک پاؤں دہلیز پر رکھ کر سگریٹ پیتا ہوگا جس کا دھواں پیچ و تاب کھاتا ہوا اسکے منہ سے نکلے گا۔

مجھے سگرٹ پینا تو اتنا برا معلوم نہیں ہوتا۔ مگر اس کی بو سے نفرت ہے، اسے یہ عادت چھوڑنا پڑے گی، اور وہ کیوں نہ چھوڑیگا میں چھڑا دوں گی "

اب اُس کی بے چینی بھی تو بڑھ رہی ہوگی، پھولدان ابھی میرے
کمرے کی دیوار پر مارے گا۔ مگر میں تب بھی دروازہ نہ کھولوں گی
اس نے مجھے کیا سمجھا تھا جو مجھے تنگ کرنے کی اسے سوجھی تھی، میں
اسے زیادہ تنگ کر سکتی ہوں، ہو، مگر اتنا تنگ نہ کروں گی، کہ اس
کی آنکھوں میں آنسو آجائیں، نہیں میں اُس کی آنکھوں میں آنسو
نہ آنے دوں۔ . . مگر شاید اس کی آنکھیں آنسوؤں سے پُر ہو کر
زیادہ خوبصورت ہو جائیں، نہیں مرد کو رونا نہیں چاہیئے: میں
اسے رلاؤں گی نہیں، وہ ذرا سا اشارہ کرے تو میں کھڑکی کو
کھول دونگی۔ اُس نے بھی تو کھول دی تھی،

کافی وقت گزر گیا

شاید اس کے کمرے میں پھولدان نہیں ہے۔ مجھے کھڑکی
بند کرنے سے پہلے اسے کوئی تحفہ ضرور بھیجنا چاہیئے تھا۔ منو پہنچا
آئے گا، میں اسے اب بھیج دوں گی، منو کو کوئی چیز دے دونگی۔ اسے
خوش کروں گی، وہ خط بھی تو لے جا سکتا ہے، مگر پہلے مجھے نہیں لکھنا
چاہیئے، پہلے تو اسے ہی لکھنا چاہیئے، اگر وہ لکھے گا۔ تو میں اس پر
بگڑ جاؤں گی، پھر منت سماجت خود ہی کریگا، تنگ اُسے نہ کرونگی
جھٹ مان جاؤنگی، مگر اسنے تو میرے پہلے اشارے پر دروازہ
کھول دیا تھا اگر وہ خط لکھے۔ تو مجھے فوراً جواب دینا چاہیئے۔ میں
اسے سب کچھ بتلا دوں گی۔ اپنے روئیں روئیں کی ساری محبت
اسکے لئے وقف کردوں گی، . . . مگر وہ کھڑکی پر اپنی کتاب
کیوں نہیں دے مارتا۔ . . . . . "

چوکیداروں کی آوازیں آنے لگیں

" میری محبت مانگتا ہے۔ اور خود اپنی محبت دینا نہیں چاہتا،
میں کھڑکی بند ہی رکھوں گی۔ کل بھی اور پرسوں بھی، اسے مجبور
کروں گی۔ کہ وہ میرا ہو کر رہے . . . " . .

کھڑکی دن بھر بند رہی، شام ہوگئی۔ پہاڑ سا دن کٹ گیا
آخر اتنی شام ہو چکی تھی مگر چڑیاں ابھی گھونسلوں میں واپس نہ آئی
تھیں۔ --- میں ابھی تک تیار نہیں ہوئی، اگر وہ ابھی کوئی چیز مار
دے۔ تو وہ مجھے ایسی بھونڈی صورت میں دیکھے گا، پاگل ہوں میں
بھی، مجھے تیار ہونا چاہیئے تھا، وہ پریشان ہو رہا ہوگا، میں نے
زیادتی کی ہے، اسے تنگ نہ کرنا چاہیئے تھا، مرد تو تنگ کرتے ہی
ہیں۔ مجھے اس طرح نہ کرنا چاہیئے تھا، مگر . . . مگر اس طرح
وہ خیال کریگا۔ کہ میں اس پر مرمٹی ہوں۔ میری کمزوریاں اُس پر
ظاہر ہو جائیں گی، اور ابھی میں نے اسے اپنی ٹانگوں کے متعلق
بھی نہیں بتلایا . . . . . . اسے میری پروا نہیں . . کھڑکی تو
اس نے کھول دی تھی، ناراض ہو گیا ہوگا، اتنی سی بات پر ناراض
ہو گیا ہے، میری غرض اسے تنگ کرنا تو تھا نہیں . . . . مان جائیگا
میں منا لونگی اسے، وہ ایسا نہیں ہے، میں نے خواہ مخواہ اسے
حیران کیا ہے، ابھی تک کر رہی ہوں . . . .

" کھڑکی مجھے کھول دینی چاہیئے، مگر یہ تو میں نے ہار مان لی
میں ہار کیوں مانوں، اگر وہ پریشان ہے۔ تو میں کچھ کم تو نہیں،
میں بھی تو حیران ہو رہی ہوں، شائد اس میں اتنی جرأت نہیں
کہ میری دیوار پر کچھ مار دے، ہمسایوں کا ڈر ہوگا۔ ورنہ ایسا
ضرور کرتا۔

" مجھے ہار مان لینی چاہیئے، آخر عورتیں کمزور دل ہوتی ہیں
وہ مرد ٹھہرا، طاقت ور، بہت ہو چکی۔ اب کھڑکی کھول دینی چاہیئے
یہ سوچکر وہ کھڑکی کی طرف بڑھی مگر اپنی نمائش کا خیال آیا، پھر
کیا ہوا، اگر آج میں تیار نہیں ہوئی، اسے معلوم تو ہو جائیگا۔ کہ میری پریشانی
کا کیا حال ہے . . . بال بکھرے ہوئے ہیں، انہیں پہلے پر اور بکھار لینا چاہیئے
اسے یوں معلوم ہوا کہ اسکا دل پھٹ جائیگا، ایک منٹ، ایک منٹ، اگر کھڑکی
کا دروازہ اور نہ کھلا۔ تو وہ مر جائے گی۔

ایک ہاتھ دل پہ رکھے دوسرے سے اسے پورے زور سے کھڑکی کے پٹ کھولے تصویر
گر کر چکنا چور ہو گئی۔

سامنے مکان میں اندھیرا تھا، پٹ بند تھے۔ سڑک کی روشنی میں بھی منحوس فقرہ دور سے
پڑھا جاتا تھا "کرایہ کیلئے خالی ہے،"

دو غزلیں

(یہ غزل ۴ ؍ جنوری سنہ ۱۹۴۱ء کو دیال سنگھ کالج لاہور کے ناظر کا انعامی مشاعرہ میں پڑھی گئی۔ اور اسے اول انعام ملا)

بتوں کو کبریائی کیوں نہ آئی
خدا ہو کر خدائی کیوں نہ آئی

نہیں معلوم شیخ پارسا کو
ابھی تک پارسائی کیوں نہ آئی

مزاجِ یار رنگیں تھا مرے کام
مری رنگیں نوائی کیوں نہ آئی

وفا بھی دلربائی کا ہے انداز
تمہیں یہ دلربائی کیوں نہ آئی

جو تم نے سیکھ لی غیر آشنائی
مجھے دشمن کی آئی کیوں نہ آئی

محبت خاکساری ہے، تو پھر کس
مجھے یہ جبہہ سائی کیوں نہ آئی

جنہیں وعدوں کی طاقت دی خدا نے
انہیں وعدہ وفائی کیوں نہ آئی

شبِ غم کی نہ صورت دیکھتی میں
"اجل ردِ جدائی کیوں نہ آئی"

سکینہ محمود

ہونے لگا شاید ہمیں عرفانِ محبت
دنیا نظر آنے لگی عنوانِ محبت

اک نسبتِ موہوم کا اعجاز ہے واللہ
ہم جس کو سمجھ بیٹھے ہیں پیمانِ محبت

صدقے ہیں کسی شوخ کی جادو نگہی کے
امڈا ہوا ہر شے میں ہے طوفانِ محبت

اک لطفِ نظر آفتِ جاں باعثِ صد لطف
دل غنچۂ راحت ہے کہ پیکانِ محبت

جل بجھنے کو دل اور ہیں یہ جانبکو آنکھیں
کب دیکھئے لٹ جائے یہ سامانِ محبت

سو زندگی اپنی ہے مجید اس پہ تصدق
تم تھام کے مر جاؤ جو دامانِ محبت

عبدالمجید بھٹی

شبیر محمد اختر

انگلیاں

پیشپا نے جب بزاری کو پہلی مرتبہ دیکھا تو اُس کی نظریں اُس کی انگلیوں پر جم گئیں۔ وہ ان کی سختی کو دیکھ کر سہم گئی۔ لیکن وقت گزرنے پر وہ انہیں بھول گئی۔ ایک دن اسکے سامنے میز پر ایک نوجوان کی لاش رکھی تھی جس کی ابھری ہوئی آنکھیں ایک دہشتناک افسانہ بیان کر رہی تھیں۔ گلے میں انگلیوں کے نشانات ابھی تک نمایاں تھے۔ یہ نشانات دیکھ کر اس کی بھولی ہوئی یاد پھر تازہ ہو گئی۔

موت گلا گھونٹنے سے واقع ہوئی ہے،، ڈاکٹر کی یہی رائے تھی۔ لاش کے پوسٹمارٹم کے وقت پیشپا بھی موجود تھی میڈیکل کالج میں اس کا آخری سال تھا۔ اسلئے اُسے اب لاشوں کے چیرنے پھاڑنے میں ذرا بھی جھجک محسوس نہ ہوتی تھی۔

زندگی اور موت یہ ایسے الفاظ ہیں۔ جو ایک ڈاکٹر کے لئے بالکل معمولی اور کاروباری حیثیت رکھتے ہیں۔ موت اسکے تجربے کے ناکام رہنے کا نام ہے۔ وہ انسانی زندگی سے کھیلتا ہے ایک بچے کی طرح جو کھلونا توڑ کر بعض اوقات خوش ہوتا ہے۔ گویا اس نے کوئی بڑا کام کیا ہے۔

لیکن اس نوجوان کی موت نے پوسٹ مارٹم کے کمرے میں موجود سب ڈاکٹروں کو اظہار ہمدردی پر مجبور کر دیا۔ وہ نوجوان تھا۔ اور اس کی موت نہایت افسوسناک طریقے سے واقع ہوئی تھی۔ قاتل نے رات اس نوجوان سے لڑائی مول لے کر آخر اُسے ہمیشہ کے لئے اپنے راستہ سے دور کر دیا تھا۔

"دنیا میں عورت فتنہ کی جڑ ہے،، کرنل بک نے مسکرا کر کہا اور پیشپا کی طرف دیکھنے لگا۔ کرنل رپورٹ لکھ چکا تھا۔ اور باہر جا رہا تھا۔ "کیوں ڈاکٹر پیشپا۔ کیا خوفناک واقعہ ہے۔ اُس نے کہا۔ لیکن پیشپا جواب نہ دے سکی۔ وہ کرنل بک اپنے کالج کے پرنسپل اور سرجن کی طرف شک و شبہ کی نگاہوں سے دیکھتی رہی

وہ جب اپنے کمرے میں لوٹی تو شام ہو چکی تھی۔ اس کا جسم تھکاوٹ سے چور چور ہو رہا تھا۔ وہ کھانے کی میز پر بھی خوش ذوقی کا ثبوت دینے سے قاصر رہی۔ لاش کی گردن پر انگلیوں کے نشان بار بار اُس کی آنکھوں کے سامنے پھر رہے تھے۔

جب وہ مطالعہ کے لئے بیٹھی تو اس کا دل کتاب کے دیکھنے کو بالکل نہیں چاہتا تھا۔ اس نے بہتیری کوشش کی کہ وہ خیالات کو یکجا کرے۔ مگر اُسے یکسوئی نہ ہوئی۔ اس کی میز کے پاس سٹینڈ پر ہڈیوں کا ایک پنجر لٹک رہا تھا۔ اچانک اس کی نگاہ اس پر جم کر رہ گئی۔ اُسے ایسا معلوم ہونے لگا۔ گویا وہ ہڈیوں کا پنجر کا ایک انسان بن گیا ہے۔ اور اس کا ہاتھ اٹھ کر بڑھتا ہوا اُس کی گردن کی طرف آ رہا ہے اور پیشپا کو گلے میں سانس گھٹتا ہوا محسوس ہونے لگا۔

حسین و جمیل نوجوان کے سفید و سرخ گلے پر نوجوان لڑکی بوسہ دے کر روحانی مسرت حاصل کرتی ہے۔ اسکے گرد باہیں حائل کرنے سے وہ ایک ایسی دنیا میں پہنچ جاتی ہے۔ جہاں تخیل کی آخری بلندی شاید پہلا زینہ ثابت ہوتی ہے۔ لیکن ایسی ہی

ایک گردن پر پانچ انگلیوں کی گرفت موت بنکر کئی زندگیوں کو تباہ کردیتی ہے۔

اس کے بعد وہ انگلیوں کے متعلق سوچنے لگی۔ اور اس نے اپنا ہاتھ میز پہ پھیلا دیا۔ اس کی لمبی انگلیاں کتنی پتلی تھیں۔ ناخن، کتنے خوبصورت تھے۔ ان انگلیوں کی کئی بار تعریف ہوچکی تھی۔ کالج کی محفل سرود میں جب وہ پیانو پہ بجلی کی تیزی کے ساتھ رقص کرتیں۔ تو وہ ان پہ فخریہ انداز سے نظر ڈال کر دل ہی دل میں خوش ہوتی۔

اور پرشن تھیٹر میں آہستہ پھرتی سے چیر پھاڑ میں مصروف دیکھ کر ڈاکٹر نے کئی بار "حیرت انگیز انگلیاں" کہہ کر اس کی تعریف کی تھی۔ ایک دن کسی نے یہ بھی کہا تھا۔ اے کاش! یہ انگلیاں جراحی کی بجائے مصوری کرتیں"

پشپا کو پامسٹری کا شوق تھا۔ اس نے اس ضمن میں بہت سی کتابوں کا مطالعہ بھی کیا تھا۔ انگلیوں کی ساخت سے وہ بتا سکتی تھی۔ کہ ان کا مالک کس قسم کا آدمی تھا۔ اپنے ہم جماعتوں میں سے اُسے کرشن کمار سے بڑی محبت تھی۔ اس کی زیادہ تر وجہ اس کی خوبصورت انگلیاں تھیں۔ اور بنواری لال نے بہت کوشش کی۔ کہ پشپا کے دل میں جگہ حاصل کر سکے۔ وہ جسمانی لحاظ سے کرشن سے کچھ خوبصورت ہی تھا۔ لیکن اس کے ہاتھوں کی انگلیوں کی ساخت کچھ عجیب سی تھی۔ اس کا دل بھی میلا تھا۔ اور دماغ مجرمانہ۔ اسکا ہاتھ دیکھ کر ہی پشپا کو اس سے نفرت ہوگئی تھی۔

کرشن کمار اور پشپا کی دلی مناسبت کا اثر بنواری پہ بُرا ہوا اس نے کئی بار کرشن سے شرارت کی۔ اسکے تجربات خراب کر دئیے اس سے لڑائی مول لینا چاہی۔ اس نے دونو کو دہشت زدہ کرکے اُن کی ملاقاتیں عارضی طور پہ بند کرادیں۔

انگلیاں ـــ اسکے خیالات اسی نقطے کے گرد گھوم رہے تھے۔ انگلیاں ـــ وہ اپنی انگلیاں دیکھ رہی تھی۔ پہلی بار جب اُس نے ایک مردہ لاش کو چھوا تھا۔ تو اُسے ایسے محسوس ہوا گویا وہ ایک برف کا ٹکڑا ہے ـــ اور جب پہلی بار کرشن نے ایک شام اسکے ہاتھ کو چھوا۔ تو وہ کس طرح چونکی تھی بجلی کی لہر اس کے رگ و پے میں دوڑ گئی۔ انگلیوں کا لمس اسے ابھی تک یاد تھا۔ اسکے چہرے پہ ایک سرخی دوڑ گئی۔

مرد کی انگلیاں جب کسی عورت کے جسم کو چھو جائیں۔ تو دل کی ساری باتیں بتا دیتی ہیں۔ اُن کا چھونا چھونے والے کی نیت کا حال ظاہر کردیتا ہے۔ کرشن کا لمس ـــ وفورِ شوق میں اس قدر بلند پروازی کرتا کہ پشپا اس کے لیے حسن کی دیوی بنجاتی۔ اور وہ اسکے قدموں کو چھوکر دل کو تسکین دیتا لیکن بنواری ـــ ہاں ایک دفعہ غلطی سے بنواری کی انگلیوں نے پشپا کے ہاتھوں کو چھو لیا تھا۔ اور چھونے کے اس مختصر سے عمل میں کتنے ہوس کارانہ جذبات نمایاں تھے۔ شاید بنواری کے نزدیک عورت مرد کا مالِ غنیمت تھا۔ یا محض ایک کھلونا۔

کرشن کی خوبصورت انگلیاں پشپا کا دل چھین کر لے گئیں۔ اور وہ مسرور تھی۔ ان انگلیوں میں دل دے کر وہ بامراد ہوگئی۔ لیکن بنواری کا ہاتھ ـــ ایک قصاب کا بیرحم ہاتھ تھا۔ جس کے لئے دل صرف گوشت کا ٹکڑا تھا۔ . . .

دیوار پہ ایک قدِ آدم تصویر آویزاں تھی۔ جو کپڑے پہ دھاگے سے کاڑھی گئی تھی۔ پشپا کی نگاہیں اچانک اس پر جم گئیں۔ یہ اس کی مرحومہ استانی کی نشانی تھی۔ " ایک نوخیز بچہ گھاس کے تختے پر بیٹھا تھا۔ اس کی کتابیں ادھر اُدھر بکھری پڑی تھیں اسکے لبوں پہ ایک مقدس مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ اس نے کمال اشتیاق سے اپنی روشن آنکھیں آسمان پہ گاڑ رکھی

تھیں. جن کی نیلاہٹوں میں سے ایک حسین و جمیل فرشتہ ظاہر ہو رہا تھا. اسکے ہاتھ میں ایک شمع تھی جس کے گرد ایک نورانی ہالہ تھا. شمع کی لَو میں لفظ "علم" لکھا ہوا تھا.

نیچے کے دائیں جانب ایک جھاڑی تھی. جس کی چوٹی پر دو کوے بٹھا دئے گئے تھے. ایک چھوٹا ایک بڑا. بڑے نے چھوٹے کی چونچ میں اپنی ساری چونچ ڈال رکھی تھی. دونوں کی آنکھیں بند تھیں. .... اس تصویر کے نیچے "طالب علم" لکھا تھا

استانی نے ساری عمر اس تصویر پر صرف کر دی تھی. وہ بےچاری خوبصورت نہ تھی. اس لئے عمر بھر کنواری رہی. سکول میں سب اس سے نفرت کرتے. اس کا نام "چڑیل" رکھا ہوا تھا. لیکن کون جانے. کہ اس کا دل کس قدر حسین اور منور تھا. بیچاری جوانی میں ہی گھل گھل کر مر گئی. مرنے سے پہلے اس نے پشپا کو یہ تصویر تحفہ دی. آخری نشانی! پشپا کی ماں نے استانی کو بہن بنا لیا تھا.

تصویر کے شیشے پر پشپا کو پھر ایک ہاتھ دکھائی دیا. نازک نازک انگلیاں سوئی سے کشیدہ کاری کر رہی تھیں. انگلیاں پتلی پتلی، لمبی لمبی، مگر سیہ فام. اُن پر گوشت کا نام نہ تھا. وہ پھرتی سے اپنا کام کر رہی تھیں. شیشہ بتدریج روشن ہوتا چلا گیا. اس نے استانی کا پژمردہ چہرہ دیکھا: نگاہیں کپڑے پر گڑی تھیں. بھاری بھاری پلکیں اس کی آنکھوں کو بوجھل بنا رہی تھیں. انگلیاں مشین کے پرزوں کی طرح اپنا کام کئے جا رہی تھیں. تاریکی میں کئی لمبے لمبے ہاتھ نمودار ہوئے. موٹی موٹی بھدی انگلیاں. وہ اُستانی کی طرف بڑھنے لگے. لیکن استانی اُن سے بےخبر کام کئے جا رہی تھی. وہ ہاتھ آگے بڑھتے گئے اُسے صرف اُنگلیاں نظر آ رہی تھیں. اُستانی کا گلا دبایا جا رہا تھا. فضا میں ایک طوفان سا محسوس ہونے لگا. چڑیل! چڑیل!! چڑیل!!! ایک شور تھا جو چاروں طرف بپا ہو گیا مگر استانی کی زبان بند تھی. اسکا پژمردہ چہرہ اور بھی زرد ہو گیا مگر اس کی انگلیاں باقاعدہ حرکت کر رہی تھیں.

اچانک اسی دھندلکے میں اس نے ہیڈ مسٹرس کا دفتر دیکھا. ایک بوڑھی عورت بیٹھی لکھ رہی تھی. اور سامنے اُستانی منتظر کھڑی تھی. مایوس اور لاغر، بوڑھیا نے آنکھیں اٹھا کر اس کی طرف دیکھا. اور بولی. "آپ بیمار ہیں. میں بچیوں کو بیمار کرنا نہیں چاہتی آج سے آپ کو علیحدہ کیا جاتا ہے." استانی نے لڑکھڑاتے ہوئے بڑھیا کو پتھرائی ہوئی آنکھوں سے دیکھا اس کی آنکھیں باہر نکلی ہوئی تھیں. جیسے کسی نے اس کا گلا گھونٹ دیا ہو ــــ اور پھر اُسے بڑھیا کی انگلیاں اور کرشن کے گلے میں پڑے ہوئے نیلے نشان نظر آنے لگے.

اور پشپا چیخ کر اپنے بستر پہ جاگری.

ایں بادِ خوش و ایں چمن و ایں مہتاب ایں سبزہ و ایں جوئے رواں مے ناب

باشی چو تو اینہا ہمہ اسبابِ طرب لاکن چو نباشی ہمہ یک باطل خواب

سردار انور خاں انور

پروفیسر کنہیا لال کپور ایم اے

نام

(کرشن چندر، حجاب امتیاز علی، منٹو، ایم اسلم سے معذرت کے ساتھ)

میرے دوست کرشن چندر کا قول ہے۔ کہ کتاب لکھنے کی نسبت کتاب کا نام تجویز کرنا زیادہ مشکل ہے۔ ایک عرصہ تک مجھے اس قول کی صداقت کے متعلق شک رہا۔ لیکن جب پچھلے ہفتہ مجھے ایک کتاب نام تجویز کرنے کی ناگہانی مصیبت پیش آئی۔ تو مجھے اپنے دوست پر ایمان لاتے ہی بنی۔ حقیقت یہ ہے۔ کہ ایک کتاب کے لئے جتنے خوبصورت نام تجویز ہو سکتے ہیں وہ تو متقدمین نے پہلے ہی اپنا لئے ہیں۔ "کہکشاں"، "کارواں"، "کوثر"، "نرگس"، اور "شعلے" سب کے سب بہت مدت سے کسی نہ کسی سرورق کی زینت بن چکے ہیں۔ اب صرف "جہنم"، "دھواں" اور "چنبیلی" متاخرین کے لئے باقی رہ گئے ہیں۔ سچ تو یہ ہے۔ کہ آجکل اچھے ناموں کی نہ صرف کمی ہے۔ بلکہ ایک اچھا خاصہ قحط ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ متقدمین نے یہ سازش کر رکھی تھی۔ کہ کوئی اچھا نام انکی زد سے نہ بچے۔ منشی پریم چند کو ہی لیجئے۔ انکے ہر ایک ناول کے نام میں وہ مقناطیسی کشش ہے۔ کہ انسان ان کی جانب راغب ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ "چوگان ہستی"، "فردوس خیال" جیسے نام ایک خوبصورت شعر کی طرح پڑھنے والے کے دل میں بے ساختہ اتر جاتے ہیں۔ علامہ اقبال کی تقریباً ہر تصنیف کے نام میں وہ جاذبیت ہے۔ کہ ہمیں بے اختیار ان کی عظمت کا قائل ہونا پڑتا ہے۔ "بال جبریل"، اور "ضرب کلیم"، جیسے ناموں میں ایک نغمے کی شیرینی اور منعدد تلواروں کی جھنکار پوشیدہ ہے۔ اب انکے مقابلے میں ہمارے زندہ شاعروں کی کتابوں کے نام ملاحظہ فرمایئے۔ "زیر و زبر"، "صبح و شام"، "سیاہ و سفید"، "این و آں"، "شیر و شکر"، شاید انہی ناموں کے پھیکے پن کو دیکھ کر میرے دوست نریندر ناتھ نے ایک دفعہ کہا تھا۔ کہ موجودہ زمانے کے شعرا اگر بجائے ایسے نام ایجاد کرنے کے پرانے ناموں کو تھوڑے بہت تصرف کے ساتھ استعمال کریں، تو مناسب ہوگا۔ مثلاً "بالِ جبریل" کی طرز پر "بالِ عزرائیل"، یا "بالِ اسرافیل" یا "بالِ ابابیل"، وغیرہ مجھے ان کی اس تجویز سے کلیتاً اتفاق ہے۔ مثلاً حجاب امتیاز علی کے افسانوں کا نام "صنوبر کے سائے" مجھے بہت پسند ہے۔ گو یہ صحیح ہے۔ کہ میں نے آجتک صنوبر کا درخت نہیں دیکھا۔ اور نہ ہی کبھی اسکے سائے میں بیٹھا ہوں۔ اب اگر کوئی صاحب اپنی کتاب کا نام "کیکر کے سائے"، تجویز کریں تو مجھے ازحد مسرت ہوگی۔ کیونکہ پنجاب میں کیکر بکثرت ہوتا ہے۔ اور ہم میں سے تقریباً ہر ایک کو اسکے سائے میں بیٹھنے کا اتفاق ہوا ہے۔ اس جدت کا یہ بھی فائدہ ہوگا۔ کہ ہر ایک نام کا ایک سلسلہ قائم ہو جائیگا۔ مثلاً "کیکر کے سائے" کے بعد "شیشم کے سائے" اور پھر "شہتوت کے سائے" اور پھر "انار کے سائے"۔ اب یہ ظاہر ہے کہ جو شخص "صنوبر کے سائے" کا مطالعہ کریگا یقیناً اس کی خواہش ہوگی کہ اب "چنار کے سائے" پڑھوں۔ اور اگر اور کسی بات کے لئے نہیں۔ تو صرف اس امر کے لئے کہ ان دونوں درختوں میں کس کی چھاؤں زیادہ میٹھی اور گھنی ہے۔ نیز مصنفوں کو اپنی نئی کتابوں کے نام تلاش کرنے میں سہولت ہو جائیگی۔ مثلاً کرشن چندر صاحب "طلسم خیال"، کے بعد "پرواز خیال"، "نیرنگ خیال" "سمندِ خیال" جیسے ناموں کے ماتحت اپنے تمام افسانوں کے مجموعے شائع کر سکتے ہیں اور "نظارے" کے بعد "شرارے" "شرارے" کے بعد "غبارے"

اور "غبارے" کے بعد "لیا دے"، نہایت آسانی کے ساتھ معرضِ وجود میں لا سکتے ہیں۔

آپ کچھ ہی کہیں کسی کتاب کے لئے آجکل ایک اچھا نام تجویز کرنا بھی جوئے شیر لانا ہے۔ آجکل اچھا نام صرف اتفاق سے رکھا جا سکتا ہے۔ جیسے سعادت حسن منٹو نے اپنے ڈراموں کا نام "آؤ" رکھدیا ہے۔ اپنے ڈراموں کے مجموعے کا نام "آؤ" رکھ کر منٹو نے نہ ہی صرف انتہائی جرأت سے کام لیا ہے۔ بلکہ ہر ایک مصنف کو نام تجویز کرنے کا ایک نہایت سہل طریقہ بتایا ہے۔ بیشک اب اچھے ناموں کی کمی ہے۔ مگر ابھی اردو زبان میں مصادر کی کمی نہیں۔ اور پھر ہر ایک مصدر سے فعل امر بنانا چنداں مشکل نہیں۔ چنانچہ انہوں نے آنا مصدر سے فعل امر بناتے ہوئے "آؤ" سے ابتدا کی ہے۔ اب آپ اسکے نقش قدم پر چلتے ہوئے "جاؤ" "گاؤ" "کھاؤ" "لڑو" "دوڑو" "بھاگو" وغیرہ متعدد نام سوچ سکتے ہیں۔ ان ناموں میں جہاں سادگی ہے "وہاں دعوتِ عمل بھی ہے۔ مثلاً پڑھنے والا جب "بھاگو" جیسی کتاب کا سرورق پڑھیگا تو کم از کم مصنف کی ایک بات پر تو عمل کریگا۔ یعنی سر پہ پاؤں رکھ کر بھاگے گا۔

دوسرے اس قسم کے نام میں کسی شک کی گنجائش نہیں ہو سکتی۔ ممکن ہے کہ "ہوائی قلعے"، کا سرورق پڑھ کر کوئی شخص غلطی سے یہ سمجھ لے کہ شاید اس کتاب میں ہوائی جنگ کے متعلق کچھ ہدایات دی گئی ہیں۔ یعنی یہ بتایا گیا ہے کہ "ہوا میں"، کس طرح قلعے بنانے چاہئیں اور کس طرح دشمن کو نرغے میں لانا چاہیئے۔ اسی طرح یہ بھی ممکن ہے کہ "سحرِ فرانس"، کو کوئی جادو یا طلسم کی کتاب تصور کرے۔ مگر "آؤ" کا مطلب سوائے "آؤ"، کے اور کیا ہو سکتا ہے؟ اسکے بعد بھی اگر آپ کو "آؤ" جیسا نام ناپسند ہو۔ تو آپ کم از کم اس بات کا اعتراف تو کرینگے۔ کہ "آؤ" "ایم اسلم کے "نمستے علیکم" سے بدرجہا اچھا نام ہے۔ "آؤ" جتنا مختصر ہے "نمستے علیکم" اتنا ہی بے ڈھب ہے۔ "آؤ" میں اچھوتا پن نہ سہی۔ مگر اختصار تو ہے "نمستے علیکم"، میں ہندو مسلم اتحاد ہو تو ہو۔ مگر ترنم اور اختصار نہیں۔

شاید "نمستے علیکم" کو دیکھ کر میرے دوست ہندر ناتھ نے کہا تھا کہ اس سے بہتر تو یہ ہوتا، کہ اسلم صاحب اس کتاب کا نام "مسجد و مندر" رکھ دیتے۔ گو میری دانست میں "شیخ و برہمن"، زیادہ موزوں رہتا۔ میرے دوست ہندر ناتھ یہ بھی کہتے ہیں، کہ اگر ہمارے مصنف انگریزی مصنفوں کی پیروی کرتے ہوئے اپنے ناولوں کے نام اُردو کے اچھے شعروں اور مصرعوں سے اخذ کریں۔ تو یہ جدت خوب ہے۔ مثلاً ٹامس ہارڈی نے اپنے ایک ناول کا نام (UNDER THE GREENWOOD TREE) رکھا ہے اور یہ مصرع شیکسپیر کے ایک مشہور گیت کا حصہ ہے۔ اسی طرح ہارڈی کے ایک اور ناول کا نام (FAR FROM THE MADDING CROWD) ہے۔ اور یہ مصرع تھامس گرے کی ایک المیہ نظم سے لیا گیا ہے۔ میرے دوست کا خیال ہے کہ اردو ناول نویسوں کو بھی اب اسطرح کے نام رکھنے چاہئیں۔ مثلاً عشق و محبت کی داستانوں کے نام کچھ اس قسم کے ہوں "عشق پر زور نہیں . . . ."، "عشق نے غالب نکما کر دیا"۔ "دل سے تری نگاہ جگر تک اتر گئی"، "جہاں ریحانہ رہتی تھی"، اور رنج و غم کے افسانوں کے نام اس طرح کے ہوں۔ "ہم روتے پہ آ جائیں تو" "مجھ غمزدہ کو نیند نہ آئی تمام رات" "تھمتے تھمتے ہی تھمیں گے آنسو" وغیرہ وغیرہ۔

چنانچہ میں نے اُن کی اس نصیحت پر عمل کرتے ہوئے اپنے ایک دوست کی کتاب کا یہ نام تجویز کیا ہے: "شرم تم کو مگر نہیں آتی" یہ مصرع جیسا کہ آپ کو معلوم ہے۔ حضرت غالب کی ایک غزل سے لیا گیا ہے۔ اور میں امید کرتا ہوں۔ کہ آپ اس مصرع کی معنوی اور صوری خوبیوں کو مدنظر رکھتے ہوئے میری جدت کی داد دینگے۔

نہال سیوہاروی

پیام امروز

ولولہ حب وطن کا عام ہونا چاہیئے
اے چمن والو چمن کا نام ہونا چاہیئے

جس کا مقصد کچھ نہیں بے سود ہے وہ زندگی
کام کرنا چاہیئے کچھ کام ہونا چاہیئے

عشق کا دعوےٰ ہے ناقص گر نہ ہو تکمیلِ عشق
یعنی ہر آغاز کا انجام ہونا چاہیئے

نوحۂ بیچارگی و بے پری کل تک رہا
آج اک عزمِ شکستِ دام ہونا چاہیئے

یا ہوں ہم ہنگامہ آرائے نبرد رستخیز
یا لحد میں مائل آرام ہونا چاہیئے

فکرِ حاصل خامیٔ ذوقِ عمل کی ہے دلیل
بے نیازِ کاوشِ انجام ہونا چاہیئے

کیوں اٹھائیں بادہ نوشی کیلئے احسانِ غیر
اپنے میخانے میں اپنا جام ہونا چاہیئے

کیف آگیں جس سے ہو جائے دماغِ زندگی
وہ لبِ مے نوش پر پیغام ہونا چاہیئے

میکدہ جب ایک ہے پھر کیا لحاظِ ما و تو
دور یہ تفریقِ خاص و عام ہونا چاہیئے

داغِ دل سے کام لینا چاہیئے خورشید کا
صبح سے کیا کم فروغِ شام ہونا چاہیئے

بے حسی ہے اپنے حق میں موت یارانِ وطن
آؤ مل جل کر کریں تزئینِ ایوانِ وطن

تسکین عابدی

سونے کی چڑیا

افراد

منصور	ایک ادھیڑ عمر کا ڈاکٹر
شوکت	منصور کی نوجوان بیوی
شریف	ایک ملازم لڑکا۔
مقام	ہندوستان کا کوئی ایک شہر
وقتِ شام	موسم بارش

منظر

(منصور کا کمرۂ ملاقات معمولی طور پر سجا ہوا ہے۔ منصور اور شوکت آمنے سامنے بیٹھے ہوئے ہیں۔ بیچ میں ایک خوبصورت اسٹول ہے جس پر ٹیلیفون رکھا ہوا ہے)

شوکت۔ کہتے ہیں کہ جب کوئی فقیر کسی بخیل کے مکان پر سے گزرتا ہے۔ تو یہ صدا دیتا ہے . . . . . .

منصور۔ (بات کاٹ کر) یعنی وہ کونسی صدا ؟

شوکت۔ یہی کہ —— دل غنی رحمت اللہ، مال غنی لعنت اللہ —— مگر اب تو مجھی کو یہ صدا دینی پڑ رہی ہے

منصور۔ چھی، چھی —— چھی، کیسی واہیات سی باتیں کر رہی ہو! —— بیوی تم نہیں سمجھتیں —— پیسہ بہت بڑی چیز ہے اجی جسکے پاس پیسہ نہیں۔ وہ بھی کیا کوئی انسان ہے؟ اسکو انسان تو کیا ایک جانور کا درجہ بھی نہیں دیا جا سکتا —— سمجھیں؟ اوں ہوں۔ نہیں سمجھیں!

شوکت۔ جی ہاں! میں کیوں سمجھنے لگی، سمجھتی اسوقت جب کہ میں پچیس ہی روپیہ کی ساری لی ہوتی۔

منصور۔ ہاں، ہاں بیوی! اسی وقت تم کفایت شعار اور معاملہ فہم کہلاتیں،

شوکت۔ مگر میں نے تو آپکا کوئی ایسا نقصان ہی نہیں کیا جس کی وجہ سے آپ اتنے کھنچے جا رہے ہیں! —— صرف یہی کہ پانچ روپیہ زیادہ قیمت کی ساری خرید لی۔ اگر مجھے معلوم ہوتا

منصور۔ کیا کہا صرف پانچ روپیہ زیادہ کی ؟

شوکت۔ جی ہاں! صرف پانچ روپیہ زیادہ کی !

منصور۔ (بگڑ کر) اوں ہوں، تم نہیں سمجھتیں! —— بیوی! تم نہیں سمجھ سکتیں، تمہیں معلوم ہے؟ ان پانچ روپیوں سے کیا کیا ہو سکتا تھا؟

شوکت۔ بس یہی کہ یہ پانچ روپیہ بھی بنک میں جمع ہوتے۔ اور ڈاکٹر صاحب کا توند ذرا سا اور بڑھ جاتا۔

منصور۔ لاحول ولاقوۃ۔ کیا واہی، تباہی بک رہی ہو! —— بیوی! تم نہیں سمجھ سکتیں! لو سنو . . . . .

شوکت۔ جی! بہت کچھ سمجھ چکی،

منصور۔ کیا خاک سمجھیں! لو میں تمہیں بتاتا ہوں — پہلے تو یہ کہ اگر کسی مریض کو دیکھنے جانا ہوتا تو ان پانچ روپیوں میں سے دو روپیہ دو آنہ کا پٹرول موٹر میں ڈلوا کر جاتے اور آتے ہوئے دس روپے فیس لے آتے۔

شوکت۔ (طنزاً) جی! بجا ارشاد ہوا۔

منصور۔ (خوش ہو کر) لو اور سنو! — اب باقی جو رہے دو روپیہ چودہ آنے سو انہیں دو روپیہ کا اورنگ آباد سلک لے آتے۔ اور چودہ آنے اجرت دے کر اس کا پتلون سلواتے — یہ تو تمہیں معلوم ہی ہے۔ کہ میرے پاس سوائے اس ایک پتلون کے (پہنے ہوئے پتلون کو بتاتے ہوئے) دوسرا تو ہے نہیں — ذرا سمجھو تو سہی!

شوکت۔ میرے دماغ میں تو بھس بھرا ہوا ہے۔ سمجھوں کیا خاک

منصور۔ (مناتے ہوئے) نہیں بیوی! — ارے تم تو بگڑی جا رہی ہو (ٹھوڑی پکڑ کر ہلاتے ہوئے)

ارے بیوی! تمہارا شوہر یعنی وہ ڈاکٹر جواد ڈنبرا کا ایم، بی، سی، ایچ، بی ہے . . . . . .

یعنی وہ ڈاکٹر جو سول ہسپتال کا سرجن ہے صرف ایک پتلون —

سمجھیں صرف ایک پتلون آج دو ہفتوں سے پہنے ہوئے . . . . . .

شوکت۔ (جل کر) تو آپ کو منع کس نے کیا۔ کہ دوسرے کپڑے نہ بناؤ — کیا کبھی میں نے . . ؟ .

منصور۔ نہیں، نہیں، یہ میں نے کب کہا۔ کہ تم نے مجھے منع کیا تھا — نہیں! تم نہیں سمجھتیں — میرا مقصد یہ تھا۔ کہ وہ ڈاکٹر جو اعلیٰ قابلیت رکھتا ہے۔ اور وہ جو اعلےٰ سوسائٹی میں اٹھتا، بیٹھتا ہے۔ اس کی بیوی . . . .

شوکت۔ بچے دماغ اور فضول خرچ . . . .

منصور۔ ہاں ہوں، نہیں سمجھتیں — بیوی! تم نہیں سمجھ سکتیں

شوکت۔ کیا ہی بہتر ہوتا۔ کہ آپ کی کوئی بات ہی میری سمجھ میں نہ آتی۔

منصور۔ پھر وہی واہیات سی باتیں — بالکل واہیات سی

(منصور کچھ اور کہنا چاہتا ہے۔ کہ ٹیلیفون کی گھنٹی بجتی ہے)

(ریسیور کان سے لگاتے ہوئے کہتا ہے)

عورت ہوتی ہی ہے ناقص العقل — ہاں! ہلو — کیا کہا۔؟ نہ میں عورت ہوں اور نہ ہی ناقص العقل — اجی صاحب! نہ تو میں نے آپکو ناقص العقل ہی کہا اور نہ ہی عورت! — جی ہاں! جی ہاں، چونکہ اس وقت میں اپنی بیوی سے گفتگو کر رہا تھا۔ غالباً وہ آپ کو بھی سنائی دی — خیر کوئی بات نہیں، ایسی غلط فہمی تو ہو ہی جاتی ہے — آپ بھی عجیب آدمی ہیں! اچھا اب یہ ارشاد فرمائیے گا۔ کہ آپ نے کیوں ٹیلیفون کرنے کی زحمت گوارا فرمائی — ہاں، ہاں تو فرمائیے میں ہوں ڈاکٹر منصور، جناب کا اسم گرامی — (پریشان ہو کر) کیا کہا۔ لالہ روشن لال، پرائیویٹ سیکرٹری داؤد بھائی قاسم جی! — آہا - لالہ جی! آپ ہیں؟ آداب عرض ہے! — بھئی معاف کیجئے گا میں نے تو آپ کی آواز بالکل ہی نہیں پہچانی — رائے صاحب مجھے اس گفتگو کا افسوس ہے! — اوہ! کوئی بات نہیں، یہ تو فرمائیے گا۔ آپ نے مجھے کیسے یاد فرمایا — کیا کہا داؤد بھائی بیمار ہیں۔ اور بہت نازک حالت ہے — اجی واہ صاحب! مجھے اور تکلیف، یہ تو میرا فرض ہے — لیجئے میں ابھی حاضر ہوتا ہوں — کیا کہا آپ نے آدمی بھیجا ہے — میرے لے آنے کے لئے — اجی اس کی کیا ضرورت تھی؟ صرف آپکا ٹیلیفون کافی تھا۔ جی ہاں، جی ہاں

صرف پانچ روپیہ (رک کر مسکراتے ہوئے شرمندگی سے)
او ہو معاف کیجئے گا! صرف پانچ منٹ . . . .
(ریسیور رکھتے ہوئے)
بیوی! سنو تو سہی ذرا ہمارا کوٹ لے آنا!
شوکت۔ (مسکراتے ہوئے) بہت خوب! ابھی صرف پانچ روپیہ ——— او ہو معاف کیجئے گا! صرف پانچ منٹ ہیں۔"
منصور۔ اُوں ہوں، بیوی! تم نہیں سمجھ سکتیں ——— یہ وقت مذاق کا نہیں ——— ہاں ہمارا ہینڈ بیگ بھی لیتے آنا، ہاں اور سنو وہ جو میں نے پرسوں آدھا جلا ہوا سگار رکھا تھا نا وہ بھی لیتے آنا۔
(شوکت جاتی ہے۔ اور تھوڑی دیر کے بعد کوٹ اور ہینڈ بیگ اور جلا ہوا سگار لیکر آتی ہے۔ ادھر سے شریف جلد جلد کمرہ میں داخل ہوتے ہوئے کہتا ہے:)
شریف۔ سرکار! باہر ایک صاحب آئے ہوئے ہیں۔ اور کہتے ہیں۔ داداجی کے نوکر ہیں
منصور۔ (جوش) احمق! داداجی کہ داؤد بھائی ——— اچھا اِس سے کہنا۔ کہ ہم آرہے ہیں ——— ارے سُن تو سہی۔
(شریف جاتے ہوئے رک جاتا ہے) اور شوفر سے کہہ موٹر فوراً لے آئے،
شریف (جاتے ہوئے) اچھا سرکار!
منصور۔ (سگار جلاتے ہوئے) ہاں تو بیوی! ہم تمہاری آج کی وہ پانچ روپیہ والی خطا معاف کئے دیتے ہیں! ——— وہ بھی صرف اس لئے کہ داؤد بھائی جیسی سونے کی چڑیا جال میں پھنسی ہے۔ سونے کی چڑیا ——— مگر خیال رہے کہ آئندہ ایسا ہونے نہ پائے ——— سمجھیں!
شوکت۔ جو ارشاد حضور کا۔
(منصور خوش خوش ہینڈ بیگ لیکر ٹائی ٹھیک کرتے ہوئے جاتا ہے۔ اور شوکت مسکراتے ہوئے کرسی پر بیٹھ جاتی ہے۔ اور تھوڑی دیر تک کسی خیال میں محو رہ کر شریف کو آواز دیتی ہے:)
شوکت۔ شریف! او شریف!
شریف۔ (تیزی سے کمرہ میں داخل ہوتا ہے) جی بیگم صاحب!
شوکت۔ ارے شریف! آج تیرے سرکار داؤد بھائی قاسم جی کے ہاں گئے ہیں ——— کیونکہ سیٹھ صاحب بیمار ہیں اور بہت نازک حالت ہے۔
شریف۔ پھر تو بیگم صاحب! وہ آپ کے بھی خسر ہوئے ہیں نا؟ تو آپ کیوں نہیں گئیں؟
شوکت۔ (تعجب سے دیکھتے ہوئے) ابے کیا بک رہا ہے کون؟
شریف۔ وہی قاسم بھائی داداجی!
شوکت۔ (جھڑک کر) چپ رہ بیوقوف کہیں کا!
شریف۔ (معصومیت سے) کیوں بیگم صاحب! آپ ہی نے کہا نا کہ سرکار قاسم بھائی داداجی کے ہاں گئے ہیں۔
شوکت۔ ارے او پاگل! قاسم بھائی داداجی نہیں ——— داؤد بھائی قاسم جی کے پاس ——— وہ جو بڑے سیٹھ اور ٹھیکہ دار ہیں نا . . . .
شریف۔ نہیں بیگم صاحب! ہم سے اور ان سے ملاقات نہیں ——— ہم انہیں نہیں جانتے ——— نہ جانے کون بلا ہے!
شوکت۔ (ایک زور کا قہقہہ لگا کر) او ہو معاف فرمایئے گا۔ یہ تو مجھے معلوم ہی نہ تھا۔ کہ جناب سے ان کی ملاقات نہیں ہے (سنجیدہ ہو کر) ارے او گدھے کے . . . .
شریف۔ نہیں بیگم صاحب! یہ گدھے ودھے نہ کہئے، ہم انسان ہیں!
شوکت۔ ہاں، ہاں اس میں کیا شک ہے۔ اچھا تو جناب انسان صاحب!

(یہ سنکر شریف خوش ہوجاتا ہے۔ اور شوکت کے پاؤں کے پاس بیٹھ کر شوکت کو دیکھتے ہوئے کہتا ہے)

شریف۔ ہاں تو بیگم صاحب! پھر کیا ہوا؟

شوکت۔ (چڑ کر) ہوگا کیا؟ ——کیا میں کوئی الف لیلے سنا رہی ہوں؟ — بیوقوف! —احمق کہیں کا! — سن ڈاکٹر صاحب ایک مریض کو دیکھنے کے لئے گئے ہیں

شریف (رونی صورت بناکر) جی!

شوکت۔ کچھ دیر میں آجائینگے، جب تک تو ذرا باہر ہی بیٹھا رہ جس وقت سرکار کی موٹر اندر آئے۔ مجھے فوراً اطلاع کرنا

شریف۔ کیا وہ سو روپیہ کی ساری پہنو گی؟

شوکت۔ ہاں!

شریف۔ (سر کھجاتے ہوئے) مگر— بیگم — سا . . .

شوکت۔ ارے صاف صاف کیوں نہیں کہتا،

شریف۔ تو پھر مجھے انعام تو دینگی آپ؟

شوکت۔ ہاں ہاں دونگی۔ مگر دیکھنا اس کی اطلاع ڈاکٹر صاحب کو نہ ہونے پائے۔

(شریف جانا چاہتا ہے۔ تو روک کر کہتی ہے؛

اور سن! اگر ڈاکٹر صاحب کسی وقت ساری کی قیمت پوچھیں . . . . .

شریف۔ (جلدی سے بات کاٹ کر) تو سو روپیہ کہدونگا

شوکت۔ الو! پاگل! پاجی! ——(منہ بناکر) تو سو روپیہ کہدونگا۔ (دونوں کان پکڑ کر ہلاتے ہوئے) تیس روپیہ کہہ تیس روپیہ ——آیا خیال میں،

شریف۔ بہت اچھا (جاتا ہے۔ تھوڑا سا وقفہ)

(شوکت ٹیلیفون پر سے ریسیور اٹھا کر ڈائیل گھماتی ہے اور کچھ دیر بعد)

شوکت۔ ہاں! ہلو! کہاں سے ——کیا پرنس سیٹھ ہیں —— جی ہاں ہوں مسز منصور ——آداب، ہاں دیکھئے سیٹھ صاحب! آئندہ بھیجئے ہمارا بل جو بھیجنے کا نا — تو اس میں وہ ساری جو آج میں نے خریدی ہے نا — اس کی قیمت تیس روپیہ لکھئے —— شکریہ! —— اور ہاں ہلو! — وہ باقی ستر روپیہ کل میں اپنے آدمی کے ذریعہ بھجوا دونگی —— شکریہ! ——مگر دیکھئے بھول نہ جائیے — اچھا شکریہ۔ آداب۔

(شوکت ریسیور رکھنے بھی نہیں پاتی۔ کہ شریف دوڑتے ہوئے کمرہ میں داخل ہوتا ہے)

شریف۔ بیگم صاحب! بیگم صاحب! لیجئے سرکار آ گئے!

شوکت۔ ہاں، سنے دے، سنے دے معلوم ہوا۔

شریف۔ ارے، آپ نے وہ ساری ابھی تک نہیں پہنی؟

شوکت۔ چپ رہ کم بخت! کیا ساری ساری کی رٹ لگا رکھی ہے!

(منصور بڑبڑاتے ہوئے کمرہ میں داخل ہوتا ہے۔ اور شریف چلے جاتا ہے۔

منصور۔ کمینہ! — بدمعاش! — ذلیل! — شہدا!

(ہینڈ بیگ زور سے میز پر رکھ کر کوٹ اتارتے ہوئے

کمینے نے خواہ مخواہ ہمیں تکلیف دی — نہ جانے اس موذی کو ہم سے کیا بیر تھا —

شوکت۔ (حیرت سے) خیر تو ہے ہوا کیا؟

منصور۔ بس کچھ نہ پوچھو! یہاں نہ تو خیر ہی ہے۔ اور نہ ہی برکت

شوکت۔ ڈاکٹر صاحب کچھ تو کہیئے۔ آخر یہ گنگا کا الٹا بہاؤ کس لئے ہے؟

منصور۔ کس لئے ہے! اجی اس بدمعاش نے ہمارا نہ صرف وقت ہی ضائع کیا۔ بلکہ نقصان بھی کر دیا۔

شوکت۔ آپ بھی عجیب آدمی ہیں! میں پوچھ رہی ہوں۔ کہ ہوا کیا؟

منصور۔ ہوا کیا! بس یہی کہ وہ پاجی ہمیں یہاں سے لے گیا۔ اور داؤد بھائی کے بنگلہ کے سامنے موٹر روک کر خود اتر پڑا۔ اور یہ کہتے ہوئے اندر داخل ہوا کہ ڈاکٹر صاحب آپ یہیں ٹھیرے رہیئے۔ میں اندر اطلاع کرا کے آپکو بلاتا ہوں۔۔۔

شوکت۔ ارے! توبہ! تو اس میں بات ہی کیا تھی؟ اگر اس نے آپکو باہر ٹھیرا دیا تھا۔ تو اس سے آپ کی شان میں کونسا فرق آگیا۔

منصور۔ (منہ بنا کر) اُونہہ! کونسا فرق آگیا! ۔۔۔ اُون ہون۔ بیوی تم نہیں سمجھ سکتیں! اسی لئے تو بزرگوں نے کہا ہے کہ عورت ناقص العقل ہوا کرتی ہے۔ پوری بات نہیں سنتیں اور کہدیا۔ کہ کونسا فرق آگیا!

شوکت (جواب تک مسکرا رہی تھی سنجیدہ ہو کر) اچھا تو اب آپ ہی اپنی داستان کہتے جائیے!

منصور۔ ہاں تو سنو! وہ کم بخت ہمیں باہر ٹھیرا کر خود اندر چلا گیا۔ اور ہم باہر ٹھیرے رہے ۔۔۔ بیوی! خدا غرق لعنت کرے اس مردود کو! اُس نے نہ صرف پانچ، دس، پندرہ منٹ بلکہ پورا آدھا گھنٹہ انتظار کرایا، جب بھی نہ آیا۔ تو ہم نے کہا۔ کہ چلو ہم خود کیوں نہ جائیں،

شوکت۔ تو کیا وہ آدھا گھنٹہ تک نہ آیا؟

منصور۔ ابی آتا کہاں سے! وہ تو گیا ہے جہنم کو۔ بھلا وہاں سے کون آیا ہے۔ جو وہ آتا۔

شوکت۔ تو پھر خود آپ چلے گئے؟

منصور۔ خود نہ جاتے تو اور کیا کرتے۔ ہاں تو خیر ہم خود اندر چلے گئے ۔۔۔ بیوی! غضب خدا کا جب اندر جاتے ہیں۔ تو دیکھتے کیا ہیں کہ داؤد بھائی ڈرائنگ روم میں بیٹھے ہوئے اپنے کسی منیجر سے حساب کتاب کر رہے ہیں۔

شوکت۔ (حیرت سے) کیا کہا! حساب کتاب کر رہے تھے؟

منصور۔ ہاں! ہاں! حساب کتاب کر رہے تھے، اور ہمیں دیکھتے ہی بہت ہی خلوص سے آگے بڑھکر ملے۔ اور مزاج پرسی کے بعد ہمارے آنے کی وجہ دریافت کی۔

شوکت۔ پھر آپ نے کیا کہا۔

منصور۔ ابی خدا کا فضل ہوا۔ کہ ہماری زبان سے فوراً نکل گیا۔ کہ سیٹھ صاحب! ہم اپنے ایک دوست سے ملنے کے لئے آئے تھے۔ اور جاتے ہوئے خیال ہوا کہ جب یہاں تک آ ہی گئے ہیں تو چلو آپ سے بھی مل لیں۔

(ٹیلیفون کی گھنٹی بجتی ہے)

بیوی! سنو تو سہی اب کس پاجی نے ٹیلیفون کیا ہے؟

(شوکت رسیور اٹھا کر بات کرتی ہے۔ اور رسیور سے آہستہ آواز آتی ہے)

شوکت۔ ہاں! ہلو!

آواز۔ ہلو! کہاں سے؟

شوکت۔ میں ڈاکٹر منصور کے بنگلے سے۔

آواز۔ کیا ڈاکٹر صاحب اس وقت مکان میں تشریف رکھتے ہیں۔

شوکت۔ جی ہاں، وہ موجود ہیں۔

آواز۔ براہ مہربانی ذرا انہیں ٹیلیفون پر بھیج دیجئیگا، ایک ضروری گفتگو کرنی ہے۔

شوکت (رسیور دیتے ہوئے) لیجئے کوئی صاحب آپ سے ضروری گفتگو کرنی چاہتے ہیں۔

منصور۔ (رسیور لیتے ہوئے) کون بلا ہے؟

شوکت۔ (مسکرا کر) انہیں مریضوں کی روحیں ہونگی۔ جو آپ کے ہاتھ پر چکے ہیں۔

منصور۔ لاحول ولا قوۃ! عجیب عورت ہے! ۔۔۔ ہاں! ہلو! کون!

آواز۔ جناب کا اسمِ گرامی؟
منصور۔ جی میں ہوں ڈاکٹر منصور۔
آواز۔ ڈاکٹر صاحب! آداب عرض ہے۔ میں ہوں آپکا ممنونِ کرم
منصور۔ یعنی؟
آواز۔ جی وہی جسکو آپ ازراہِ مہربانی ابھی ابھی داؤد بھائی کے
بنگلے تک چھوڑ آئے ہیں۔
منصور۔ (ایک دم بگڑ کر) کمینہ! پاجی! احمق! . . . .
آواز۔ (بہت ہی ندامت کیساتھ قہقہہ) اجی ڈاکٹر صاحب سنئے تو سہی
منصور۔ کیا سنیں، خاک سنیں، تم کمینے ہو! پاجی ہو! نامعقول ہو!
آواز۔ ڈاکٹر صاحب یہ سب کچھ سہی۔ مگر نیازمند کا معروضہ تو سنئے گا۔
منصور۔ بولو! جلد بولو! جو کچھ کہنا ہے۔ کہہ ڈالو۔ میرے پاس
ایسے کمینے مذاق کے سننے کا وقت نہیں،
آواز۔ ہاں تو سنئے گا۔ عرض یہ ہے۔ کہ میں ہوں یعنی آپکا نیازمند
ایک طالب العلم . . . یونیورسٹی کا اور یہ آپکا بدنصیب نیازمند
اُن چند بدنصیبوں میں سے ایک ہے جسکے والدین اپنے لختِ جگروں
کو فردِ جرم لگا کر کسی ایک یونیورسٹی کے اقامت خانہ میں مقید
کر دیتے ہیں . . . . .
منصور۔ (چیخ کر) کیا فضول سی بک بک لگا رکھی ہے!
آواز۔ اوہو، ڈاکٹر صاحب! معاف فرمائیگا اگر بغیر معروضہ سماعت
فرمائے جائیگا۔ نہیں۔۔ ہاں تو قصہ مختصر یہ کہ چونکہ آج روز جمعہ
یعنی عید المومنین ہے . . . .
منصور۔ پھر وہی بک بک؟
آواز۔ ڈاکٹر صاحب! معلوم ہو رہا ہے۔ کہ آپ اپنے نیازمند پر
بہت ہی خفا ہوئے ہیں،
منصور۔ اور نہیں۔ تو کیا تم جیسے نالائقوں سے خوش ہوتے؟
آواز۔ اچھا تو ڈاکٹر صاحب! ایک مرتبہ اور معاف فرما دیجئے گا۔
ہاں تو اسلئے ہمارے مہتمم مجلس یعنی نگران صاحب اقامت خانہ
نے ازروئے ضابطہ فوجداری دفعہ فلاں، فلاں، فلاں،
منصور۔ (بے ساختہ مسکرا کر) پھر وہی؟
آواز۔ اوہو! چوک ہوئی! ایک مرتبہ اور معاف فرما دیجئے گا۔ ہاں
تو ہمیں اپنے دیدار مفیض آثار سے والدین اور دوست احباب
کی آنکھیں روشن کرنے کی اجازت دیدی، اور یہ آپ کا
نیازمند چلا طرف گھر کے۔ پر وہاں سے دوست احباب،
اور دوست احباب سے مل ملا کر سینما، چنانچہ انہیں شدید
ضروریات کی وجہ سے کیونکہ ایک تو جیب میں پیسہ نہیں
رہا۔ دوسرے رات ہو گئی، تیسرے بارش اور سردی مارے
ڈال رہی تھی۔ چوتھے پاؤں میں درد اور دوریِ منزل۔
ایسی صورت میں برائے خدا آپ ہی تبلائیے گا۔ کہ اگر میرے
بجائے آپ ہوتے۔ تو کیا صورت اختیار کرتے؟ یہاں
تو بقول غالب۔
گم ستہ لنگر کشتی و ناخدا خفتہ
والا معاملہ تھا ——
منصور۔ مجھے اگر یہ حال معلوم ہوتا۔ تو تمہیں جہنم واصل کر آتا۔
آواز۔ شکریہ! مگر ایسا زریں موقعہ آپ کے ہاتھ سے نکل گیا
بہر حال جناب کا بہت بہت شکریہ! — ڈاکٹر صاحب
افسوس نہ کیجئے جو کچھ ہونا تھا۔ ہو گیا —— اچھا شب بخیر
—— آداب عرض ہے!
منصور۔ (ریسیور زور سے رکھتے ہوئے)۔ احمق! پاجی! ذلیل
خدا تجھے . . . .
شوکت۔ ارے ارے یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ! - یہ عورتوں کی سی
بددعائیں کب سے سیکھیں آپنے۔ طالب العلم ہے ایک سنجیدہ
مذاق کر ڈالا،
منصور۔ جی! طالب العلم ہے سنجیدہ مذاق کر ڈالا! - بیوقوف!
شوکت۔ (ایک خاص انداز سے) اوں ہوں، بیوی! انہیں مجھتیں
ابھی سونے کی چڑیا ہے! اوں ہوں، نہیں سمجھ سکتیں . . .
(ایک قہقہہ کے ساتھ پردہ گرتا ہے)

روش صدیقی

باغِ نشاط

(کشمیر کا خوابِ رنگ و بو)

خوابِ رعنائیٔ فردوس کی تعبیر کہوں
غازہ افروزِ رخِ شاہدِ کشمیر کہوں
میں تجھے معجزۂ عشقِ جہانگیر کہوں
بے حجابی میں بھی اک جلوۂ مستور ہے تو
شاید الفاظ کے جادو سے بہت دور ہے تو

سرو و شمشاد و صنوبر کی قطاروں میں نہیں
گل و ریحاں کی جنوں خیز بہاروں میں نہیں
دلربائی تری محدود نظاروں میں نہیں
حسن روپوش ہے بیگانۂ اظہار ترا
ماورائے نگۂ شوق ہے دیدار ترا

آتشِ لالہ و گل آبِ رواں سے ہمدوش
سایۂ آب کبھی خوابِ گراں سے ہمدوش
اور ہر خواب جہانِ دگراں سے ہمدوش
زندگی نغمۂ خاموش سنا جاتی ہے!
ترے آغوش میں احساس کو نیند آتی ہے!

وہ تری صبح وہ آئینۂ تصویرِ نشاط
وہ نسیمِ سحری آہ وہ زنجیرِ نشاط
دوشِ شمشاد پہ وہ پرچمِ تنویرِ نشاط
کاروانِ شفقِ سرخ اترتا ہے یہیں
ڈل میں ڈوبا ہوا خورشید ابھرتا ہے یہیں

پیرِ گردوں کو تمنائے تکلم تجھ سے
کہکشاں کرتی ہے باتیں بہ تبسم تجھ سے
آہ! مانوس بہت ہے دلِ انجم تجھ سے
جستجو میں تری آوارہ ہے مہتاب ابھی
رفتۂ حسرتِ نظارہ ہے مہتاب ابھی

تری چھاؤں سے ہیں انوارِ لطافت پیدا
نکہتوں سے تری صد عالمِ نکہت پیدا
تیرے ہر جلوۂ پنہاں سے ہے جنت پیدا
اپنے دامن میں لئے آتشِ شاداب ہے تو
جس نے بیدار کیا روح کو وہ خواب ہے تو

وہ لبِ جو کہیں رخشندہ جبینوں کا ہجوم!
فرشِ کمخواب پہ وہ عرش نشینوں کا ہجوم!
زیرِ شمشاد وہ معصوم حسینوں کا ہجوم!
مہ و پرویں کہیں، زہرہ کہیں ناہید کہیں
اور کھوئے ہوئے کچھ حیرتِ دید کہیں

خلوتِ شوق کہیں، انجمنِ ناز کہیں
نکہتِ راز ہے آمادۂ پرواز کہیں
داستانِ غمِ دل مائلِ آغاز کہیں
نہ ملا آہ کسی انجمن آرائی میں
روح نے کیف جو پایا تری تنہائی میں

تیرے سینے میں محبت کا فسوں ہے آباد
درد ہی درد سے آغوشِ سکوں ہے آباد
تجھ سے خلوت کدۂ ہوش و جنوں ہے آباد
گیت جب سوزِ محبت کے صبا گاتی ہے
آتشِ شوق چناروں سے برس جاتی ہے

آبشاروں سے رواں زمزمۂ سوزِ وفا
نفسِ لالہ و ریحاں تپشِ اندوزِ وفا
سروِ آزاد سراپا ادب آموزِ وفا
ہمہ تن دردِ محبت کا فسانہ ہے تو
کسی گم گشتۂ الفت کا فسانہ ہے تو

ہر ادا میں تری پاتا ہوں ادائے محبوب
ہر نفس سے ترے سنتا ہوں صدائے محبوب
آہ! کیا تیرے لبوں پر بھی ہے ہائے محبوب
تو بھی اُس شمعِ دل افروز کا پروانہ ہے
کیا اُسی شاہدِ معصوم کا دیوانہ ہے

شاکر علی

بھُوک

ابھی تک میری زندگی عورت کے وجود سے خالی تھی۔ یہ نہیں کہ عورت سے مجھے نفرت ہے۔ بلکہ پیٹ کی مانگ نے اتنی مہلت کہاں دی

کچھ دنوں سے میں ایک دفتر میں ملازم ہو گیا تھا، دن بھر کام میں اس طرح جتا رہتا۔ جیسے کولہو کا بیل! ـــ موٹے موٹے رجسٹروں میں بڑی بڑی رقموں کا اندراج کرنا پڑتا، جن میں میں نے کبھی آنکھ سے نہیں دیکھا۔ ہاں روپیوں کی کھنکار۔ اور نوٹوں کی سرسراہٹ اکثر سنا کرتا۔ جو مجھے ایسی ہی بھلی معلوم ہوتی۔ جیسے خالی پیٹ پر مزے دار کھانوں کی سوندھی سوندھی خوشبو، مہینے میں سینکڑوں اور ہزاروں روپے کا حساب کتاب رکھنے پر بھی مجھے وہی چالیس روپے ملتے، ان تمام کاموں میں میری حیثیت دفتر کے ٹائپ رائٹر سے زیادہ نہیں تھی۔ جو چاہے تو لیکن بغیر جانے اور بوجھے ہوئے۔

اکیلے آدمی کے لئے چالیس روپے ماہوار ہندوستان میں بہت کافی رقم سمجھی جاتی ہے۔ جبکہ یہاں ہزاروں آدمی بھوک سے مر رہے ہوں۔ لیکن میں تنہا کب تھا؟ میرے اوپر پانچ پیٹوں کا بھی بوجھ تھا، ایک بوڑھی ماں، ایک بیوہ بہن اور تین یتیم بچے۔ جو مہینے کی ہر تیسری کو وطن میں بیٹھے منی آرڈر کی راہ تکتے۔

میں ایک بڑی سی عمارت کے ایک چھوٹے کمرے میں رہتا۔ جو جاڑے میں سردی سے گلاتا۔ اور گرمی میں گرمی سے تپاتا۔ برسات میں اگر ایک گھنٹہ برستا۔ تو یہاں ڈیڑھ گھنٹے سے پہلے نہیں تھمتا۔ سیل اس بلا کی کہ پیر نہیں رکھا جاتا تھا۔ غرض زندگی بڑی مشکل سے گزرتی۔ لیکن یہ سمجھتے ہوئے۔ کہ یہ میرے اوپر ظلم ہے!" خالق اور مخلوق دونوں کا۔

ایک روز کا ذکر ہے۔

دن بھر کام زیادہ رہا۔ بہت تھک رہا تھا، دوسرے دفتر میں دیر بھی ہو گئی تھی۔ اس لئے بس، یہی صرف یہی ایک عیاشی تھا جو اگر جیب میں پیسے ہوتے۔ تو مہینے میں ایک آدھ مرتبہ کر لیتا۔ جب سیٹ پر بیٹھ چکا۔ تو معلوم ہوا کہ میرے برابر ایک خاتون بیٹھی ہیں۔ یہ حادثہ!؟ بالکل لاعلمی میں ہوا۔ ورنہ مجھ میں اتنی جرات کہاں ہم دونوں اپنی اپنی جگہ پریشان تھے۔ میں اس وجہ سے کہ اس کے گداز جسم اور اس کی ہلکی آنچ سے میرے جسم اور دل میں گدگدی سی ہو رہی تھی۔ اُسکے لباس اور بالوں کی خوشبو میرے دماغ میں چڑھی جاتی تھی۔ اور وہ اسوجہ کہ میرے محنت سے سجائے ہوئے پسینے اور میلے کپڑوں کی بدبو اسکے لئے ناقابلِ برداشت ہو رہی تھی۔ ہم بہت کسمسائے۔ پہلو بدلے لیکن مجبور رہے تھے۔ بس میں بہت بھیڑ تھی، ایک پر ایک چڑھا بیٹھا تھا۔ میں آخر دم مار کر اس طرح بیٹھ گیا۔ کہ جیسے کسی نے کانٹوں پر بٹھا دیا ہو۔ لیکن اسپر بھی میں محسوس کر رہا تھا کہ سب کی نظریں ہم دونوں پر جمی ہیں۔ بہتوں کو تو میں نے "زیرلب" مسکراتے ہوئے بھی دیکھا۔ آخر میں بیزار ہو کر بیچ راستہ ہی میں اُتر پڑا۔ اِدھر میں نے اطمینان کی سانس لی۔ اُدھر اُس نے اپنی ساڑھی کو جھاڑا۔

گھر اب بھی کافی دور تھا۔

شام کی خنکی ہو چلی تھی۔ دوسرے میرے کپڑے بھی موسم کے لحاظ سے ناکافی تھے۔ لیکن اُس کی جوانی کی دھیمی آنچ نے میرے جسم میں بھی ہلکی سی حرارت کا احساس پیدا کر دیا۔ سارے جسم پر چیونٹیاں سی رینگتی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں۔ جوانی کی یہ دھیمی حرارت بڑھ کر اچھا خاصا بخار ہو گئی

یہ پہلا موقعہ تھا۔ جو مجھے جنسی بھوک کا احساس ہوا ـــ میں نے اپنا راستہ تبدیل کر دیا۔ اور آخر وہاں پہنچ گیا۔ جہاں روپیہ کا

کے ساتھ ساتھ ابھرے ہوئے کوہان، گھستی ہوئی چھاتیوں اور تپتے ہوئے ہونٹوں کا بھی بھاؤ ہوتا ہے

پٹڑی پر میں آہستہ آہستہ چل رہا تھا۔ اور اوپر اس طرح تک رہا تھا جیسے دسترخوان پر بیٹھنے کے بعد لوگ کھانوں کا جائزہ لیتے ہیں۔ کہ پہلے کس قاب میں ہاتھ ڈالیں

میری نگاہیں ایک پتلی سی عورت پر پڑیں اور زینے پہ آنکھیں بند کرکے چڑھ گیا۔ زینے کی سیڑھیاں مسجد اور مندر کی سیڑھیوں سے زیادہ گھسی ہوئی تھیں۔ ان دھسی اور گھسی ہوئی سیڑھیوں پہ بیڑی سگریٹ اور ماچس کے بجھے ہوئے ٹکڑے اور پان کی خالی ڈبیاں ان عورتوں کی کھوکھلی جوانیوں کی طرح قدموں سے مسلی مسلائی پڑی تھیں۔ پان کی پیکوں اور رستے چونے کے دھبوں سے زینے کی سیڑھیاں اور دیواریں نہائی ہوئی تھیں۔ میں انہی بکھری ہوئی چیزوں کی پامالی پہ غور کرتا ہوا بائی جی تک پہنچ گیا۔ وہ شیشے کے سامنے اپنے گالوں اور ہونٹوں کے اڑے ہوئے پوڈر اور سرخی کو سنوار رہی تھی۔ جیسے معمار دیوار پر گارا پھیرتا ہے۔ تاکہ اس کی اونچی نیچی سطح ٹھیک ہو جائے مجھے دیکھتے ہی وہ اپنی مسلی ہوئی چولی اور ساڑھی سنبھالتی میری طرف بڑھی۔

وہ کچھ ایسی اچھی نہ تھی۔ لیکن بھوک کی شدت میں زبان کے چٹخارے کا خیال جاتا رہتا ہے۔ صرف پیٹ کی آگ بجھانے کی فکر ہوتی ہے۔

میں نے جذبات کا غلام ہو کر بے اختیار اس کی کلائی پکڑنا چاہی لیکن اس نے اپنا ہاتھ جھٹک دیا۔ میں بھول گیا تھا۔ کہ میری طرح اسے بھی یہاں۔ بھوک، ہی کھینچ لائی ہے۔ لیکن پیٹ کی ——

میرے دیئے ہوئے سکوں کو پہلے اس نے دیئے کی کانپتی ہوئی لو میں دیکھا۔ پھر زمین پر ٹپک کر ان کی آواز کو پرکھا۔ اور اپنے دلال کے حوالہ کر دیا۔

* * * * *

میں نے اسے ایک بجھی ہوئی چنگاری پایا۔ جو لاکھ ہوا دینے پر بھی نہ بھڑکی۔ وہ بالکل دفتر کے ٹائپ رائٹر کی طرح میرے زیر اثر تھی

ہمارے اس معاشی نظام نے عورت کو بھی ایک بے حس مشین بنا دیا ہے۔ جنسی مشین! — میں کوٹھے سے تھکے ہوئے قدموں سے اتر رہا تھا۔ اسی طرح جیسے میں روز صبح شام نانبائی کی دوکان سے دانتوں سے گوشت صاف کرتا اترتا ہوں۔

کھانڈیکر

نئی دنیا

سورج غروب ہو رہا تھا۔ اُس کو دیکھ کر دامن کو یکایک اپنی موت کا خیال آ گیا۔ اُس کی نظر سے کہیں یہ گزرا تھا کہ انسان کو سولی پر چڑھاتے وقت اسکے چہرے پر سیاہ نقاب ڈال دیتے ہیں۔ اس بھیانک منظر کے تصور سے اسکے جسم کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ کچھ دیر تک اس کی سمجھ میں نہ آ سکا کہ موت پھانسی، وغیرہ اس قسم کی باتیں شام کے وقت اُسکے دل میں کیوں آتی ہیں۔ اس خوفناک خواب سے بیدار ہونے کے لئے اس کا دل مضطرب ہونے لگا۔ وہ کہہ رہا تھا۔ شام ہمیشہ ہی دلفریب ہوتی ہے جس وقت میں پانچویں جماعت میں تھا بالوی کا وہ شعر کس قدر گنگناتا تھا۔ اور کتنا لطیف خیال ہے کہ سورج پوجا کے رنگ محل میں گیا ہے۔ اور وہاں۔ ۔ ۔ ۔ ۔ " وہ شعر دامن نے ذہن میں لانے کی بہت کوشش کی مگر وہ ایک پرانی تصویر کی طرح مٹے ہوئے خطوط کی طرح اُسکے ذہن سے مٹ چکا تھا۔ وہ مسکرا دیا۔ مجھے دسویں جماعت کا امتحان پاس کئے تین برس گزر چکے چار دن تک موٹر کے کارخانہ میں کلرک رہا۔ کچھ دن ڈیری کے حساب کتاب میں گزارے۔ اور بقیہ ایام بیروزگاری میں بسر ہوئے۔ اشعار ایک ہی دفعہ پڑھ لینے سے حفظ نہیں ہو سکتے۔ انہیں بار بار یاد کرنا پڑتا ہے۔ لیکن تین سال سے تو میں صرف ایک ہی بات کو دھرا رہا ہوں۔ ملازمت، مستقل ملازمت جو گذر اوقات کے لئے کافی ہو۔ مجھے کہیں جانا پڑے۔ صرف پچیس روپے ماہوار کے لئے بھی تیار ہوں۔ دامن کو اس بات کا بھی تجربہ تھا۔ کہ اس زمانہ میں ملازمت ملنا مشکل تھی۔ اُس نے اِدھر اُدھر کے سفارشی خطوط کے ذریعے انتھک کوششیں کی تھیں۔ لیکن جن کنوؤں میں اس نے اپنی امیدوں کے ڈول بڑی آرزوؤں اور بڑی تمناؤں سے ڈالے تھے۔ اُن میں سے صرف کھڑکھڑ کی آواز سنائی دی اور بس!

عجیب عجیب واقعات اسکے دل میں خار کی طرح کھٹکنے لگے تھے۔

"میٹرک پاس انسان کو ہنسی خوشی سے زندگی بسر کرنے کیلئے اس قدر ہاتھ پیر مارنے کی کیا ضرورت ہے؟ چار چھوڑ چالیس بھائی ہوں تو ہم کیا کریں؟ اس کی تو تیرے والدین ہی کو فکر کرنی چاہیئے تھی تیرے سے جوان ہونا ہی بہت بڑا گناہ ہے۔ خوبصورت گھوڑا ہوتا۔ تو چاندی کے ڈبہ میں چیندی کھانے ملتی، کتا ہوتا تو سینما کی ایکٹرسوں کی جارجٹ کی ساڑھیوں پر لوٹتا۔ تو جوان ہوا۔ یہی تیری بہت بڑی غلطی ہوئی۔ اور غربت میں کوشش کر کے میٹرک پاس کرنا تو گویا بڑا گناہ کیا۔ اور اس گناہ کے عوض تجھے یہی سزا۔ ۔ ۔ ۔"

اُس نے دیکھا۔ سورج غروب ہو چکا تھا۔ اُس نے خیال کیا کہ اب میرے زندہ رہنے کی آرزو بھی اسی طرح غروب ہو رہی ہے زندہ رہیں۔ تو کس لئے؟ کن کے لئے؟ دفعتہً اُسکی آنکھوں کے سامنے پانچ معصوم چہرے کھڑے ہو گئے، ہمیشہ بیمار رہنے والی اور چھوٹے چھوٹے چار بھائی۔

سال گزشتہ جب دامن دو دن کے لئے ماں سے ملنے گیا تھا۔ تو بہن نے اُس سے پھولوں کی ساڑی کے لئے ضد کی تھی۔ ۔ ۔ ۔ چھوٹا بھائی روتا ہی رہا۔ اُسکو زمین پر دوڑنے والی ننھی موٹر درکار تھی۔ اس نے اسکو یہ کہکر تسلی کرا دی تھی۔ آئندہ سال جب آؤنگا۔ تیرے لئے ضرور ایسی موٹر لیتا آؤنگا۔ اور، لیکن

اس فاقہ زدہ سال میں خود اس کا پیٹ اسکے لئے وبال جان بن گیا تھا۔ دس پانچ روپے تو ماں کو بھیجنا ورنہ ادھار اُسی کے پاس سے اور منگوانے کی باری آ گئی تھی۔ مدرسہ کی زندگی میں اس نے اپنے مستقبل کے لئے کتنے اعلیٰ خیالات کی پرورش کی تھی۔ مگر تجربات کی حرارت سے جلا ہوا دل کہہ رہا تھا۔ کہ یہ سب خیالات ہی خیالات تھے۔ پرند چرند اپنا پیٹ بھر سکتے ہیں۔ لیکن میں۔ . . . ''

اپنے گھونسلے کی طرف لوٹنے والے کوّے کو دیکھ کر دامن کو حیرت ہوئی۔ کہ یہ کوا کہیں نہ کہیں سے اپنے بچوں کے لئے غذا لاتا ہوگا۔ لیکن میں؟ دیہاتی گھر میں اپنی ماں اور چھوٹے بھائیوں کو صورت بھی نہیں دکھا سکتا۔ اُسے یاد آیا کہ میرا گھر اب میرا نہیں

دامن نے جیب میں سے اپنی ماں کا خط نکال کر پھر پڑھا دو پہر میں اسکو پڑھتے ہوئے اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کے چند قطرے بھی گرے تھے۔ لیکن ان آنسوؤں سے اسکے حرف تو نہ دھل سکے۔ دو سو پہلے قرض اور اسکے سود کے عوض اُسکا گھر ساہوکار کے قبضہ میں جا رہا تھا۔ اگر کوئی ظالم و جابر انسان درخت سے گھونسلا اتار کر بے بال و پر بچوں کو زمین پر پھینک دے تو اس کی ماں کا دل کس طرح دکھے گا۔ اسکا اندازہ اُسے ماں کے خط کے ایک ایک لفظ سے ہو رہا تھا۔ مگر اس خط کا کیا جواب دیا جائے۔ دو سو پائیوں کا محتاج انسان دو سو روپے کہاں سے بھیجے؟ دامن کا دل مضطرب تھا وہ کہہ رہا تھا ہزار چند پہلے کے زمانہ میں تو بھی انسان کی کچھ نہ کچھ قیمت تھی۔ وہ غلام بنا لیا جاتا تھا۔ مگر اب. . . . ؟

—— قریب کے کارخانے کی گھنٹی بجی۔ تھوڑی ہی دیر میں ہی مزدوروں کے ہجوم کے ہجوم جانے لگے، عورتیں، مرد، ہر ذات اور ہر قسم کے لوگ اس میں دکھائی دے رہے تھے دامن متعجب ہو کر اس نئی دنیا کی طرف دیکھنے لگا۔ عورتوں کی پھٹی پرانی ساڑیاں، مردوں کی ڈاڑھی بڑھی ہوئی صورتیں، کسی کے پیر میں نہ چپل نہ جوتا۔ وہ اس منظر کو دیکھ کر کسی اور ہی دنیا کے تصور میں کھو گیا۔

چند لمحوں کے بعد رات کے مزدور کارخانہ کی طرف آنے لگے۔ ان کی حالت بھی ویسی ہی تھی۔ ان کے ہنسنے اور مسکرانے سے دامن بہت متاثر ہو رہا تھا۔ وہ اٹھ کر آہستہ آہستہ چلنے لگا۔ وہ ابھی ڈیڑھ فرلانگ بھی نہ جانے پایا تھا۔ کہ اسکو ایک مجمع دکھائی دیا۔ وہ مجمع میں گھسا۔ دیکھا کہ ایک نوجوان لڑکی کی نعش بیری کے پتوں پر ابھی لا کر رکھی گئی ہے۔ یہ صاف ظاہر تھا۔ کہ اس نے خودکشی کی تھی۔ وہ لوگوں کی سرگوشیاں سنتا رہا۔ ساس کی سختیوں سے تنگ آکر اس نے اپنی جان دی تھی۔

دامن نے نعش کی طرف پلٹ کر دیکھا۔ وہ چونکا۔ اُسے ایسا معلوم ہوا کہ گویا اُسکے پاؤں سے چھو کر ابھی کوئی سانپ نکل گیا ہے۔ اُسے اس نوجوان لڑکی کی نعش میں اپنی مردہ زندگی کا عکس دکھائی دیا۔

اس خوفناک حادثہ کو بھول جانے کے لئے وہ تیز تیز چلنے لگا، دُور جانے کے بعد اُس نے مڑ کر دیکھا۔ اسکے اردگرد کا وہ ہجوم اب دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ وہ کچھ دیر تک افسوس کرتا رہا۔ مگر فوراً اس کو اس مصیبت کی ماری لڑکی کا چہرا دکھائی دینے لگا۔ لیکن تھوڑی ہی دیر میں اُسکے چہرے کی جگہ اپنی تصویر صاف دکھائی دینے لگی۔ وہ سہم گیا، اُسکا دل کہہ رہا تھا۔ کہ اس لڑکی کو اس کی ساس تکلیف پہنچاتی تھی۔ اور تجھے اب دنیا ستا رہی ہے۔ اُس نے خودکشی کر کے تو نجات پا لی مگر تو . . . .

دامن کی حالت اس وقت ایسی ہی تھی۔ جس طرح کہ کوئی موٹر ڈھلان پر ہو۔ اور اُس کی بریک یکایک خراب ہو گئی ہو!

اس نے خیال کیا۔ کہ ان مصیبتوں اور تکلیفوں سے نجات پانے کے لئے بجز خودکشی کے کوئی چارہ نہیں، جس طرح بارش کے موسم میں بعض دفعہ تھوڑی ہی دیر میں سیاہ بادل گھر آتے ہیں

اور اندھیرا ہو جاتا ہے، اسی طرح خودکشی کے خیالات نے اسکے دل کو گھیر لیا، اسکے پاؤں ریل کی پٹڑی کی طرف خود بخود بڑھنے لگے۔

وہ پٹڑی پر بیٹھ کر سوچنے لگا۔ مسکراتے ہوئے تارے، دور سے گاؤں کے ٹمٹماتے ہوئے چراغ، جسم کو گدگدی کرنے والی ہوا یہ سب اُسے یہی کہہ رہے تھے کہ زندہ رہنے ہی میں دنیا کا لطف ہے، مگر اسکا دل کہہ رہا تھا۔ کہ کس کے لئے زندہ رہیں؟ ہر روز پیٹ کی فکر کرنی پڑتی ہے۔ قصائی کے پاس کے بکروں کو بالآخر ایک ہی دن تو مشکل سے کاٹنا پڑتا ہے۔ مگر سدا مصیبت میں گرفتار رہنے والی زندگی کے لئے اس قدر کشمکش اور جد و جہد سے کیا حاصل؟

اسکے کانوں میں چیخیں سنائی دیں۔ گاڑی قریب آ رہی تھی وامن دل کو مضبوط کر کے اس پر لیٹ گیا۔ فوراً ہی اس کو ایسا معلوم ہوا۔ کہ کوئی اُسے پیچھے کھینچ رہا ہے۔ اُس نے پیچھے دیکھا۔ وہی کنوئیں میں جان دینے والی جوان لڑکی کھڑی ہوئی دکھائی دی۔ اسکو پسینہ آنے لگا، وہ چاہتا تھا کہ اٹھ کر دور بھاگے۔ مگر اس پر بھی اس نے اپنے عزم کو قائم رکھا۔ وہ دل ہی دل میں کہہ رہا تھا۔ کہ میری ماں دوسروں کے پاس مزدوری کرتی ہے۔ اسکو ان آنکھوں سے دیکھنے سے بہتر تو یہی ہے۔ کہ دنیا سے ہمیشہ کے لیے چل بسیں؟ میں نہ تو بہن اور بھائیوں کو تعلیم دلوا سکتا ہوں۔ اور نہ انہیں اچھے کپڑے پہنا سکتا ہوں۔ اُن کو خواب میں بھی اچھی غذائیں نہیں مل سکتیں۔ میں ان سب کو کیسے برداشت کر سکتا ہوں؟

دل کو پتھر بنا کر وہ پٹڑی پر پڑا رہا؛ اپنے اطمینان پر وہ خود متحیر تھا، وہ موت کے بعد کی زندگی کے تصور میں کچھ دیر کھو سا گیا لیکن فوراً ہی اسکے جسم کے رونگٹے کھڑے ہو گئے، سگنل نہ گرنے کی وجہ سے یا اسٹیشن قریب آنے کی وجہ سے ریل نے زور سے سیٹی دی۔ یہ سنتے ہی اُس کا دل زور سے دھک دھک کرنے لگا۔ وہ فوراً پٹڑی پر سے اٹھ کر بلند کھڑا ہو گیا۔

کھاڑ کھاڑ، دھاڑ دھاڑ کرتی ہوئی گاڑی اسکے سامنے سے جانے لگی، تھرڈ کلاس کے ڈبہ میں کئی لوگ تھے۔ بعض سامان پر بیٹھے ہوئے تھے۔ ایک عورت اپنے ننھے بچہ کو سینے سے لگائے کھڑکی کے قریب کھڑی ہوئی دکھائی دی۔ اسکے بعد سیکنڈ کلاس کا ڈبہ آیا۔ اس میں ایک لحیم شحیم مرد سگار پیتا ہوا بیٹھا تھا۔ گاڑی چلی گئی، وامن ویسا ہی کھڑا تھا۔ رہ رہ کر اس کھڑکی کے قریب کی عورت کی تصویر اس کی آنکھوں کے سامنے دکھائی دینے لگی۔ نہ معلوم وہ عورت کب سے اس طرح کھڑی تھی۔ اسکا جسم کس قدر دُکھتا ہوگا۔ مگر وہ تکلیف کو کتنی خوشی سے برداشت کر رہی تھی۔ تو پھر میں ہی . . . .

اُسکے پیر اُسکو گاؤں کی طرف کشاں کشاں لے جانے لگے تھوڑی دور جانے کے بعد گاؤں کے باہر ایک بنگلہ میں کچھ شور و غل کی سی آواز سنائی دی۔ اُس نے خیال کیا۔ کہ شاید کسی معزز مہمان کی آمد کی تیاریاں ہیں۔ راستہ کی جانب کی کھڑکی میں سے اس نے دیکھا . . . صاحب سوٹ پہنے ہوئے ہیں، عورتیں ریشمی ساریوں میں ملبوس ہیں، دوسری طرف گراموفون بجنے کی آواز آ رہی ہے . . .

وامن حیرت و استعجاب سے سامنے دیکھ رہا تھا۔ کارخانے کی چمنی سے نکلنے والا دھواں یہ بتلا رہا تھا۔ کہ مزدور کس قدر جانفشانی سے اپنا کام سرانجام دے رہے ہیں۔ اسکو ان عیش پرستوں کے بنگلوں کے پاس ٹھہرنا بالکل پسند نہ آیا، وہ تیز تیز جانے لگا۔ باجے کی آواز ابھی اسکے کانوں میں سنائی دے رہی تھی۔ اس نے خیال کیا۔ کہ صحنوں میں خوشنما گلاب کے پھول لگانے والوں کو اس بات کی خبر کہاں۔ کہ اس کی سرخی کتنے غریبوں اور مزدوروں کے خون کی مرہونِ منت ہے؟"

اب وہ مزدوروں کی آبادی میں سے گزرنے لگا۔ مٹی کے چھوٹے سے گھر۔ اس میں صحن کہاں؟ اور پھر صحن میں گلاب کھلنے کی بات تو دور ہی رہی، ایک گھر کے سامنے پانچ چھ آدمی گرمی کی وجہ سے باہر ہی سو گئے تھے۔ ان کے پھٹے پرانے کپڑے دیکھ کر وامن کو

اس جنگل کی عورت کی جارجٹ کی ساڑھی یاد آگئی۔ وہ آہستہ آہستہ جانے لگا۔

وہ ایک چٹان پر تھکا ماندہ بیٹھ گیا۔ وہیں وہ کتنی دیر سوچ میں بیٹھا رہا۔ اسکو ایسا معلوم ہوا۔ کہ زندگی ایک جنگ ہے۔ گو جاہل اور غریب لوگوں کو اسکا احساس نہیں۔ مگر وہ برابر اس جنگ میں شریک ہیں۔ اور ہم تعلیم یافتہ اور امیر انسان صرف زبانی باتیں کرنا جانتے ہیں۔ اور وقت پر منہ موڑ دیتے ہیں۔

مرغے کی ککڑوں کوں کی آواز سنائی دی، ساڑھے چار کی سیٹی بجی۔ رات کے مزدور کارخانے سے باہر نکلنے لگے۔ ان کو دیکھ کر وامن نے خیال کیا کہ، ہاں یہی ہیں وہ درحقیقت سپاہی اور ہم صرف تماشائی۔ تھوڑی ہی دیر میں اسکو نیند آ گئی، رہ رہ کر اس کو ایک خواب دکھائی دے رہا تھا۔

کہیں اور کئی سپاہی لڑ رہے ہیں۔ جسم سے خون کے فوارے نکل رہے ہیں۔ لیکن تب بھی زبان سے کہہ رہے ہیں۔ ہم نئی دنیا کے سپاہی ہیں۔ اور بالآخر ہم ہی فتح یاب ہونگے۔ اسکے دل میں یہ خواہش چٹکیاں لینے لگی۔ کہ وہ بھی ان سپاہیوں میں شامل ہو جائے۔

وہ بیدار ہوا۔ اور جسم میں زندگی کی ایک نئی حرارت لئے کارخانے کو جاتے ہوئے مزدوروں کے ہجوم میں شامل ہو گیا۔

بیدار ایم۔ اے

غزل!

نہ جانے کونسے قصے سنا دیئے تو نے — کہ ہوش والے بھی بیخود بنا دئے تو نے

کسی کا صبر سرِ عرش بار یاب ہوا — جو آج آنکھ سے دریا بہا دیئے تو نے

سمجھ گیا ہوں حقیقت جہانِ فانی کی — سنا ہے راز کے پردے اٹھا دیئے تو نے

بنا کے ہر کس و ناکس کو اپنا دیوانہ — جہاں میں حسن کے سکے بٹھا دئے تو نے

مرا جنون تھا باعث مری تباہی کا — شرابِ ہوش کے ساغر پلا دئے تو نے

اسیرِ زلف نہ بیدار ہو سکا ورنہ!
بڑے بڑوں کے قدم ڈگمگا دئے تو نے

سیّد مقبول حسین احمد پوری

تین دھڑکنیں

یہ بال پنا بھولا بھالا   اب ہونے کو ہے متوالا
یہ لوٹ مچل تیری پیاری   اب کرتی اور ہی تیاری
یہ آنکھ مچولا تاک رہا   یہ چھپی چھپولا جھانک رہا
اب چھیڑ رہا تجھ کو جوبن
وہ گھور رہا تیرا بچپن!

اب تیری جوانی دیوانی   ہے کرتی مستی من مانی
اب تیرا جوبن ہے بیکل   ہے گاتا ہردے میں منگل
کس سوچ میں پیاری گھوم رہی   وہ شام سہانی جھوم رہی
ہے چیخ رہا تیرا جوبن
اب جلد کسی کی دولھن بن۔

وہ دولھا کہتا ہے پٹ سے   کیوں دیکھ رہی تو گھونگھٹ سے
اب جیون کا یہ روپ بدل   آ ڈال مرے دل میں ہلچل
ہے تاک رہا جوبن تیرا   اور مچل رہا ہے من میرا
من میرا کرتا یہ سمرن
اے ولکی دیوی دے درشن

لے مجلۂ عروسی کے کواڑ کا پٹ

چیخوف — مترجمہ: محمد الیاس خاں

بوسہ

" مارچ کی شام کو قریباً آٹھ بجے یہ توپ خانہ میشیکو نامی گاؤں میں آکر ٹھیرا۔ فوجی افسر سامانِ حرب کو ترتیب سے رکھ رہے تھے کہ ایک نہایت ہی خوش پوشش گھڑ سوار آیا۔ اور افسروں کو سلام کرتا ہوا انکے قریب پہنچ گیا۔

" میں نواب خاں رابک ہوں مجھے مسرت ہوگی۔ اگر آپ حضرات آج میرے ساتھ چائے نوش فرمائیں "

گھوڑا اچھلا اور ایک طرف کو مڑا نواب نے ایک مرتبہ اور سر سے ٹوپی اتاری اور گرجا کے عقب سے ہوتا ہوا غائب ہو گیا۔

" لاحول ولا قوۃ " افسروں نے کہا ہمیں نیند آ رہی ہے اور یہ خان رابک چائے پر مدعو کرنے کیلئے آیا ہے۔

افسروں کو سال گذشتہ کی مورچہ بندی کا موقعہ کا ایک واقعہ یاد آ گیا۔ پچھلے سال بھی ایک کاؤنٹ نے انہیں مدعو کیا تھا۔ اور نہایت شاندار طریقہ پر ان کی خاطر تواضع کی تھی۔ اور مصر ہو کر تمام شب اپنے یہاں رکھا تھا۔ وہ ہنگامہ لطف وطرب ہر طرح سے کامیاب تھا۔ کاؤنٹ نوجوان افسروں کی معیت میں بہت زیادہ محظوظ تھا۔ وہ صبح تک اپنی زندگی کے پُر مسرت واقعات سنا سنا کر افسروں کو اور بھی زیادہ کسلمند بنا تا رہا تھا۔ وہ انہیں ایک کمرہ میں لے گیا تھا اور مصوری و نقاشی کے بہترین نمونے اور نایاب قسم کے ہتھیار دکھائے۔ اس نے وہ خطوط بھی پڑھ کر سنائے۔ جو اسے مختلف تقاریب کے مواقع پر حاصل ہوئے تھے خستہ حال افسروں نے مجبوری تمام ان چیزوں کو دیکھا بھالا درانحالیکہ وہ سب کے سب بالش و بستر کے لئے بیتاب تھے اور منہ پر ہاتھ رکھ رکھ کر جماہیاں لے رہے تھے۔ ان کے میزبان نے جس وقت انہیں اجازت دی۔ تو سونے کا وقت جا چکا تھا۔

خان رابک بھی کیا ایسی ہی دعوت کر رہا ہے؟ افسروں کو کوئی کام نہ تھا انہوں نے منہ ہاتھ دھوئے کپڑے پہنے اور نواب کے دولت کدہ کی طرف چل دیئے۔ وہ گرجا کے عقب میں ایک مختصر راستہ سے ہوتے ہوئے نواب کے باغ میں پہنچے۔ اور وہاں سے شارعِ عام پر ہوتے ہوئے نواب کے قصر کی طرف چل دیئے۔

" یہ خان رابک ہے کون؟ " ان میں سے ایک نے پوچھا " یہ کہیں وہی شخص تو نہیں۔ جو پیدا میں گھوڑ سوار دستہ کا افسر اعلیٰ تھا "

" نہیں وہ خان رابک نہیں تھا بلکہ اس کا نام تو صرف ربیب تھا۔ اسکے نام کے ساتھ خان وغیرہ کچھ نہیں لگا تھا "

" آج کیا خوشگوار موسم ہے "

سڑک دو راہوں میں تقسیم ہو جاتی تھی۔ ایک سیدھی چلی جاتی تھی۔ اور شام کے دھندلکے میں غائب ہو جاتی تھی۔ دوسری داہنی طرف کو گھومتی ہوئی نواب کے محل کو جاتی تھی۔ افسر دائیں جانب مڑے اور خاموش چلتے رہے۔ سڑک کے ہر دو جانب کنکریٹ کے اونچے اونچے ڈھیر پڑے ہوئے تھے۔ معلوم ہوتا تھا کہ جیسے کسی بڑے شہر کی بارکیں ہوں۔

" حضرات شگون اچھا ہے " افسروں میں سے ایک نے کہا۔

" ہمارے خضرِ راہ آگے چل رہے ہیں۔ انہیں اپنے شکار کی بو آ گئی ہے " سب سے آگے لفٹیننٹ لوبیکو (LOBETKO) تھا وہ دراز قد تھا

اس کا سینہ چوڑا تھا اور مونچھیں منڈی ہوئی تھیں۔ اس کی عمر پچپن سال تھی۔ مگر اس کا سن اسکے بیضوی چہرے کو دیکھتے ہوئے کم معلوم ہوتا تھا۔ وہ جنسِ لطیف کی موجودگی کا فی فاصلہ سے محسوس کر لیا کرتا تھا اور اپنی اِس صفت کے لئے بریگیڈ میں مشہور تھا۔ وہ گھوما اور گویا ہوا۔

"ہاں مجھے یقین ہے کہ یہاں قریب ہی مستورات ہیں میں بغیر دیکھے ہوئے کہہ سکتا ہوں"

دروازہ پر خان رابک بہ نفسِ نفیس پذیرائی کے لئے موجود تھا اس کی عمر کوئی۔ ساٹھ سال کی ہوگی۔ وہ اس وقت سادہ لباس میں ملبوس تھا۔ اس نے مہمانوں سے مصافحہ کیا اور کہا "میں آپ صاحبان کو دیکھ کر بہت خوش ہوا" اور ساتھ ہی معذرت خواہ ہوں کہ میں نے آپ حضرات سے شب باش ہونے کے لئے نہیں کہا وجہ یہ ہوئی۔ کہ مری دو بہنیں اُن کے بچے بھائی اور کچھ پڑوسی آئے ہوئے ہیں۔ اسلئے سارا مکان گھرا ہوا ہے۔ امید ہے آپ معاف فرمائیں گے۔

نواب خوش اخلاقی کا مجسمہ تھا۔ تاہم اسکے چہرہ سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ اسے اپنے مہمانوں کی آمد کی اتنی خوشی نہیں ہوئی جتنی سال گذشتہ کے نواب کو۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس نے محض اخلاقی طور پر مدعو کیا ہے۔ یہ بات افسروں پر اس وقت ثابت ہوگئی جب وہ زینہ میں سے جہاں چادر بچھی ہوئی تھی۔ اپنے میزبان کی گفتگو سنتے ہوئے اور یہ دیکھتے ہوئے کہ ملازمین ہال اور زینہ میں لیمپ روشن کرنے کے لئے اِدھر اُدھر دوڑ رہے ہیں۔ انہوں نے محسوس کیا۔ کہ ان کی آمد باعثِ مسرت نہیں ہے۔ اس مکان میں جہاں بہن بھائی جمع ہوں۔ اور جہاں انکے اپنے احباب آئے ہوئے ہوں وہاں انہیں اجنبیوں کی موجودگی کب قابلِ مسرت ہوسکتی ہے

مہمان جب نشستگاہ کے دروازہ پر پہنچے۔ تو اُن کا استقبال ایک بزرگ خاتون نے کیا۔ خاتون کے بشرہ سے بزرگی ٹپکتی تھی۔

ان کا چہرہ کتابی تھا اور بھویں سیاہ وہ ہو بہو شہزادی یوجین معلوم ہوتی تھی۔ اس نے حسین تبسم کے ساتھ انہیں خوش آمدید کہی اور معذرت چاہی۔ کہ وہ شب میں انہیں مہمان نہ رکھ سکی جیسے ہی وہ وہاں سے گئی۔ اسکے لبوں سے مسکراہٹ مفقود ہوگئی۔ اس سے صاف ظاہر تھا۔ کہ خاتون کو اپنے مہمانوں سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ مکان پر افسروں کو مدعو کرنا اور پھر معذرت چاہنا۔ یہ صرف اس لئے تھا۔ کہ اخلاق اور عزّو وقار اسکے متقتضی تھے۔

افسر جب طعام گاہ میں داخل ہوئے۔ تو قریباً ایک درجن ذکور و اناث ایک طرف بیٹھے ہوئے چار پی رہے تھے۔ مائی کرسیوں کے پیچھے کچھ مردوں کا ایک گروہ سگار کے دھوئیں میں چھپا ہوا بیٹھا تھا۔ ان میں ایک پتلا دبلا آدمی انگریزی میں گفتگو کر رہا تھا۔ اور اس مجمع کے پس پشت روشنی سے منور کمرہ تھا۔ جس میں ہلکے پیلے رنگ کا فرنیچر پڑا ہوا تھا۔

"معززدوستو۔ آپ حضرات اتنے ہیں۔ کہ سب کا تعارف کرانا مشکل ہے،، نواب نے مسکراتے ہوئے کہا" برائے عنایت تکلف برطرف کر کے آپس میں خود تعارف کیجئے۔

آخر بیٹھ گئے۔ بعض کے چہروں سے متانت و خاموشی ظاہر تھی۔ اور کچھ زبردستی کی ہنسی ہنس رہے تھے۔ وہ سب کے سب بڑی بے آرامی محسوس کر رہے تھے۔ لیکن ربیوویچ ناظم عملہ جو پستہ قد اور گول شانوں کا آدمی تھا۔ بہت زیادہ کوفت محسوس کر رہا تھا۔

اس وقت جبکہ افسروں نے اپنے چہروں کو متین بنا لیا تھا اور بعض نے مصنوعی مسکراہٹ پیدا کر لی تھی۔ ریبوویچ کا بدحواس چہرہ۔ بن بلاؤ کی طرح مونچھیں۔ عینک یہ سب زبانِ حال سے کہہ رہی تھیں۔ کہ تمام بریگیڈ میں سب سے زیادہ شرمیلا باحیا اور بدمذاق ہوں" وہ کمرہ میں کسی چیز کو اپنی توجہ کا مرکز نہ بنا سکا حسنا کے شگفتہ چہرے عمدہ پوشاکیں شیشہ کا سامان مے ناب کی

صراحیاں جھاڑ فانوس وغیرہ یہ سب مل کر ریبو وچ کے لئے باعث
پریشانی بن گئے۔ وہ چاہتا تھا۔ کہ کہیں اپنا منہ چھپا لے۔ اس کی گھبراہٹ
بالکل اس مقرر کی طرح تھی۔ جو پہلی بار مجمع میں تقریر کرے۔ کچھ دیر
کے بعد جب وہ اپنے گرد و پیش سے قدرے مانوس ہوا۔ تو اس نے
چاروں طرف نگاہ ڈالی۔ شرمیلا اور علم مجلسی سے ناواقف ہونے
کی وجہ سے وہ اپنے میزبان کی حرکات دیکھ کر حیران رہ گیا۔ وان رابک
اس کی بیوی دو بزرگ خواتین ایک سبز پوش لڑکی اور رابک کے
چھوٹے لڑکے نے جس کی مونچھیں سرخ تھیں۔ نہایت سرعت سے
اپنے آپ کو افسیروں میں تقسیم کر لیا۔ گویا کہ وہ پہلے سے اس کی مشق
کر چکے تھے۔ اور مہمانوں سے باتیں کرنے لگے۔ سبز پوش دوشیزہ گرم
جوشی سے بحث کر رہی تھی۔ کہ توپ خانہ میں زندگی بہ نسبت گھوڑے
سوار یا پیدل کے زیادہ آسائش سے گزرتی ہے۔ برخلاف اسکے
رابک اور دونوں خواتین اسکے خلاف کہہ رہی تھیں۔ ریبو وچ نے
دیکھا۔ کہ لڑکی کا بحث ایسا ہے۔ جسکے متعلق وہ خود کچھ نہیں جانتی
اور یہ کہ اسے خود اس بحث میں دلچسپی نہ تھی۔ وہ صرف افسیروں
کی دلجمعی و دلبستگی کے لئے یہ گفتگو کر رہی تھی۔ ریبو وچ اس مصنوعی
شگفتگی اور مسکراہٹ کو دیکھ رہا تھا جو حسینہ کے رخ رنگین پر جلوہ
افروز تھی۔

خان رابک اور اس کی بیوی نے مہمانوں کو نہایت ہوشیاری
سے باتوں میں لگایا اور ساتھ ہی اس کا بھی خیال رکھا کہ کسی کو کسی
چیز کی ضرورت تو نہیں اور سب کے سب اکل و شرب میں مشغول ہیں
ریبو وچ تمام گفتگو اچھی طرح سن رہا تھا۔ جسقدر وہ سنتا تھا
اسی قدر اپنے دل میں مہذب خاندان کے لئے محبت پاتا تھا۔ وہ
پر تصنع گفتگو کو بہت پسند کرتا تھا۔

چاء کے بعد افسیران نشست گاہ میں گئے۔ لفٹنٹ لوبکو
کا خیال صحیح نکلا۔ کمرہ میں بہت سی لڑکیاں اور خواتین تھیں۔
لفٹنٹ ایک سیاہ لباس والی حسینہ کے پاس کھڑا ہوا اور اس
کی طرف ایسے جھکا۔ جیسے کسی نعلوم تلوار کے بل پر جھکا ہو۔ وہ
مسکرایا۔ اپنے شانوں کو کربایانہ انداز میں جنبش دی۔ لاریب
وہ اس دوشیزہ سے کوئی دلچسپ گپ ہانک رہا تھا۔ ہرچند حسینہ
خاموشی سے اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ مگر اس سے اس کا التفات
ظاہر نہ ہوتا تھا۔ اس نے بپایان کار نہایت سرد مہری سے کہا۔
"واقعی"۔ اگر لفٹنٹ کچھ بھی زیرک ہوتا۔ تو اس سرد مہر "واقعی"
سے سمجھ جاتا۔ کہ وہ کچھ محظوظ نہیں ہو رہی ہے

کسی نے پیانو پر نغمۂ جانگداز چھیڑ دیا۔ دریچہ میں ہوا چل
رہی تھی۔ جس سے ہر ایک کو معلوم ہوا کہ مئی کا مہینہ ہے۔ موسم
خوشگوار اور گلاب و سوسن کی خوشبو سے ہوا معطر ہے

ریبو وچ جو موسیقی سے مسحور اور مے ناب کے نشہ میں چور تھا
مسکراتا ہوا دریچہ کا سہارا لے کر بیٹھ گیا اور کافر ادا حسن کی کرشمہ
سازیوں کو دیکھنے لگا۔ اسے ایسا معلوم ہوتا تھا۔ کہ گلاب و سوسن
کی جانفزا خوشبو باغیچہ سے نہیں آ رہی ہے بلکہ یہ تعطر بیزی انکے
جسم و لباس سے ہو رہی ہے

خان رابک کے فرزند نے ایک دراز قامت اور نازک تن
لڑکی کو رقص کی غرض سے بلایا۔ اس نے کمرہ میں دو تین چکر لگائے
لوبکو سبز پوش حسینہ کے پاس پہنچا اور اسے کمرہ کے وسط میں لے
آیا۔ اور رقص شروع ہو گیا۔ ریبو وچ دروازہ کے پاس کھڑا تھا۔ وہ
ناچنے والوں میں سے نہ تھا۔ اس کی حیثیت محض تماشائی کی تھی۔
اس نے اپنی زندگی میں کبھی رقص نہیں کیا تھا۔ اور نہ کبھی اسے
ایسا موقعہ ملا تھا۔ کہ اپنی باہوں کو کسی پری جمال کی کمر میں رقص
کی غرض سے حمائل کر دے۔ ریبو وچ کے لئے یہ امر نہایت
فرحت بخش تھا۔ کہ مجمع عام میں کسی مرد رعنا کے ہاتھ کسی نازنین
کی کمر کے گرد حمائل ہوں۔ اور انکے دست نازک جوان شخص کے
شانوں پر رکھے ہوں۔ لیکن وہ یہ تصور نہیں کر سکتا تھا کہ کبھی
اس کی قسمت بھی ایسی ہو گی۔ اکثر اس نے اپنے ساتھیوں کی

جرأت و ہمت پر رشک کیا۔ اور جب اسے یہ احساس ہوتا کہ وہ نہایت ہی شرمیلا اور کور ذوق واقع ہوا ہے۔ اور یہ کہ اس کی مونچھیں بن بلاؤ کی طرح ہیں۔ تو اسکا دل غم سے بیٹھ جاتا لیکن جیسے جیسے اس کی عمر بڑھتی گئی۔ اس کی جھجک میں بھی کمی ہوتی گئی۔ اب جب اس نے مرد اور عورت کے جوڑوں کو رقص کرتے اور لوگوں کو ہمکلام دیکھا۔ تو اسکے دل میں کوئی حسد نہ پیدا ہوا ہاں وہ غم کے احساس سے ضرور متاثر ہوا۔

رقص شروع ہوا تو ریبوورچ ناچنے والوں میں آملا۔ کچھ افسران بلیرڈ کھیلنے کے لئے باہر آگئے۔ ریبوورچ کو کوئی کام نہ تھا۔ وہ چاہتا تھا۔ کہ اس جشن و سرور میں وہ بھی حصہ لے چنانچہ افسران کے ہمراہ وہ بھی باہر چلا آیا وہ سب کے سب ایک تنگ برآمدہ اور بے شمار کمروں میں سے ہوتے ہوئے بلیرڈ روم میں داخل ہوئے۔ ایک کمرہ میں تین اشخاص کوچ پر خوابیدہ ان کے چلنے کی آہٹ محسوس کر کے چونک اُٹھے۔ مگر وہ اُن کی بغیر پرواہ کئے ہوئے بلیرڈ روم میں داخل ہو کر بلیرڈ کھیلنے لگے۔

ریبوورچ جو سوا تاش کے اور کوئی کھیل نہ جانتا تھا میز کے پاس کھیل دیکھنے کے لئے کھڑا ہو گیا۔ وہ اسے بڑی بے توجہی سے دیکھ رہا تھا۔ کھلاڑیوں نے کوٹوں کے بٹن کھول دے۔ اور ہاتھوں میں بلیرڈ کھیلنے کی لکڑی لئے ہوئے ہنسی مذاق کرتے ہوئے اِدھر اُدھر گھوم رہے تھے۔ کھلاڑیوں نے ریبوورچ کی طرف بالکل توجہ نہیں کی۔ ہاں کھیل کے دوران میں جب کبھی کبھار ریبوورچ کو اتفاقیہ لکڑی لگ جاتی۔ تو وہ اخلاقی طور پر "معاف کیجئے گا" کہتا کہ ابھی پہلا کھیل ختم بھی نہ ہوا تھا کہ ریبوورچ اکتا گیا۔ اور اسے محسوس ہوا کہ اس کی وہاں ضرورت نہیں ہے۔ اور یہ کہ وہ انکے کھیل میں مخل ہو رہا ہے۔ وہ باہر چلا آیا۔ اور رقص گاہ کا رخ کیا

اسے واپسی میں ایک واقعہ پیش آیا۔ نصف راستہ طے کرنے کے بعد اسے معلوم ہوا۔ کہ وہ گم کردہ راہ ہے اسے یاد آیا۔ کہ اسے اُس کمرہ میں سے گزرنا چاہیئے تھا۔ جہاں تین آدمی سو رہے تھے وہ حالانکہ چھ کمروں میں سے گزر چکا تھا۔ مگر خوابیدہ اشخاص اسے نظر نہ آئے۔ اپنی غلطی کا احساس کر کے وہ کچھ دور واپس گیا اور بائیں طرف مڑا۔ اور ایک کمرہ میں جس میں دھندلی دھندلی روشنی تھی عمداً داخل ہوا۔ بلیرڈ روم کو جاتے ہوئے اس نے یہ کمرہ نہیں دیکھا تھا۔ ایک ثانیہ کے لئے وہ کھڑے ہو کر سوچنے لگا اور پھر سامنے کا دروازہ کھولا۔ اندر داخل ہوا۔ کمرہ بالکل تاریک تھا ہاں دروازہ کی درازمیں سے روشنی کی کرن آتی معلوم ہوتی تھی۔ کمرہ کے عقب میں ایک نغمہ حزیں سنائی دے رہا تھا۔ رقص گاہ کی طرح یہاں بھی پھولوں کی خوشبو مہک رہی تھی۔

ریبوورچ حیران و پریشان کمرہ میں کھڑا ہو گیا۔ اس وقت اس نے عجلت میں کسی کے آنے کی پیروں کی چاپ سُنی۔ کسی کے لباس کی سرسراہٹ محسوس کی۔ اور عورت کے جذبات سے مملو آواز گوش گزار ہوئی "پایانِ کار"۔ اور دو نرم خوشبو سے معطر بازو جو بالایقین ایک عورت کے ہی بازو تھے۔ اس کی گردن کے گرد حمائل ہو گئے۔ گرم رخسار اسکے رخسار سے مس ہوا اور اسی لمحہ ایک بوسہ کی آواز سنائی دی۔ لیکن فوراً ہی اس عورت کے منہ سے چیخ نکل گئی۔ ریبوورچ نے محسوس کیا۔ کہ وہ خوفزدہ ہو کر اس سے علیحدہ ہو گئی۔ ریبوورچ کے منہ سے بھی چیخ نکل گئی۔ اور وہ دروازہ کی طرف جس کی درز سے روشنی آتی تھی جھپٹ کر گیا۔

وہ جب رقص گاہ میں پہنچا۔ تو اس کا دل بُری طرح سے دھڑک رہا تھا۔ اور ہاتھ ایسے نمایاں طور پر کانپ رہے تھے۔ کہ اس نے فوراً انہیں پسِ پشت چھپا لیا۔ کچھ دیر تک وہ خود کو بہت خوفزدہ اور شرمسار تصور کرتا رہا۔ وہ سمجھ رہا تھا کہ ہر شخص

کو علم ہے۔ کہ کسی عورت نے اسے سینہ سے لگایا ہے۔ اسے پیار کیا ہے۔ اس کا بوسہ لیا ہے۔ اس نے اپنی پریشان نگاہیں چاروں طرف ڈالیں۔ لیکن اسے یقین ہو گیا۔ کہ یہ سب رقص میں مشغول ہیں۔ انہیں کچھ پتہ نہیں۔ اور وہ پھر اِس لذتِ خاص کا مزہ لینے لگا۔ جو اسے زندگی میں پہلی بار حاصل ہوئی تھی۔

یہ کچھ عجیب و غریب حادثہ تھا۔ رخسار پر جہاں اسے چوما گیا تھا۔ وہ پیپرمنٹ جیسی سنسناہٹ محسوس کر رہا تھا اور گردن میں جہاں گدرائے ہوئے بازوؤں نے حلقہ کیا تھا۔ تیل کی خنکی سی محسوس کر رہا تھا۔ جتنا زیادہ وہ اپنے گال کو ملتا تھا۔ اسی قدر سنسناہٹ پیدا ہوتی تھی۔ سر سے لے کر پیر تک جسم میں عجیب اور نئے قسم کا احساس ساری تھا۔ جو برابر بڑھ رہا تھا۔ وہ چاہتا تھا۔ کہ باغ میں چلا جائے۔ وہاں ناچے اچھلے۔ کودے اور زور زور سے بولے۔ اور باغ میں اِدھر اُدھر دوڑتا پھرے۔ اور قہقہے لگائے۔ وہ اس امر کو بالکل بھول گیا۔ کہ اسکے شانے گول ہیں۔ اور وہ کور ذوق و بدشکل ہے۔ بیگم خان رابک اس کے قریب سے گزریں۔ وہ انہیں دیکھ کر متبسم ہوا۔ وہ ٹھیر گئیں اور اس کی طرف حیران ہو کر دیکھنے لگیں۔

”مجھے آپ کا دولتکدہ بہت زیادہ پسند ہے“ اس نے اپنی عینک درست کرتے ہوئے کہا۔

بیگم خان رابک نے جواب دیا۔ کہ یہ مکان ان کے والد کا تھا۔ پھر انہوں نے دریافت کیا۔ آیا اسکے والدین بقیدِ حیات ہیں اور وہ ملازمت میں کب سے ہے۔ اس قدر دُبلا کیوں ہے۔ وغیرہ کچھ دیر بات چیت کر کے وہ آگے بڑھ گئیں۔ گفتگو کے بعد ریبوویچ پھر مسکرایا۔ اس کی مسکراہٹ میں احسان شناسی کا جذبہ پایا جاتا تھا۔ اس نے خیال کیا۔ کہ نواب اور ان کے گھر والے نہایت شریف لوگ ہیں۔

دعوت میں جو کچھ ریبوویچ کے سامنے آیا۔ وہ بے خبری کے عالم میں کھاتا چلا گیا۔ اس نے اس گفتگو کا لفظ تک نہیں سنا۔ جو دورانِ دعوت میں ہوتی رہی۔ وہ اپنے رومان کے لطف کو کھونا نہیں چاہتا تھا۔ یہ حادثہ بالکل پُراسرار تھا۔ لیکن اس کا سمجھنا کوئی مشکل نہ تھا۔ کسی نوخیز لڑکی یا شادی شدہ خاتون نے اپنے محبوب سے اس تاریک کمرہ میں ملنے کا وعدہ کیا ہو گا۔ چونکہ خاتون نے اپنے ملاقاتی کا بہت زیادہ انتظار کیا۔ اور اس سے ملنے کے لئے پریشان تھی۔ ظاہر ہے۔ کہ عالمِ سراسیمگی میں وہ ریبوویچ کو اپنا ہیرو سمجھی۔ خصوصاً ایسی حالت میں جبکہ ریبوویچ خود کسی کی تلاش میں تھا۔ اور معلوم ہوتا تھا۔ کہ اسے بھی کسی کا انتظار ہے۔ ریبوویچ نے بوسہ کی تاویل نکالی

”لیکن وہ تھی کون؟“ اس نے سوچا۔ اور مستورات جو وہاں تھیں کی طرف دیکھنے لگا۔ وہ نوخیز نوجوان ہونی چاہیئے کیونکہ ڈھلی ہوئی عمر کی عورتیں زمان و مکاں کے اقرار نہیں کیا کرتیں۔ وہ کوئی ذہین ہو گی۔ میں نے اسکے لباس کی سرسراہٹ نکہت پاش جسم اور لوچدار آواز سے معلوم کر لیا تھا۔ کہ وہ ذکی ہے

اس کی نگاہ ایک سبزپوش لڑکی پر جم گئی۔ وہ اسے بڑی دلکش نظر آئی۔ اسکے شانے و بازو نہایت خوبصورت تھے۔ اسکے بشرہ سے ذہانت اور آواز سے شیرینی ٹپکتی معلوم ہوتی تھی۔ اسے دیکھ کر ریبوویچ نے کہا۔ ”یقیناً سوائے اس دوشیزہ کے کوئی دوسری لڑکی مری معلوم ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ نہیں ہو سکتی“، لیکن وہ پُرتصنع انداز میں مسکرائی اور ناک سکوڑی۔ جس سے معلوم ہوا کہ وہ کافی سن و سال کی ہے۔ اس نے پھر سیاہ پوش لڑکی پر نگاہ ڈالی۔ وہ کمسن اور سادہ لوح لڑکی تھی۔ اس کی کنپٹیں نہایت خوبصورت تھیں۔ اسکے جرعہ نوشی کا انداز غایت درجہ حسین تھا۔ ریبوویچ نے خیال کیا۔ کہ یہی اس کی معلوم ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ہے“، لیکن یہ امر اس پر جلد ہی منکشف ہو گیا۔ کہ اس کا چہرہ چپٹا ہے۔ اس نے فوراً ہی اپنی توجہ دوسری لڑکی کی طرف منعطف

کرلی۔

"مگر" اس نے کہا۔ "کوئی سبز پوش حسینہ کے خوبصورت شانے وبازو۔ اور دوسری حسینہ کی کنپٹیاں اور وہ لڑکی جو پوٹیکا کے پاس بیٹھی ہے۔ اس کی آنکھیں اور پھر . . . ."

طعام نوش جاں کرنے کے بعد افسروں نے اپنے میزبان سے اجازت طلب کی۔ نواب اور اس کی اہلیہ نے ایک مرتبہ اور معذرت خواہی کی۔ کہ وہ انہیں رات میں نہ ٹھہرا سکے

"معزز دوستو۔ میں آپ سے ملکر بہت خوش ہوا،" نواب نے سنجیدگی سے کہا۔ "امید ہے آپ حضرات واپسی پر پھر اس بندۂ ناچیز کو شرف نیاز بخشینگے۔ آپ راستہ تو نہ بھولے ہونگے۔ کیا گھوڑوں پر جائیگا۔ اگر نہیں تو پھر باغ میں ہوتے ہوئے جائیے اقامت گاہ بالکل قریب ہے"

افسر باغ سے ہوتے ہوئے چل دئے۔ وہ نور ونغمہ سے نکل آئے تھے۔ اسلئے باغ میں تاریکی تاریک تر نظر آ رہی تھی۔ وہ ساکت وصامت پھاٹک تک آ گئے۔ انہوں نے خوب سیر ہوکر شراب وطعام نوش جان کیا تھا۔ وہ کافی مسرور تھے۔ لیکن باغ میں چاروں طرف چھائے ہوئے سناٹے وظلمت نے انہیں قدرے آزردہ کر دیا۔ ریبو وچ کی طرح انکے دماغ میں یہ خیال پیدا ہوا۔ کہ رابک کی مانند کاش انکے پاس ایک محل عظیم وسیع خاندان اور شاندار باغ بھی ہو۔ اور مہمانوں کی خاطر تواضع کی خوش نصیبی بھی حاصل ہو۔ خواہ ظاہرداری کے طور پر ہی کیوں نہ ہو۔ انہیں انواع واقسام کے کھانوں اور آتش سیال سے خوب سیر کریں

پھاٹک سے باہر نکل کر وہ آپس میں باتیں کرنے لگے۔ اور بلاوجہ وبلاسبب زور زور سے ہنسنے لگے۔ وہ لب جو چل رہے تھے۔ جسکے ہر دو جانب خود رو جھاڑیاں لگی ہوئی تھیں۔ لمبے لمبے نرکل استادہ تھے۔ تاریکی کی وجہ سے راہ اور کنارہ دریا میں امتیاز کرنا مشکل تھا۔ اور دوسرا کنارہ تو بالکل ظلمت میں ملفوف تھا۔ پانی میں کہیں کہیں انجم خوشتاب کا عکس پڑتا تھا۔ ان کی تارعین کی جھلملاہٹ سے معلوم ہوتا تھا۔ کہ دریا نہایت آہستہ خرامی سے رواں ہے۔ ہوا بند تھی۔ دریا کے دوسرے کنارے پر طیور خوشنوا چہچہہ زن تھے۔ ایک جھاڑی پر ایک عندلیب آفیسران کی موجودگی سے بے پرواہ درد بھرا نغمہ الاپ رہی تھی۔ افیسران میں سے ایک نے جھاڑی کی ایک شاخ ہلائی۔ مگر بلبل برابر نغمہ سنج رہی۔

"کتنا جری فقیر ہے،" ایک آفیسر نے سرراہ بیٹھے ہوئے فقیر کو دیکھ کر کہا۔ "ہم کھڑے ہیں اور اسے کچھ پرواہ نہیں۔ بدمعاش کہیں کا،"

چڑھائی آگئی۔ یہ راستہ گرجا کے پیچھے سے ہوتا ہوا سڑک میں ملجاتا تھا۔ چڑھائی پر چڑھنے سے آفیسراں کا سانس پھول گیا۔ وہ آرام کے لئے ٹھیر گئے۔ اور سگریٹ کے کش ہوا میں چھوڑنے لگے۔ دریا کے اس پار انہوں نے مدھم روشنی دیکھی۔ وہ سوچنے لگے۔ آیا یہ آگ کیمپ میں روشن ہے۔ یا کسی دور دراز جھونپڑے میں چراغ جل رہا ہے۔ یا کوئی اور شئے ہے۔ ریبو وچ نے بھی روشنی کو دیکھا اس نے محسوس کیا۔ کہ وہ اس پر خنداں ہے معلوم ہوتا ہے کہ بوسہ کے راز سے وہ بھی آگاہ ہے۔

اقامت گاہ پہ پہنچ کر ریبو وچ نے اپنا لباس اتارا اور بستر پہ دراز ہو گیا لوٹبکو اور لفٹنٹ مرسلیاکو بھی اسی کمرہ میں تھے موخرالذکر خاموش کم گو اور نہایت مہذب انسان متصور ہوتا تھا۔ وہ عموماً "پیغام یورپ" رسالہ پڑھا کرتا تھا۔ اس رسالہ سے اسے اتنا انس تھا۔ کہ اسے ہمیشہ ساتھ رکھتا۔ لوٹبکو نے بھی لباس اتارا اور کمرہ میں ہی پریشان وافسردہ ٹہلنے لگا۔ اس نے اردلی کو شراب ناب کی ایک بوتل لانے کے لئے کہا مرسلیاکو نے موم کی شمع روشن کی۔ اور سرہانے رکھ کر وہ بستر پہ دراز ہوکر رسالہ کا مطالعہ کرنے لگا۔

"مجھے تو حیرت ہے۔ پتہ نہیں کون تھی" ریبورچ نے میلی کچیلی چھگری پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔

وہ ابھی تک گردن پر تیل کی ٹھنڈک اور رخسار پر پیپرمنٹ کی کیفیت محسوس کر رہا تھا۔ سبز پوش لڑکی کے بازو و شانے سیاہ لباس لڑکی کی کنپٹیاں انکے معطر ملبوس اور خوبصورت زیورات کی تصویریں انکے دماغ میں رقصاں تھیں وہ حسن و عشق کے تصورات میں اپنا ایک صنم خانہ تعمیر کر رہا تھا۔ اس کی چشم تصور کے سامنے شعر و شباب کے مناظر رقص کرتے۔ اور غائب ہو جاتے۔ اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ اب اسے کسی کے پیروں کی چاپ لباس کی سرسراہٹ اور بوسہ لینے کی آواز سامعہ نواز ہوئی۔ اس پر فرحت و محبت کے جذبات متولی ہو گئے۔ اس وقت جب کہ وہ خود کو سپرد جذبات کر چکا تھا۔ اس نے اردلی کو جو واپس آگیا تھا۔ کہتے سنا کہ مے ناب دستیاب نہیں ہوئی۔ ٹوٹیکو شراب کے نہ ملنے سے بہت آزردہ ہوا۔

"یہ احمق نہیں تو اور کون ہے"، اس نے ریبورچ کے بستر کے قریب ٹھہرتے ہوئے کہا۔ "انسان ایسا بھی کیا کودن اور بیوقوف کہ شراب تک نہ لا سکا۔ بدمعاش کہیں کا"

"واقعی یہاں شراب نہیں مل سکتی"، مرسلیا کو نے رسالہ پر سے بغیر نظریں ہٹائے کہا۔

"آپ نے یہ کیسے سمجھ لیا" ٹوٹیکو نے کہا "میں آپ سے شرط باندھتا ہوں۔ کہ شراب کیا یہاں تو عورتیں بھی مل سکتی ہیں اور میں لا سکتا ہوں۔ میں ابھی جاتا ہوں۔ اب خواہ مجھے گالیاں ہی کیوں نہ دیں۔ مگر میں پرواہ نہیں کرتا۔ میں ضرور جاؤنگا"

اس نے کپڑے زیب تن کئے اور لمبے جوتے بھی پہنے۔ اور پھر بغیر کوئی لفظ کہے ہوئے وہ باہر چلا گیا۔

"رابنگ گریک لیبک"، اس نے یہ نام پکارے۔ اور باہر آن کر کھڑا ہو گیا۔ "بھاڑ میں جائے شراب میں اس وقت تنہا جانا نہیں چاہتا۔ ریبورچ کیا تم بھی اس وقت سیر کرتا ہوا چلو گے"؟

اسے جب کوئی جواب نہ ملا۔ تو پیچھے سے واپس آیا پوشاک اُتاری اور بستر پر چلا گیا۔ مرسلیا کو نے ٹھنڈی سانس بھری اور رسالہ ایک طرف رکھ دیا۔ اور چراغ گل کر کے سونے کے لئے آنکھیں موند لیں۔

"ہاں"، ٹوٹیکو نے جو اندھیرے میں سگریٹ پی رہا تھا کہا

ریبورچ نے چادر سے منہ ڈھانپ لیا۔ اور منتشر تصورات کو جو دماغ میں گردش کر رہے تھے۔ پھر مجتمع کرنے کی سعی کرنے لگا۔ لیکن سب لاحاصل وہ جلد ہی سو گیا۔ اس کا خیال تھا کہ کسی نے اسے محبت کے خزانہ بے بہا سے سرفراز کیا۔ اس کی زندگی میں کوئی نہایت خوش کن و فرحت بخش کیفیت پیدا ہو گئی۔ حالانکہ ایسی چیز کا نہ سر تھا نہ پیر۔ اسکے اس تخیل نے اسے عالم خواب میں بھی نہ چھوڑا

وہ جب بیدار ہوا۔ تو پیپرمنٹ کی کیفیت اور تیل کی ٹھنڈک معدوم ہو چکی تھی۔ لیکن پھر بھی وہ مانند پیروزہ کے مسرت در آغوش تھا۔ وفور شوق میں اُس نے کھڑکی کے چوکھٹے کی طرف جو ابھرتے ہوئے سورج کی روشنی میں زرنگار ہو رہا تھا دیکھا اور گلی میں کسی کے بولنے کی آواز سنی۔ اسکے اپنے دریچہ کے نیچے سے بولنے کی آواز آ رہی تھی۔ کمانڈر ریبڈسکی سارجنٹ کو کسی قصور پر ڈانٹ رہا تھا۔

"اور"، کمانڈر نے چیخ کر کہا۔

"حضور گل پُشکا زخمی ہو گئی۔ ڈاکٹر نے کچھ مٹی اور شراب طلب کی۔ گذشتہ شب میکنک آر ٹیٹو نے بھی صہبا پی اور لفٹیننٹ صاحب نے حکم دیا تھا۔ کہ اسے علیحدہ گولا انداز وقین رکھا جائے"

"ہاں حضور کاربو نے جنمے بھی نہیں لگائے۔ اور یہ کہ آفیسران نے شام وان رابک کے یہاں گذاری"، کمانڈر باتیں کرتا ہوا دریچہ کے پاس آگیا۔ اس نے افیسران کے مخمور چہرے

کو دیکھا اور پوچھا۔

"خیریت ہے"

"گھوڑی کے دونوں پہلو زین سے رگڑ کھا کر زخمی ہو گئے"۔

لڈیکو نے جمائی لیتے ہوئے کہا۔

کمانڈر نے ٹھنڈی آہ بھری۔ کچھ دیر ٹھیرا اور پھر کہا۔ مجھے انگیز بلڈ کے پاس جانا ہے۔ اس سے ملنا ضروری ہے۔ اچھا الوداع میں شام تک آپ صاحبان سے ملونگا۔

پندرہ منٹ میں بریگیڈ روانہ ہو گیا۔ وہ جب وان رایک کے خرمن کے پاس سے گزرے۔ تو ریبوورچ نے اسکے مکان پر نگاہ والپسین ڈالی۔ کھڑکیوں پر پردے پڑے ہوئے تھے۔ اور لوگ تا ہنوز محو خواب تھے۔ وہ لڑکی جس نے کل ریبوورچ کا بوسہ لیا تھا۔ خواب شیریں میں سرمست تھی۔ اس نے سوچا۔ کہ وہ کیسے سو رہی ہوگی۔ اسکے سونے کے کمرہ کی کھڑکی کھلی ہوئی تھی۔ شاہ بہائے سبز دریچہ میں سے جھانک رہی تھیں۔ نسیم صبح گاہی گلاب و سوسن کی مست خوشبو۔ نرم بستر۔ خوبصورت کرسی جس پر وہ لباس جو وہ کل زیب تن کئے ہوئے تھی۔ پڑا تھا سلیپر اور میز پر ایک خوبصورت گھڑی یہ تمام چیزیں اس نے صاف طور سے دیکھیں۔ لیکن لڑکی کا چہرہ اس کا خواب آسا تبسم آہ یہی کچھ تو تھا۔ جس کی دید کے لئے وہ بیتاب تھا۔ مگر یہ سب کچھ اسکے تخیل سے ایسے نکل گیا۔ جیسے انگلیوں میں سے سیماب۔ قریب نصف فرلانگ تک وہ مڑ مڑ کر دیکھتا رہا۔ پیلے رنگ کا گرجا قصر عظیم دریا باغ زرد ضیا میں غسل کر رہے تھے۔ دریا معہ اپنے سبز پوش کناروں کے نہایت حسین دکھائی دے رہا تھا۔ اور اسپر آسمان کا عکس اور آفتاب عالمتاب کی روشنی سونے پر سہاگہ تھی۔ ریبوورچ نے ایک مرتبہ اور قریہ پر نظر ڈالی۔ اس کا دل غم و اندوہ سے مملو ہو گیا۔ جیسے وہ اپنی نہایت عزیز و قیمتی چیز چھوڑے جا رہا ہے۔

سڑک پر بھی حسین و جمیل مناظر جلوہ افروز تھے۔ لیکن جانب سے ماورا دائیں جانب رائی اور گندم کے کھیت لہلہا رہے تھے۔ سامنے گرد و غبار آگے چار چار کر سپاہی کا دستہ چل رہا تھا اسکے پیچھے باجے والے تھے۔ یہ لوگ ایسی خاموشی سے جا رہے تھے کہ دھوکا ہوتا تھا۔ کہ کسی جنازہ کے پیچھے چل رہے ہوں۔

شہری شخص کے لئے فوجی مارچنگ نہایت عجیب و دلچسپ نظارہ ہوتا ہے۔ ان کے لئے یہ سمجھنا نہایت مشکل ہے۔ کہ ایک بندوق کو اکثر کئی کئی آدمی کیوں اٹھا کر چلتے ہیں۔ یا ایک توپ کے کھینچنے کے لئے بہت سے گھوڑے کیوں درکار ہوتے ہیں۔

لیکن ریبوورچ ان تمام باتوں سے بخوبی واقف تھا۔ اسلئے یہ سین نہایت بے مزہ اور غیر جاذب تھا۔ اسے اس میں کیا دلچسپی ہو سکتی تھی۔ کہ گاڑی پر سپاہی کیوں بیٹھا ہے۔ اس کی گردن کل کے گرد و غبار سے کیوں اٹی ہوئی ہے۔ ریبوورچ کے لئے یہ نظارہ نہایت بے معنی تھا۔

ریبوورچ نے نہایت لاپرواہی سے اپنے سامنے کے آدمیوں کی گردنوں اور پس پشت آنے والوں کے چہروں پر نظر ڈالی۔ اور پھر اپنے خوشگوار تخیلات میں محو ہو گیا۔ بریگیڈ کی روانگی کے وقت اس نے یقین کرنے کی کوشش کی تھی۔ کہ بوسہ کا واقعہ ایک معمولی واقعہ تھا۔ اور یہ کہ قابل توجہ نہیں۔ لیکن جلد ہی اس نے تمام منطق کو بالائے طاق رکھ دیا۔ اور پھر سنہرے سپنوں کی دنیا میں پہنچ گیا۔ اس نے خود کو وان رایک کی نشستگاہ میں تصور کیا۔ اور یہ کہ اسے اس نادرہ جمال کی صحبت کا جو سبز لباس زیب تن کئے ہوئے تھی شرف حاصل ہے۔ اور کبھی وہ سیاہ لباس والی صبیحہ کے پاس استادہ ہے۔ اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ اور ماضی کے دھندلکے میں اسکی چشم تصور نے دوسری لڑکی کے نقش و نگار دیکھے۔ تصور ہی تصور میں وہ اس سے ہمکلام ہوا پیار کیا۔ پھیلے ہوئے بازوؤں میں لے کر خوب بھینچ بھینچ کر سینہ سے لگایا۔ اس نے خیال کیا۔ کہ وہ جنگ پر جا رہا ہے۔ اور اپنی محبوبہ

کو چھوڑے جا رہا ہے۔ یہاں تک کہ وہ جنگ سے واپس آیا۔ اور اہل وعیال کے ساتھ مل بیٹھ کر کھانا کھایا۔

"بریکوں کو ہاتھ میں رکھو" پہاڑی کی اترائی پر کمانڈر نے کہا۔ ریبوویچ نے بھی کمانڈر کے الفاظ دہرائے۔ گو اسے خوف ہوا کہ بولنے سے اسکے تصور کا طلسم ٹوٹ جائیگا۔ اور وہ پھر حقائق و اصلیت کی دنیا میں آ جائیگا۔

راستہ میں انہیں ایک دیہاتی مکان ملا۔ ریبوویچ نے باغ کے خوشنما پودوں پر نظر ڈالی۔ باغ کا ایک لمبا راستہ جس کے گرد و پیش اشجار تھے۔ کو دیکھنے لگا۔ خواب و خیال کی دنیا میں رہنے والے شخص کی طرح اس نے تخیل ہی تخیل میں صنفِ نازک کے ننھے پیروں کی تصویر دیکھی جو کہ باغیچے کی روشوں پر محو خرام ہو گئی۔ اور پھر غیر متوقع طور پر اس دوشیزہ کا نقشہ جس کا اس نے بوسہ لیا تھا۔ سامنے آ گیا۔ اسی لڑکی کا نقشہ جس کی شکل و صورت وہ کل شام باوجود سعی بسیار کے نہ یاد کر سکا تھا۔ اب اسکے پیش نظر تھا۔ یہ بھی صورت اسکے دماغ میں منقوش ہو کر رہ گئی۔ اور پھر کبھی محو نہ ہوئی۔

دوپہر کے وقت بریگیڈ کے آخری حصہ سے آواز آئی۔

"ہوشیار باش۔ افسروں پیش رہیں"

سفید رنگ کے گھوڑوں والی گاڑی میں جنرل سوار تھا وہ دوسرے دستہ کے پاس آن کر ٹھیرا۔ اور کچھ دھیمی آواز میں کہا جسے کوئی سمجھ نہ سکا۔ کچھ افسران جس میں ریبوویچ بھی تھا۔ آگے بڑھتے چلے گئے۔

"یہ کیسے چل رہے ہیں کیا کوئی بیمار ہے" جنرل نے پلکیں جھپکاتے ہوئے کہا۔

جنرل مسکرایا اور ایک دوسرے آفیسر سے مخاطب ہو کر کہنے لگا۔

"آپ کی گاڑی غصہ کے گاڑیبان نے یہ پرسے پٹی اتار کر گاڑی کے ڈنڈے پر لٹکا دی ہے۔ اسے سزا دیجئے" اس نے ریبوویچ کی طرف دیکھا۔ اور کہا "آپ کی بندوق کا فیتہ بہت لمبا ہے"

دو چار جملے اور کہہ کر وہ مسکراتا ہوا لوبکو سے مخاطب ہوا لفٹنٹ لوبکو آپ آج کیسے اداس ہیں" اس نے پوچھا "کیا مادام لوپوخوفا کے لئے ٹھنڈی سانسیں بھر رہے ہیں۔ آہا دوستو لوبکو مادام لوپوکھوا کے لئے آہیں بھر رہے ہیں"

مادام لوپوکھوا دراز قامت اور باوقار عورت تھی۔ اس کی عمر چالیس کے لگ بھگ تھی۔ جنرل جو علو مرتبت و معمر عورتوں کی طرف خواہ ان کی عمر کچھ بھی ہو مائل ہو جایا کرتا تھا اپنے ماتحتوں کو بھی وہ اپنی ہی طرح سمجھتا تھا۔ افسران مسکرائے جنرل بھی اپنی خوش ذوقی پر ہنسا اور زور کا قہقہہ لگایا۔ اس نے گاڑی بان کی پیٹھ ٹھونکی۔ اور گاڑی آگے نکل گئی۔

"میں خوب سمجھتا ہوں۔ کہ یہ محض خواب تھا اور امکانات کی حد و دسے ماورا لیکن ایسے واقعات اکثر ظہور پذیر ہو جاتے ہیں" ریبوویچ نے دل میں کہا "یہ عام بات ہے اور ہر شخص اپنی عمر میں ایسے حادثہ سے دوچار ہوتا ہے۔ جنرل کو ہی کیوں نہ دیکھو۔ اسے پہلے عشق ہوا پھر شادی کر لی۔ اب اسکے اپنے بچے ہیں کپتان باکرکو لے لو حالانکہ اس کی شکل صورت نہیں ہے۔ اور کرتو ہے ہی نہیں۔ تاہم اس سے محبت کی گئی۔ اور پھر اس کی شادی ہوگئی۔ سالمون کو دیکھو کتنا اجڈ انسان بالکل تاتاری معلوم ہوتا ہے۔ اس نے بھی ایک عورت سے محبت کی۔ جو شادی پر منتج ہوئی۔ میں بھی آخر دوسرے انسانوں کی طرح ہوں جلد یا بدیر میرا نصیبہ بھی جاگیگا"

وہ خود کو عام انسانوں کی طرح خیال کر کے بہت زیادہ محظوظ و مسرور ہوا۔ اس نے اپنے اسپ تخیل کو بے لگام چھوڑ دیا۔ اپنی خیالی محبوبہ اور مستقبل کی پر مسرت زندگی کے خیال

میں کھو گیا۔

بریگیڈ جب منزل گاہ پہنچ گیا، اور افسر چھولداریوں میں
بیٹھ گئے۔ تو ریبو وچ بمعہ مرسلیا کو کھانے میں مشغول ہو گیا۔ مرسلیا کو
پیغام یورپ گھٹنوں پر رکھے پڑھ رہا تھا۔ اسلئے بہت آہستہ آہستہ
کھا رہا تھا۔ لوڈنکو مسلسل باتیں کئے جا رہا تھا۔ اور جام پر جام
چڑھائے جا رہا تھا۔ ریبو وچ جس کا دماغ تمام دن کی تخیل
آرائی کے سبب چکرا رہا تھا۔ وہ تھوڑی تھوڑی پی رہا تھا تیسرے
جرعہ کے بعد وہ مست اور نحیف ہو گیا۔ اس پر ایسا جذبہ طاری
ہوا۔ کہ اپنا راز اپنے ساتھیوں پر ظاہر کرنے کے لئے
بیتاب نظر آنے لگا۔

" وان رابک کے مکان پر ایک عجیب واقعہ پیش آیا" اس
نے اپنی آواز میں بے توجہی و عدم التفاتی پیدا کرتے ہوئے کہا
" آپ کو معلوم ہے نا۔ میں بلیرڈ روم میں گیا تھا" پھر اس نے
پورے کی ساری کہانی بالتفصیل سنا دی۔ اسے حیرت ہوئی۔ کہ
اتنی دلچسپ کہانی کو اس نے ایک منٹ میں ختم کر دیا۔ اس
نے خیال کیا۔ کہ اس رومانوی افسانے کو بیان کرتے ہوئے
صبح ہو جانا چاہیئے تھی۔ لوڈنکو نے جو تسلیم شدہ دروغ گو انسان
تھا۔ ریبو وچ کی طرف ایسے انداز میں مسکراتے ہوئے دیکھا
گویا اسے ریبو وچ کے بیان پر کوئی اعتبار نہ تھا۔ مرسلیا کو نے
بھی رسالہ پر سے بغیر نظر ہٹائے کہا۔

" واقعی عجیب قصہ ہے۔ وہ عورت منہ سے ایک لفظ کہے
بغیر اجنبی مرد سے بغلگیر ہو گئی۔ میرا خیال ہے۔ کہ لڑکی بڑی
عاشق مزاج ہو گی"

" بیشک" ریبو وچ نے اتفاق رائے کرتے ہوئے کہا
ایک مرتبہ میرے ساتھ بھی ایسا ہی حادثہ پیش آیا تھا"
لوڈنکو نے کہا "سال گزشتہ میں سیکنڈ کلاس میں کیف جا رہا تھا
گاڑی لوگوں سے بھری ہوئی تھی۔ ایسی حالت میں سونا ناممکن
تھا۔ میں نے ٹی ٹی ای کو ایک روبل دے دیا اور سامان کر
سونے والے ڈبہ میں آ گیا۔ چہرہ کمبل اوڑھ کر لیٹ گیا۔ جیسا کہ
آپ جانتے ہیں کمرہ خواب میں کیسی تاریکی ہوتی ہے۔ میں نے
محسوس کیا کہ کسی نے میرے شانوں کو ہلایا ہے اپنے چہرہ پر کسی
کے گرم تنفس کو محسوس کیا۔ اور پھر کمبل میں سے ہاتھ نکالا میری
گرفت میں کسی کی کہنی آ گئی۔ میں نے آنکھیں کھولیں یقین مانئے
میرے سامنے صنفِ نازک کا مرمریں پیکر تھا۔ سیاہ آنکھیں ہونٹ
گلاب کی پنکھڑیوں کی طرح سرخ و نازک اور سینہ کا مدوجزر۔
آہ کچھ نہ پوچھو"

" خیر میں سینہ کے مدوجزر کے متعلق یقین کئے لیتا ہوں
لیکن یہ تو فرمائیے۔ آپ نے تاریکی میں ہونٹوں کی رنگت کیسے
دیکھ لی" مرسلیا کو نے کہا

لوڈنکو مرسلیا کو کی موٹی عقل پر بہت ہنسا۔ کہ وہ مزاق نہ
سمجھ سکا۔ ریبو وچ نے بُرا محسوس کیا۔ وہ دل میں کہتا ہوا وہاں
سے اٹھ گیا۔ کہ آئندہ وہ ان سے پھر کبھی اپنا رازِ نہاں بیان نہ کریگا

فوجی زندگی کا آغاز ہوا۔ دن پر دن گزرنے لگے۔ ریبو وچ
کو ایک ہی خیال گھیرے رکھتا تھا۔ اس کی حرکات و سکنات مبتلائے
محبت کی طرح تھیں۔ ہر صبح جب اردلی منہ ہاتھ دھونے کے لئے
پانی لاتا۔ تو وہ محسوس کرتا۔ کہ اسے زندگی میں نہایت خوشگوار
اور قیمتی چیز حاصل ہو گئی ہے۔

بعض اوقات جب اسکے احباب عشق و محبت کے موضوع
پر گفتگو کرتے۔ تو وہ قریب ہو بیٹھتا۔ غور سے سنتا۔ اسکے چہرہ پر مسرت
و بہجت کے آثار نمایاں ہو جاتے۔ بعینہٖ اس سپاہی کے جو اس
فتح جنگ کا قصہ سنتا ہو۔ جس میں وہ خود شریک رہ چکا ہو۔ وہ
اکثر رات بھر جاگتا رہتا۔ خلوت میں اپنے بچپن، والدین اور
قریبی اعزا کو یاد کرتا۔ بیگم رابک جو شہزادی یوجین سے مشابہ
تھی۔ تاریک کمرہ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ویرانا مدہوش آواز تمام۔

وقت کیا ہوا بوسہ دماغ میں گستاخانہ قائم تھی۔

ہزیمت خوردہ دوستوں کے ہمراہ واپس جا رہا تھا مگر ریبوروچ وہ بہت خوش و شادکام تھا۔ گویا اپنے وطن کو مراجعت کر رہا ہے اس کی آرزو تھی۔ کہ ایک مرتبہ اور گرجا رابک کے کنبہ اور تاریک کمرہ دیکھے۔ اسکے دل سے آواز آئی۔ ایسی آواز جو عشاق کو مبتلائے فریب رکھتی ہے۔ "اے نادان تو اسے دیکھ سکتا ہے" وہ دل میں سوچنے لگا۔ وہ اسے کیسے سلام کریگا۔ اس سے کیا کہے گا۔ کیا وہ بوسہ کے واقعہ کو بھول چکی ہوگی۔ اگر وہ نہ مل سکی۔ تو وہ اس کمرہ میں جائیگا۔ اس میں گھوم کر چلا آئے گا۔ کمرہ میں جانے سے بوسہ کا لطف از سرِ نو تازہ ہو جائیگا۔

بوقتِ شام افقِ بعید میں گرجا و خرمن نظر آئے۔ ریبوروچ کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ اس نے اپنے برابر سے گزرتے ہوئے آفیسر کی گفتگو بھی نہ سنی۔ اس نے ہمہ تن تمنا بنکر دور چمکتے ہوئے دریا کو دیکھا۔ اس نے رابک کے سقف مکان اور کبوتر خانہ پر بھی نگاہ ڈالی۔

آفیسر گرجا پہنچے۔ پادری وعظ کر رہا تھا۔ ریبوروچ کو امید تھی۔ کوئی اسپ سوار گرجا کے پس پشت سے آئیگا۔ اور چاد پر مدعو کریگا پادری نے اپنا وعظ بھی ختم کر لیا۔ افسیران شب باش ہونے کے لئے کیمپ کی طرف بڑھے۔ مگر کوئی اسپ سوار نمودار نہ ہوا۔

"رابک کو کسی کسان سے پتہ لگ جائیگا۔ کہ ہم یہاں ہیں پھر وہ مدعو کریگا" ریبوروچ نے ایک کمرہ میں داخل ہوتے ہوئے کہا "یہ آفیسران اردلی کیسے بیوقوف ہیں۔ کہ لیمپ روشن کرتے پھرتے ہیں۔ اور اردلی کو دیکھو سماوار گرم کر رہا ہے"

وہ بہت زیادہ کبیدہ خاطر ہوا۔ وہ لیٹ گیا۔ پھر دریچہ میں سے جھانک کر دیکھنے لگا۔ آیا کوئی اسپ سوار آیا ہے۔ لیکن کوئی بھی دکھائی نہ دیا۔ وہ پھر لیٹ گیا۔ اپنی بے چینی و بے قراری پر وہ قابو نہ پا سکا۔ وہ اٹھا۔ باہر آیا اور سوئے گرجا چل دیا۔ گرجا کے سامنے میدان بالکل تاریک اور ویران پڑا تھا۔ پہاڑی کی ایک چٹان پر تین سپاہی استادہ تھے۔ ریبوروچ کو دیکھ کر انہوں نے سلام کیا اور چل دئے۔ ریبوروچ نے سلام کا جواب دیا اور پہاڑی سے اتر گیا۔

دریا کے دوسرے کنارہ پر شفق کے بادلوں میں نیلگوں سرخی کا رنگ بہار دکھا رہا تھا۔ چاند ضیا باری کرتا ہوا نکل رہا تھا۔ عورتیں زور زور باتیں کرتی ہوئیں باغ والے باورچی خانہ میں گوبھی کے پھول لئے جا رہی تھیں۔ باغ سے پرے کچھ جھونپڑیاں تھیں بالکل مئی کے مہینے کا منظر تھا۔ وہی راستہ وہی جھاڑیاں وہی نرگل مگر صرف بلبل کا نغمہ ہی نہ تھا۔ گلاب و سوسن کی خوشبو بھی نہ تھی۔

ریبوروچ باغ میں داخل ہوا اور پھاٹک کے پاس کھڑے ہو کر دیکھا۔ اندر بالکل اندھیرا سا چھایا ہوا تھا۔ بڑے بڑے درختوں کے تنے اور وسیع راستہ کا کچھ حصہ ضرور دکھائی دے رہے تھے باقی ہر چیز ظلمت میں ملفوف تھی۔ ریبوروچ نے کان لگائے اور اندھیرے میں گھور گھور کر دیکھا۔ مگر آدھ گھنٹہ انتظار کرنے دیکھنے اور سننے کے بعد بھی اسے کچھ نہ دکھائی دیا۔ اور نہ کچھ سنائی دیا بالآخر وہ واپس ہوا۔

وہ کنار دریا کھڑا ہو گیا۔ تاریکی میں دور نواب کا غسل خانہ جس میں روشنی ہو رہی تھی۔ دکھائی دیا۔ پل کے جنگلہ پر کوئی کپڑا لٹکا ہوا تھا۔ وہ پل کے پاس آیا۔ اور بغیر سوچ سمجھے کپڑا مس کرنے کے لئے ہاتھ بڑھایا۔ پھر جھک کر آب رواں دیکھنے لگا۔ پانی مدھم سروں میں نغمہ جانفزا گاتا ہوا بہہ رہا تھا۔ ماہ عالم تاب دریا میں عکس ریز تھا۔ سبک لہریں رواں دواں تھیں معلوم ہوتا تھا۔ کہ قمر نور پاش کو وہ اپنی آغوش میں بہالے جانا چاہتی ہیں

"کتنا غیر جاذب کتنا غیر دلکش سین ہے۔ سب فضول بے معنی" ریبوروچ نے دریا کی بیتاب لہروں کو دیکھتے ہوئے کہا۔

اب وہ بالکل مایوس ہو گیا تھا۔ بوسہ کا واقعہ اسکا مضطرب

وہاں اور اس کی مبہم امیدیں اپنے اصلی رنگ میں ظاہر ہو رہی تھیں۔ اب اسے کوئی حیرت نہ تھی۔ کہ نواب کا گھوڑا کیوں نہیں آیا اور یہ کہ اس لڑکی سے جس نے اسکا بوسہ لیا تھا۔ کبھی ملاقات نہ ہوگی۔ اور ہاں اگر اس لڑکی سے ملاقات ہو جاتی۔ تو یہ امر تعجبات میں سے ہوتا۔

اسکے سامنے ندی بہ رہی تھی۔ کون جانتا ہے کہ یہ کیوں بہ رہی ہے۔ کہاں جا رہی ہے؟ مٹی میں بھی یہ بہتی تھی۔ یہ معمولی چشمہ سے نکلتی ہے۔ اور بڑے دریا سے ہمکنار ہو جاتی ہے۔ اور سمندر بے پایاں سے ہم آغوش۔ پھر بحرِ بیکراں سے کہر کی صورت میں اٹھتی ہے اور بارش بنکر برستی ہے۔ اب شاید یہ پانی جو بہہ رہا ہے۔ وہی پانی ہے جو اس نے مٹی میں دیکھا تھا۔ آہ یہ سب کیوں اور کس لئے؟

پیرو وچ کے لئے اب زندگی عبادت تھی۔ وسعت بے پایاں سے۔ زندگی اسکے لئے ناقابل تجزیہ مسئلہ تھا۔ وہ اسے محض خوش مزاجی سے تعبیر کر رہا تھا۔ اس نے پانی پر سے اپنی نگاہیں ہٹائیں سوئے آسمان دیکھا۔ اسے پھر محسوس ہوا کہ قضا و قدر نے کیسے ایک عورت کے ذریعہ خلاف توقع اس کی زندگی میں ایک صورت دیکھنا پیدا کر دیا۔ پھر موسم بہار کی دلآویزیوں اور رنگینیوں کو یاد کیا۔ آہ اب اس کی زندگی کتنی درماندہ ویران اور بے رونق تھی

وہ جب اسکے کمرہ میں واپس آیا۔ تو وہاں اسکے ساتھیوں میں سے کوئی بھی نہ تھا۔ اردلی نے کہا۔ کہ تمام افسران کو نواب نے مدعو کیا تھا۔ وہ سب کے سب انکے یہاں گئے ہیں۔ اوخدایا بلانے کے لئے کون اسپ سوار آیا تھا۔ ایک ثانیہ کے لئے پیرو وچ کے سینہ کا لبت وکشاد مسرت و انبساط سے لبریز ہو گیا۔ لیکن فوراً ہی اس کی خوشیوں پر یاس و قنوط کے بادل چھا گئے۔ قسمت نے اس کے ساتھ کتنا برا سلوک کیا۔ وہ نواب کے عشرت کدہ پر نہیں گیا۔ بلکہ مایوس و پریشان بستر پر یہ کہتا ہوا گر پڑا۔

ہمہ شوق آمدہ بودیم۔ ہمہ حیراں رفتم

شایق ہندو

اشنان

گنگا پہ منہ اندھیرے اشنان کرنیوالی
او بحر و بر میں برپا طوفان کرنے والی

کچھ ہے خبر بھی تجھ کو اے پیکرِ جوانی
غیرت سے تیرے آگے گنگا ہے پانی پانی

بخشی ہے تونے آکر ساحل کو زندگی سی
دریا میں پڑ گئی ہے سمت کھلبلی سی

موجیں لپک رہی ہیں ہاتھوں پہ تجھ کو لینے
گرداب بڑھ رہے ہیں آنکھوں پہ تجھ کو لینے

نظروں سے حسن اپنا ان کی ذرا بچانا
لاکھوں جگہ کہیں گے ان سب کا کیا ٹھکانا

چپکی ہوتی ہے تن سے ساری مہک نہ جائے
پانی کی زد سے کوئی کونا کھسک نہ جائے

پا جائیں گی جو موجیں رخسار کے گلوں کو
سوغات دینگی جاکر کاشی کے ساحلوں کو

گیسو نہ کھول کر تم اس طرح سے نہاؤ
دنیا پہ رحم کھاؤ جادو نہ یوں جگاؤ

بالوں کو یوں نہ جھٹکو باز آؤ خود سری سے
پیدا نہ ہوں بلائیں اس ابرِ سامری سے

اُودے سے لگ رہے ہیں جو ہونٹ تھے گلابی
پانی ہیں جاکے بالکل لگتے ہیں یہ بھی آبی

پھیکے سے پڑ گئے ہیں رخسارِ ارغوانی
رنگت پہ پھر گیا ہے دوشیزگی کا پانی

سُرخی یہ اُڑ نہ جائے گالوں کی دھول ہوکر
پانی میں رہ نہ جائیں پانی کے پھول ہوکر

پانی سے آؤ باہر سردی کا ہے زمانا
ہندو کی بات مانو بس ہو چکا نہانا

گردوپیش

ہندی تھیٹر

دیومالا رکھنے والی اقوام ڈرامہ اور اس کی ضروریات بھی رکھتی ہیں۔ ہندوستان قدیم سے اس فن میں درک رکھتا ہے۔ پروفیسر کیتھ کا یہ خیال کہ ہندوستان میں ڈرامہ اور ڈرامہ کی تمثیل کے لئے "گھر" کا باقاعدہ رواج یونانیوں کی آمد سے ہوا۔ ذرا بعید از قیاس ہے۔ اس لئے کہ یونانیوں کی آمد و فتح سے بہت پہلے بھی ہندوستانی ادب اور دوسرے ذرائع سے ہندوستانی ناٹک اور اس کی عمارت کا پتہ چلتا ہے۔ موجودہ تحریر میں میں صرف اس فن کے ایک پہلو پر روشنی ڈالوں گا۔ اور وہ ناٹک کی تعمیر کاری ہے

ظاہر ہے۔ کہ ہر عمارت اپنی مدنی ضرورت کا نتیجہ ہوتی ہے۔ اس لئے ہندوستانی ناٹک کے تین مقام ہیں۔ ایک کھلی فضا دوسرا کھلی فضا اور کچھ عمارت اور تیسرا ناٹک کی عمارت۔ ہندوستان اپنے موسم کے لحاظ سے کم از کم سال کا ایک حصہ ایسا رکھتا ہے۔ جس کے لئے معاشرتی اشغال دھوپ اور بارش سے محفوظ رہ کر بھی کھلی فضا میں ہو سکتے ہیں۔

کھلی فضا کی ناٹک دراصل ہندوستان کی قدیم ترین تمثیل گاہ ہے۔ جس کے نہایت ہی پست اور متبذل شدہ نمونے اب بھی رہس اور گاؤں کے بھاگوت وغیرہ میں نظر آتے ہیں۔ یہ طریقے کسی زمانہ میں بہت پاکیزہ باقاعدہ اور حسن کارانہ تھے۔ مثال کے طور پر آپ آج سے دو ہزار سال قبل کے ہندوستان کو تصور کی آنکھ سے دیکھئے۔ تاروں بھری رات ہے۔ موسم گرما اور سرما کے درمیان کا ہے۔ ایک اونچے چبوترے کے اطراف مختلف حصوں پر نشستیں بنی ہوئی ہیں۔ کہیں پر گاؤں کے بڑے لوگ براجمان ہیں۔ کہیں عورتوں کی نشست ہے۔ اور کہیں اعلیٰ ذات کے تماشائی ہیں۔ اس میں کہیں دور پرے مفتوح قوم بھی بیٹھی ہوئی ہے۔ جس کو اچھوت کہتے ہیں۔ سامنے اونچے مقام پر پھول پات کی تزئین سے ایک ناٹک کا منڈوہ ڈالا گیا ہے۔ جس کے پردوں کو رنگ برنگ کے کپڑے اور ملبوس خوبصورت بنائے ہوئے ہیں۔ اسٹیج کا پروسیلین (RROCELENE) (نظارہ گاہ) دو طرف موز کے تنوں پتوں اور ناریل کی ٹہنیوں سے قائم ہے۔ جس پر خوبصورت پھول اور پتوں کے بار آویزاں ہیں۔ صرف اسٹیج مشعلوں کی آڑی ترچھی روشنی سے منور ہے۔ جس کی بھولی بھٹکی روشنی تماشائیوں کے سروں پر بکھری ہوئی ہے۔ انہیں مشعلوں کو کم یا زیادہ کر کے روشنی کے تاثرات میں کمی بیشی کی جا رہی ہے۔ غم کے منظر میں دو دھندلے میں روشنی پیدا کر رہے ہیں۔ خوشی کے منظر میں چھ مشعل منور کر رہے ہیں۔ اسی طرح مختلف مناظر کے پس منظر رنگین کپڑوں کے الٹ پھیر رد و بدل اور کمی زیادتی کے ذریعہ سے تنوع پیدا کیا جا رہا ہے۔ یہ اسٹیج انتہائی سادہ اور پرکار ہے۔ اس میں دماغ اور تخیل کا زور زیادہ اور ظاہری اعمال کی نمائش کم ہے۔ اکثر چیزیں مفروضات پر ہیں۔ زیادہ تر اعمال تصور کے زور سے تماشائیوں کے دل کی آنکھوں کے سامنے آتے ہیں۔ بہت سی چیزیں پہلے سے مانی ہوئی ہیں۔ اور کچھ ان دیکھے منوائی گئی ہیں۔

ہندی ناٹک کا بیرونی نقشہ

دوسرے قسم کا اسٹیج اور تھیٹر کم و بیش یونانی طرز کا ہے۔ جس میں اسٹیج پر ایک مستقل عمارت ہے۔ اور اطراف تماشائیوں کا میدان اس کی صورت شکل زیادہ تر دیہات سے قصبوں کے لئے موزوں ہے۔ جہاں کا ماحول ایسی مستقل چیز کے لئے اجازت دے سکے۔
اس میں پہلی قسم کے اسٹیج سے کچھ زیادہ ظاہری سہولتیں ہیں۔ لیکن سادگی میں دونوں تقریباً برابر ہیں۔ تاہم اس سے ایک فائدہ

نقشہ ہندی ناٹک گھر نیم دائری

اداکار اور اداآموز کو پہنچتا ہے۔ کہ وہ اس مستقل عمارت کے سایہ میں اچھی طرح سے نظر بندی OPTICAL ALLUSION پیدا کر سکتا ہے۔

تیسرا طریقہ تیسرے طریقے کو بیان کرنے سے پہلے چند علمی باتیں کہہ دینا ضروری ہیں۔ ہندوستانی ناٹک گھر اہل ہنود کے دوسرے فنون کی طرح مذہب ہی کی ایک شاخ ہے۔ اور یہ کہنا مبالغہ نہیں۔ کہ ناٹک گھر کی تعمیر کو بھی ایک مستقل فن کی طرح پیش کیا گیا ہے۔ جس کو سنسکرت میں رنیتہ شاستر کہتے ہیں۔ اس پر سنسکرت کے مستشرق اور ہندی پنڈتوں نے خاصی تشریح کی ہے چنانچہ قدیم ہندوستانی تعمیر کاری کے متعلق جو کتاب مسٹر ویدیا گھو ندنے لکھی ہے۔ اس میں بھارتہ، (کتاب رنیتہ شاستر) کے دوسرے باب کو اس فن کے اصول بیان کرنے کے لئے نقل کر دیا ہے۔ چونکہ ہم اس وقت ایک عام فہم اور مختصر مضمون لکھ رہے ہیں۔ اس لئے اس فن کی تفصیلات میں جانے کی ضرورت نہیں۔ ایک مختصر خاکہ ہماری اس تحریر کے لئے کافی ہے۔

مستقل ناٹک کو ہندوستانی اہلِ فن نے بڑی تفصیل کیساتھ پیش کیا ہے۔ جس میں دیہات، قصبہ اور شہر تینوں کی ضروریات کے لحاظ سے عمارتوں کو تجویز کیا ہے۔ اسی طرح ضروریات کے لحاظ سے بھی خاکوں میں تبدیلی ہوئی ہے۔ مثلاً مذہبی ناٹک گھر، معاشرتی ناٹک گھر، اور فنی ناٹک گھر، ظاہر ہے کہ ناٹک ایک مقام ہے۔ جہاں انسانی تخیل کے ان اعمال کو عملی شکل میں پیش کیا جاتا ہے۔ جو ادبی زبان میں ڈرامہ کے نام سے یاد کئے جاتے ہیں۔ جو ڈرامہ کے علاوہ ناچ مذہبی نظم خوانی، بھجن کے گیت۔ اور بلا الفاظ کے ڈرامہ غرض مختلف اور چیزیں بھی داخل ہیں۔ تعمیر کار نے ہر ضرورت اور ہر مقام اور ہر موضوع کے لئے گنجائش رکھی ہے۔

جو فرق عمارتوں کا آبادی کے لحاظ سے کیا گیا ہے۔ اسی میں صرف گنجائش کی کم و بیشی کے لحاظ سے عمارت کی کیفیت اور کمیت کو تجویز کیا گیا ہے۔ لیکن ضروریاتِ فن کے لحاظ سے اس کی تین قسمیں ہیں۔ ایک نیم دائری ناٹک دوسری مستطیل ناٹک۔ تیسری مثلثی ناٹک۔ اب ہم ان تینوں کو الگ الگ بیان کرینگے۔

پہلی (نیم ڈائری) ناٹک میں اسٹیج سے نیچے ایک نیم دائرہ بنایا جاتا ہے۔ اور اسٹیج کے دونوں جانب سنگھار گھر وغیرہ ہوتے ہیں۔ اسٹیج کہیں پر مقام تماش میں گھس آتا ہے: اور کہیں پر نہیں۔ چھت ستونوں پر قائم کیا جاتا ہے۔ جو نیم دائرہ میں اس طرح تقسیم کئے جاتے ہیں۔ کہ تماشائیوں کی نظر میں حائل نہ ہوں۔ اسی طرح تماشہ گاہ میں آنے کے لئے سات دروازے رکھے جاتے ہیں۔ جن میں سے بڑا دروازہ بالکل وسط میں ہوتا ہے۔ ایک اور خاص بات یہ ہوتی ہے۔ کہ نیم دائرے کے اطراف ایک کھلا برآمدہ ہوتا ہے۔ تاکہ تماشائیوں کو انتظار کے وقت ٹھہرنے کی جگہ ملے۔ اور ہال میں ہوا کی کافی گنجائش رہے۔ سیدھی جانب اسٹیج سے ملا ہوا آخری دروازہ بادشاہ یا سب سے بڑے امیر کے لئے ہوتا ہے۔ اور بائیں جانب کا اسٹیج سے ملا ہوا آخری دروازہ امرأ کے لئے ہوتا ہے۔ باقی دوسرے دروازوں سے چاروں جاتی کے لوگ اپنی اپنی جگہ پر بیٹھتے ہیں۔ اور اسی طرح ایک دروازہ اس قوم کے لئے ہوتا ہے۔ جس پر آریہ حکمران ہیں

نقشہ مثلثی ناٹک گھر

یہ اسٹیج اور ناٹک شہروں کے لئے بہت موزوں ہے۔ اسکی تعمیر میں نہ صرف کافی جگہ کی ضرورت ہے۔ بلکہ سرمایہ اور فن بھی۔ عموماً اس قسم کے ناٹک ہر کام کے لئے استعمال ہو سکتے تھے۔ اور چونکہ نشستیں پہلے ہی سے مقرر ہوتی تھیں۔ اس لئے کوئی دقت نہ تھی۔
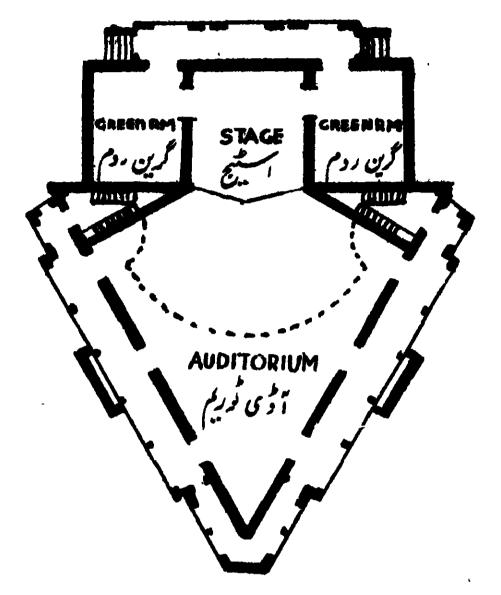
دوسری قسم کا ناٹک گھر مستطیل ہے۔ تماشہ گاہ ایک بڑے مستطیل میں کیا جاتا ہے۔ اس کی جانب اسٹیج معہ اس کی لوازمات کے اور دوسری جانب اصل دروازہ معہ سیڑھیوں کے۔ اور دونوں رخوں پر تین تین دروازے ہوتے ہیں۔ یہاں بھی سات دروازوں کی تقسیم اسی غرض و غایت کے لئے رکھی جاتی تھی۔ جو اوپر کی طرز میں موجود ہے۔ یہ عمارت چونکہ تعمیر میں بہت آسان ہے۔ اور ضروریات کے لحاظ سے سہولیت بخش ہے۔ اس لئے پہلی طرز سے زیادہ مقبول اور عام رہی ہے

تیسری قسم کا ناٹک مثلثی ناٹک ہے۔ یہ چونکہ ایک انوکھی طرز ہے۔ اس لئے زیادہ عام نہیں۔ ایک مستطیل چبوترے پر اسٹیج اور اس کے ایک بڑے رخ کو قاعدہ مان کر ایک مثلث مساوی الاضلاع اور اسی مثلث کے اندر تماشہ گاہ ہے۔ یہاں دروازے چھ ہیں لیکن اسٹیج کی طرف دو دروازوں کا اضافہ ہوگیا ہے۔ جو ضروریات کی تکمیل کرتے ہیں۔ اسٹیج کے نظارہ گاہ سے آگے بڑھا کر ایک قوس بنایا گیا ہے۔ تاکہ اسکی وسعت کو اداکاروں کے عمل کے لئے میدان بنایا جا سکے۔ اور اس طرح ناظرین کی تماشہ بینی میں کوئی فرق نہ آئے۔ ہمارے خیال میں یہ ناٹک گھر اپنی نوعیت کی سب سے انوکھی تعمیر ہے۔ اور چھوٹے مقام کے لئے بہترین نمونہ ہے

نوٹ:۔ یہ مضمون بی۔ کے اچاریہ پروفیسر جامعہ الہ آباد کے ایک مضمون THE PLAYHOUSE OF HINDU PEIOD سے ماخوذ ہے۔

اکبر وفا قانی بی۔ اے

(مجلہ عثمانیہ)

عہدِ حاضر

علی سردار جعفری

وقت کی پلکوں پہ اِک آنسو چمکتا ہے مگر
تھرتھرا سکتا ہے عارض پر ٹپک سکتا نہیں

عمر کی بوڑھی رگوں میں نوجوانی کا لہو
دوڑتا پھرتا ہے چہرے پر جھلک سکتا نہیں

تاجِ انگریزی میں اِک ہیرا ہے مثلِ آفتاب
ہند کے بے نور ماتھے پر چمک سکتا نہیں

چپکے چپکے کھل رہا ہے عہدِ نو کا سرخ پھول
مسکرا سکتا ہے زیرِ لب مہک سکتا نہیں

رات کے آنچل میں پنہاں ہے سحر کا زرد نور
صبح کے زریں ابر و پر چمک سکتا نہیں

ایک انگارہ چھپا ہے زندگی کی راکھ میں
راکھ کے نیچے سلگ سکتا ہے دہک سکتا نہیں

نا تمام